حصّہ دوم

# بابری مسجد

# شہادت کے بعد

ترتیب و ادارۃ : محمد عارف اقبال

# بابری مسجد

شہادت سے قبل — شہادت کے بعد

## ایک تاریخی دستاویز

حصہ دوم

شہادت کے بعد

مرتب

محمد عارف اقبال

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ

FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.

NEW DELHI-110002

نام کتاب

بابری مسجد

شہادت سے قبل......شہادت کے بعد

ایک تاریخی دستاویز

حصّہ دوم بابری مسجد: شہادت کے بعد

مرتب: محمد عارف اقبال

کمپوزنگ: عبدالتواب

صفحات: ۴۶۸+۲۰ قیمت:-/۱۲۵روپے

طبع اوّل: مارچ ۲۰۰۴ء

باھتمام

محمد ناصر خان

## ضروری وضاحت

ایک مسلمان جان بوجھ کر قرآن مجید، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دینی و دیگر علمی کتابوں میں غلطی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بھول کر ہونے والی غلطیوں کی تصحیح و اصلاح کے لیے بھی ہمارے ادارہ میں مستقل شعبہ قائم ہے اور طباعت سے قبل کوشش کی جاتی ہے کہ نشاندہی کی جانے والی جملہ غلطیوں کی بروقت تصحیح کر دی جائے۔ اس کے باوجود غلطیوں کا امکان باقی رہتا ہے۔

لہٰذا قارئین کرام سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ علمی غلطیوں کی نشاندہی کریں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔ نیکی کے اس کام میں تعاون کرنا صدقہ جاریہ کے مترادف ہے۔ (ادارہ)

Name of the book
**BABRI MASJID**
(*Shahadat se Qabl... Shahadat ke Baad*)
Part II: *Shahadat ke Baad*
Compiled by: **Muhammad Arif Iqbal**
Ist Edition: **March, 2004**
Pages: 468 + 20 Size: 23x36/16
**Price: Rs. 125/-**

ناشر

فرید بک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ

**FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.**

Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House Darya Ganj, N. Delhi-2
Phones: 23289786, 23289159 Fax: 23279998 Res.: 23262486
E-mail: farid@ndf.vsnl.net.in Websites: faridexport.com, faridbook.com

Printed at: Farid Enterprises, Delhi-6

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# پیغامِ ربّانی

□□ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا
جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے
اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کرے؟
ایسے لوگ تو اس قابل ہیں کہ
ان میں قدم ہی نہ رکھیں اور ان میں داخل بھی ہوں
تو ڈرتے ہوئے
اُن کے لئے تو دنیا میں رسوائی ہے اور
آخرت میں عذابِ عظیم۔ (سورہ البقرہ:114)

□□ اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔

(سورہ الحج:78)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرضِ ناشر

مسلمانانِ ہند کو تقسیم ہند 1947ء کے بعد جس بڑے سانحہ سے گزرنا پڑا وہ سانحہ شہید بابری مسجد ہے جس کی شہادت تخریب پسند ہندوؤں کے ہاتھوں 6 ردسمبر 1992ء کو ہوئی۔

ملک کی موجودہ نازک صورت حال میں ''رام مندر'' بنانے کی تیاری آر.ایس.ایس.اوراس کی ذیلی دہشت پسند تنظیموں کی طرف سے کی جارہی ہے۔خدشہ ہے کہ کہیں پورے ملک میں گجرات سانحہ کا اعادہ نہ کر دیا جائے۔ایسے پر تشدد ماحول میں نئی نسل ایک دوراہے پر کھڑی نظر آتی ہے۔کیونکہ اب نام نہاد قیادت بھی بے بسی، اضطراب اور مایوسی کی کیفیت میں مبتلا ہو چکی ہے۔نئی نسل کو جہاں اسلام کی تاریخ نہیں معلوم ہے وہاں خود اس ملک میں بابری مسجد کی شہادت اور اس کی تاریخ سے بھی نئی نسل تقریباً نابلد ہے۔لہٰذا اس کے خام ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات جنم لے رہے ہیں۔ایسی صورت میں اس بات کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی کہ بابری مسجد تنازع کے تاریخی پس منظر اور اس مسئلہ کے تناظر میں رونما ہونے والے خونریز واقعات اور حالات پر مشتمل ایسی کتاب ہو جس کے مطالعہ سے ایک نشست میں مسئلہ کے تاریخی پس منظر اور نوعیت سے ہر شخص واقف ہو سکے۔نیز ہندتو کے عزائم بھی ان پر آشکارہ ہو جائیں۔ مجھے بے حد مسرت ہے کہ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اس موضوع پر کتاب کی دو جلدیں آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔

مجھے توقع ہے کہ عصرِ حاضر کے اس سلگتے ہوئے موضوع پر اس انتخاب میں آپ کو اس مسئلہ کے ہر پہلو پر مفید معلومات حاصل ہوں گی۔تمام معلومات مستند ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں، اس لیے کتاب کی دونوں جلدیں دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔

میں کتاب کے مرتب کے لئے خصوصی طور پر دعاء گو ہوں جن کی انتھک محنت سے ''شہید بابری مسجد'' کے موضوع پر دونوں جلدیں شائع کی جاسکیں۔اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر سے نوازے۔آمین

—— محمد ناصر خان

# ترتیب

## بابری مسجد: شہادت سے قبل ـــ شہادت کے بعد

## باب: 8 موجودہ حالات میں



## باب: 9 دستاویزات (Documents)

**تمت بالخیر**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرضِ مرتب

ہمارے ملک کے دستور میں ہندوستان کو ایک سیکولر ملک قرار دیا گیا ہے اور سیکولرزم کی تعریف میں ہمارے قانون داں اور دانشور جس مفہوم کو بیان کرتے ہوئے نہیں تھکتے، اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ ملک میں ہر مذہب کے ماننے والے کو اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے اور مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی مکمل آزادی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ہمارے ملک میں سیکڑوں مساجد ایسی ہیں جن میں مکمل طور پر مسلمانوں کو عبادت کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ اس کے جواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہ مساجد تاریخی ہیں، لہٰذا ان کی حفاظت حکومت کی ذمہ داری ہے۔ چونکہ یہاں موضوع بحث سیکولرزم نہیں ہے، لہٰذا فی الحال اس سے گریز کرتے ہوئے اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ ہمارے ملک میں تاریخ کے نام پر جن مساجد کو حکومت اپنی تحویل میں رکھتی ہے، اسی ملک میں تاریخ کا یہ افسوسناک اور المناک سانحہ بھی وقوع پذیر ہوا کہ اجودھیا میں 6 دسمبر 1992ء کو 1528ء کی تعمیر شدہ بابری مسجد کو ہندو احیاء پرست دہشت پسندوں کے ہاتھوں سیکوریٹی فورسز اور انتظامیہ کی نگرانی میں اس طرح شہید کر دیا گیا کہ اب وہاں مسجد کی زمین کے علاوہ مسجد کی عمارت کا نشان تک نہیں پایا جاتا اور بڑی دیدہ دلیری سے اس جگہ پر رام کے بت کو نصب کر دیا گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس وقت بابری مسجد کو شہید کیا جا رہا تھا اس وقت کیا کچھ دیر کے لئے دستور سے 'سیکولرزم' کی شق کو خارج کر دیا گیا تھا۔ یقینی طور پر ایسا نہیں تھا بلکہ ملک میں ہندتو کی دہشت گردی کی آگ کو ہوا دینے والی تحریک اور تنظیموں نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔ جس وقت یہ واقعہ رونما ہوا، اتر پردیش میں آر.ایس.ایس.کی سیاسی تنظیم بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت تھی اور وہاں کے وزیر اعلیٰ آر.ایس.ایس.کی اہم شخصیت کلیان سنگھ تھے۔ البتہ مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی اور اس وقت وزیر اعظم پی.وی.نرسمہا راؤ تھے۔

بابری مسجد کی شہادت کے بعد ساری دنیا میں شدید احتجاج کیا گیا اور ہمارے ملک پر ہر طرف سے تھوتھو کی بوچھار کی گئی۔ کچھ دیر کے لئے پارلیمنٹ میں مسلم ممبران کے احتجاج پر ہنگامہ ضرور ہوا لیکن رفتہ رفتہ بابری مسجد کی شہادت کو فراموش کر دیا گیا۔ مسلم ممبران پارلیمنٹ کا احتجاج برائے نام تھا حتیٰ کہ کسی نے یہ بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ وہ احتجاج میں اپنا استعفیٰ ہی پیش کر دیں۔ دوسری طرف زمینی سطح پر ہندتو وادی تنظیموں نے ''رام مندر'' کی تعمیر کی تحریک شروع کر دی۔ ملک کی مختلف ریاستوں میں فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ اب تک ہزاروں مسلمان شہید ہو چکے ہیں اور اربوں کھربوں کی املاک تباہ ہو چکی ہے۔ حالیہ گجرات فساد نے تو مسلمانوں کی کمر ہی توڑ دی ہے۔

فی الوقت ملک میں مسلمان جن نازک حالات سے گزر رہے ہیں اس کا اندازہ کم و بیش سبھی کو ہے۔ لیکن اس المیہ کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ملک میں ''قیادت'' کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے۔ اور مسلمانوں کی صورت حال بھیڑ کے اس ریوڑ کی طرح ہے کہ جب چاہے بھیڑیا اس کا شکار کر لے۔

رام مندر کی تحریک اپنے شباب پر پہنچ چکی ہے۔ اور منافق مسلمانوں کا اس تحریک کو بھرپور تعاون حاصل ہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ، بابری مسجد کی کمیٹیاں اور مسلم مجلس مشاورت کے رہنما اپنی حد تک احتجاجی داؤ پیچ سے کام لے

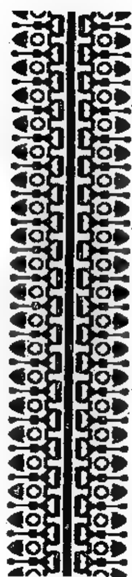
رہے ہیں۔ لیکن بابری مسجد کے مسئلہ کی ڈور جوں جوں سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے، مزید اُلجھ جاتی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کو اب جبکہ تقریباً 12 سال ہونے کو ہیں، ہر طرف خون کی ہولی کھیلنے کی زبردست تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ مسلم قائدین ''جمہوریت اور سیکولرزم'' کی بقا اور عدلیہ کی دہائی تو دے رہے ہیں لیکن قوم کی حقیقی قیادت کرنے والا کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔ ایسی صورتحال میں قوم کی وہ نوجوان نسل جو بالخصوص 25-20 سال کی عمر کے درمیان ہے، حیران و پریشان ہے کہ بابری مسجد کا اصل معاملہ کیا ہے؟ اس نسل کو یہ بھی نہیں معلوم کہ بابری مسجد کی اصل تاریخ کیا ہے؟ اللہ کے نزدیک مسجد کی کیا حیثیت ہے؟ رام مندر کے پس پردہ کون سے عوامل کارفرما ہیں؟ جو کچھ بتایا جا رہا ہے وہی درست ہے یا کچھ اور بھی حقیقت ہے۔ بعض اوقات نوجوانوں کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''ملاؤں نے اپنا پیٹ پالنے کے لئے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے'' کسی طرف سے یہ آواز بھی آتی ہے کہ اب تو مسجد منہدم ہو گئی۔ پھر رام مندر بنانے کے لیے جگہ کیوں نہیں دی جاتی۔ بعض نوجوانوں کے معصوم ذہنوں سے یہ بھی اگلوایا جاتا ہے کہ وہاں مسجد ویران تھی، کوئی نمازی جاتا ہی نہیں تھا لہٰذا اگر توڑ دی گئی تو کیا ہوا، دوسری جگہ مسجد بنالی جائے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

''بابری مسجد: شہادت سے قبل ـــــ شہادت کے بعد'' کتاب کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ اس موضوع پر بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کیا جائے اور تمام نقطۂ نظر پر مشتمل ایک ایسا انتخاب ہو جس کے مطالعہ سے بابری مسجد کی تاریخ، اس کی شہادت اور تاحال صورت حال سے لوگ واقف ہو سکیں۔ اگرچہ انتخاب کے وقت اس موضوع پر اتنا مواد اکٹھا ہو گیا کہ اسے کتابی صورت دینے میں دقت بھی محسوس ہوئی۔ تاہم تکرار سے گریز کرتے ہوئے کوشش کی گئی کہ اس موضوع کا کماحقہٗ احاطہ کیا جا سکے۔ اس کے باوجود اس کی ضخامت بڑھتی ہی گئی۔ لہٰذا سہولت کے پیش نظر اس انتخاب کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس کی پہلی جلد ''شہادت سے قبل'' اور دوسری جلد ''شہادت کے بعد'' پر مشتمل ہے۔ لیکن دونوں جلدیں اپنی جگہ منفرد اور مکمل ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ شہید بابری مسجد کے موضوع پر یہ دونوں جلدیں اپنے مواد کے لحاظ سے ہر طرح مکمل اور اس مسئلہ کو گہرائی سے سمجھنے میں معاون ہوں گی۔ اس انتخاب کے لیے جن متعدد کتب، رسائل و اخبارات کے تراشوں اور مضامین کا مطالعہ کیا گیا ان میں مولانا صباح الدین عبدالرحمٰنؒ کی تصنیف ''بابری مسجد: تاریخی پس منظر اور پیش منظر کی روشنی میں'' ماہنامہ افکار ملی نئی دہلی کا بابری مسجد نمبر، کانپور کا ڈائجسٹ استقامت (شہید بابری مسجد نمبر)، روزنامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی اور انگریزی جریدہ فرنٹ لائن سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا۔ میں ذاتی طور پر تمام کتب کے مصنفین اور رسائل و اخبارات کے مدیران کا ممنون ہوں۔ اس انتخاب کی ترتیب میں جن اصحاب نے جس درجہ میں تعاون و مشورے سے نوازا ان کا بھی بے پایاں ممنون ہوں۔

دعا ہے کہ ''بابری مسجد: شہادت سے قبل ـــــ شہادت کے بعد'' کی دونوں جلدیں ملک اور مسلمانانِ ہند کے لیے باعث خیر ہوں اور اللہ تعالیٰ ہمیں درست فیصلے تک پہنچنے کی سعادت نصیب فرمائے۔ نیز ادارہ 'فرید بکڈپو (پرائیویٹ) لمیٹڈ' کے ڈائریکٹر محمد ناصر خان صاحب کا بھی متشکر ہوں کہ ان کی تحریک اور تعاون سے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو!

ـــــ محمد عارف اقبال






# بابری مسجد: شہادت کے بعد

## چشم دید واقعات، تبصرہ، تجزیہ، ردّعمل





بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہندتو کے جارحانہ انداز اور مظالم سے خود اس ملک کی ہندو برادری کے دل دھل اٹھے۔ میڈیا نے بھی اس المناک واقعہ کو ملک کا عظیم سانحہ قرار دیا۔

اس باب میں شامل چشم دید تاثراتی مضامین کے مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ 'ہندتو' کا کریہ اور شرمناک چہرہ کیسا ہے... جو انسانیت کی تذلیل کو بھی اپنے دھرم کا ایک حصہ تصوّر کرتا ہے۔ (مرتب)

# ہندتو کے مضرت رساں اصول بے نقاب ہو گئے

از: دلیپ پڈ گاؤنکر (معروف صحافی)

اجودھیا کے سلسلہ میں تمام بدترین خدشات سامنے آ گئے، متنازعہ بابری مسجد کی عمارت مسمار کر کے پیوندِ زمین کر دی گئی۔ سپریم کورٹ کو دی گئی تمام یقین دہانیوں اور وعدوں کے باوجود کلیان سنگھ کی حکومت اور "سنگھ" خاندان کے لیڈر اس انتہائی تہذیب سوز فعل کو وقوع پذیر ہونے سے نہ روک سکے۔ ان کی یہ ناکامی اس بات کا مظہر ہے کہ وہ آئین کے دائرہ کار میں عمل کرنے سے یا تو گریزاں تھے یا نااہل یا پھر دونوں ہی باتیں تھیں۔ مسجد کی تباہی کے سلسلے میں وہ خواہ کچھ بھی تاویلات پیش کریں ملک اور قوم کی نگاہوں میں انہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ آئین اور قانون کے دائرہ سے خارج ہو چکے ہیں۔ اپنے اس انتہائی جاہلانہ اور ناعاقبت اندیشانہ کردار کی بہت مہنگی قیمت بھارتیہ جنتا پارٹی کو چکانی پڑے گی، جبکہ ملک کی چار ریاستوں میں ان کی حکومت ہے، اور بھی کئی مقامات پر ان کے نمایاں اثرات ہیں۔ بیک جنبش قلم بی۔ جے۔ پی نے اپنے حاکمانہ حق کو ساقط کر دیا ہے اور قوم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہو گئی ہے کہ اتوار کے ڈرامائی واقعات کے دوران جبکہ اس نے اپنے حواس اچانک خبط کر دیئے کوئی ذمہ داری کیونکر اس کے سپرد کی جا سکتی ہے۔ اپنے اس عمل سے اس نے خود ہی اپنے خلاف غیر آئینی اقدامات کے الزامات عائد کر لئے ہیں۔

ان واقعات نے "سنگھ" خاندان کے محبوب تصور "ہندتو" کے مضرت رساں خیالوں اور خدوخال کو بھی پوری طرح بے نقاب کر دیا ہے۔ ان اصولوں کی تمام تر قوت منافرت ضرر رسانی تعصب اور اس کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کے متحمل، بردبار، اجتماعیت پسند اور اقداری بنیاد پر مستحکم کردار کی کلیتہً اور بے حیایانہ نفی سے حاصل ہوئی ہے۔ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے سنگھ خاندان نے جی بھر کے من مانے انداز سے مذہبی جذبات سے کھلواڑ کی۔ اس کی مخصوص انداز کی قوم پرستی نے ہندو قوم کو متحد کرنے کے بجائے ان میں عدم اعتمادی اور تفرقہ کی تخم ریزی کی جو بابری مسجد کی تباہی کے نتائج سے اور بھی زیادہ نمایاں ہو گئی ہے جس نے ہندوستان کی دو عظیم اقوام کے درمیان ناقابلِ عبور خلیج کو وسیع تر کر دیا تھا۔ ہندوستان کی حکومت کو اپنا منھ چھپانے پر مجبور کر دیا ہے اور ہندوستان کے چہرے پر کالک پوت دی ہے۔ اس معاملہ کی سب سے زیادہ

ظریفی یہ ہے کہ یہ تمام مکروہ عمل رام کے نام پر کیا گیا۔ اس رام کے جس کے نام سے ہندوستان کے کروڑوں، ہندوؤں کے دلوں میں انصاف، صداقت، رواداری اور بردباری و دلیری کے جذبات بیدار ہوتے ہیں۔

لیکن اتوار کے مذموم واقعات کا ذمہ تنہا ''ہندتو'' کی طاقتوں کو ہی گردانا درست نہیں ہے کیونکہ مرکزی حکومت، پارلیمنٹ، عدالتیں اور وہ تمام ادارے جو رائے عامہ پیدا کرتے ہیں، اپنی ذمہ داری سے بری الذمہ نہیں قرار دئے جا سکتے کیونکہ یہ بات عیاں ہے کہ انہوں نے اس اتھاہ گہرائی کا اندازہ ہی نہیں کیا جس گہرائی تک ''ہندتو'' کے عناصر نے اپنی سیاست کی جڑیں پھیلا دی تھیں۔ اجودھیا میں انتظامیہ اور قانون کا نفاذ کرنے والی طاقتوں کا کردار نا قابل فہم ہے اتوار کے روز ان کا جمود مجہولیت اور بعض حالات میں ''کارسیوکوں'' کے ساتھ اس کی نہ صرف ساز باز بلکہ عملی شمولیت آئین و قانون کے متعلق ان کے محافظانہ کردار پر شرمناک دھبہ ہے۔ اگر ان تمام باتوں کو مدنظر رکھا جاتا تو بہت ممکن ہے کہ صورت حال بے قابو نہ ہوتی۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جانا ضروری تھا کہ کارسیوکوں کی بڑی تعداد مسجد سے محفوظ فاصلہ پر روک دی جاتی اور ان میں جو گرم جوش اور خودسر عناصر تھے ان پر کڑی نظر رکھی جاتی۔ لیکن یہ تمام باتیں اب داستان پارینہ بن چکی ہیں۔ اس وقت سب سے اہم سوال جو درپیش ہے ■ ہے اجودھیا کے مابعد کے واقعات پر حکومت ہند کا رویہ اور ردعمل۔

اگرچہ یہ بات ایک غیر معمولی بات ہے لیکن اس پر سب سے پہلا ردعمل صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی طرف سے سامنے آیا ان کا بیان اس تمام غم وغصہ اور درد کا آئینہ تھا جو ان واقعات سے عوام کی اکثریت کے دلوں میں بیدار ہوا تھا۔ انہوں نے انتہائی واضح الفاظ میں اس المناک تہذیب سوزی اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کی مذمت کی اور وزیر اعظم سے درخواست کی کہ قانون کی حکمرانی کی بحالی، امن عامہ کے قیام اور پر امن شہریوں کے تحفظ کے فوری اقدامات کریں۔ ساتھ ہی انہوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ امن و امان اور اتحاد قائم رکھیں۔ اور غیر سماجی عناصر کا تدارک کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ اس وقت پوری ہندوستانی قوم کی نگاہ اس بات پر مرکوز تھیں کہ مرکزی حکومت تعصب اور منافرت کی قوتوں کا پوری طاقت کے ساتھ سختی سے مقابلہ کرے۔ مسلم اقلیت کے زخموں پر مرہم رکھے اور اس بات کا تیقن کرے کہ آئین کے دائرے

کار کے اندر ہی رام کا احترام کیا جائے گا حکومت کے اس ارادہ کا پہلا اظہار کلیان سنگھ حکومت کی برطرفی سے ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں دہلی کی جامع مسجد کے شاہی امام کی اس اپیل پر بالخصوص دھیان دیا جائے جو انہوں نے صبر و ضبط کے تعلق سے اپنے ہم مذہبوں سے کی ہے اور آخر میں یہ بات بھی سامنے رکھی جائے کہ اتوار کے روز اجودھیا میں جو کچھ ہوا اس کی شدت کی تمام تر اخلاقی ذمہ داری بی۔ جے۔ پی۔ نے اپنے بیان سے خود پر عائد کر لی ہے۔ اگر جمہوریت کو منافرت اور تعصب کے عذاب سے محفوظ رکھنا ہے تو آنے والے ایام میں زیادہ شدید اور مزید مستحکم اقدامات بھی ضروری ہوں گے۔



چشم دید

# 6/دسمبر کا آپریشن تریشول

از: حسام صدیقی

اجودھیا میں بنی 465 برس پرانی بابری مسجد کو صرف چار گھنٹے پینتالیس منٹ میں ہی پوری طرح ختم کر دیا گیا۔ ہم نے ہندوستانی تاریخ کا یہ بدترین جرم اپنی ان گنہگار آنکھوں سے دیکھا ہے جسے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں تا کہ اپنے دل و دماغ کے بوجھ کو کسی حد تک ہلکا کر سکوں۔

6/دسمبر 1992ء کو صبح سویرے ہم لوگ بابری مسجد کے پیچھے کے راستے سے جب اس کے قریب پہنچے تو ہمیں سب سے پہلے کلکتہ کے ایک اخبار کے فوٹو گرافر جگدیش یادو ملے۔ انہوں نے بتایا کہ کارسیوک مسجد توڑنے کی تیاری میں ہیں۔ وہ اپنے ساتھ توڑ پھوڑ کرنے کے لئے ضروری چیزیں بھی لائے ہیں۔ ایک جگہ موٹے موٹے رسے میں بندھے ہوئے کئی کانٹے رکھے ہوئے ہیں۔ جنہیں مسجد کے گنبدوں پر پھینک کر رسیوں کے سہارے چڑھنے کا ارادہ ہے۔ جب میں نے اس سامان کی فوٹو کھینچی تو کارسیوکوں نے میرا کیمرہ چھین لیا۔ اس کی فلم نکال لی اور بولے کہ اگر سامان واپس لینا ہے تو پانی پت کے کیمپ میں آ جانا۔ جگدیش یادو کے پیسے بھی چھینے گئے پھر بھی وہ اپنے کام میں لگے تھے۔ ابھی ہم لوگ جگدیش یادو کی بات سن ہی رہے تھے کہ دو تین کارسیوک سڑک کے کنارے پڑی بجلی والوں کی سیڑھی اُٹھانے لگے اور اُسے مسجد کی دیوار پر لگانے کی بات کرنے لگے۔ اتنے میں ہم نے دیکھا کہ بابری مسجد کے چاروں طرف بنائی گئی مضبوط دیوار میں ایک گیٹ بھی بنا ہوا ہے۔ دیوار پر مسجد کی حفاظت کے لئے جو پولیس کھڑی تھی اس کے ساتھ راشٹریہ سیوک سنگھ (آر.ایس. ایس) کے نیکر پہنے رضا کار بھی بیچ بیچ میں موجود تھے۔ یہ سب دیکھ کر ہمیں شک ضرور ہوا۔ ہمارا ماتھا ٹھنکا، چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ دیکھا کہ کچھ کارسیوک چپ چاپ کھڑے ہوئے مسجد کے شمالی سمت میں سڑک کے کنارے لگے کٹیلے تاروں کو کھول رہے ہیں۔ ان کی یہ حرکت وہاں پر تعینات پی.اے.سی جوان خاموشی کے ساتھ دیکھ رہے ہیں۔ انہیں نہ تو تار کھولنے سے منع کر رہے تھے اور نہ ہی کوئی اعتراض کر رہے تھے۔ ہمارا شک کچھ اور پکا ہوا پھر بھی ہم آپس میں یہ باتیں کرتے رہے کہ

شاید 1990ء اکتوبر کی طرح یہ کارسیوک اوپر چڑھنے یا توڑ پھوڑ کرنے کی معمولی کوشش کریں گے۔ جنہیں پولس، پی.اے.سی. اور آر.ایس.ایس. کے رضا کار بعد میں ناکام بنادیں گے۔

اب ہم مسجد کے سامنے شیلانیاس کی جگہ اور مسجد کے صدر دروازے کے بیچ ٹھیک اس جگہ پہنچ چکے تھے۔ جہاں پر ایک گڈھا جیسا بنا تھا جس کے چاروں طرف کچھ اہم سادھو گھیرا بنائے بیٹھے تھے۔ یہ وہ سادھو تھے جنہیں پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ٹھیک سوا بارہ بجے دوپہر کو علامتی کارسیوا کرنی تھی۔ مسجد کے ٹھیک سامنے مانس بھون کی چھت پر ہزاروں کارسیوک کھڑے نعرے لگا رہے تھے۔ انہیں کے ساتھ بڑی تعداد میں ٹی.وی. اور دیگر ویڈیو کیمرہ والے لوگ بھی کارسیوا کے مناظر کی فلم بندی کے لئے موجود تھے۔

شلانیاس کی جگہ اور مسجد کے سامنے کی متنازعہ 2.77 ایکڑ زمین پر پوری طرح سے آر.ایس. ایس کے لوگوں کا کنٹرول تھا۔ کارسیوکوں کو اندر آنے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ ایک دو کارسیوک اگر کسی طرح اندر آجاتے تھے تو آر.ایس.ایس. کے نیکر پہنے لوگ انہیں زبردستی باہر کر دیتے تھے۔ شلانیاس کی جگہ کے بائیں طرف اونچائی پر ایک چھوٹا سا شامیانہ جس کے نیچے مائک لگا تھا وہیں سے دو تین لوگ سارے بندوبست کی نگرانی کر رہے تھے اور ضروری ہدایتیں دے رہے تھے۔ پورے کیمپس میں کوئی پچاس سادھو تھے۔ باقی آر.ایس.ایس. کے رضا کار اور اخبار نویس تھے۔

اس جگہ سے کوئی آدھا فرلانگ کے فاصلے پر ایک بڑا شامیانہ لگا تھا جس میں ایک ڈائس بھی بنا تھا۔ وہاں بھارتیہ جنتا پارٹی کے فرقہ پرست لیڈروں کی زہریلی تقریریں جاری تھیں۔ اس ڈائس پر دیش کے سب سے بڑے ہندو لیڈر کی حیثیت سے خود کو پیش کرنے والے لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، وجے راجے سندھیا، اوما بھارتی، اشوک سنگھل ونئے کٹیار، رتھمبرا اور ایسے ہی کئی دوسرے لیڈر موجود تھے۔ کوئی سوا گیارہ بجے اعلان ہوا کہ اب اڈوانی جی تقریر کریں گے تو بھیڑ سے لوگوں نے نعرہ لگایا۔ کارسیوا نہیں تو مارسیوا ہوگی اور مارسیوا کا نعرہ لگانے والوں کا اشارہ ڈائس پر بیٹھے لوگوں کی طرف تھا۔ اس شور میں تھوڑی دیر تک افراتفری کا ماحول تھا۔ اڈوانی کی تقریر میں بھی ہمیشہ کی طرح زہر بھرا ہوا تھا۔

ادھر کارسیوا کی جگہ پر پہنچنے کے لئے کارسیوکوں کے نام پر اجودھیا میں اکٹھا غنڈوں کا دباؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے ساکشی گوپال مندر یعنی کیمپس کے شمال کی طرف سے

کارسیوکوں کا ایک جتھا آیا، اندر پہنچنے کی اجازت نہ ملنے پر وہ بھی زمین پر دھرنا دے کر بیٹھ گئے۔ انہیں ہٹانے کی کوشش آر.ایس.ایس کے نیکر والوں نے کی لیکن وہ نہیں ہٹے تو مائک سے جو شخص کنٹرول کر رہا تھا اسے بھی بھیڑ دیکھ کر غصہ آ گیا انہوں نے فوراً ہی بجرنگ دل کے کرناٹک کے کمانڈوز کو بلایا۔ وہ اپنے اپنے سروں پر جے شری رام لکھے ہوئے لال پٹی پہنے تھے۔ کافی صحت مند اور خونخوار قسم کی اس فورس سے کہا گیا کہ جو لوگ ساکشی گوپال کی طرف دھرنا دے کر بیٹھے ہیں انہیں اُٹھا کر پھینک دو۔ اس بریگیڈ نے یہی کرنا شروع کیا تو کارسیوکوں میں بھی اُبال آیا اوپر مانس بھون پر چڑھے ہزاروں کارسیوکوں نے بھی بجرنگ دل کی اس کاروائی کے خلاف شور کرنا شروع کر دیا۔

اچانک ایک دبلا پتلا داڑھی والا کارسیوک کود کر ہم لوگوں کے بیچ پہنچا اور زور زور سے گالیاں دینے لگا۔ وہ اپنے ہاتھ میں لاٹھی لئے تھا۔ نام معلوم کرنے پر اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ وہ بہار سے آیا ہے۔ وہ آگے کہتا ہے کہ ''بہار کوئی ہجڑہ دیش نہیں، یہ ہمارے یہاں رہی ہوتی تو ہم کب کا اسے توڑ کر مندر بنا چکے ہوتے''۔ یہ سالے بی.جے.پی. والے ہمیں یہاں بار بار بلاتے ہیں۔ ہم اپنا پیسہ اور وقت دونوں برباد کرتے ہیں۔ پھر ہمیں اندر گھسنے نہیں دیا جاتا۔ اور یہ سب سرکار بنا لیتے ہیں۔ ابھی اس کارسیوک کی بات چل ہی رہی تھی کہ مائک سے اعلان ہوا کہ آپ لوگ اپنے کیمرے بند کر دیجئے۔ کیمروں کو دیکھ کر ہی کچھ کارسیوک 'ناٹک' کرنے لگتے ہیں۔ اتنا سننا تھا کہ اس بہاری کارسیوک نے پھر گالیاں دیں، ''سالے ہم کو ناٹک سمجھ رہے ہیں'' اور اس نے زور زور سے اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر کہا: ''سب لوگ اندر آ جاؤ''۔ اس آواز پر ساکشی گوپال مندر یعنی مسجد جانے والے سب سے پرانے راستے شمالی سمت کی طرف سے ہزاروں کارسیوکوں کا ہجوم اندر آ گیا، وہ نعرے لگا رہے تھے اور پاگلوں کی طرح ناچ رہے تھے۔ چند منٹوں میں ہی ان لوگوں نے مسجد کے چاروں طرف سے اوپر چڑھنے کی کوشش شروع کر دی اور مسجد کی حفاظت کے لئے لگی پولس پر پتھراؤ کرنے لگے۔ ابھی دو یا تین پتھر ہی پھینکے تھے تو ایسا لگا جیسے پولیس جوانوں کے لئے یہ پتھر کوئی طے شدہ اشارہ تھا اور وہ لوگ چوہوں کی طرح بھاگ کر ایک طرف چلے گئے۔ انہوں نے چند منٹ کے اندر ہی اس جگہ کو چھوڑ دیا اور مسجد کے پیچھے کی طرف دور جا کر ایک کھیت میں سب کے سب آرام سے بیٹھ گئے۔ آنکھ جھپکتے ہی تین طرف سے لوگوں کو مسجد کے اوپر پہنچتے دیکھا گیا۔ دو لڑکے بیچ والے گنبد پر اور ایک جنوبی گنبد پر دکھائی دیا۔ اس وقت بارہ بجنے میں ٹھیک پانچ منٹ باقی تھے۔ سیکڑوں

کارسیوک چاروں طرف سے اوپر ہی چڑھ رہے تھے۔ اوپر چڑھنے کیلئے ان کانٹوں اور رسوں کا استعمال ہو رہا تھا جن کی تصویر لینے پر جگدیش یادو کا کیمرہ صبح ہی چھن چکا تھا۔ اور وہ پٹتے پٹتے بچے تھے۔ کوئی پانچ سات منٹ کے اندر ہی مسجد کے اوپر اور اس کے چاروں طرف صرف بھگوا کپڑا گلے میں ڈالے یا سر میں باندھے کارسیوک ہی دکھائی دے رہے تھے۔ مائک سے ایک دو بار تو یہ کہا گیا کہ آپ لوگ نیچے آ جایئے۔ پھر جے رام جے رام جے جے رام کا گانا شروع کر دیا گیا اس وقت تک ہمارے کئی ساتھی اخبار نویسوں کو یقین تھا کہ معمولی توڑ پھوڑ کے بعد یہ لوگ نیچے اُتر آئیں گے۔ سینکڑوں کیمرے یہ منظر کیمرے میں قید کرنے میں مصروف تھے۔ لیکن دس منٹ کے اندر ہی اچانک مسجد کے چاروں طرف دو دور تک موجود اخبار نویسوں خاص کر کیمرہ والوں پر حملہ ہو گیا۔ جو جس جگہ تھا پٹتا ہی نظر آ رہا تھا۔ خاص طور سے غیر ملکی لوگوں کی پٹائی زیادہ ہو رہی تھی۔ کارسیوک اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ جس کسی بھی اخبار نویس کو اپنا نشانہ بنایا اس کی جیبوں سے پرس اور پیسے ضرور نکال لیتے تھے بلکہ کئی لوگوں کی جیبوں پر پہلے حملہ ہوا۔ وائس آف امریکہ کے ''پیٹر'' کو کارسیوک باقاعدہ زمین پر گرا کر رگڑ رگڑ کر مار رہے تھے۔ ایک فوٹو گرافر جس کی شکل چوٹ کی وجہ سے پہچانی نہیں جا رہی تھی اسے کچھ کارسیوک ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے تھے۔ پھر بھی تین چار اس کو پیٹتے ہی جا رہے تھے۔ تین اخبار نویس لڑکیوں کے ساتھ جیسا سلوک کیا گیا اس سے ایسا لگ رہا تھ کہ کارسیوکوں کی شکل میں جیسے ''کوروؤں'' کی فوج اجودھیا میں آ گئی ہو اور اس کا ہر فرد دریودھن ہو۔

بیس منٹ ہی میں مسجد کی کھدائی اور اس کے چاروں طرف لگے تاروں کی باڑھ ٹوٹنا شروع ہو گئی۔ لوہے کے پائپ اور اینگل جو چاروں طرف لگے ہوئے تھے انہیں کا استعمال مسجد توڑنے میں ہونے لگا۔ چاروں طرف شور اور صرف شور ہی سنائی دے رہا تھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون کیا کہہ رہا تھا۔ اب تک وجے راجے سندھیا، اڈوانی، مرلی منوہر جوشی اوما بھارتی، رتھمبرا، اشوک سنگھل سمیت اجودھیا میں موجودہ بی۔جے۔پی۔ اور آر۔آر۔ایس کے تمام لیڈر اپنا پنڈال چھوڑ کر شیلانیاس کی جگہ کے بائیں طرف اونچائی پر لگے شامیانہ کے نیچے آ چکے تھے اور مسجد کی شہادت کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ ان میں کئی لوگ ایک دوسرے سے گلے مل کر مبارکباد دیتے ہوئے بھی دیکھے گئے تو کئی لوگ خوشی سے ناچ رہے تھے۔ ساڑھے بارہ بجے تک ہم لوگ مسجد کے سامنے میدان میں کارسیوکوں کے بیچ کھڑے رہے۔ ہمارے سامنے راشٹریہ سہارا کے فوٹو گرافر براجیند رکمار کی پٹائی ہوتی رہی۔ خون

کھولنے کے باوجود ہم اسے بچانے کی ہمت نہ کر سکے کیونکہ اسے بچانے کی کوشش یا موت کو گلے لگانا دو میں سے ہمیں اس وقت ایک ہی بات چننی تھی۔ اور ہم پانچ اخبار نویس خونی درندوں کے سامنے بزدل ہی ثابت ہوئے۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ کر کے ہم لوگ کسی طرح اس شامیانے کے برابر پہنچ گئے، یہاں مائک پر طرح طرح کی ہدایتیں جاری کی جارہی تھیں، تھوڑی ہی دیر میں ہمارے پیچھے کھڑے کارسیوکوں نے ہم پر حملہ کرنے کے لئے اپنے کسی ساتھی سے کہا تو وہ ایک راڈ لئے ہمارے پیچھے چلا گیا۔ بھیڑ میں راڈ تو خیر اسے کہاں ملتی ہم فوراً ہی وہاں سے کھسک کر مسجد کے سامنے مانس بھون میں پہنچ گئے۔ جس پر پوری طرح کارسیوکوں کا قبضہ تھا۔ میرے ساتھ 'سکال' پونا کے چیف رپورٹر راجیو سابڑے، ٹائمس آف انڈیا کے شرت پرِدھان، اروند سنگھ، وششٹ اور کلثوم طلحہ تھیں۔ راجیو کے چہرے پر مسلسل ہوائیاں اُڑتی دیکھ کر ہم نے ان سے ڈرنے کی وجہ معلوم کی تو وہ خاموش رہا۔ واپسی میں لکھنؤ آتے وقت راستے میں اس نے بتایا کہ اسے سب سے زیادہ پریشانی میری اور کلثوم کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ ہم دونوں مسلمان تھے۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ ایک پکا ہندو ہونے کی وجہ سے کارسیوکوں کی اس حرکت پر اسے شرم بھی آ رہی تھی۔ مانس بھون میں بھی اپنے کو محفوظ نہ پا کر ہم وہاں سے جان بچا کر نکلے اور بابری مسجد کے برابر ہی رام جنم استھان کے مندر کے اندر چلے گئے۔ جس میں فیض آباد کے ڈی.ایم آر.ایس.سریواستو، ایس.ایس.پی.ڈی.بی.رائے سمیت تمام اعلیٰ افسر اور کچھ لٹے پٹے زخمی اخبار نویسوں اور فوٹو گرافروں نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس مندر کی دوسری منزل کی چھت پر تین عورتیں قیامت برپا کئے ہوئے تھیں۔ جو بھی اوپر چڑھتا وہ پتھر مارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

کوئی سوا بجے ہم لوگ کسی طرح جنم استھان مندر کی چھت پر پہنچ سکے اور بابری مسجد کی شہادت کی پوری کاروائی 30-35 فٹ کے فاصلے سے دیکھتے رہے۔ ایک بج کر بیس منٹ پر چار پانچ سادھوؤں کو مسجد کے اندر رکھی مورتیوں کو شھنیل کے کپڑے میں رکھ کر باہر نکالتے دیکھا تو پورا یقین ہو گیا کہ آج مسجد کی بنیاد تک کھودا جانا یقینی ہے۔ اس وقت تک کارسیوکوں کے پاس بڑی تعداد میں پھاوڑے، کدالیں اور کھدائی کے کام میں آنے والے ہر طرح کے اوزار پہنچ چکے تھے۔ ٹھیک دو بجے مسجد کی شمالی دیوار اور پھاٹک گرتا ہوا دکھائی دیا، کھدائی کرنے والوں کا حوصلہ اور بھی بلند ہو گیا۔ ادھر مائک پر رتھمبرا سمیت کئی فرقہ پرست لیڈر نعرے لگا رہے تھے۔ ''ایک دھکا اور دو بابری مسجد توڑ

دو"۔ "ہندوؤں کے اس کلنک کو مٹا دو اور ہم ہندو ہیں"، ہندوستان ہمارا ہے وغیرہ کے علاوہ کچھ ایسے بھی نعرے لگائے جا رہے تھے جن کا سننا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ اس بیچ کچھ لوگوں نے مائک سے یہ بھی اپیل کرنے کی کوشش کی کہ کارسیوک مسجد سے نیچے آ جائیں لیکن اس طرح کی اپیل کرنے والوں کو دھکے مار کر پیچھے ڈھکیل دیا گیا۔

مسجد کے چاروں طرف زور و شور کے ساتھ کھدائی چلتی رہی۔ ٹھیک ڈھائی بجے مسجد کا پہلا گنبد (شمالی سمت میں) ایک زبردست دھماکے کے ساتھ گرا تو اس کی زد میں کچھ کارسیوک بھی آ گئے۔ اوپر کھڑے سولہ لوگوں کو زخمی حالت میں نکال کر علاج کے لئے لے جاتے ہوئے ہم نے دیکھا جن میں صرف دو کی حالت زیادہ خراب لگ رہی تھی۔ پہلا گنبد گرتے ہی مسجد کا ایک تہائی حصہ شہید ہو گیا۔ مانس بھون کی چھت پر ہمارے بیچ وشو ہندو پریشد کے لیڈر، پارلیمنٹ ممبر اور ریاست کے سابق پولیس چیف شریش چندرز دیکشت بھی تھے۔ وہ مسجد گرانے کی کارروائی کی برابر نگرانی بھی کر رہے تھے اور مسلسل ہنومان چالیسا بھی پڑھتے جا رہے تھے۔ ہم لوگوں نے ان کا ردعمل جاننے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

ٹھیک پونے تین بجے اجودھیا کے جنوبی حصے میں سڑک کے کنارے دو جگہوں سے زبردست دھواں اُٹھتا دکھائی دیا۔ پھر اس طرح کا دھواں کئی طرف نظر آیا۔ پہلے تو کچھ معلوم نہ ہو سکا لیکن واپسی میں ہم نے دیکھا کہ یہ اجودھیا کی باقی مسجدیں اور مسلمانوں کے مکانات تھے جنہیں کارسیوک جلاتے پھر رہے تھے اور شہر میں تعینات پولیس انہیں بالکل منع نہیں کر رہی تھی۔ صرف ایک ٹیڑھی بازار کی مسجد کی آگ بجھاتے فائر بریگیڈ کے لوگ ضرور نظر آئے۔ اس کا دروازہ اکھاڑ کر غنڈے اندر داخل ہوئے تھے۔

ہم لوگ پونے چار بجے تک مانس بھون مندر پر رکے۔ پھر نکلنے کی کوشش کی۔ پیچھے میدان میں دیکھا کہ لوہے کی باڑ کاٹنے کے لئے باقاعدہ گیس پلانٹ اور گیس کے سلینڈر وہاں رکھے تھے۔ پولس کے جوان نہ صرف ان کی حفاظت کر رہے تھے بلکہ مسجد کا کچھ حصہ گرنے پر پولس والے خوشی کا اظہار بھی کر رہے تھے اور کارسیوکوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ مسجد کی اصل دیواریں تقریباً آٹھ فٹ چوڑی بنی تھیں، پہلا شمال کی طرف کا گنبد شہید کرنے کے بعد کافی کوشش کرنے کے بعد بھی کارسیوک بیچ کا بڑا والا گنبد جو کافی مضبوط تھا، نہیں توڑ سکے تو انہوں نے پیچھے اور آگے دونوں طرف

سے اس کی دیوار کھود ڈالی۔ نتیجتاً ٹھیک چار بجے بیچ والا بڑا گنبد بھی شہید ہو گیا۔ پھر تو ہزاروں کارسیوکوں کا حملہ تیسرے اور آخری گنبد پر ہی مرکوز ہو گیا اور پونے پانچ بجے بابری مسجد مکمل طور پر شہید ہو چکی تھی، اب وہاں پر صرف اینٹ مٹی اور گارے کا ایک ڈھیر ہی تھا۔ مسجد توڑنے والے کارسیوک سینہ پھلائے اپنے کیمپوں میں پہنچ رہے تھے۔ انہیں برابر شاباشی بھی دی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی اوما بھارتی تقریر کر رہی تھی کہ اتر پردیش میں ایک بھی مسلمان نے بی۔جے۔پی کو ووٹ نہیں دیا پھر بھی ہماری حکومت بن گئی۔ اس لئے دیش کے کونے کونے سے آئے کارسیوکوں سے اپیل ہے کہ وہ واپسی پر یہ پیغام لے کر جائیں کہ پورے دیش میں ایک بھی مسلمان کا ووٹ نہیں ملے گا تو بھی ہم دلی میں اپنی سرکار بنائیں گے۔

اب دوسرے کارسیوک جو صبح سے الگ کھڑے نعرے بازی کر رہے تھے وہ آگے آ چکے تھے اور مسجد کا ملبہ ہٹانے کی کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ آدھی رات تک مورتیوں کو پھر اسی جگہ واپس رکھ دیا گیا تھا جہاں پہلے وہ رکھی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ چار پانچ گھنٹہ پہلے اس جگہ بابری مسجد تھی جس کی چھت کے نیچے مورتیاں تھیں، اب وہاں مورتیاں تو تھیں لیکن ان کے اوپر ایک چھوٹا سا ٹین اور بھگوا کپڑا ہی تنا ہوا تھا۔

بجرنگ دل کے ونے کٹیار اور وشو ہندو پریشد کے اشوک سنگھل اب بھی کارسیوکوں کا حوصلہ بڑھانے مین لگے ہوئے تھے۔ 6/دسمبر کی شام سے پوری رات بھر 7/دسمبر کو تمام دن کے دوران کارسیکوں نے مورتیوں کے چاروں طرف دس فٹ اونچی دیوار بھی کھڑی کر لی چونکہ مسجد کی جگہ کافی اونچائی پر ہے اس لئے مورتیوں تک پہنچنے کے لئے مضبوط سیڑھیاں بھی بنا لی تھیں۔

6/دسمبر کو مسجد شہید کرنے کی کارروائی باقاعدہ ایک سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جیسے ہی ایک طرف مسجد پر حملہ ہوا دوسری طرف ہزاروں کارسیوکوں نے اجودھیا کو چاروں طرف خاص کر ان سڑکوں پر جن سے زیڈ ایکشن فورس یا سنٹرل فورسز آ سکتی تھیں، ہر سڑک پر پوری طرح قبضہ کر رکھا تھا تیسری طرف ہزاروں کارسیوک اجودھیا کے تمام مسلمانوں کے مکانات اور مسجدیں جلانے کا کام کرتے پھر رہے تھے۔ اب اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ گنبد پر چڑھنے اور اسے گرانے کی کارروائی وقتی غصے کا نتیجہ تھی تو کیا غصہ میں ہی آندھرا پردیش، کرناٹک اور مہاراشٹر کے کارسیکوں کو اجودھیا کے تمام راستے بلاک کرنے کی بھی خبر آ گئی تھی؟ سڑک روکنے والے کارسیوک

نہ کسی کو اجودھیا کی طرف پہنچنے دے رہے تھے، اور نہ اجودھیا کے اندر سے کسی بھی اخبار نویس کو باہر جانے دے رہے تھے۔ کیمرے والوں کا باہر جانا تو ممکن ہی نہیں تھا۔

اب اندھیرا بھی ہونے لگا تھا۔ ہم لوگ کسی طرح بابری مسجد کے پیچھے کے راستے ٹیڑھی بازار کی سڑک سے پیدل نکل رہے تھے کہ تھانے کے ٹھیک سامنے کوئی پچاس کارسیوک کھڑے ملے۔ پوچھا تم سالو کہاں جا رہے ہو، اخباری ہو، تلاشی دو اور اپنے اپنے کارڈ دکھاؤ۔ میں سب سے آگے تھا۔ راجیو سابڑے اور شرت پردھان نے اپنے ہی کارڈ دکھا کر ہم لوگوں کو بھی آگے چلنے کو کہا۔ اس وقت یہ اور بھی پریشان تھے۔ اگر میں نے اور کلثوم نے بھی کارڈ دکھا دیا تو مسلمان نام دیکھ کر ہی قیمہ بنا دیا جائے گا۔ اسی بیچ زخمی کارسیوکوں کو ہسپتال لے جاتی ایک تیز رفتار کار آئی۔ کارسیکوں نے اسے راستہ دیا۔ پیچھے سے ایک گاڑی آ گئی تو ہم لوگ بھی موقع کا فائدہ اُٹھا کر آگے نکل آئے۔ یہ ساری کارروائی تھانے کے سامنے کی تھی۔ جہاں کافی تعداد میں پولیس والے بھی موجود تھے۔ ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ کسی طرح مین روڈ تک آئے۔ یہاں تو جیسے کارسیکوں کا کیمپ ہی سڑک پر آ گیا تھا۔ دوسری طرف آمنے سامنے کی دو مسجدیں بری طرح جل رہی تھیں۔ شاید آگ لگانے سے پہلے کارسیکوں نے قریب کی دکان سے اُٹھا کر موٹر کے پرانے ٹائر بھی مسجد میں اکٹھا کر رکھے تھے تاکہ جلنے میں آسانی ہو سکے۔

کوئی راستہ نہ دیکھ کر ہم لوگ بھاگ کر ریلوے لائن پر ہو لئے اور فیض آباد کی طرف چلنے لگے۔ کیونکہ سڑک پر پریس کا لیول لگا ہوا تھا جو ٹیکسی کھڑی تھی وہ غائب ہو چکی تھی۔ دو کلومیٹر کے بعد ریلوے لائن اور سڑک آ گئی تو مجبوراً سڑک پر آنا پڑا۔ خوش قسمتی ہے اس جگہ سڑک روکنے کے لئے مہاراشٹر کے کارسیوک لگے تھے۔ راجیو سابڑے نے ان سے مراٹھی میں بات کی۔ اپنے بارے میں بتانے کے بعد درخواست کی کہ ہم لوگوں کو کارسیوکوں سے بچا کر کسی طرح فیض آباد تک پہنچا دیں۔ اُن میں سے تین کارسیوک تیار ہوئے اور ہمیں لے کر فیض آباد کی طرف چلے۔ راستے میں مسلمانوں کو گالیاں دیتے رہے۔ بابری مسجد اور دوسری مسجدیں گرانے کی بہادری بیان کرتے رہے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ آخر میں نے کہہ ہی دیا کہ میرا نام حسام الدین صدیقی ہے اور میں بھی مسلمان ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ وہ لوگ جیسے زمین میں گڑ پڑے ہوں، چہرے کی رنگت اُڑ گئی، انتہائی شرمندگی بھرے لہجے میں کہنے لگے کہ ہمارے بھی گاؤں میں ایک صدیقی ہیں، وہ ہمارے بڑے اچھے دوست ہیں۔

اس طرح فیض آباد پہنچ کر ہم لوگ کسی طرح لکھنؤ پہنچنا چاہتے تھے۔ کوئی ٹیکسی نہیں ملی، ایک ملی تو تو اس نے اتنا کرایہ بتا دیا جتنے میں دو بار ٹیکسی فیض آباد سے لکھنؤ جاتی۔ وہ موقع کا فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ ہم پریشان کھڑے تھے کہ جاگرتی کے ایڈیٹر ونود شکلا جی آگئے۔ انہیں رات فیض آباد میں ہی رکنا تھا۔ ہمیں پریشان دیکھ کر انہوں نے اپنے ڈرائیور سے کہا کہ وہ ہم لوگوں کو لکھنؤ پہنچائے۔ رات کوئی پونے دس بجے ہم لوگ لکھنؤ پہنچے تو شہر میں کرفیو لگ چکا تھا۔ ہر طرف سے نعرے اور کہیں کہیں سے دھماکے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اتر پردیش ہی کیا پورا دیش ہی جل اُٹھا اور ووٹ بڑھانے کے لالچی فرقہ پرستوں نے اس آگ میں ہاتھ سینکنا شروع کر دیا۔

اگلے دن یعنی 7/دسمبر کو کارسیوکوں نے اجودھیا پہنچنے والے اخبار نویسوں سے وہی سلوک کیا جو 6/دسمبر کو کیا تھا۔ انہوں نے سینٹرل فورسز کو بھی اجودھیا نہیں پہنچنے دیا تھا اور مسجد کی جگہ پر مورتیوں کے چاروں طرف دیوار بھی تعمیر کر لی تھی۔ پھر 8/دسمبر کی صبح تین بجے سے کارروائی شروع کر کے سینٹر فورسز نے اجودھیا پر قبضہ کیا وہ بھی شاید اس لئے کہ اب تک اڈوانی وغیرہ گرفتار ہو چکے تھے۔ کارسیوکوں کا حوصلہ ٹوٹ چکا تھا۔ کیونکہ موقع پر کوئی بڑا لیڈر ان کو بچانے کے لئے نہ تو موجود تھا اور نہ ہی اب پولس کارروائی روکنے والی اتر پردیش میں کلیان سنگھ کی سرکار ہی بچی تھی۔

## کارروائی

اجودھا میں 6/دسمبر کو بابری مسجد شہید کئے جانے کے وقت پولس یا ضلع انتظامیہ کی طرف سے اسے بچانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ کچھ پولس افسران کہہ رہے تھے کہ ہلکا لاٹھی چارج ہوا یہ بات سراسر غلط ہے۔

ہم لوگ تو پورے واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔ ہم نے فیض آباد کے ضلع مجسٹریٹ اور اعلیٰ پولس کپتان کو بدحواس دیکھا۔ ان کی سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ کوئی ساڑھے بارہ بجے ضلع مجسٹریٹ آر.این. سریواستو فون پر وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ سے پوچھ رہے تھے کہ کیا کیا جائے۔ دوسری طرف سے جواب تھا کہ گولی چلائے بغیر جو بھی ہو سکے کرو اور سینٹرل ریزرو پولس کو بھی بلاؤ تو گولی چلانے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ تھوڑی دیر میں پتہ چلا کہ سی.آر.پی نے اجودھیا کی طرف آنے کی کوشش کی تو راستے میں کارسیوکوں نے سڑک پر قبضہ کر کے اسے روک لیا۔ ان کارسیوکوں کو ہٹانے

کے لئے طاقت کا استعمال کرنے یا فائرنگ کرنے کی اجازت ضلع مجسٹریٹ کی طرف سے ملی ہی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ کہ سی آر پی فورس واپس چلی گئی۔

اتنا ہی نہیں اجودھیا میں تعینات سبھی پولس اور بڑے سول افسر خود بھی کارسیوکوں کی طرح کام کر رہے تھے۔ اعلیٰ پولس کپتان ڈی. پی. رائے اور ضلع مجسٹریٹ آر. این. سریواستو نے ریپڈ ایکشن فورس منسٹروی. ایم. سارسوت کی قیادت میں اجودھیا گیا۔ وہ سا کیت ڈگری کالج تک گئے وہاں فیض آباد کے سٹی مجسٹریٹ موجود تھے۔ انہوں نے روکا تو مسٹر سارسوت نے کہا کہ ڈی. ایم اور ایس. ایس پی نے خود بلایا ہے۔ اس لئے ہم تو جائیں گے۔ سٹی مجسٹریٹ نے انہیں جواب دیا۔ کارسیوک بہت غصے میں ہیں۔ میں آپ کی فورس اندر جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ میں سٹی مجسٹریٹ ہوں۔ پھر بھی مسٹر سارسوت نہیں مانے تو سٹی مجسٹریٹ نے انہیں لکھ کر آرڈر دے دیا کہ آپ اور آپ کی ریپڈ ایکشن فورس اندر نہیں جاسکتے وہ بھی واپس آ گئے۔

رام جنم استھان مندر کے اندر کچھ سول اور سبھی بڑے پولس افسران چوہوں کی طرح ڈرے سہمے ہوئے چھپے تھے۔ انہیں سب سے زیادہ فکر اپنی جان بچانے کی تھی۔ آئی. پی. ایس کا بلا لگائے اس بری طرح سے ڈرے ہوئے افسروں کو شاید پہلی بار دیکھا گیا تھا۔ آئی. جی. زون مسٹر اے. کے. سرن اس وقت سیتا رسوئی کی چھت پر بیٹھے اطمینان سے چائے پی رہے تھے۔ جس وقت مسجد پر حملہ ہوا، کارسیوک مسجد توڑ رہے تھے ان کا چائے پینا جاری تھی۔ انہوں نے اس موقع پر اپنے ماتحت افسروں کو کوئی ہدایت بھی نہ دی۔ ایک اخبار نویس نے ضلع مجسٹریٹ سے سوال کیا کہ آپ کیا کیا کارروائی کر رہے ہیں، تو جواب انگریزی میں تھا، ''ایم آئی ابلاج ٹو آنزیو؟''

جنم استھان مندر کی چھت پر پی. اے. سی. کے دو سپاہی لگ تھوڑی اونچائی پر بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ بولے، صاحب ہم تو بندر ہیں، ہمیں اپنے افسروں کا آرڈر چاہیے۔ اگر ہمارے افسر آرڈر کر دیتے تو ہم اس بھیڑ کو جانوروں کی طرح دوڑا کر بھگا دیتے۔ لیکن یہ سالے جنکھے...... افسر ہیں خود ہی بھاگتے پھر رہے ہیں، ہم کیا کریں۔ ان لوگوں نے بیچ میں جو بڑی بڑی گالیاں اپنے افسروں کو دیں وہ لکھی نہیں جاسکتیں۔

ضلع مجسٹریٹ اگر اتنا قابل ہے کہ ضلع میں ہر موقع پر ہر وقت ہر مصیبت پر کیا کرنا ہے، اس کی اجازت فون پر وزیر اعلیٰ سے مانگتا ہے تو اس طرح کے افسر کو برخواست ہو جانا چاہیے، موقع کے

حالات کو دیکھ کر فیصلہ کرنے کی ذمہ داری تو ہر طرح سے موقع پر موجود افسر کی ہی ہوتی ہے۔ وزیر اعلیٰ کو یا راجدھانی میں بیٹھے افسروں و وزیروں کو موقع کے پورے حالات تو دکھائی نہیں دیتے۔ بعد میں لکھنؤ میں ایک پولس سرکل افسر نے ہم سے کہا بھائی ہم تو دو طرح سے شرمندہ ہیں۔ ایک تو مسجد گرنے کی وجہ سے تو دوسرے ہندو ہونے کی وجہ سے، اور پولس افسر ہونے کی وجہ سے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے سامنے قانون توڑا جا رہا ہے اور اوپر کا حکم ہے کچھ نہ کرنے کا، تو ہم یا تو اپنی وردی اُتار پھینکیں گے یا موقع کے حالات کے مطابق سخت کارروائی کریں گے یا پھر ڈیوٹی دینے سے ہی انکار کر دیں گے۔

## راؤ کے کارسیوک

بابری مسجد پر حملہ کرنے والوں اور سب سے پہلے چڑھنے والوں میں شیوسینا کے علاوہ آندھرا پردیش کے کارسیوک بھی تھے۔ ان میں سے کچھ جو مسجد میں تھک کر آرام کرنے گئے ہے استھان مندر میں آ گئے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ وزیر اعظم پی.وی. نرسمہا راؤ کے گاؤں سے ہی پانچ سو سے زیادہ کارسیوک یہاں آئے ہوئے ہیں۔ نرسمہا راؤ کو گالیاں دیتے ہوئے ان کارسیوکوں نے راؤ کو رام مخالف بھی بتایا۔

اس پورے واقعے کے دوران ''سوتنتر بھارت'' لکھنؤ کے نمائندۂ خصوصی ''جے پرکاش شاہی'' اور نو بھارت ٹائمز کے سابق ایڈیٹر ''ایس. پی. سنگھ'' کی بیوی ''ششِکھا'' جو خود بھی صحافی ہیں۔ دونوں کو بری طرح روتے ہوئے دیکھا گیا۔ دونوں کا کہنا تھا کہ وشو ہندو پریشد اور بھارتیہ جنتا پارٹی نے مسجد توڑوا کر دیش کا، قانون اور دستور کا نقصان تو کیا ہی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں، ہندوؤں کے مذہب اور رام کو بھی بے عزت کیا ہے۔ جنم استھان مندر کے اندر ہمیں کلکتہ کے ہیرالال کوٹھاری اور ان کی بیوی سومترا دیوی کوٹھاری بھی روتے ہوئے ملے۔ یہ وہی ہیں جن کے دو بیٹے 1990ء میں کارسیوا کے نام پر 30/ اکتوبر کو بابری مسجد توڑنے کے لئے گنبدوں پر چڑھے تھے اور پولس کی گولی کا شکار ہو گئے تھے۔ ہیرالال کوٹھاری اور ان کی بیوی نے اس نمائندے سے کہا کہ ''آج ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا، ایک بار اس گنبد کو گرتے ضرور دیکھوں گی، جس سے میرے بیٹوں کی لاشیں گری تھیں''۔ یقیناً انہیں رام کی عقیدت سے زیادہ بیٹوں کے مرنے کا غم تھا جو ہونا بھی چاہئے۔

(ماہنامہ استقامت، کانپور، جون/1993ء)

# سورت کا بدترین دن ـــــ ہندتو کا جنگل راج

8/دسمبر کو سورت کے فسادزدہ علاقے ویدروڈ میں ہونے والی ویڈیو شوٹنگ کوئی معمولی درجے کی فلم شوٹنگ نہیں تھی جس میں خواتین کا ایک گروہ جو کمر تک برہنہ تھیں، اپنے گھروں سے نکل کر بھاگ رہی تھیں اور ایک ہجوم جس کے پاس ہتھیار نہیں بلکہ ویڈیو کیمرے تھے، اُن کا پیچھا کررہا تھا۔ اُس وقت جبکہ سورت میں فساد کی آگ بھڑکی ہوئی تھی۔ یہ لوگ ایک انوکھے انداز سے موقع کا فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ دراصل یہ لوگ عصمت دری کا منظر فلمارہے تھے۔

یہاں کے ریلیف کیمپ میں پناہ گزینوں نے اپنی رندھی ہوئی آوازوں میں یہ غلیظ اور گندے واقعات بیان کئے جن میں عورتوں کو برہنہ کرکے ان کی عصمت ریزی کی گئی اور ان مناظر کو فسادات کے دوران فلم بند کیا گیا۔

مغل سرائے اور رانی تلاؤ کے ریلیف کیمپوں میں موجود خواتین ممکن طور پر برباد ہوچکی ہیں۔ اس سے زیادہ ہولناک بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ پولس نے اب تک ایک بھی مجرم کو گرفتار نہیں کیا ہے جبکہ مظالم کی شکار ان خواتین کے پاس ان کی شناخت موجود ہے۔ اور مجرمین آرام سے گھوم پھر رہے ہیں۔

اجتماعی عصمت دری کے مناظر کی یہ فلمبندی 8/دسمبر کی رات کو اس وقت عمل میں آئی جب پورا سورت جل رہا تھا۔ ان عورتوں نے بتایا کہ جس وقت چاقوؤں اور تلواروں سے مسلح مردوں کے ایک گروہ کے سامنے انہیں برہنہ ہونے کے لئے کہا گیا تو ایک ویڈیو کیمرہ حرکت میں تھا اور فلیش لائٹس کا رُخ ان کی طرف تھا اُن کے شوہروں کو باہر نکال دیا گیا تھا اور ان میں سے بعض کو ہلاک کردیا گیا تھا۔ کیمرے کا رُخ ان لوگوں کی طرف ایک بار بھی نہیں ہوا جو پرشوق انداز میں اس منظر کو کھڑے دیکھ رہے تھے۔ وِجے نگر، وشرام نگر اور سربرنگر سوسائٹیوں میں رہنے والی خواتین کو سب سے زیادہ نشانہ بنایا گیا تھا۔

شہر کے 14/ریلیف کیمپوں میں گزشتہ ہفتے کے واقعات کے سلسلے میں سرگوشیاں اب بھی جاری ہیں۔ حکومت اور رضاکار تنظیموں کے تحت قائم کردہ ان کیمپوں میں موجود 8000 مرد، عورتوں اور بچوں میں سے بیشتر افراد اپنے گھر واپس جانے میں تذبذب کا شکار ہیں۔ جہاں خود ان کے ہمسایوں

نے فسادیوں کو ان پر حملے کی راہ دکھائی تھی۔

ان مظلومین کا کہنا ہے کہ ایک بی۔ جے۔ پی۔ اور ایک کانگریس لیڈر دونوں نے جنہیں وارڈ نمبر 23 سے الیکشن لڑنے کے لئے ٹکٹ دیا گیا تھا متنجیہ علاقوں میں حملوں کے سلسلے میں مختلف گروہوں کی رہنمائی کی تھی۔

ان لوگوں نے اپنی شکایت میں کہا ہے کہ اُن کے مقامی لیڈروں نے بھی انہیں ہتھیار حوالے کر دینے کی ترغیب دی تھی اور جیسے ہی ہتھیار حوالے کئے گئے ان پر حملے شروع کر دیئے گئے اور وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں کر سکے۔

ان مظلوم افراد کو اسٹیٹ ریزرو پولس سے ناراضگی ہے جو دور کھڑی تماشہ دیکھتی رہی۔ وجے نگر میں ایک جگہ پر پولس نے ان لوگوں پر فائرنگ کی جو اپنے گھروں کی حفاظت کے لئے کھڑے تھے لیکن بڑھتے ہوئے ہجوم پر فائرنگ نہیں کی۔ 35 خاندانوں پر مشتمل ایک گروہ جو اپنے گھروں سے بھاگ کر قریب کے ایک پاورلوم کارخانے میں پناہ گزین تھا، 3 دنوں تک تکلیف دہ حالت میں اس وقت تک فسادیوں میں گھرا رہا جب تک کہ ایک محفوظ ریلیف کیمپ میں منتقل نہ کر دیا گیا۔

متاثرہ خاندانوں کے بعض افراد کا کوئی پتہ نہیں ہے اور ایسے بھی واقعات دیکھنے میں آئے ہیں کہ فساد کے دوران بچھڑ جانے والے رشتے دار 2 یا 3 دنوں کے بعد کسی ریلیف کیمپ میں دوبارہ ملے ہیں۔ کچھ لوگ اب تک گمشدہ عزیزوں کے انتظار میں ہیں۔ ایک 3 سالہ لڑکا جس کا تلوار سے سر پھاڑ دیا گیا ہے صرف 'باپائی مری دیا' (میرے باپ کو مار ڈالا) ہی کہتا ہے اور کچھ نہیں کہتا۔ کیمپ کے نگراں 3 لڑکوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہ لڑکے روز رات کو سوتے سے اُٹھ کر فسادیوں کی طرح شور مچانے لگتے ہیں۔ "مارو، مارو"۔ (ماہنامہ استقامت، کانپور، جون 1993ء، شہید بابری مسجد نمبر)



# قومی رسوائی

از: ایچ۔ کے ڈُوا (معروف صحافی اور مشیر وزیر اعظم)

## قوم کا سر شرم سے جھک جانا چاہئے

اجودھیا میں جو کچھ ہوا اس پر پوری قوم کا سر شرم سے جھک جانا چاہئے۔ بابری مسجد پر حملہ اور اس کو مسمار کر کے کار سیوکوں نے جو اقدام کیا ہے وہ ہندوستان کی فراخ دلانہ روایات اور ہندو مذہب کی رواداری کی روح پر (جو ہمیشہ سے مشہور ہے) ایک بدنما داغ ہے۔

متنازعہ عمارت کے تحفظ میں ناکامی پر یو۔پی کی بی۔جے۔پی حکومت برطرف کر دی گئی ہے اور وہاں صدر راج کا نفاذ ہو گیا ہے لیکن اقوام عالم کے درمیان عزت و وقار کا مقام قائم رکھنے کے لئے اتنا کافی ہے؟

یہ نقصان محض ایک مسجد کا ضیاع نہیں ہے قطع نظر اس کے کہ یہ مسجد کس چیز پر بنائی گئی تھی بلکہ یہ نقصان ان اقدار کا ہے جو ہندوستان کی اساس ہیں۔ کسی کو علم نہیں کہ اتوار (6 ر دسمبر) کے واقعات نے جو نفسیاتی تقسیم اور تفرقہ پیدا کر دیا ہے اس کی اصلاح میں کتنا وقت صرف ہوگا۔

وہ لوگ جو خود کو ہندوؤں کا لیڈر کہتے ہیں اگر کسی پُر امن باہمی سمجھوتہ یا عدالت کے فیصلے کا انتظار کرتے کہ جہاں مسجد بنی ہوئی ہے کیا واقعی اس مقام پر کبھی کوئی مندر تھا تو آسمان نہ ٹوٹ پڑتا۔ اگر مقصد کے حصول کے لئے وہ 6 ر دسمبر ہی کو آخری تاریخ مقرر نہ کرتے تو عذاب الٰہی نازل نہ ہو جاتا لیکن ہندوؤں کے ان خود ساختہ لیڈروں نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا۔

اتوار کے دن اجودھیا میں ہونے والے خونچکاں اور تہلکہ آمیز واقعات کی ذمہ داری منجملہ اوروں کے لال کرشن اڈوانی جیسے افراد پر بھی ہے جنہوں نے بغیر یہ اندازہ کئے رتھ کی سواری کر ڈالی کہ یہ یاترا انہیں اور ملک کو کس جگہ پہنچا دے گی۔ اس کی ذمہ داری مرلی منوہر جوشی جیسے افراد پر بھی ہے جن کے اڑیل انداز کی تشریح صرف پارٹی کے دباؤ اور کوتاہ نظری پر محمول کی جا سکتی ہے۔ شاید مسٹر اڈوانی قومی اتحاد و یگانگت سے زیادہ وزیر اعظم بننے کی ذاتی آرزو مندی میں مبتلا تھے۔ اور ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کو بھی اور باتوں سے زیادہ اس بات میں دلچسپی تھی کہ وہ پارٹی کے صدر دوسری میقات کے لئے بھی بن جائیں۔ اٹل بہاری باجپئی جیسے سمجھدار افراد کو بخوبی ادارک تھا کہ پارٹی غلط

راہ پر جارہی ہے لیکن انہوں نے اس کی مخالفت کی کوئی جرأت نہیں کی۔ اور بھول گئے کبھی ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ پارٹی ڈسپلن سے زیادہ اہمیت اور فوقیت قوم اور ملک کو دینی پڑتی ہے۔

ضرورت ہے کہ ان سب سے یہ سوال کیا جائے کہ اس مندر کی کیا اہمیت و قیمت ہے اگر اسے قوم کے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے تعمیر کیا جائے۔ ایک تاریخی بے انصافی کی درستی کی تشویش میں انہوں نے ایک ایسی تاریخی سنگین غلطی کا ارتکاب کیا ہے جس کا ازالہ وہ کم سے کم اپنی زندگی میں نہیں کریں گے البتہ انہوں نے اپنا مقام، قوم کی تاریخ کے دھندلے نقوش پا میں ضرور بنالیا ہے۔

اس وقت قوم میں جتنا بحران سیاسی نوعیت کا ہے اتنا ہی ضمیر کا بحران ہے۔ ضرورت ہے کہ قوم اس وقت ایک مقام پر ٹھہرے اور غور کرے کہ کہاں کیا غلطی واقع ہوئی، اس واقعہ سے ہمیں دو سبق حاصل ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ سیاست میں مذہب کو داخل مت کرو، کیونکہ بعد میں دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسرا سبق یہ کہ جذبات کو برانگیختہ مت کرو کیونکہ بعد میں انہیں قابو میں کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

کانگریس پارٹی نے اجودھیا میں مسجد کا قفل کھولا اور تین سال قبل وہاں ''شلانیاس'' کی اجازت دی محض اس لئے کہ اس کا مقصد انتخابات میں فائدہ حاصل کرنا تھا اور یہ نہیں سوچا کہ اس کے اس عمل کے نتائج کیا ہوں گے۔ بی۔جے۔پی۔ نے کسی انتخابی حلقہ کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کے خوف کے تحت مندر کے رتھ پر سواری کی بغیر یہ محسوس کئے کہ اپنے اس عمل سے وہ جن قوتوں کو سلاسل سے آزاد کر رہے ہیں انہیں وہ بعد میں کیسے قابو میں رکھ سکیں گے۔

اتوار کے دن اجودھیا میں قوم نے بہت کچھ کھو دیا۔ اس کا قومی اتحاد اس وقت واقعی خطرہ میں پڑ چکا ہے۔ دنیا اس پر اپنی تعریف وتوصیف نچھاور نہیں کرے گی اور نہ انتظار کرے گی کہ کب یہ قوم دوبارہ شیرازہ بندی کرے کوئی بھی ان افراد کا انتظار نہیں کرتا جو باہم معرکہ آرائی اور جھگڑوں میں مصروف رہتے ہیں۔

تاہم یہ وقت ہے کہ کانگریس، جنتا دل، کمیونسٹ پارٹیوں اور خود بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر ساتھ بیٹھ کر اس سے قبل کہ مزید کچھ اور کھویا جائے اس صورت حال سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کریں اتوار کے اس المیہ کا بنیادی سبب ہے ذہنی غیر پختگی۔ ایک دوسرے پر معمولی اور بے حقیقت

کامیابیوں کا حصول اور سبقت ۔ سیاسی آرزوئیں اور بلند تمنائیں اور مذہبی جذبات کے سامنے خود سپردگی، کیا ہمارے سیاسی لیڈر اپنے انداز میں کچھ تبدیلی کر کے سیاست سے آگے بھی کچھ غور کریں گے اور قوم کا تحفظ کریں گے؟

بہرصورت اس وقت سخت قومی بحران سامنے ہے امن و قانون کی بحالی و استحکام کے لئے مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو ہر ممکن اقدامات کرنے ضروری ہیں۔ ضرورت ہے کہ تمام ملک میں افراد صبر و ضبط سے کام لیں اور اس بات کا دھیان رکھیں کہ وہ لوگ جو فرقہ وارانہ امن وہم آہنگی کو برباد کرنے کے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں وہ اس کو درہم برہم نہ کر دیں۔ قوم کا بہت کچھ اس وقت داؤ پر لگا ہوا ہے۔ اور ہر اس فرد سے جس کو قوم کی فکر ہے تقاضہ ہے کہ وہ جذبات کو علیحدہ رکھ کر اپنا ذاتی محاسبہ کرے اور قوم کے مستقبل کے متعلق غور کرے۔



# ہندو سماج شرمندہ ہے

از: پربھاش جوشی (معروف صحافی)

رام کی جئے، بولنے والے دھوکہ باز، انہی رام کاروں نے مریادا پرشوتم رام کے سورج ونشی خاندان کی روایت پر اجودھیا میں سیاہی پوت دی۔

ہندو عقیدہ اور طرز زندگی میں یقین رکھنے والے لوگوں کا دل آج دکھ سے بھرا اور سر شرم سے جھکا ہوا ہے۔ اجودھیا میں جو لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد پیش کر رہے ہیں اور بابری مسجد کی متنازعہ عمارت کو منہدم کرنے کو ہندو جذبات کا دھاکہ بتا رہے ہیں وہ خواہ خود کو سادھو، سادھوی، سنت مہاتما اور ہندو مفادات کا محافظ کہتے ہوں ان میں اور اندرا گاندھی کے قتل کی خبر پر برطانیہ میں تلوار نکال کر خوشی سے ناچنے والے لوگوں کی ذہنیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک نہتی عورت کا اپنے باڈی گارڈوں کے ذریعہ قتل پر رقص کرنا جتنا وحشی پن ہے اس سے کم ایک عبادت گاہ کو منہدم کرنا قابلِ مذمت، شرمناک اور غیر مذہبی نہیں ہے۔ وہ مذہبی مقام بابری مسجد بھی ہے اور رام للہ کا مندر بھی۔ ایسی عمارت کو دھوکہ دہی سے گرا کر جو لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ رام کا مندر بنائیں گے وہ رام کو مانتے جانتے اور سمجھتے نہیں ہیں۔

رام کے سورج ونشی خاندان کا رواج ہے کہ جان جائے لیکن زبان نہ جائے۔ یو. پی. کی بھاجپا حکومت، وشو ہندو پریشد اور آر.ایس.ایس. نے سپریم کورٹ، پارلیمنٹ اور ملک کے عوام کو زبان دی تھی کہ متنازعہ عمارت کو ہاتھ نہیں لگایا جائے گا لیکن 6 دسمبر کو اجودھیا میں سپریم کورٹ، پارلیمنٹ اور ملک کو دھوکہ دیا گیا۔ یہ کہنا کہ یہ ہندو جذبات کا دھاکہ ہے۔ جھوٹ بولنا ہے، جس طرح مسجد کو منہدم کیا گیا وہ کسی جذبات کے اچانک پھوٹ پڑنے کا نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر رچی گئی سازش کا ثبوت ہے۔ بی.جے.پی. کے ہی نہیں آر.ایس.ایس. کے لیڈر بھی وہاں موجود تھے۔ وہ سادھو مہاتما بھی وہاں موجود تھے جنہیں مارگ درشک منڈل کہا جاتا ہے۔ وشو ہندو پریشد، بی.جے.پی. اور آر.ایس.ایس. کو اپنے مہذب کارسیوکوں اور اپنے رضا کاروں پر بڑا فخر ہے۔ لیکن وہ سب کچھ دیکھتے رہے اور مسجد کو منہدم کر دیا گیا۔ مسمار کرتے وقت رام للہ کی مورتیاں لے جانا اور پھر لا کر رکھ دینا بھی یہ

ثبوت ہے کہ جو کچھ ہوا وہ منصوبہ بند طور پر ہوا ہے۔ بی. جے. پی. حکومت انتظامیہ اور پولیس کا کچھ بھی نہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ کلیان سنگھ حکومت بھی اس سازش میں شامل ہے۔

کلیان سنگھ نے پہلے استعفیٰ دیا اور پھر حکومتِ ہند نے اسے ڈسمس کر کے اتر پردیش میں صدر راج نافذ کر دیا۔ بی. جے. پی. کی ایک حکومت نے بتا دیا ہے کہ وہ رائے عامہ کو کس طرح پورا کرتی ہے۔ اس میں نہ اصولی، آئینی اور انتظامی ذمہ داری کو پورا کرنے کی خواہش تھی اور نہ طاقت۔ وہ جس طرح کی موت ماری گئی اسی کے قابل تھی۔ کیونکہ وہ دہشت گردوں کے ہاتھوں کا کھلونا ہو گئی تھی اور سازشیوں نے مسجد کے انہدام تک اس کا استعمال کیا۔ وہ ڈیڑھ سال سے کلیان سنگھ کی حکومت کو مندر بنانے کی راہ میں آنے والی دشواریوں کو حل کرنے کا وسیلہ بنائے ہوئے تھے۔ اپنی آئینی پارلیمانی اور اخلاقی ذمہ داریوں کو سمجھ کر ادا نہ کرنے والی حکومت کے لئے کوئی آنسو نہیں بہائے گا۔ لیکن کیا عوام پھر ایسی حکومت بننے دیں گے؟

حکومتِ ہند نے صدر راج ضرور نافذ کیا ہے لیکن اتنے مہینوں سے وہ حکومت اتر پردیش اور بی. جے. پی. کو ذمہ دار بنانے کے سیاسی کھیل میں لگی ہوئی تھی اب اس کے سامنے ایسی حالت ہے کہ اجودھیا میں دو تین لاکھ لوگ جمع ہیں، پولیس اور نیم فوجی دستوں کو پہنچنے میں بہت سی رکاوٹیں ہیں، جو ٹکراؤ وہ ٹالنا چاہتی ہے اب وہ اس میں گردن تک دھنس چکی ہے۔ مسجد کا تحفظ، آئین اور سپریم کورٹ کے احکامات کے احترام کی اس کی اتنی ہی ذمہ داری تھی جتنی حکومت اتر پردیش کی۔ کیا اس نے ایک ریاست کی منتخبہ حکومت پر اعتماد کر کے غلطی نہیں کی؟ کیا اسے آئین کے تحفظ کے لئے غیر آئینی قدم اُٹھانے چاہئیں؟ ان سوالوں کے جواب آسان نہیں ہوں گے لیکن تاریخ میں وہ کوئی فعال حکومت تسلیم نہیں کی جائے گی۔ کوئی نہیں جانتا کہ حکومت ہند اب اجودھیا میں کتنا کچھ کر سکے گی لیکن ملک کی رائے عامہ اسے معاف نہیں کرے گی۔

یہ سچ ہے کہ تمام سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں نے اجودھیا کے مسئلے کو اُلجھایا ہے سبھی نے اس کا سیاسی استعمال کیا ہے اور کل جو ہوا اس میں اس سیاست کا بھی ہاتھ ہے لیکن رام مندر کی تعمیر کی تحریک وشو ہندو پریشد چلا رہی تھی۔ یہ ادارہ آر. ایس. ایس. کا بنایا ہوا ہے۔

6/دسمبر کو شروع ہونے والی کارسیوا کی ذمہ داری آر. ایس. ایس. نے اُٹھائی تھی۔ سنگھ خاندان یہ جانتا تھا کہ شیو سینا اور بجرنگ دل کے لوگ کیا کر سکتے ہیں، لیکن انہوں نے لوگوں کے جذبات کو

مشتعل کیا اور انہیں کثیر تعداد میں اجودھیا میں جمع کیا۔ سیاسی پارٹیوں کے کھیل تو سب جانتے ہیں لیکن سنگھ ہندو سماج کو ہندو کلچر کے مطابق منظم کرنے والی تنظیم ہے۔ اور وشو ہندو پریشد مندر اور وہ بھی رام کا مندر بنانے والا ادارہ ہے۔ آپ کانگریس اور بی۔ جے۔ پی کو سیاسی پارٹیوں کی طرح ''کوس'' سکتے ہیں لیکن سنگھ خاندان کو کیا کہیں گے جس نے ہندوتو کے لئے یہ شرمناک سیاہ دن آنے دیا۔ اجودھیا میں جو کچھ ہوا اس کے لئے ہندو سماج شرمندہ ہے اور ملک کو کیسے بچانا ہے وہ اس کی کشادہ روایتوں میں پنہاں ہے۔ وہ پوچھے گا کہ زبان توڑ کر، دھوکہ دہی کر کے اور انتقام کی بنیاد پر رام مندر بناؤ گے؟ اور جو کہے گا کہ ہاں تو اس سے وہ پوچھے گا کہ کیا یہ ہندو دھرم ہے؟

کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کارسیوا کے نام پر مسجد اس لئے مسمار ہوئی کہ اچانک مشتعل ہونے والے جذبات کو روکا نہیں جا سکا تھا۔ اجودھیا جانے پر ملائم سنگھ کی طرح کسی نے پابندی نہیں لگائی تھی۔ سپریم کورٹ نے کارسیوا کی اجازت دی تھی۔ الہ آباد ہائی کورٹ پر فیصلے کو لٹکائے رکھنے کا الزام ہے وہ پانچ دن بعد تحویل شدہ اراضی پر فیصلہ دینے والی تھی۔ اس وقت تک کارسیوا صحیح طور سے چل سکے اس کے لئے مرکزی حکومت نے تعاون والا رُخ اختیار کر رکھا تھا۔ حکومت اتر پردیش نے اس قدر کم پولیس تعینات کر رکھی تھی کہ اُسے دیکھ کر کسی کے بھڑکنے کی توقع نہیں تھی۔ بی۔ جے۔ پی۔ اور آر۔ ایس۔ ایس۔ والے کارسیوا میں جن روڑوں کی بات کر رہے تھے وہ سبھی ہٹے ہوئے تھے، اور ایسی بھی بات نہیں کہ ''غلامی'' کی مبینہ علامت اس عبادت گاہ کو کارسیوکوں اور ان کے لیڈروں نے پہلی بار دیکھا ہو کہ وہ ایک دم بھڑک اُٹھے۔ وہ مسجد وہاں 465 سال سے کھڑی تھی اور اس میں رام للاّ کی مورتی رکھی ہوئی تھی اور وہاں پوجا پاٹھ میں کوئی پابندی نہیں تھی۔ پھر اُسے آج ہی گرانے اور اس طرح گرانے کی ضرورت کیا تھی؟

یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں مرکز نے ٹکراؤ مول لیا ہو، لوگوں کو مشتعل کیا ہو۔ بی۔ جے۔ پی۔ اور سنگھ کے ہی نہیں، وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل جیسی دہشت گرد تنظیموں نے کہا تھا کہ مرکز چاہے گا تو ٹکراؤ ہوگا۔ لیکن مرکز 6 ردسمبر کو سات گھنٹے تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہا۔ اور نام نہاد کارسیوکوں نے اپنے لیڈروں کی موجودگی میں انتہائی دہشت گردانہ کام کر ڈالا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انہیں مشتعل کیا گیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ جذبات کے مشتعل ہونے کا اچانک دھماکہ تھا۔ یہ زبردستی اور سوچ سمجھ کر کیا گیا کام ہے۔ اس میں جو دھوکہ بازی ہے وہ ہماری جمہوریت اور سیکولر آئین کو دیا گیا چیلنج

نہیں ہے۔ یہ پورے ہندو سماج کے اعتماد اور جواب دہی کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ سنگھ خاندان کو فیشن ایبل سیکولرزم کی فکر نہ بھی ہو تو کم سے کم اس سماج کی روایت، پابندی اور اعتماد کی فکر تو کرنی چاہئے جسے وہ دنیا کا سب سے اعلیٰ کلچر کا سماج مانتا ہے۔ اس کے بعد ہم سکھ دہشت گردوں کے مذہب کی آڑ میں چلتے خالصتان اور کشمیر کے مسلمان دہشت گردوں کی آزادی کا کیا جواب دیں گے؟ طاقت دکھانے کے لئے ہندو سماج کے لئے مذہبی، روایتی، آئینی اور پارلیمانی راستے کھلے ہوئے تھے پھر کیوں اسے عہدِ وسطیٰ جیسی بربریت میں ڈالا گیا۔ جو سمجھتے ہیں کہ مسجد مسمار کرکے وہ ایک نئے ہندوتو کی بنیاد رکھ رہے ہیں وہ جلد ہی دیکھیں گے کہ ہندو سماج انہیں کہاں پہنچاتا ہے۔ انتقام کے جذبے سے کانپنے والے بزدلوں کے علاوہ کسی ہندو دل نے اس انہدام کی حمایت کی ہے۔

ملک، مرکزی حکومت اور ہندو سماج کے سامنے آزاد ہندوستان کا سب سے بڑا بحران منھ کھولے کھڑا ہے۔ آئندہ کچھ دنوں میں انہیں ''اگنی پریکشا'' سے گزرنا ہے۔ آئین اور پارلیمانی روایت ان کے ساتھ ہے اور انہیں اتحاد و یک جہتی کی ہی حفاظت نہیں ان روایتوں کو بھی نبھانا ہے جو ہزاروں برسوں سے اس ملک میں ہے اور جس کے تباہ ہونے سے نہ ہندوستان، ہندوستان رہے گا نہ ہندو سماج ہندو۔ اس بحران میں وہ بھگوان رام سے بھی ترغیب لے سکتے ہیں جنہوں نے ایسے بحران میں عزم کے ساتھ اصولوں کو قائم کیا اور اس کی حفاظت کی۔



# بابری مسجد کا تالا کانگریس (I) کی سازش سے کھولا گیا

از: شمس الہدیٰ ندوی

یکم فروری/1986ء کو آزاد ہندوستان کی عدلیہ کی تاریخ میں بلاشبہ ایک سیاہ دن کے روپ میں یاد کیا جاء گا جب فیض آباد کے سیشن جج نے عدل وانصاف کے تمام معیارات اور مسلّم اصولوں کو نظر انداز کر کے بابری مسجد تالہ کھولنے کا فیصلہ سنا دیا۔ یہ فیصلہ بابری مسجد کو رام جنم بھومی مندر میں تبدیل کرنے کی تمہید تھی۔

مذکورہ سیشن جج نے یہ فیصلہ کلکٹر اور ایس. پی. کی اس یقین دہانی کو بنیاد بنا کر سنایا تھا کہ نقض امن کا کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوگا۔ اور فیض آباد کے ضلع حکام اس طرح یقین دہانی کرانے پر اس لئے مجبور تھے کہ اس وقت کے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ (جو بعد میں مرکز میں کیبنٹ رینک کے وزیر برائے مواصلات ہو گئے تھے، اور اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے ان کا سرکاری دورہ برائے پیرس کے دوران دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا) نئی دہلی اپنے سرپرست اور مربی ارون نہرو کی اس ہدایت پر عمل کرنے پر مجبور تھے کہ جیسے بھی ہو بابری مسجد کو رام جنم بھومی میں تبدیل کر دیا جائے۔ ارون نہرو جو اس دوران راجیو گاندھی کی سرکار میں وزیر تھے اور بہت ہی اونچی مسند پر جلوہ افروز تھے اور بعد میں جب وی. پی. سنگھ کی سرکار بنی تب بھی ان کو اسی عہدے سے نوازا گیا تھا اور اسی کرسی پر وہ براجمان ہوئے۔ ارون نہرو اس وقت جب شاہ بانو کا مسئلہ چل رہا تھا اور سپریم کورٹ میں مسلم پرسنل لاء میں مداخلت کر دی تھی جس سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے اندر زبردست بے چینی پیدا ہو گئی تھی اور راجیو گاندھی حکومت کو زبردست اختلاف کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جس کی انہوں نے مسلم پرسنل لاء پر خصوصی بل لاکر مسلمانوں کے پرسنل لاء میں مداخلت کو ختم کر دیا تھا۔ ارون نہرو اسے مسلم بنیاد پرستوں کی منہ بھرائی تصور کرتے تھے۔ اور بابری مسجد پر قبضہ کر کے یہ جتانا چاہتے تھے کہ ان کے ہاتھ بھی کم لمبے نہیں ہیں۔ انہوں نے ویر بہادر سنگھ کی مدد سے بابری مسجد پر قبضہ کا فیصلہ ایسے وقت میں کیا جب تحفظ شریعت کی تحریک ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکی تھی اس وقت کے وزیر اعظم راجیو گاندھی مسلم مطلقہ بل لانے کا اعلان کر چکے تھے۔ ارون نہرو کا خیال تھا کہ مسلمان اس مرحلے میں مسجد کو بچانے کے لئے کوئی فیصلہ کن قدم نہیں اُٹھائیں گے کیونکہ اس صورت میں مطلقہ

بل خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ تھا ان کا یہ اندازہ درست نکلا، مسلمان اس ردّعمل کا مظاہرہ نہیں کر سکے جس کی اسے توقع تھی۔ شروع میں مسلم قائدین نے اس کا سختی سے نوٹس نہیں لیا اور کھل کر سامنے نہیں آئے البتہ انہوں نے ''بند'' اور مظاہروں کے نعرے تو دیئے۔ لیکن اس پر عمل کس طرح ہوگا اس کا انہوں نے کوئی پلان مرتب نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ بغیر کمانڈر کے فوج جو کچھ کرتی ہے وہی مسلمانوں نے کیا اور بابری مسجد کی بازیابی کی تحریک مثبت ڈھنگ سے نہ چل سکی۔

لیکن ایک سوال عام طور پر بہت سے مسلمانوں کے ذہن میں بار بار اُٹھتا رہتا ہے کہ ارون نہرو نے آخر کیوں تالا کھلوایا۔ اور یہ کس کی سازش اور اشارے سے ہوا۔ ہمیں حالات کے جائزے اور تحقیقات سے جو پتہ چلتا ہے وہ ذیل میں بیان کیا جا رہا ہے:

یہ بات بہت باریکی سے غور کرنے کی ہے اور تاریخی پس منظر کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ 1977ء میں جب اندرا گاندھی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا اور ایمرجنسی کے بعد جب جنتا پارٹی وجود میں آئی اور الیکشن میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور جنتا پارٹی کی حکومت بنی اس وقت سنجے گاندھی زندہ تھا اندرا اور سنجے نے ایک کامیاب چال چل کر جنتا پارٹی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور کچھ دنوں کے لئے چرن سنگھ کو وزارت عظمیٰ کی کرسی پر بٹھا دیا اور اس طرح سے 1979ء میں جنتا پارٹی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ اور پھر 1980ء میں اندرا گاندھی دوبارہ برسرِ اقتدار آ گئیں۔ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کا عام رجحان آزادی کے بعد عام طور سے کانگریس کی طرف تھا مگر 1977ء میں کانگریس کو مسلمانوں کی طرف سے بہت مایوسی ہوئی اور پھر 1980ء میں بھی مسلمانوں کا دل کانگریس کی طرف سے اچاٹ سا نظر آیا۔ دوسری طرف ہندوؤں کا ایک بہت بڑا طبقہ بھی کانگریس کی حمایت میں نہیں تھا۔ اس طرح سے کانگریس کے سامنے ان کا ووٹ بینک پہلے کی طرح اتنا پختہ اور مضبوط نہیں تھا اس سلسلہ میں اندرا گاندھی بہت زیادہ فکر مند رہا کرتی تھی۔ اس وقت ارون نہرو کلکتہ کی کسی کمپنی میں ملازم تھے۔ اور اندرا گاندھی کے رشتہ دار ہونے کے ناطے ان کے پاس تو آیا ہی کرتے تھے۔

ایک صبح جب اندرا گاندھی، راجیو گاندھی و خاندان کے دیگر افراد ارون نہرو کے ساتھ ناشتہ پر اکٹھا تھے۔ ارون نہرو نے محسوس کیا کہ اندرا گاندھی بہت زیادہ متفکر ہیں اور جب بھی آتے ہیں ان کو بہت زیادہ سوچ و فکر میں ڈوبے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ انہوں نے اس دن ان سے پوچھ ہی لی۔ جب اندرا گاندھی نے اپنے فکر کا اظہار ارون نہرو سے کیا تو ارون نہرو نے اندرا

گاندھی کو عام ہندوؤں کو اپنی طرف مبذول کرنے کا خیال بتایا۔ اس پر اندرا گاندھی نے ارون نہرو سے اس سلسلے میں ان کی مدد کرنے کے لئے کہا اور یہ درخواست کی کہ وہ نوکری چھوڑ کر باقاعدہ سیاست سے منسلک ہو جائیں۔ اس وقت اندرا گاندھی پارلیمنٹ کی دوسیٹ جیت آئی تھیں، رائے بریلی کے علاوہ میدک کی سیٹ، اندرا گاندھی نے ان سے رائے بریلی سے الیکشن جیت کر پارلیمنٹ میں آنے کا مشورہ دیا۔ اور وہ فوراً تیار ہو گئے۔ اور الیکشن میں کامیابی کے بعد وہ باقاعدہ اس ادھیڑبن میں رہے کہ کوئی موقع ومحل دیکھ کر اندرا گاندھی کے لئے ''ہندوکارڈ'' کا کھیل کھیلا جائے اور ہندوؤں کے ایک بہت بڑے طبقے کو جو اندرا گاندھی کو عام ہندوؤں کے خلاف سمجھتا ہے ان کے حق میں کرنے کا پلان بناتے رہے۔

اندرا گاندھی کی زندگی تک ہندوکارڈ کھل کر کھیلنے کے مواقع میسر نہیں آئے۔ لیکن اندرا گاندھی ارون نہرو وراجیو گاندھی اس سلسلے میں بہت متفکر تھے۔ تبھی 31/اکتوبر 1984ء کو اندرا گاندھی کا قتل ہو جاتا ہے اور اس فکر کے ساتھ ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو جاتی ہیں۔ اور راجیو گاندھی کو اندرا گاندھی کے قتل سے ہمدردی کے نتیجہ میں الکشن میں زبردست اکثریت حاصل ہوتی ہے اور اس وقت اپوزیشن کے دیگر رہنما پارلیمنٹ سے دور ہو جاتے ہیں لیکن اس الیکشن میں بھی مسلمانوں کا جھکاؤ کانگریس کی طرف ماضی کی طرح نہیں ہوتا ہے اور ہندوقتی طور پر سکھوں کے مقابلہ میں کانگریس کو کامیاب کرتے ہیں پھر اچانک سپریم کورٹ سے ''شاہ بانو'' کے مقدمہ کا فیصلہ ہوتا ہے جو ''مسلم پرسنل لاء'' کے خلاف ہوتا ہے اور عام مسلمان متحد ہو کر اس کا اختلاف کرتے ہیں اور کسی قیمت پر بھی اس مقدمہ کے فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ مجبور ہو کر راجیو گاندھی جو اس وقت وزیر اعظم تھے، اعلان کرتے ہیں کہ مسلم پرسنل لاء کی حفاظت کے لئے خصوصی طور پر پارلیمنٹ سے بل پاس کیا جائے گا اس طرح سے عام مسلمان اندرا کانگریس کی طرف جھک سکتا ہے لیکن دوسری طرف ہندوؤں کے جغادری قسم کے لیڈران اس کی مخالفت کرتے رہے اور ایسے بل پاس کرنے کے خلاف تھے اور یکساں سول کوڈ کے حق میں تھے ایسے وقت میں راجیو گاندھی کو پورے ہندوستان کے ہندوؤں کی حمایت سے کنارہ کشی کا خطرہ لاحق ہو رہا تھا اور وہ بہت متفکر تھے کہ آخر اس کی کاٹ کس طرح کریں۔ ایک بار پھر نہرو خاندان کے لئے ایک لمحۂ فکریہ بن گیا جس کا فوری علاج نہیں نظر آتا تھا راجیو گاندھی اور ارون نہرو کے درمیان باہم مشورہ ہوا۔ اس وقت بابری مسجد اور رام جنم بھومی کا مسئلہ

سرد خانے میں پڑا ہوا تھا۔ بابری مسجد میں مورتی رکھنے کے بعد سے تالا لگا ہوا تھا اور برسوں سے اس کا مقدمہ عدالت میں چل رہا تھا کوئی شدت نہیں تھی کہ اسی درمیان راجیو گاندھی نے ارون نہرو کو مشورہ دیا کہ "اسے پلان کرو" اس وقت یو. پی. کی وزارت اعلیٰ کی کرسی پر ویر بہادر سنگھ جلوہ افروز تھے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ ویر بہادر سنگھ مسلمانوں کے ناطے اپنے دل میں نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے بلکہ مسلمانوں کے تیئں ان کا رویہ کافی خوش کن تھا اور مسلمانوں کے کاز کی انہوں نے کبھی مخالفت نہیں کی اور ان کا کوئی فعل مسلمانوں کے حقوق کے مخالف نظر نہیں آتا ہے بلکہ ان کا مسلمانوں اور مسلمانوں سے متعلق جو مسائل ہیں اس کی کتنی حمایت کرتے تھے کہ اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ گورکھپور کے تھے اور گورکھپور کے عام مسلمانوں سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے ان کے ایک قریبی دوست ہیں ان کا خیال ہوا کہ گورکھپور سے اردو کا ایک روزنامہ نکالا جائے یہ بات جب وزیر بہادر کے سامنے آئی تو انہوں نے اسے ہر قسم کی مدد دینے کا بھروسہ دلایا۔ اور انہوں نے گورکھپور سے روزنامہ "مشرقی آواز" کا اجراء کیا۔ اور ویر بہادر سنگھ نے اپنے وعدہ کے مطابق اس اخبار کی بہت مدد کی اور ہر قسم کی سرکاری سہولیات فراہم کیں۔ اشتہارات، کاغذ کا کوٹہ و دیگر سہولیتیں مہیا کی گئیں۔ اس ایک نظیر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو انہوں نے ایک مسلمان کی بھرپور مدد کی دوسری طرف انہوں نے اردو کو پروان چڑھایا اس کے علاوہ راقم الحروف کا ویر بہادر سنگھ سے پارلیمنٹ کے کئی مسلم ممبران کے ساتھ ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان ممبروں کی عزت افزائی و احترام میں میں نے ان کے اندر وہ بات دیکھی جو دوسرے کسی سیکولر لیڈر سے کم نہ تھی اس لئے ہم صرف ویر بہادر سنگھ کو اس کا ذمہ دار "مجرم" نہیں قرار دے سکتے ہیں۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب ارون نہرو نے راجیو گاندھی کے مشورے سے ایک پلان مرتب کیا اور اس پلان کے ساتھ ویر بہادر سنگھ سے ملے اور بتایا تو ویر بہادر سنگھ نے اس پر عملی اقدامات کرنے سے معذرت ظاہر کی اور اس کے دور رس نتائج پر روشنی ڈالی لیکن ارون نہرو نہیں مانے اور انہیں دھمکی دی گئی کہ نہ صرف راجیو گاندھی ایسا ہی چاہتے ہیں بلکہ میڈم "اندرا گاندھی" کا یہ خواب ہے۔ اور اگر انہوں نے ایسا نہیں کیا تو عین ممکن ہے کہ انہیں وزیر اعلیٰ کی کرسی سے تیاگ دینا ہوگا۔ پھر ارون نہرو نے اپنے ڈھنگ سے اس کا فائدہ بتایا اور وہ بمشکل اس کام کے لئے تیار ہوئے اور پھر ارون نہرو کے تیار کردہ پلان کے تحت بابری مسجد کا تالا کھولا گیا اور اس کو باقاعدہ ٹی.وی پر دکھایا گیا تاکہ

پورے ہندوستان کا عام ہندو اسے دیکھے اور یہ نہ سمجھے کہ کانگریس صرف مسلمانوں کی حمایت کرتی ہے بلکہ وہ ہندوؤں کی اس سے بھی زیادہ ہمدرد ہے۔ یہ ہیں وہ حقائق۔ ان حقائق کے پس منظر کے سامنے ان کے بعد بہت سی چیزوں سے پردہ اُٹھ جائے گا۔ اور وہ کہاں کھڑے ہیں آپ خود جان لیں گے؟

اور پھر ساری دنیا نے دیکھا کہ کانگریس کے زمانہ میں ہی اس متنازعہ جگہ پر رام مندر بنانے کا نہ صرف پلان بنا بلکہ عملی طور پر اس کا شلانیاس اور ''بنیاد'' بھی رکھ دی گئی اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت چاہیے۔

کسی بھی چیز کا عمل اور ردِ عمل ہوتا ہے۔ راجیو گاندھی نے مسلمانوں کے خلاف جو سازش رچی تھی اسے پورا کرنے میں تو وہ کامیاب ہو گئے لیکن اس کے ردعمل سے وہ مات کھا گئے اور ان کا سارا پلان نہ صرف یہ کہ فلاپ ہو گیا بلکہ اس کا فائدہ دوسرے لوگ اُٹھانے لگے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے اس کا سیاسی فائدہ اُٹھالیا اور شلانیاس کرا کر باقاعدہ بابری مسجد کو توڑ کر رام مندر بنانے کا پلان تیار کر لیا اور یہ قسم کھائی کہ مندر بنوا کر رہیں گے۔ اب ایسی صورت حال ہو گئی کہ کانگریس کے لئے وہ کھلم کھلا مسجد توڑنے کے بارے میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتی ہے۔ اور مندر بنانے کے بارے میں بھی۔ بلکہ اسی سازش کی وجہ سے ان کو گزشتہ الیکشن میں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔

(بشکریہ کتاب: بابری مسجد کے آنسو، مرتب: شمس الہدیٰ ندوی)



# مرکزی نامرد حکومت اور کلیان سنگھ کے داؤ پیچ

از: ہارون رشید علیگ مرحوم (روزنامہ انقلاب، ممبئی)

کم و بیش 48 گھنٹے تک دلی کی مرکزی حکومت نامرد بنی رہی۔ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو اسے مردانگی کی گولی کھلا دیتا تا کہ اُس میں سیکولرزم کو بچانے کی اخلاقی طاقت پیدا ہوتی۔ وزیر اعظم اور ان کی کابینہ نے شتر مرغ کی طرح ریت میں اپنا سر چھپا لیا۔ دوسری جانب اتر پردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی بھانڈ سرکار نے بھی سیکولرزم کی تکفین و تدفین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ نوٹنکی کے کسی چھچھورے بھانڈ کی طرح جھوٹ کا ڈرامہ کرتی رہی۔ انجام کار ان دونوں کی مشترکہ کاوشوں سے گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد کا ہندوستان دنیا بھر میں رسوا ہوا۔ بابری مسجد شہید کر دی گئی۔

جن کارسیوکوں نے مسجد کو مسمار کیا وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے سب سے بڑا نقصان ہندوازم اور اس کی نیک قدروں کو پہنچایا ہے۔ اب چاہے جو بھی ہو وقت نے تو دلی کی کانگریس حکومت اور یو. پی. کی بی. جے. پی سرکار کے چہرے پر کالک پوت دی ہے۔ تاریخ نے ان پارٹیوں کے حکمرانوں کے سیاہ اور مکروہ چہروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا ہے۔

دو دنوں تک اجودھیا پر دھرم کے جنونیوں، سادھوؤں اور سنتوں کا قبضہ رہا۔ راتوں رات ہندوستان ہندو ملک بن گیا۔ کہاں گئے وہ ارباب اختیار جو ان ملکوں کی جانب حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جہاں ملا اور مولوی کے فتوؤں پر حکومتیں چلتی تھیں؟

آج کانگریس اور بی. جے. پی. جو جواز پیش کر رہی ہیں ▪ سب کے سب بے بنیاد اور لغو ہیں۔ کیا دلی سرکار کو یہ معلوم نہیں تھا کہ لاکھوں افراد اجودھیا میں جمع ہوئے جا رہے ہیں؟ کیا اس کی عقل ماری گئی تھی کہ ▪ یہ تک نہ سوچ سکی کہ دھرم کے جنونیوں کو روکنا ممکن نہ ہوگا؟ بی. جے. پی.، آر. ایس. ایس.، وشو ہندو پریشد اور شیو سینا پر اوپر اوپر لعنت بھیجنے والی مرکزی سرکار اندر سے ان پر ایمان لے آئی۔

وزیر اعظم نرسمہا راؤ اور وزیر داخلہ ایس. بی. چوان ہندوستانیوں کو وعدے پر ٹرخاتے رہے۔ کتنا

خیال تھا انہیں بی. جے. پی سرکار کا۔ جب اجودھیا میں فورسیز اتاری گئی تو بڑے مؤدبانہ انداز میں کہا گیا کہ یہ فورسیز کارسیوکوں کے لئے تھوڑے ہی آئی ہے بلکہ یہ تو معمول کی ڈیوٹی انجام دے رہی ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ معمول کی ڈیوٹی کیا تھی۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ سریع الحرکت فورس یا ریپڈ ایکشن فورس ( آر. اے. ایف ) کو جان بوجھ کر روک لیا گیا۔ اگر یہ یقین نہ آئے تو اس کے کمانڈر کا یہ بیان پڑھئے جو 7 دسمبر کے روزنامہ انڈین ایکسپریس، کے صفحہ اول پر چھپا ہے۔

''ہم چند گھنٹوں میں تمام بھیڑ صاف کر دیتے اور........ جانی نقصان بھی بہت کم ہوتا، ہمیں ایسے حالات سے نپٹنے کی ٹریننگ دی گئی ہے۔ ہم بآسانی متازعہ ڈھانچہ تک پہنچ سکتے تھے۔''

ہم قارئین کو یاد دلا دیں کہ سریع الحرکت فوج کو اجودھیا سے صرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر روک لیا گیا۔ اور یہ حکم ڈسٹرکٹ کے اعلیٰ عہدیداران نے دیا تھا۔

کتنے بڑے مجرم ہیں یہ لوگ۔ سرکار ٹاڈا میں چھوٹے مجرموں، چوروں یا پھر بے قصور لوگوں کو گرفتار کر کے اذیتیں پہنچاتی ہے لیکن ان بڑے مجرموں کو گرفتار کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

کیا سپریم کورٹ کے احکام کی خلاف ورزی کرنا جرم نہیں؟ کیا لوگوں کو ورغلانا اور فساد کروانا جرم نہیں؟ کیا دہشت گردی میں اہم رول ادا کرنا جرم نہیں؟

وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے ٹیلیوژن پر ایسے عناصر کو ملک اور قوم کا دشمن قرار دیا ہے تو پھر ایسے دشمنوں کو آزاد کیوں چھوڑے ہوئے ہیں۔ ان بھینسوں کو سیکولرزم کی کھیتی چرنے کی اجازت کیوں دی جا رہی ہے۔ کیا اب یہ کہنے کی بھی ضرورت ہے کہ ایل. کے. اڈوانی، اشوک سنگھل، اور ان کے سینکڑوں ساتھی سیکورلزم کی عدالت میں سب سے بڑے مجرم ہیں اور حکومت کو چاہئے کہ انہیں فوراً گرفتار کرے۔ اگر ملک دشمن عناصر پر کشمیر اور پنجاب میں گولیاں داغی جاسکتی ہیں۔ ان پر فوجوں کے ذریعہ چڑھائی کی جاسکتی ہے تو اجودھیا میں قوم دشمن عناصر کو کیوں کھلی چھوٹ دے دی گئی؛؟

اڈوانی جی آج مگرمچھ کے آنسو بہا رہے ہیں۔ انہوں نے اپوزیشن کی قیادت سے استعفیٰ دے دیا ہے، لیکن اب ان کا بھانڈہ پھوٹ چکا ہے۔ ان کے اور ان کے ساتھیوں کے اصلی چہرے سامنے آ چکے ہیں۔ اڈوانی جی پشیمان ہیں، پریشان ہیں، تو ہوا کریں۔ رتھ یاترا نکال کر آگ بھی تو انہوں ہی نے لگائی تھی۔ اور وہ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ جب علامتی کارسیوا کی بات ہو رہی تھی تو انہوں نے

زعم میں آکر کہا تھا کہ علامتی نہیں اصل کارسیوا ہوگی، تعمیر کا کام ہوگا اور وہ خود اس میں شریک ہوں گے۔اڈوانی جی شریک بھی ہوئے اور اپنا کام بھی کر دکھایا۔ (پڑھیے پردیپ کپور کی رپورٹ)

جب بھی مرکز یہ کہتا ہے کہ وہ یو. پی. سرکار پر بھروسہ کر کے مارا گیا تو ہمیں اُس کی ناسمجھی پر رونا آتا ہے۔نئی دلی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یو. پی. انتظامیہ اور اس کی پولس گیروے رنگ میں رنگ چکی ہے۔ وہ بابری مسجد کی حفاظت کیسے کرسکتی ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملائم سنگھ کے دور میں یو. پی. کی پولس نے جے سری رام کا نعرہ لگا کر اور دیکشت کو سلامی دے کر جس طرح فرقہ پرست اور متعصب ہونے کا ثبوت دیا تھا اس سے دنیا واقف ہے۔ اگر چوان صاحب نہ جانتے ہوں تو پھر ان سے خدا سمجھے۔ ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں اور پورا ملک فساد کی آگ میں جھلس رہا ہے۔ ممبئی کو تو صرف چند گھنٹوں میں فوج کے حوالے کر دیا گیا لیکن اجودھیا کو دو دنوں تک سادھوؤں، سنتوں اور کارسیوکوں کی جھولی میں ڈالتے ہوئے حکومت کو ذرا سی بھی شرم محسوس نہیں ہوئی۔

حکومت نے اب اپنا چار نکاتی پروگرام پیش کیا ہے:

1. وہ بابری مسجد دوبارہ تعمیر کرے گی۔
2. وہیں رام مندر بھی بنے گا۔
3. فرقہ وارانہ تنظیموں پر پابندی لگائی جائے گی۔
4. قصور واروں پر مقدمات چلائے جائیں گے اور انہیں سزا دی جائے گی۔

جہاں تک بابری مسجد کی تعمیر کا سوال ہے اُس کا اعلان تو مسلمانوں کے زخم پر مرہم رکھنے کے لئے کیا گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں اور نرسمہا راؤ کی حکومت کے لئے بہت مشکل ہے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق بابری مسجد کی ایک ایک اینٹ کارسیوک اپنے ساتھ لے گئے یہ سمجھ کر کہ یہ اینٹ ان کی بہادری کا سرٹیفکیٹ ہے۔ مسجد کی جگہ پانچ فٹ اونچی دیوار قائم کی جا چکی ہے اور اس میں مورتیاں نصب کی گئی ہیں۔ بانسوں کے سہارے شامیانہ لگا دیا گیا ہے۔ 7/دسمبر کی شام تک اشوک سنگھل رام للا کی مورتی اپنی گود میں لئے بیٹھے تھے۔ اُسے نصب کر کے واپس لوٹے تھے۔

دوسری بات رام مندر کی تعمیر کی ہے۔ بھلا اس سے کس ہندوستانی کو انکار تھا۔ سب چاہتے تھے کہ مندر بنے لیکن مسجد کو آنچ نہ آئے۔ حکومت مندر کی تعمیر جتنی جلد شروع کر دے اتنا اچھا ہے۔

حکومت فرقہ وارانہ تنظیموں پر پابندی لگانے کی بات کر رہی ہے اور وزارتِ داخلہ نے ایسی تنظیموں کی فہرست بھی تیار کر لی ہے۔ ورنہ ایسی تنظیمیں سات پردوں میں تو چھپی نہیں ہیں۔ ہماری حکومت کو چاہئے کہ اس معاملے میں سب کو ایک لاٹھی سے نہ ہانکے۔ ایسی کئی تنظیمیں ہیں جن کا تعلق ہندوؤں سے بھی ہے اور مسلمانوں سے بھی اور جو فرقہ پرست نہیں ہیں۔ اس لئے وزارتِ داخلہ کو محض خانہ پُری کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے۔

سب سے اہم پہلو قصورواروں پر مقدمہ چلانے اور انہیں سزا دینے کا ہے۔ لیکن یہ گرفتاری رسمی نہیں ہونی چاہئے۔

ان لوگوں پر باقاعدہ نورمبرگ کی عدالت کی طرح مقدمہ چلایا جانا چاہئے کہ ایک طرف ان لوگوں نے ہندوستانی سیکولرزم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تو دوسری طرف سیکڑوں افراد کی اموات کا سبب بنے۔

اگر ہماری سرکار میں تھوڑی بہت جرأت ہے تو وہ ممبئی میں شیو سینا کے چیف ٹھاکرے کی لگام بندی کرے۔ موصوف نے کہا تھا کہ اگر مسجد شیوسینکوں نے توڑی ہے تو یہ فخر کی بات ہے۔ افسوس فخر سے سینہ پھلانے والے ٹھاکرے اجودھیا جانے کی ہمت نہیں کر سکے اور جو دستہ انہوں نے بھیجا وہ بھی راستہ میں رہ گیا۔ اس کے باوجود ٹھاکرے نے مسجد مسمار کرنے کا 'کریڈٹ' لے لیا۔ شہر میں شیو سینا والے فتح کا جلوس نکالنے کی تیاری کر ہی رہے تھے کہ انہیں اطلاع دی گئی کہ ممبئی سے کوئی شیو سینک اجودھیا پہنچا ہی نہیں۔



# شہادت بابری مسجد: زبردست المیہ

از: ایم۔ جے۔ اکبر☆

کیا گذشتہ چند دن ہندوستان کے تاریخ کی سب سے بُرے دن رہے ہیں یہ ہمارے زمانے کا پہلا بحران نہیں ہے لیکن ہر چیلنج کے بعد ہم اپنے بارے میں کوئی نہ کوئی ایسی حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جس نے ہمیں زندہ اور متحرک رکھا ہے۔ 1962ء میں حب الوطنی کی شدید گہرائیوں نے ہمیں بچالیا۔ 1965ء میں ہماری فوجوں نے بے جگری اور پنجاب کے عوام کی بہادری نے کم وبیش ہاری ہوئی جنگ کو فتح میں بدل دیا۔ 1971ء میں ہمیں یہ سبق ملا کہ اگر ہندوستانی صرف ہندوستانی رہنے کی کوشش کریں تو ہم کتنا کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایمرجنسی میں بھی یہ ثابت ہوگیا کہ ہندوستانی جمہوریت اصلی اور مضبوط لوہے کی بنی ہوئی ہے۔ لیکن ہم 7/دسمبر 1992ء سے شروع ہونے والے ہفتے کے بارے میں اپنی ہڈیوں تک میں اُتر جانے والے تشدد، اپنے لیڈروں کے قانونی حیلے۔ chicanery، انتہا پسندوں کے وحشیانہ رویے اور بیچارگی والی صورت حال کے علاوہ ہمیں اور کیا یاد رہ سکتا ہے۔ ہمارے معزز لیڈران کرام ایک طرف اگر اپنے دیوان خانوں میں جمہوریت کا سودا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تو دوسری طرف وہ ٹیلیویژن پر جمہوریت کا دفاع نہایت ہی اچھے انداز میں کرتے ہیں۔ دھوکہ دہی ان کے لئے کوئی تکلیف دہ بات ہونے کے بجائے کھال بچانے کا بہانہ ہو جاتی ہے۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ جن لوگوں کے دلوں میں صرف تخریب کا جذبہ ہو ان پر بھروسہ اور اعتماد ہی کیوں کیا گیا۔

جھونپڑ پٹی والے علاقے یکے بعد دیگرے جلتے رہتے ہیں، کونے کھدرے میں عورتوں کے ساتھ زنا کیا جاتا ہے، بچے جل کر خاک ہو جاتے ہیں لیکن دوردرشن کے پردے پر حالات میں بہرحال سدھار ہوتا رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ اب پورا ملک دوردرشن کے بجائے بی۔ بی۔ سی۔ کو دیکھنا اور سننا پسند کرتا ہے۔

جب بابری مسجد کا ڈھانچہ (اب مسجد کو ڈھانچہ کہنا عام فیشن ہو گیا ہے) گرایا جارہا تھا تو مرکز پر انجماد کی کیفیت کیوں طاری ہو گئی تھی۔ جب ایل۔ کے۔ اڈوانی کو گرفتار کرلیا جانا چاہئے تھا اس وقت

انہیں مکمل آزادی کیوں دی گئی۔ اور جب انہیں ملک کے زخموں کو دیکھنے کے لئے تنہا چھوڑ دینا چاہئے تھا اس وقت انہیں گرفتار کیوں کیا گیا۔ ملک کے وزیر داخلہ نے آج تک یہ کیوں نہیں بتایا کہ نازک صورت حال سے نمٹنے کے لئے انہوں نے کون سا منصوبہ تیار کیا تھا، ہر شخص یہ کیوں بھول گیا ہے کہ جمہوریت میں عوام نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے جس کے سامنے حکومت کو جواب دہ ہونا پڑتا ہے شاید اہم ترین سوال یہ ہے کہ ملک کے وزیر اعظم اپنی پارٹی اور عوام سے ایسے وعدے ہی کیوں کرتے ہیں جنہیں پورا کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان کے اندر بابری مسجد کو بالکل اُسی جگہ پھر سے تعمیر کرنے کی صلاحیت ہے جہاں وہ 6/دسمبر تک موجود تھی، سوال یہ ہے کہ کیا وہ واقعی ایسا کریں گے۔ یہ سوال اس لئے اہم ہے کہ ان کی براہِ راست نگرانی میں اجودھیا میں عارضی طور سے رام مندر بنایا جا چکا ہے اور حفاظتی دستوں نے وہاں پوجا پاٹ بھی شروع کر دی ہے۔ جب آپ اپنے وعدے کو پورا نہیں کر سکتے تو پھر وعدہ ہی کیوں کرتے ہیں؟ مزید یہ کہ آپ سوچے سمجھے بغیر کسی سے کوئی وعدہ ہی کیوں کرتے ہیں۔ یہاں میں یہ وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرے پاس اڈوانی سے پوچھنے کے لئے کوئی سوال نہیں ہے۔ وہ اپنے ذہن سے اچھی طرح واقف ہیں اور میں بھی اس ذہنیت کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ وہ دور ختم ہو چکا ہے جب اڈوانی بقول خود ''جعلی جمہوریت'' سے چھیڑ چھاڑ والی دلچسپی رکھتے تھے۔ شیو سینا کے کئی اراکین اسمبلی کے انتخاب کو ''فرقہ وارانہ بنیادوں'' اور منافرت پھیلانے کی وجہ سے ہائی کورٹ رد کر چکا ہے۔ لیکن حکومت کی نظروں میں یہ پارٹی فرقہ پرست نہیں ہے۔ بال ٹھاکرے کی حمایت میں ایک بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ جو کچھ محسوس کرتے ہیں برملا کہہ دیتے ہیں۔

لال کرشن اڈوانی اور کلیان سنگھ وغیرہ نے مسجد کے انہدام کے بعد 7/دسمبر کو اظہارِ افسوس تو کیا لیکن ان کے نزدیک یہ سب کچھ ''عوامی جذبات کی شدت'' کا نتیجہ تھا۔ بی۔ جے۔ پی۔ نے اس سلسلے میں کوئی سرکاری بیان جاری نہیں کیا۔ چونکہ جذبات کو بھڑکانے میں انہوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا اس لئے ظاہر ہے کہ وہ نہ تو خود اپنی کمزوریوں کو پرکھنے کے قابل ہیں اور نہ ہی ان کی باتیں قابلِ یقین ہو سکتی ہیں۔ ٹھاکرے نے مسجد کے انہدام کے بعد کسی جھجھک کے بغیر یہ اعلان کر دیا کہ وہ خود کو ''دنیا کا مسرور ترین آدمی سمجھتے ہیں''۔ ٹھاکرے نے مسجد کے انہدام کا سارے کا سارا کریڈٹ خود لینے کے بجائے کچھ حصہ بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد کے لئے بھی چھوڑ دیا۔

حقیقی المیہ یہ ہے کہ کانگریس خود اپنے ہی کرتوتوں کے جال میں پھنس چکی ہے۔ لیکن اس کے تتر بتر ہو جانے سے صرف بھارتیہ جنتا پارٹی کو فائدہ پہنچے گا۔ شری نرسمہا راؤ نے بابری مسجد کی تعمیر کا اعلان یہی سوچ کر کیا ہے کہ ان کی پارٹی کے ممبران پارلیمنٹ ان کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں۔ کانگریسی مسلم وزارء جو اپنا منہ کھولے اور اپنی کرسیاں چھوڑے بغیر اپنی کھال کو بچانے کی فکر میں بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ میں نرسمہا راؤ سے زیادہ سیکولر وزیر اعظم کوئی اور نہیں ہوا۔ وہ اجودھیا میں بیک وقت ایک عالی شان رام مندر بھی بنوانا چاہتے ہیں اور اس کے قریب ہی مسجد کی ازسرِ نو تعمیر بھی ہوگی، مزید یہ کہ دونوں عمارتوں کی تعمیر کا کام جلدی شروع ہونے والا ہے۔ 10/دسمبر کو بالکل یہی بات خود نرسمہا راؤ نے ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر دلیپ پڈ گاؤنکر سے کہی۔

جب ان سے پوچھا گیا کہ آخر ان کے پروگرام کی نوعیت کیا ہے تو وزیر اعظم نے فرمایا کہ ''پہلے تو ہمیں ملک کے حالات کو نارمل بنانا ہے۔ صورت حال کے مکمل طور سے نارمل ہو جانے کے بعد ہی ہم اپنے وعدوں کو عملی جامہ پہنانے کی بات سوچ سکیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کام ہو کر رہے گا''۔ ان کا یقین دراصل اب مشروط ہو گیا ہے۔ چونکہ حالات کے نارمل ہونے کا کوئی طے شدہ پیمانہ نہیں ہے اس لئے ہمیں انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی، والی صورت حال سے دوچار ہونے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس درمیانی عرصے میں حقیقی فائدہ کسے پہنچے گا۔ آپ یقین کیجئے کہ کم از کم کانگریس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ لوگ کانگریس سے بدظن ہو گئے ہیں۔ ایک طرف تو وہ مسجد کی تعمیر کا وعدہ کر رہی ہے اور دوسری طرف اس وعدے کی تکمیل کو ٹالتے رہنے کے بہانے ڈھونڈھ رہی ہے۔ ہماری قیادت عام دنوں میں کوئی فیصلہ کرنے کی اہل نہیں اور بحرانی دور میں بیحد کمزور پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے خلاف مسلمانوں کا ابتدائی غصہ اب فرقہ وارانہ تشدد کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ مہاراشٹر اور گجرات میں جو کچھ ہوا ہے وہ مستقبل میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات کی ایک جھلک ہے۔ اتر پردیش میں بی۔ جے۔ پی۔ سرکار تو نہیں رہی لیکن اس کا ووٹ بینک محفوظ ہے۔

ایک بار پھر سب سے زیادہ نقصان ان ریاستوں میں ہوا ہے جہاں کانگریس کی حکومت ہے۔ 6/دسمبر سے پہلے کانگریس، بی۔ جے۔ پی۔ نامی شیر پر سوار تھی لیکن اب کانگریس پارٹی خود اپنے آپ کو نوچ رہی ہے۔ ایک اور پرانا نظریہ جو ان دنوں سچ ہوتا نظر آ رہا ہے یہ ہے کہ جب حالات ہمارے

قابو سے باہر ہو جاتے ہیں تو پھر آپ جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر آر.ایس.ایس. کے مسلم نعم البدل اسلامک سیوک سنگھ پر بہت پہلے ہی پابندی عائد کر دینی چاہئے تھی، لیکن چونکہ اسے موقع مل گیا اس لئے اس نے پابندی کا جواب یوں دیا کہ خود کو چپ چاپ تحلیل کر کے اس پابندی کو بے معنیٰ بنا دیا۔ ہمیں خوف و ہراس، نفرت، تشدد اور تکالیف کے بدترین لمحوں میں بھی امید کی کچھ کرنیں نظر آئی ہیں۔ یہ حقیقت بے حد خوشگوار ہے کہ 6/دسمبر کو ملک کے جمہوریت پسندوں نے اخبارات کے ذریعہ اپنی بالادستی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان عناصر نے دکھا دیا کہ وہ آج بھی مشترکہ قومیت کی حمایت اور فرقہ واریت کے خلاف لڑنے کی سکت رکھتے ہیں۔ جیوتی باسو اور لالو پرشاد یادو نے جس مضبوط قوت ارادی کے ساتھ فسادات پر قابو پانے کی کوشش کی اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ ان لوگوں نے نفرت کا جواب نفرت سے دینے یا سیاسی داؤ پیچ سے کام لینے کے بجائے فسادات پر قابو پانے کی مخلصانہ انسانی کوششیں کیں۔

شری باسو اور شری یادو دونوں ایک سے زائد بار ثابت کر چکے ہیں کہ وہ حقیقی معنیٰ میں ایسے ہندوستانی ہیں جن کی اس وقت ملک کو بڑی شدید ضرورت ہے۔ نئی دہلی کا جو حال ہے اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ سارے وزراء کی خاموشی چیخ چیخ کر یہ کہہ رہی ہے کہ ان کا حقیقی مقصد صرف کرسی کے ساتھ چپکے رہنا ہے کم از کم ایک کانگریسی نے یہ ثابت کر دیا کہ اسے واقعی لیڈر ہونے کا حق حاصل ہے۔ ہمارا اشارہ گجرات کے احمد پٹیل کی طرف ہے وہ تنہا کانگریسی ہیں جو اس بحرانی دور میں خاموش نہیں رہے۔ انہوں نے ملک بھر میں مرنے اور زخمی ہونے والے شہریوں کی طرف سے وہ سب کچھ کہا جو کہہ سکتے تھے۔

آخری سوال! گذشتہ چند دنوں میں جو حالات رہے ہیں ان کا اثر ملک کے مستقبل پر کیا ہوگا؟ سردست تو ہم اس سلسلے میں تخیل سے ہی کام لے سکتے ہیں۔ اس وقت ایک دہرے سر والا شیطان گھوم گھوم کر ملک کے امن و امان کو روند رہا ہے۔ یہ ایک ایسا دور ہے جب ہمیں کوئی واضح راستہ سجھائی نہیں دے رہا ہے تو ہم میں سے بیشتر لوگ اپنے اپنے خول میں سمٹ کر خاموش بیٹھ جانے پر مجبور ہیں۔

مشہور انگریزی شاعر کیٹس (Keats) نے لکھا تھا: ''میرا دل درد سے بے چین ہے اور میرے اعصاب کچھ اس طرح سن پڑ گئے ہیں گویا میں نے زہر کا پیالہ پی لیا ہو......'' لیکن ناامیدی کبھی بھی

نامعقول حالات کا معقول جواب نہیں بن سکتی۔ اپنے خول میں سمٹ کر بیٹھے رہنا یا تنہائی پسند ہو جانا مسئلے کا حل نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ وقت ہے جب روشنی کے چھوٹے چھوٹے نقطوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ضم ہوجانا چاہیئے۔ تباہی و تاریکی کے ملبے سے امید کی چھوٹی سی کرن کا حصول بھی سردست بہت کافی ثابت ہوگا۔

☆ معروف صحافی،مدیر روزنامہ "ایشین ایج" اور ممبر پارلیمنٹ



# صرف اقلیتوں کا ہی قتل عام کیوں؟

روزنامہ ''انڈی پینڈنٹ'' کا اداریہ

تین دنوں تک بے تحاشہ تشدد، سات سو ہلاکتیں، ڈھائی ہزار زخمی اور بے شمار بے گھر، یہ ہے حالت ہمارے ملک کی۔ کوئی بھی اس بارے میں کیا کر رہا تھا؟ بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کی ہم نوا پارٹیوں کے لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ فرقہ پرست پارٹیوں پر پابندی کا اعلان کیا جا چکا ہے اور بابری مسجد کی جگہ کو مرکزی دستوں نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ لیکن ان میں سے کسی کے بھی باعث تشدد کی روک تھام نہیں ہوئی۔

یہ اس لئے کہ یہ سب کارروائیاں بعد میں کی گئیں۔ اگر یہی سب کچھ سنیچر کے روز (5 / دسمبر 1992ء) ہوا ہوتا تب ہمارا ملک اس کربنا کی سے بچ جاتا۔ اس مرحلہ پر یہ سارے اقدامات معدودے چند اور تاخیر سے ہوتے ہیں۔ اگر یہ بروقت اُٹھائے گئے ہوتے تب ہم اپنی حکومت کی اس تصویر کو دیکھنے سے بچ جاتے جس میں وہ مجبور و بے کس کھڑی ہوئی نظر آتی ہے اور بے لگام ہجوم کو قانون پر برتری حاصل رہی۔ ماضی میں جس طرح کانگریس سرکار نے معمولی وجوہات کی بنا پر ریاستی حکومتوں کو برطرف کیا تھا اس کے پیش نظر کلیان سنگھ حکومت کو برطرف کرنے کے بارے میں قانونی موشگافیوں کا سہارا لینے سے بات نہیں بنتی۔ کیا یہ حقیقت کہ مرکز کے نیم فوجی دستے کسی قسم کی کارروائی کرنے سے پہلے حکم ملنے کا انتظار کرتے رہے اور یہ حقیقت کہ حکم جاری ہی نہیں کیا گیا، عوام کو یہ باور کرانے کے لئے کافی نہیں ہے کہ مرکز نے اجودھیا کے معاملہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے ساتھ سازش کر رکھی تھی؟

یہ حیرت کی بات ہے کہ صرف غصہ آ کر رہ گیا؟

لیکن یہ غصہ جس کا اظہار بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہوا ہے ایک یادگار کے انہدام پر محض اظہار غم و غصہ نہیں ہے۔ یہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ یہ ایک محبوس ناراضگی ہے جو برسہا برس اکٹھا ہوتی رہی اور اب کسی بھی سیاستداں یا فرقہ پرست لیڈروں کے اکسائے بغیر پھوٹ پڑی۔

اگر ہمیں طویل مدتی حل تلاش کرنا ہے تب ہمیں خود سے ہی یہ سوال کرنا ہوگا کہ آخر اقلیتیں ایسا کیوں محسوس کرتی ہیں۔ ایک وجہ تو ظاہر ہی ہے۔ گذشتہ بیس برسوں کے دوران بڑے پیمانہ پر اگر کسی کی اموات ہوئی ہیں تو وہ اقلیتوں کی ہوئی ہیں۔ 1984ء میں دہلی کے سکھ مخالف فسادات کے دوران

اوراب۔ اول الذکر کے وقت تو سرکاری مشنری ساکت تھی جبکہ غنڈہ عناصر جن کا تعلق اندرا کانگریس سے تھا اور وہ جن کا تعلق خود سے ہی تھا۔ منصوبہ بند طریقے سے سکھوں کو چن چن کر نکالتے رہے اور انہیں قتل کرتے رہے۔ چند ایک تو انتہائی بے رحمانہ انتقامی جذبے کے ساتھ۔ گذشتہ تین دنوں کے دوران جو اموات ہوئیں تمام کی تمام مسلمانوں کی تھیں۔ جن میں تقریباً سب کے سب ہی پولس فائرنگ کا شکار ہوئے تھے اور کچھ تو محض راستے سے گزرتے وقت گولی کا شکار بنے۔ فساد کے جواب میں خاص طور سے شہر میں جہاں قریباً ڈیڑھ سو افراد ہلاک ہوئے، پولس کارروائی تیز رفتار تھی۔ فساد پر قابو پانے کے لئے لاٹھی چارج، پانی کی دھار یا ربڑ کی گولیوں کا کوئی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس پولس لبلبی نواز نظر آئی اور جوڈرانے کے لئے نہیں بلکہ جان سے مارنے کے لئے گولیاں چلاتی رہی۔

ان سب سے اقلیتیں کیا سمجھیں گی؟ اس اخبار نے کل اور آج جن واقعات کا تذکرہ کیا ہے اور جن کو وہ خود دیکھ چکے ہیں، مسلمان کیا نتیجہ اخذ کریں گے؟ خاص طور سے جب وہ اجودھیا میں کارسیوکوں کے ساتھ کئے گئے پولس کے نرم سلوک کا موازنہ اپنے ساتھ کئے جارہے سلوک سے کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی حکومت مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف سلوک کرتی ہے۔ کسی کے لئے نرم گوشہ اور کسی کے لئے فولادی ہاتھ۔

لال کرشن اڈوانی جب ہم پر نقلی سیکولرزم کے لئے جو الزام لگاتے ہیں وہ بالکل صحیح ہے لیکن اس صورت میں نہیں جس میں وہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی مملکت نے سیکولرزم کا پرچار کیا ہے، اس کی قسم کھائی ہے اور اسے دستور کی زینت بنایا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کیا ہے۔ اس کا اگر مشاہدہ کرنا ہے تو انجینرنگ اور میڈیکل کالجوں جیسے ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں یا انتظامی سروسوں میں مسلمانوں کے تناسب پر نظر دوڑا لیجئے۔ یہ اعداد وشمار خود ہی بول اٹھیں گے کہ انتظامیہ کی انتہائی نچلی سطح کے اعداد وشمار بھی کوئی خاص نہیں ہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ہمیں ایسے افراد زیادہ نظر آتے جو مذہب سے مسلمان ہیں لیکن پیشہ سے پولس والے ہوتے۔

ہمارے نقلی سیکولرزم کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ مسٹر اڈوانی اینڈ کمپنی جیسے لوگ ہمارے درمیان پائے جاتے ہیں۔ اپنے دستور کے دیباچہ کے لحاظ سے تو ہم ایک سیکولر ریاست میں ہیں، دستور کی اسی بنیاد پر انتخابی قوانین وضع کئے گئے ہیں۔ جن میں مذہبی نشانات اور نہ ہی اپیلوں کی مخالفت ہے

مگر اس کے باوجود شری اڈوانی کو رتھ یاترا نکالنے دیا گیا جس کا مقصد ہی ایک مذہبی یادگار قائم کرنا تھا۔ بی. جے. پی. کے انتخابی منشور میں بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کا وعدہ شامل ہے۔ بی. جے. پی. کے انتخابی منشور میں، وشو ہندو پریشد کی سادھوی رتمبھرا مذہب کے نام پر اپیل کیا کرتی تھی۔

ہمارے نقلی سیکولرزم کی مثال پیش کرنے کے لئے ایسی اور کئی مثالیں ہیں۔ لیکن اتنا ہی کافی ہے۔ اگر ہم واقعی خود کو صحیح معنوں میں سیکولر ملک بنانا چاہتے ہیں تب ہمیں خود سوال کرنا ہوگا اور خود ہی اس کا جواب ڈھونڈ نا ہوگا۔ یہ طویل مدتی حل ہو سکتے ہیں لیکن اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں ہے کہ ہم اپنی اقلیتوں میں تحفظ کا ایسا احساس پیدا کریں کہ وہ ایک جدید ہندوستان اور ترقی پذیر ملک میں برابر کے حصہ دار بن سکیں۔

بہرحال! فوری طور پر تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈروں اور مذہبی جماعتوں کے رہنماؤں کی طرف سے امن کی اپیل اور تشدد کی روک تھام کی ہے۔ مہاراشٹر جیسی ریاست میں جہاں پولس حد سے زیادہ تجاوز کر چکی ہے اس بات کی یقین دہانی بھی ضروری ہے کہ فساد کی صورت حال سے نپٹنے کے لئے سریع الحرکت فورس موجود رہے گی۔

آخر میں مرکز کو بھی چاہئے کہ بلا تاخیر اجودھیا کے بارے میں فیصلہ کرے۔ اس اخبار سے ایک انٹریو کے دوران دہلی جامع مسجد کے امام نے حیرت انگیز طور پر وسیع النظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ اجودھیا کے اس علاقہ کو محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دینا چاہئے۔ وہاں نہ مسجد بنائی جائے اور نہ مندر۔ اسی طرح رہنے دیا جائے یا پھر مسجد اور مندر دونوں ہی ساتھ ساتھ بنائے جائیں۔ مندر کے لئے مسلمان اور مسجد کے لئے ہندو کارسیوا کریں۔ کیونکہ ایسی ہی عمارت فرقہ وارانہ خیر سگالی کا آئینہ دار ہوگی۔

بہرحال! جو کچھ بھی کیا جائے فوراً کیا جائے۔ یہ ملک پہلے ہی نرسمہا راؤ کے تذبذب کے باعث کافی کچھ بھگت چکا ہے۔ پہلے 1984ء میں جب وہ وزیر داخلہ تھے، اور اب جب وہ وزیر اعظم ہیں۔ اب ہم مزید تاخیر سہن نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کو تیزی کے ساتھ آگے بڑھنا ہے۔

(استقامت کانپور، شہید بابری مسجد نمبر، جون / 1993ء)

# شہادت بابری مسجد: پہلے سے خبر تھی

از: رشمی سکینہ

انٹیلی جنس بیورو (خفیہ ایجنسی) کی اطلاعات دو نکات پر انتہائی واضح تھیں۔ ایک یہ کہ کارسیوکوں کی اتنی بڑی تعداد کو جمع نہ ہونے دیا جائے جنہیں قابو میں کرنا مشکل ہو جائے اور دوسرے یہ کہ کارسوکوں کا ایک طبقہ مسجد کو مسمار کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہے۔ وزارتِ داخلہ کے ایک افسر کے بموجب یہ منصوبہ کارسیوکوں کے کس گروپ نے بنا رکھا ہے اس کی نشاندہی کرنے میں ہم کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ اطلاعات خفیہ ایجنسی لگ بھگ پندرہ دن پہلے سے ہی وزیر اعظم تک پہنچاتی رہی۔

وزارتِ داخلہ بظاہر یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ آخر حکومت کیا چاہتی ہے جبکہ چوان ان اقدام کے حق میں تھے۔ ایک افسر کے مطابق ''جب وی. پی. سنگھ وزیر اعظم تھے تب ہم ان کے خیالات سے پوری طرح واقف تھے۔ اس لئے ہم انہیں مشورہ بھی دے پاتے تھے۔ لیکن اس بار ہم صرف ان رپورٹوں کو ہی آگے پیش کرتے رہے جو ہمیں مل رہی تھیں۔ کسی نے بھی یہ نہیں پوچھا کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیئے۔'' اس نے کہا کہ 1990ء کے دوران پولیس فائرنگ کا حکم دیئے جانے سے ہی مسجد کا انہدام رک گیا تھا۔

خفیہ اطلاعات سے ظاہر تھا کہ آندھرا پردیش اور مہاراشٹر کے کارسیوک جتھے ''جنگجویانہ'' ہیں۔ 4 اور 5 دسمبر کے روز وزارتِ داخلہ کو یہ اطلاع بھی ملی کہ انہدام کا ریہرسل کیا جارہا ہے۔ پانی کی ٹنکیوں اور طبی امداد کے مراکز کے ٹھکانوں کی نوعیت بھی انہدام کے منصوبہ کی غمازی کر رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود کارسیوکوں کو روکنے کا حکم جاری نہیں کیا گیا۔ ایک افسر کے مطابق ''وزیر اعظم کسی بھی فیصلے سے پس وپیش کر رہے تھے۔ ہنگامی پلان پر قانونی پہلو سے غور کیا گیا اور اسے ناقابل عمل پایا گیا۔ اس کے برعکس بھاجپا کے لیڈروں کی یقین دہانیوں پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا گیا۔

صدر راج نافذ کئے جانے کے بعد بھی کارسیوکوں کو باہر نکالنے کا طریقہ کار وضاحت سے نہیں بتایا گیا۔ حکام کا کہنا تھا کہ نئی دیوار بنائے جانے سے پہلے ہی کارسیوکوں کو وہاں سے باہر نکالا جا

سکتا تھا اگرچہ کارسیوک سلاخوں اور کدالوں سے مسلح تھے لیکن ان کے پاس آتشیں ہتھیار وغیرہ نہیں تھے۔ ان کی قوت صرف ان کی تعداد تھی۔ خبر ملتے ہی کہ تین سو زخمی کارسیوک اسپتال میں ہیں۔ وزارتِ داخلہ نے ان سے پوچھ گچھ کرنے اور انہدام کے پس و پشت لوگوں کا پتہ چلانے کے لئے افسروں کی ایک ٹیم اجودھیا روانہ کی لیکن مرکز نے ان زخمی کارسیوکوں کی گرفتاری کا حکم جاری کرنے میں دیر لگائی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان زخمی کارسیوکوں کو اس کی بھنک ملتے ہی وہ ہسپتالوں سے چل دیے۔ بہر حال بہار کے وزیر اعلیٰ لالو پرساد چالاک ثابت ہوئے۔ انہوں نے لگ بھگ پچاس کارسیوکوں کو جن میں زخمی کارسیوک بھی تھے ٹرین سے اترتے ہی گرفتار کرلیا۔ اس لئے حکام کو امید ہے کہ وہ ان گرفتار شدہ زخمی کارسیوکوں سے پوچھ گچھ کر کے کچھ نہ کچھ معلوم کر ہی لیں گے۔

(استقامت، کانپور، جون 1993)



# مسجد کی شہادت ایک نئے باب کا آغاز

از: مولانا محمد عبدالوحید نوری

(مشیر اعلیٰ ادارہ شرعیہ اہل سنت، مدھیہ پردیش)

اجودھیا میں 6/دسمبر 1992ء کو بابری مسجد اور اس کے علاوہ بہت سی اور مساجد مسمار کی گئیں اس سانحہ سے پوری دنیا کے مسلمانوں کے قلوب مجروح ہوئے ہیں۔ یہ سانحہ عظیم ہے۔ نہایت ہی پرغم، و پُر الم ہے۔ شہادت چاہے مومن کی ہو یا اللہ کے کسی بھی گھر کی، شہادت سے ایک نئے باب کا تاریخ عالم میں آغاز ہوتا ہے۔ ایک عبرت آموز تاریخ مرتب ہوتی ہے اور پاکیزہ انقلاب آتا ہے جو ظلم و جبر سے عدل وانصاف کی عظمت کو بچاتا ہے۔ ظالموں، جابروں کو کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہے۔ مظلوموں کی آہیں اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں خوف و ہراس کے اندھیرے سے نکال کر عدل و انصاف، شرافت و انسانیت کی روشن فضا میں باوقار زندگی عطا کرتا ہے یہ شہادت کا پاکیزہ انقلاب ہی تو تھا جس نے میدانِ بدر و اُحد میں بے سروسامانی کے عالم میں بھی جبر و استبداد کی آندھیوں کو مٹا کر رکھ دیا۔ میدانِ کربلا میں یزیدیت کو ہمیشہ کے لئے فنا کر دیا۔ چنگیز و ہلاکو کے گھروں میں حق وصداقت کی قندیلیں جلا دیں۔

معرکے اور حادثے ہوتے رہے ہیں اور شہادتیں شہیدوں کو گلے لگاتی رہی ہیں لیکن تاریخ گواہ ہے کہ عدل و انصاف، حق وصداقت، شرافت و انسانیت کے قاتل ذلیل و رسوا ہوئے اور ہوتے رہیں گے، مٹے اور فنا ہوتے رہیں گے۔ جبر واستبداد کی لاکھ آندھیاں چلیں مگر حق وصداقت عدل وانصاف کا پرچم بلند ہی رہے گا۔ خالقِ کائنات نے کبھی بھی اپنی مخلوق پر ظلم وستم برداشت کیا ہے اور نہ کرے گا۔ بابری مسجد کی شہادت بھی جہاں ایک نئے باب کا آغاز ہے وہیں ایک پاکیزہ انقلاب قدرت کی آمد بھی ہے۔ طاقت کے بل بوتے پر اللہ کی عبادت گاہوں کی حرمت پامال کرنے والے ومسمار کرنے والے، بے قصور مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگنے والے، جمہوریت کے قاتل منھ چھپاتے پھریں گے۔ مگر کہیں جائے پناہ نہ ملے گی، بابری مسجد کی شہادت ضرور رنگ لائے گی، بے دریغ مسلمانوں کا خون بہایا گیا، لوٹی گئی مسلم عورتوں کی عصمتوں کے خلاف قدرت کا خطرناک و

عبرت ناک انتقام دنیا اپنے ماتھوں کی آنکھوں سے دیکھے گی۔ اس وقت ظالموں کے پاس اپنے ہاتھوں کے ملنے اور ندامت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی قوم مسلم سے بھی کچھ کہنا ہے اگر تمہیں اپنا وقار و اقتدار محبوب و عزیز ہے، اپنی عزت و عصمت پیاری ہے تو دنیا کی قوتوں، طاقتوں کے مقابلے میں خدا کی بارگاہ میں تیرا ایک سجدہ بھاری ہے۔ جھوٹے اقتدار کی جھوٹی کرسیوں پر بیٹھنے والوں سے کہنے کے لئے سڑکوں پر احتجاج نہ کرو، خدا کے گھر پہنچ کر خدا سے فریاد کرو، اپنی دکھ بھری داستانیں، گنبد خضرا کے مکیں کو سناؤ، کانوں کے دروازے بند مت کرو۔ یاد رکھو عظمت، وحشت، وقار و اقتدار، خدا ورسول کے فرمان پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں　　یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح وقلم تیرے ہیں

آئندہ کے حادثات، تباہی و بربادی کا انتظار مت کرو، حالات وخطرات درپیش ہیں، تقاضا ہے کہ ہم سوچیں کہ کتنے فرائض ہم ترک کر رہے ہیں۔ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی سنتیں ہم پامال کر رہے ہیں۔ سر کو خدا کی بارگاہ میں جھکا کر دل میں مصطفےٰ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کا چراغ جلاؤ پھر دیکھو مٹنے والے مٹ جائیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ!



# مسلمان کہاں جائیں؟

از: جیوتی پنوانی (معروف صحافی)

میں نے ماضی میں بابری مسجد کے تینوں گنبدوں کو تصاویر میں دیکھا ہے، اور جب بھی میں نے بابری مسجد کو دیکھا تو میرے دل میں ازمنہ قدیم کی اس یادگار کو دیکھ کر احترام کے جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ میں نے جب بھی اسے دیکھا ہے تو میرے دل میں یہی خیال پیدا ہوا کہ ہندو راشٹر کا نعرہ لگانے والے اس عظمت کے نشان کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے ہیں۔ لیکن اب بابری مسجد کے ان گنبدوں کو اس کے در و دیوار کو صفحۂ ہستی سے ملا دیا گیا ہے۔ اور ان کارسیوکوں میں سے ایک کارسیوک کے اعلان کو بھی میں نے سنا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''اب بنے گا ہندو راشٹر''۔

یہ سب تماشا حکومت کی مرضی و منشاء کے تحت ہوا ہے اور سپریم کورٹ اپنے ملکی جاہ و جلال کے بعد بھی ایک مسجد کو بچا نہ سکا۔ جبکہ اس بات کا اشارہ اور نوٹس مل چکا تھا کہ بابری مسجد پر حملہ کیا جائے گا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ بابری مسجد کے سانحہ کی خبر سن کر ہندوؤں کی بڑی اکثریت ہکا بکا رہ گئی کہ آخر یہ کیا ہوا؟ کیوں کیا گیا؟ ابھی 8 سال قبل سکھوں کے سنہری گرودوارہ کو حکومت نے نشانہ بنایا تھا اور اب مسلسل 5 گھنٹوں تک بابری مسجد کا انہدام ہوتا رہا اور حکومت کھڑی تماشہ دیکھتی رہی۔ ضلع افسران مزے سے چائے کی چسکیاں لیتے رہے اور پولیس نے بابری مسجد کامپلیکس سے راہِ فرار اختیار کی۔ بابری مسجد کے دو گنبد تو ایک ساتھ گرے اور انہیں گرانے میں دو گھنٹے لگے اور آخری گنبد کو منہدم کرنے میں دو گھنٹے لگے۔ اس وقت بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈران کیا کر رہے تھے؟ اگر اڈوانی نے 6 ردسمبر کو وہاں جا کر اشتعال نہ پھیلاتے تو یہ سانحہ پیش نہیں آتا۔

مرکزی حکومت، مقامی مجسٹریٹ کے سامنے سرخم کئے کھڑی تھی جس کے نیم فوجی دستوں کو بابری مسجد کامپلیکس تک آنے کی اجازت نہیں دی گئی تھی، بابری مسجد کے انہدام کے 24 گھنٹوں کے بعد بھی مرکزی حکومت نے اجودھیا میں کوئی قدم اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے ان دہشت پسند کارسیوکوں کو من مانی کرنے کا موقعہ مل گیا۔ یا یوں کہنے دیجئے کہ ان کو موقعہ فراہم کیا گیا۔ اگر مرکزی حکومت بابری مسجد کو بچانے کی کوشش کرتی، قانون کی بالادستی کو قائم رکھتی اور

کارسیوکوں پر فائرنگ کر دیتی تو بابری مسجد کا سانحہ رونما ہونے ہی نہ پاتا۔

بابری مسجد کے انہدام کے بعد جب دوسرے دن مرکزی حکومت کے نیم فوجی دستوں نے وہاں کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد فوری طور پر کامپلیکس کو صاف کر دیتی تو اسے بھی حکومت کا مثبت اقدام سمجھا جاتا۔ پھر کارسیوکوں کو وہاں سے ہٹانے کے آپریشن میں بھی ایک بھی کارسیوک کو ہاتھ تک نہ لگایا گیا۔

بابری مسجد سانحہ کے بعد مسلمانوں کا اضطراب اور غصہ فطری بات تھی لیکن اگر انہوں نے اپنے لیڈروں کا کہنا مانا ہوتا تو پولیس کی گولیوں کا شکار نہ ہوتے۔ بابری مسجد کے انہدام کے 24 گھنٹوں بعد 220 مسلمانوں کی جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ ملک بھر میں ممبئی مسلم ہلاکتوں میں سرفہرست ہے۔ جہاں 41 مسلمانوں کو پولیس نے شہید کر دیا تھا۔ پولیس کی ان پر فائرنگ اس بات کا دوسرا ثبوت ہے کہ ہندو راشٹر آ چکا ہے۔

آپ خود ہی دیکھئے جب اجودھیا میں کارسیوا سے دو روز قبل ہندو تشدد پر اُتر آئے تھے یا 1984ء میں ہندوؤں نے سکھوں کے قتل عام کا راستہ اپنایا تھا۔ اس وقت فوج نے خود کو پرے رکھا تھا۔ لیکن جب مسلمان، بابری مسجد سانحہ پر یا کسی موقعہ پر ردعمل ظاہر کرتا ہے تو فوج گولیاں برساتی ہوئی مسلمانوں کے سامنے آ جاتی ہے۔

اجودھیا میں بابری مسجد کی آخری اینٹ گرنے کے ساتھ ہی اجودھیا میں مسلمانوں کے گھروں کو گرایا جانے لگا، ان کے گھروں کو آگ لگائی جانے لگی۔

آج مسلمان کہاں جائیں؟ کس کی طرف دیکھیں؟ یہ سوال دانشوروں کے ذہنوں میں آ رہا ہے۔ جب سنجے گاندھی سے مسلمان بدظن ہوئے تھے تو انہوں نے اپنا رخ جنتا پارٹی کی طرف کر لیا تھا۔ علی گڑھ، جمشید پور میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد مسلمانوں نے اندرا گاندھی کی طرف مدد کے لئے اپنا رخ کیا تھا۔ اور اجودھیا میں ان کا قتل عام ہوا تو انہوں نے وی۔ پی۔ سنگھ کی جانب رخ کیا اور جب انہیں خود بھی ہندوؤں کے ہاتھوں محفوظ نہیں پایا تب وہ دوبارہ کانگریس کی طرف جھکے مگر اب ایک بار پھر دھوکہ کھانے پر آپ اس بات کے لئے کسے موردِ الزام قرار دے سکتے ہیں۔ جب یو۔ پی۔ کا مسلمان پاؤ والا تک یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ "ایران اور پاکستان بمباری کریں گے، وہ ہمارے ساتھ ہیں"۔ آپ اسے کس طرح سمجھائیں گے کہ اسے یہاں ہی رہنا ہے۔ □ □

# کرامتی بابری مسجد

## جس نے تخریبی نظر ڈالی اُس کا نام و نشان مٹ گیا

از: محمود حسین

اجودھیا میں بابری مسجد میں مورتی رکھ کر اسے مندر بنانے اور پھر 6/دسمبر 1992ء کو مسجد کی تاریخی عمارت کو گرانے کا جو مہاپاپ ہوا ہے اس کی سزا پورا ملک بھگت رہا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ ایسا ہے جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ اگر کوئی بہت بڑا زلزلہ آ گیا ہوتا تب بھی شاید اتنا لرزہ نہ پیدا ہوتا۔ بابری مسجد کا قضیہ ایک پھوڑا بن کر اتنے برسوں سے قوم کے جسم میں پک رہا ہے۔ 6/دسمبر کو مسجد کے گرا دیئے جانے پر جو دھماکہ ہوا اس میں وہ پھوٹ گیا۔ اس سے جو لہو اور پیپ نکل کر بہا تو اس میں ایسی بدبو ہے کہ دنیا والے اپنی ناک پر رومال رکھ کر غصہ اور حقارت بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں کہ اس زمانے میں بھی ایسی حرکتیں کسی مہذب ملک میں ہو سکتی ہے؟

بابری مسجد گرائے جانے پر مسلمانوں کے صبر و ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ یہ دوسرا سانحہ ہے جس میں جتنا ملال اور ماتم کیا جائے کم ہے۔ ایک دن (7/دسمبر) میں ملک بھر میں کتنا بھاری جانی و مالی نقصان ہو گیا۔

مسجد کے معاملے میں ہر ظلم و ستم اور زیادتی و ناانصافی پر مسلمانوں نے انتہائی صبر و ضبط کا مظاہرہ کر کے تمام سیکولر اور انصاف پسند لوگوں کا دل جیت لیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلمانوں کو اور بابری مسجد کو وہ حمایت اور تائید حاصل نہ ہوتی جو ادھر کچھ عرصے سے مل رہی ہے۔ لیکن اگر عالم اضطراب و ہیجان میں مسلمانوں کا ردِ عمل غیر اسلامی ہوگا تو وہ اللہ کی نصرت اور بندگانِ خدا کی حمایت سے محروم ہو جائیں گے۔ واقعہ یقیناً اتنا سخت و سنگین ہے کہ انسان کیا، چٹان بھی ٹوٹ جائے۔ مسلمانوں کے صبر و ضبط کا بندھن ٹوٹا۔ مگر انہیں بہر حال اس کڑی آزمائش میں صابر و شاکر اور راضی برضائے مولیٰ رہنا ہوگا۔ اسی میں مسلمانوں کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔ اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ

مسلمان کیوں اتنے زیادہ غم زدہ اور ہراساں ہوتے ہیں؟ پونے پانچ سو سال پرانی مسجد کا

ڈھانچہ ڈھایا گیا ہے (بہت برا ہوا) مگر بابری مسجد اپنی جگہ باقی ہے، جو اس کی زمین ہے۔ بابری مسجد بھی عجیب کراماتی مسجد ہے۔ اس کی تعمیر جو شہنشاہ بابر کے نام پر میر باقی نے 1526 میں کی تھی، وہ کون سی تاثیر پوشیدہ ہے کہ جس کسی نے بابری مسجد کو ہاتھ لگایا تو اس کا نام ونشان مٹ گیا۔

راجیو گاندھی کی حکومت میں یو. پی. کے آدم خور وزیر اعلیٰ ویر بہادر سنگھ نے سازش کر کے بابری مسجد کا تالا کھلوا دیا تو پیرس جا کر مرا۔ راجیو گاندھی نے نومبر 1989ء میں مسجد کی زمین (گنج شہیداں) پر شلا نیاس کرایا تو حکومت الٹ گئی اور اس کا آخری حشر عبرتناک ہوا اور یو. پی. کے وزیر اعلیٰ این. ڈی. تیواری اور مرکزی وزیر داخلہ بوٹا سنگھ کا بھی پتا کٹ گیا۔

وی. پی. سنگھ نے اڈوانی کا رام رتھ 1990ء میں نکالنے کی اجازت دی جو بابری مسجد پر دھاوا بولنے جارہا تھا تو وی. پی. سنگھ کی حکومت الٹ گئی اور اب کلیان سنگھ نے بابری مسجد کو گرا دیا تو اس کی حکومت بھی ایک گھنٹے میں ختم ہوئی اور وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے مسجد کو بچانے میں کوتاہی کی تو ان کے تخت کی چولیں بھی ہلنے لگیں۔ بابری مسجد شہید ہو کر وہ کام کر گئی جو بڑی بڑی حکومتوں اور عدالتوں سے نہ ہو سکا۔

بابری مسجد کے مقدمے کا فیصلہ ہو گیا۔ یہ فیصلہ ہندوستانی قوم نے کیا ہے۔ قوم نے بابری مسجد کو مسجد مان لیا اور اسے گرانے والوں کو راکھشش اور دیش دشمن قرار دے کر ان کو سزا دینے کے مطالبہ میں اتفاق رائے ہو گیا ہے۔ فرقہ پرست جماعتوں کے خلاف قانونی کارروائی کر کے ان پر پابندی لگا دی ہے اور فرقہ پرست گرو گھنٹالوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا ہے ان پر مقدمہ چلے گا۔ مسجد از سر نو بنانے کا حکومت نے وعدہ کیا ہے۔ رام مندر بھی بنے گا اور سچی شان اور مریادا سے بنے گا۔ یہ واقعی رام کا مندر ہوگا۔ ظلم کا مندر نہیں ہوگا۔ کورٹ سے اکوائر زمین کا فیصلہ ہونے کے بعد رام مندر کی تعمیر کے لئے جگہ کا انتخاب کر لیا جائے گا لیکن اسی کے ساتھ سب سے اہم کام یہ کرنا ہے کہ بابری مسجد سے مورتی فوراً ہٹالی جائے اور اسے کسی مندر میں استھاپت کر دیا جائے۔ یہ کام بلاتاخیر ہونا چاہئے۔

حکومت نے اپنی روایتی کوتاہی، بے عملی اور دیر لگانے کی عادت سے اگر کام لیا تو یہ سنہرا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ابھی لوہا گرم ہے۔ آخری ضرب لگانے کا یہی وقت ہے۔ کسی کی ہمت نہیں ہے کہ اب مسجد کو مندر کہے۔ اب یہ متنازعہ مقام نہیں رہا۔ بابری مسجد تھی، ہے اور رہے گی، مسجد میں

بتوں کا کیا کام؟

رام للا کو کسی مندر میں رکھا جائے۔ رام مندر بننے کے بعد تو اس میں شری رام، سیتا جی، اور لکشمن کی قد آدم مورتیاں رکھ جائیں گی۔ شوق سے شاندار مندر بنائیں، مگر مسجد فوراً خالی کر کے مسلمانوں کو واگزار کر دیں۔ اگر اب بھی مسجد سے مورتی نہ ہٹائی گئی تو پھر یہ سب نالہ دسیون بیکار اور فریب ہے۔ مورتی رکھ کر بابری مسجد کے ڈھانچے کی از سرِ نو تعمیر بھی ہوگئی تو مسلمانوں کو کیا، جب کہ وہ مسجد میں نہ قدم رکھ سکتے ہیں اور نہ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اگر وزیر اعظم نرسمہاراؤ اپنے قول وعمل میں مخلص ہیں اور اپنی ہمالیائی غلطی کی تلافی کرنا چاہتے ہیں تو بلا تاخیر مسجد سے مورتیوں کو ہٹائیں ورنہ یہ ساری بکواس بند کی جائے۔ کوئی کہاں تک فریب پیہم کھائے اور جھوٹے وعدوں کے سہارے اپنی زندگی خراب کرے۔

مسلمانوں کے صبر وضبط کے بہت امتحان ہو چکے اور کب تک آزمائش میں ڈالیں گے۔ لگی لپٹی او دو رنگی چھوڑ کر اخلاص سے کام کریں اور قوم کو اس سنکٹ سے نکالیں۔ یہ موقع گنوا دیا تو پھر یہ جھنجھٹ لگا رہے گا اور آگے بھی وبال بنے گا۔

حکومت ہند نے مسجد کو نہ بچا کر جو قصور کیا اسے مسلمان صرف اسی صورت میں معاف کر سکتے ہیں جب معاملہ صاف اور یکسو کر دیا جائے۔ اب متنازعہ کچھ نہیں ہے۔ مسجد جب سب مان رہے ہیں تو مسجد سے مورتی ہٹاؤ ورنہ حکومت سے ہٹو۔ مسلمان صبر وتحمل کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہیں کہ ان کیلئے یہی حکم ربانی ہے۔ لیکن اپنے حق کے لئے جدوجہد سے بھی دست بردار نہ ہوں۔

اجودھیا پر سیکوریٹی فورسیز کا قبضہ ہو گیا ہے۔ منہدم مسجد بھی ان کے قبضے میں ہے۔ حکومت فوراً آرڈی نینس جاری کر کے مورتی ہٹائے اور تب مسجد بنا کر نماز کے لئے مسلمانوں کو دی جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو مسلمانوں کا ٹوٹا ہوا اعتماد بحال نہ ہوگا۔ یہ اعتماد تیزی سے بحال ہو سکتا ہے اگر اخلاص اور ایمانداری سے کام لیا جائے۔ سارے جھگڑے کی بنیاد مسجد میں چوری سے مورتی رکھنا تھا۔ پھر اس پر تالہ پڑا۔ پھر تالا کھلا۔ پھر مسجد گرا دی گئی۔ تلافی مافات کے لئے کرنا یہ ہوگا کہ مورتی ہٹا کر اور مسجد دوبارہ بنا کر فوراً مسلمانوں کو واپس دی جائے۔ اس قومی بحران سے نکلنے کے واحد راستہ یہی ہے۔

(ماہنامہ، استقامت، کانپور جون 1993ء شہادت بابری مسجد نمبر)

# انہدام بابری مسجد: ایک ایسا زخم جو ناسور بن چکا ہے

از: شمیم طارق، ممبئی (صحافی ادیب، دانشور)

اجودھیا میں جو شرمناک دہشت گردی ہوئی اس کے بارے میں یہی کہنا کافی ہوگا کہ مسجد کی منتقلی کا مطالبہ کرنے والی جارح فرقہ پرست جماعتوں نے نہ صرف اپنے مطالبوں بلکہ مسجد کو شہید کرکے اپنی دھمکیوں کو بھی سچ کر دکھایا مگر مرکز کی نرسمہا راؤ حکومت اپنی بار بار کی یقین دہانیوں، روایتوں، دستور، الکشنی منشور اور آئینی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں قطعی ناکام رہی۔ یعنی منفی قوتوں نے تو ڈٹ کر اپنا کام کیا۔ مثبت قدروں کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھانے والی قوتیں منافق ثابت ہوئیں۔

بات صرف اتنی ہی نہیں کہ مرکزی حکومت کلیان سنگھ حکومت کی یقین دہانیوں سے سے دھوکا کھا گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے مسجد کے تقدس سے کھیل کر بی۔ جے۔ پی۔ کو سیاسی مات دینے کی کوشش کی جس سے پہلے کلیان سنگھ کی حکومت مسجد گرادے اور پھر نرسمہا راؤ، سیکولرزم کے علمبردار بن کر کلیان سنگھ کی حکومت کو گرادیں اور اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو جائے۔

مگر وہ جو کہتے ہیں کہ شر میں بھی خیر کا پہلو ہوتا ہے تو مسجد کی شہادت کے ساتھ ہی کانگریس کے 'سیکولرزم' اور ہندو مذہبی اور سیاسی جماعتوں، بی۔جے۔پی۔، آر۔ایس۔ایس۔، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، شیو سینا کی نام نہاد 'مذہبیت' کی قلعی کھول گئی۔ 'مریادا پرشوتم' کے نام پر دیش اور دھرم دونوں کی مریادا بھنگ ہو گئی۔

کارسیوکوں نے جو کیا یا انہیں مشتعل کرنے اور یکجا کرنے والوں نے جو کیا اسے ''قانون شکنی'' اور ''دہشت گردی'' کے سوا کیا نام دیا جا سکتا ہے۔ خود وزیر اعظم نے اپنی ٹی۔وی تقریر میں انہیں سماج دشمن کہا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک نہیں کیا جانا چاہئے جو کشمیر و پنجاب کے ''قوم دشمنوں'' کے ساتھ کیا جا رہا ہے؟ یا کسی قوم دشمن کے ساتھ کیا جانا چاہئے۔

مسجد کو 'شہید' اور 'اجودھیا' میں مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگانے کے باوجود یو۔ پی۔ کی ہندو سرکار ہی نہیں مرکز کی سیکولر سرکار بھی کارسیوکوں کو چمکارتی، پچکارتی رہی، دوسرے دن رات تک جب ملک کے بیشتر حصوں میں احتجاج کی آگ کو بجھانے کے نام پر فوج طلب کر لی گئی تھی یا دوسری

سیکوریٹی فورسیز فائرنگ کر رہی تھیں 'اجودھیا' میں کارسیوکوں کا ہی راج تھا۔ وہ مسجد کی جگہ مندر بنا رہے تھے اور انہیں اس 'دہشت گردی' سے باز رکھنے کے لئے فوج طلب کی گئی تھی، نہ ہی دوسری فورسیز نے کوئی زحمت اُٹھائی تھی۔

یہ دوہرا معیار ہے اور اس کو کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی۔ 'سیکولرزم' کے خوبصورت لباس میں جس قسم کی بدترین فسطائیت کا مظاہرہ ہو رہا تھا وہ اب دنیا پر ظاہر ہے۔

پی.اے.سی. اور انتظامیہ نے ایک بار پھر وہی کیا جو ہمیشہ کرتی آئی ہے بلکہ اس بار تو دو جوتے آگے بڑھ کر کیا اور اتنا کیا کہ اظہارِ تشکر میں ڈوبے ہوئے کارسیوکوں نے پی.اے.سی. زندہ باد کے نعرے کے ساتھ مسجد کی شہادت کا آغاز کیا۔

اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ 'آپریشن بلیو اسٹار' کے ردِعمل کے طور پر فوج سے بھاگ جانے والے فوجیوں کو موردالزام ٹھہرایا جا سکے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر اُس مسئلہ میں جس کی نوعیت 'ہندو مسلم مسئلہ' کی ہو پولیس اور پی.اے.سی. انتظامیہ کے ایک موثر طبقے کی مدد سے باوردی فریق کا کردار ادا کرتی ہے۔

حکومت نے جن چار اہم اقدامات کا اعلان کیا ہے وہ اچھے ہیں مگر ان پر کیا اور کیسے عمل درآمد ہوتا ہے۔ اس پر یہ شکوک وشبہات کی پرچھائیاں پڑی ہوئی ہیں۔

مسجد کی دوبارہ تعمیر کا کیا مطلب ہے؟ ڈھانچے کی تعمیر نو یا اس کے تقدس کی بحالی؟ اگر تقدس کی بحالی نہیں ہوتی تو مسلمانوں کے رِستے زخم مندمل نہیں ہوں گے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ بی.جے.پی.، آر.ایس.ایس.، وشو ہندو پریشد، جماعتوں کے نام تو ہیں ہی ہندو ذہنیت اور یہ ذہنیت سیکولر پارٹی کے بعض لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر وسنت ساٹھے کا نام لیا جا سکتا ہے اس ذہنیت سے نمٹنے کے لئے کیا کیا جائے؟

ہمیں کہنے دیجئے کہ اگر پارلیمنٹ میں سوم ناتھ چٹرجی جیسے لوگ نہ ہوتے تو کانگریس بھی اپنا رُخ بدلنے پر مجبور نہ ہوتی خدا کرے یہ تبدیلی اخلاص پر مبنی ہو۔

مسجد کی شہادت سے ہندوستانی قوم کے ضمیر پر چوٹ لگی ہے اگر یہ برسراقتدار جماعت صحیح جہت میں صحیح لوگوں کو ساتھ لے کر کام کرے تو فرقہ پرستی گہری کھائی میں دفن ہو جائے۔ مگر اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ 'لو' اور 'دو' کے الگ الگ پیمانے نہ ہوں۔ ☐ ☐

بشکریہ: ماہنامہ استقامت، کانپور، جون/1993

## روز نامہ "Statesman" میں مسٹر اڈوانی کے نام کھلا خط

اتوار،12دسمبر 1992 کی صبح بھارتیہ جنتا پارٹی کی لیڈر ایل کے اڈوانی کے نام ایک کھلا خط میرے گھر پر پہنچایا گیا۔ اس نوجوان لڑکی نے جو یہ خط لیکر آئی تھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ یہ کہہ کر لوٹ گئی کہ بعد میں مجھ سے فون پر گفتگو کرلے گی۔ دو طالب علموں کی جانب سے لکھا ہوا یہ خط مجھے ان کے دل کی پکار محسوس ہوا۔ ہم اس خط کو کسی بھی تبدیلی کے بغیر شائع کر رہے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ پہلا موقع ہے جب ایڈیٹر کے نام لکھا گیا کوئی خط صفحہ اوّل پر شائع ہو رہا ہے۔ سنئے مسٹر اڈوانی!

ہندوستان کے مستقبل کی آواز!! (Chief Editor, Statesman)

مذکورہ تاثراتی تحریر "Statesman" کلکتہ کے چیف ایڈیٹر مسٹر سی.آر.ایرانی کی ہے. جو خط کے ساتھ ہی شائع ہوئی۔ یہاں خط کا اُردو ترجمہ من وعن شائع کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

ڈیر مسٹر اڈوانی!

ملک بھر میں ہونے والے اس تشدد کا جس کی اس سے پہلے کوئی اور مثال نہیں ملتی ہم خاموشی اور غور کے ساتھ مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ حالیہ کرفیو ہماری زندگی کا پہلا کرفیو تھا۔ ہم گھر پر بیٹھے ہوئے موجودہ سنگین حالات پر کفِ افسوس ملتے رہے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ حالات جلد ہی بہتر ہو جائیں گے لیکن ہماری اُمید پوری نہیں ہوسکی۔ حقیقت پسند طلبہ کو بھی ایک نہ ایک دن حقیقت کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اڈوانی جی! ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ کی وجہ سے ہماری آنکھیں جلد ہی کھل گئیں۔ ہندوستانی قوم میں ہندوازم کی جو بھی تھوڑی بہت حقیقی روح باقی بچی تھی، اُسے بھی پچھلے دنوں آپ کی جذباتی 'ہندتو' نے ختم کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہوسکتی ہے کہ آپ کا بی.جے.پی، وی.ایچ.پی، آر.ایس.ایس، متحدہ محاذ جو ہندوازم کا سب سے بڑا محافظ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہی ہندوازم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کا بھی ذمے دار ہے۔

ہم، آپ سب لوگوں کے شکر گزار ہیں۔ آپ نے ہندوازم کی رُوح کو کچھ اس طرح کچلا ہے کہ آج شرم کے مارے کوئی ہندو اس قابل نہیں رہ گیا کہ وہ دنیا کے سامنے سر اُٹھا کر چل سکے، جب بھگوا پوش پاگل بابری مسجد کے گنبدوں کو مسمار کر رہے تھے، اس وقت اڈوانی جی، آپ کو کیسا لگ رہا تھا۔ خوشی کا احساس؟ فتح کا احساس؟ لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان نے کیا محسوس کیا، مسٹر اڈوانی! پورا ہندوستان اپنی ذلت اور رسوائی کو محسوس کر رہا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ 7 /دسمبر کو بی. بی. سی کی شاہ سرخیوں میں ہندوستان کے چرچے تھے۔ لیکن یہ کوئی فخر وغرور کی بات نہیں تھی۔ ہندوستان کے فخر وغرور کو تو وہ مٹھی بھر افراد مٹی میں ملا چکے تھے جو ہندوازم کے محافظ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

کیا آپ خدا کے لئے ہمیں یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ 400 سالہ قدیم تاریخی یادگار کو منہدم کر کے آپ کو کیا ملا؟

آگ اگلتی ہوئی فرقہ پرستی کے شیطان کے ذریعے مساوات اور بھائی چارگی کی اس علامت کو برباد کیا جانا کیا آپ کے نزدیک محض تفریح طبع کی بات ہے؟ کیا اس مسجد کے احاطے میں ہندو اور مسلمان دونوں عبادت نہیں کیا کرتے تھے؟ کیا ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ضروری تھا؟ اگر وہ جگہ شری رام کی جائے پیدائش بھی تھی تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا؟ اگر وہاں ہزاروں سال پہلے کوئی مندر تھا تو اس سے بھی کیا فرق پڑتا تھا؟ رام کی مورتی تو وہاں موجود ہی تھی، اور لوگ اس کی پوجا بھی کر رہے تھے۔ کیا آپ واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلم طرز کا ڈھانچہ رام کے تقدس کو برباد کر سکتا ہے؟ جب خود اجودھیا کے لوگ ماضی پر خاک ڈالنے اور اسے بھول جانے کے لئے تیار تھے تو پھر آپ ایسا کیوں نہیں کر سکے؟ مسٹر اڈوانی! آپ کے ہندتو سے غلیظ سیاست کی بو آ رہی ہے۔

کیا آپ ان ہزاروں افراد کی موت کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ جو ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور برطانیہ میں مارے گئے؟ کیا آپ کی 'ہندتو' اُن لاتعداد لوگوں کا پیٹ بھر سکتی ہے جو آج اپنی جھونپڑوں میں بے کس ولاچار پڑے ہوئے بھوکے مر رہے ہیں۔ مسٹر اڈوانی! آپ نے سیدھے سیدھے اپنے ہی لوگوں کا قتل کیا ہے۔

آخر آپ نے بابری مسجد کو کس لئے منہدم کیا؟ ظاہر ہے کہ یہ کام ایک عام ہندوستانی کے لئے نہیں کیا گیا، ایک عام آدمی کی شخصیت میں تو صدیوں سے ہندو اور مسلمان دونوں ہم آہنگی کے

ساتھ زندہ تھے۔ مسٹر اڈوانی آپ نے ملک کی 80 کروڑ عوام کے سامنے کون سی اقدار پیش کی ہیں؟ یقیناً آپ کی پیش کردہ اقدار کو ''جیو اور جینے دو'' والے اس اصول سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو ہندو ازم کی پہچان ہے۔

آپ کی تنگ نظری اور عصبیت سے ہم متنفر ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی طلبہ آپ کو آسانی کے ساتھ معاف نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں بھی اس بات کا فخر تھا کہ ہم ایک جمہوری سیکولر اور سوشلسٹ ملک کے شہری ہیں، جی ہاں، سیکولر۔ کیا آپ جاننا چاہتے ہیں کہ لفظ سیکولر کے کیا معنی ہوتے ہیں؟ لغت کے مطابق سیکولر اس شخص کو کہتے ہیں، جس کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو۔ لیکن ہمارے دستور میں سیکولر کا مطلب مذہبی مساوات اور بھائی چارگی ہے۔ سیکولر ازم ہمارے وجود کا ناقابلِ تقسیم حصہ ہے۔ دستور کی خلاف ورزی کر کے آپ نے تمام ہندوستانی شہریوں کی شناخت کو برباد کر دیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے کہ آپ بابری مسجد کے انہدام کا دفاع یہ کہہ کر کر رہے ہیں کہ کشمیر میں 50 مندر منہدم کئے جا چکے ہیں؟ لیکن پہلے یہ تو بتایئے کہ کیا خود آپ کی لغت میں 'اہنسا'، نامی کوئی لفظ پایا جاتا ہے۔ آیئے اب آپ کی تمام خامیوں اور کمزوریوں کو تھوڑی دیر کے لئے بھول کر یہ سوچیں کہ آپ (خدا نخواستہ) ہندوستان کے وزیر اعظم بن گئے ہیں۔ کیا وزیر اعظم بننے کے بعد بھی آپ اپنی پارٹی کے نظریات پر عمل کریں گے؟ کیا آپ ملک کے وزیر اعظم کی حیثیت سے منہدم شدہ مسجد کی تعمیر نو کی اجازت نہیں دیں گے؟ آپ بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ اس مسئلے پر نرسمہا راؤ سرکار غلط پالیسیاں اپنا کر خودکشی کے راستے پر چل رہی ہے۔ مسٹر اڈوانی، اگر آپ نرسمہا راؤ کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ کیا آپ ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے مفادات کو ٹھکرا کر یہ ثابت کرتے کہ آپ صرف ایک ہندو وزیر اعظم ہیں؟ کیا آپ یہ اعلان کر دیتے کہ ہندوستان ایک ہندو مملکت ہے؟ ایسی صورت میں آپ کروڑوں ہندوستانی مسلمانوں سے کیسے نمٹتے؟ کیا آپ ان ہندوستانی مسلمانوں سے ان کی شناخت چھین لینا چاہتے ہیں؟ یہ مسلمان تو زمانہ قدیم سے ہی ہندوستانی ہیں۔ صرف ہندوستانی!

ایک ایسے وقت میں جب ملک لڑکھڑاتے ہوئے ہی سہی لیکن اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ نے ہمیں پچاس سال پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب ملک شدید قسم کے قومی اور معاشی بحران سے دوچار ہے اور یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ ہر ہندوستانی اپنی تمام کوششیں ملک کی ترقی کی طرف مرکوز کر دے آپ نے ملک کے سیاسی منظر نامے

میں نیچ اور فرقہ وارانہ سیاست کو داخل کرنے کی جرأت کی۔ اس کے باوجود آپ خود کو ہندوستانی کہتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپ خود کو ہندو کہنے پر بھی مصر ہیں۔ آپ نے اپنے 'آج' کی خاطر ہمارے 'کل' کو برباد کر دیا ہے۔ ہم ہندوستان کا مستقبل ہیں، اور ہم بابری مسجد کا انہدام نہیں چاہتے تھے۔ آپ کو ہمارے خوابوں اور مستقبل کو تاراج کرنے کا کیا حق تھا۔ آپ کو اس بات کا حق کس نے دیا تھا کہ آپ ان کروڑوں نوجوانوں کے تصورات کو مسمار کر دیں جو مستقبل کے ہندوستان کو بنانے سنوارنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

مسٹر اڈوانی! کیا آپ کے پاس ہمارے سوال کا جواب ہے۔ کلکتہ 12/دسمبر 1992ء

احترام کے ساتھ

● ورشا وینکٹیش ● پونم سارنگ



# اجودھیا میں تین دن

از: سریندر پرتاپ سنگھ (صحافی)

ہم 5 دسمبر کی دوپہر لکھنؤ کے راستے سے اجودھیا پہنچے تھے اور اسی دن لکھنؤ میں اٹل بہاری واجپئی کی تقریر تھی۔ اتفاق سے وہ بھی صبح کی ٹرین سے اسی دن لکھنؤ پہنچے تھے۔ سرکاری ریسٹ ہاؤس میں اپنے حمایتیوں سے صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ اٹل بہاری واجپئی سے وہاں موجود صحافی یہ دریافت کر رہے تھے کہ کارسیوا کے لئے آپ اجودھیا کیوں نہیں جا رہے ہیں؟ واجپئی جی کہہ رہے تھے کہ انہیں وہاں نہ جانے کا حکم ہے کیونکہ ان کی ضرورت اجودھیا کے باہر رہے گی۔ ان سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا آپ کو یہ اعتماد ہے کہ اجودھیا میں سب کچھ امن و امان سے ہوگا واجپئی نے جواب دیا کہ امید ہے۔ پھر تھوڑی دیر رک کر انہوں نے کہا کہ شک بھی ہے اور خاموش ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سلسلے میں مزید تفصیل بتاتے۔ اجودھیا معاملے کے نگراں وزیر لال جی ٹنڈن اور اتر پردیش بھاجپا کے صدر کلراج مشرا بات چیت میں کود پڑے اور کہنے لگے کہ کارسیوک کتنے امن کے خواہاں اور منظم ہیں۔

جب انہیں یہ بتایا گیا کہ اجودھیا میں مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے اور کچھ مزاریں توڑنے کی خبریں موصول ہوئی ہیں تو ان لیڈروں نے کہا کہ یہ غلط فہمی کے سبب ہوا ہے۔ کارسیوکوں کو اس کا علم نہیں تھا کہ منہدم شدہ مزاریں ہیں۔ وہ تو اوبڑ زمین اور ٹیلوں کی صفائی کر رہے تھے کہ وہاں قبریں بھی نکل آئیں لیکن جیسے ہی مزاریں ہونے کا انکشاف ہوا تو فوراً کام روک دیا گیا۔ اور کارسیوک اپنے خیموں میں چلے گئے۔ واجپئی جی نے کہا کہ دیکھئے، اسی سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کارسیوک ڈسپلن کے کتنے بڑے پابند ہیں۔ حکم کے خلاف جا کر یہ کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ آپ اجودھیا میں دیکھئے گا۔

لکھنؤ سے فیض آباد کے راستے پر یہ احساس یقین میں بدلنے لگا تھا کہ حقیقت میں اس مرتبہ نہ صرف ڈسپلن لوگ آئے ہیں بلکہ وہی آ رہے ہیں جنہیں آنے کی اجازت دی گئی ہے۔ فیض آباد پہنچ کر ابھی سامان ہی رکھا تھا کہ ادھر سے بی. بی. سی کے مارک ٹیلی آ پہنچے۔ وہ مارگ درشک منڈل کی میٹنگ کا فیصلہ سن کر آئے تھے۔ جس میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ لوگ سرجو کا پانی اور مٹھی بھر ریت لے کر

جنم استھان کے چبوترے کی صفائی کریں گے۔ مارگ درشک منڈل کا یہ فیصلہ اسی شام کارسیوکوں کی ایک عام سبھا میں سنایا جانا تھا۔

رام کتھا کنج کا میدان کارسیوکوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کتھا کنج دفتر کی چھت ہی اسٹیج کا کام کر رہی تھی۔ منظم کارسیوک اپنے نام اور پتہ کی پٹیاں سر پر باندھے بڑے صبر وتحمل سے لیڈروں کی تقریریں سن رہے تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ تقریروں کی زبان مارگ درشک منڈل کی تجویز سے بالکل مختلف تھی۔ وہی منافرت پھیلانے والی پرانی تقریریں تھیں۔ صحافی بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے کہ کب اس تجویز کا عام اعلان ہوتا ہے اور وہ خبریں روانہ کرنے کے لئے فیض آباد کا رخ کریں۔ کافی انتظار کے بعد آچاریہ دھرمیندر اس تجویز کا اعلان کرنے کھڑے ہوئے ان کی تقریر کا انداز اور زبان میں بھی کہیں کوئی نرمی نہیں تھی اور کافی دیر بعد انہوں نے اس تجویز کو کسی طرح کارسیوکوں کے سامنے پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ انہیں بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ کارسیوک صرف یہی کر کے مطمئن ہونے والے نہیں ہیں۔ آخر کئی سالوں سے انہیں جس نفرت کی آگ میں بھڑکایا جا رہا تھا وہ آگ چلو بھر پانی سے اور بھڑکنے ہی والی تھی۔ کارسیوکوں کی بے چینی کا پیمانہ لبریز ہوا۔ اسی وقت اشوک سنگھل اُٹھے اور ان جوشیلے کارسیوکوں کا دل بہلانے کے لئے یہ کہنا شروع کیا کہ اخبار والے کیسے جھوٹ پھیلا رہے ہیں اس کا خاطر خواہ جواب انہیں ملنا چاہئے۔

شام ہو رہی تھی، کچھ صحافی یہ سوچ رہے تھے کہ کیوں نہ کارسیوکوں کے الگ الگ کیمپوں میں جا کر ان سے بات چیت کی جائے تا کہ یہ پتہ چل سکے کہ آخر وہ کیا چاہتے ہیں؟ میں کچھ صحافیوں کے ساتھ کارسیوک پورم پہنچا۔ رام جنم بھومی نرمان نیاس کی طرف سے جاری شناختی کارڈ کے باوجود ہمیشہ کچھ کارسیوک ساتھ لگے رہے اور کسی سے بھی بات کی کوشش کو ناکام کرتے رہے۔ ناکام ہو کر ہم فیض آباد لوٹ آئے۔ وہاں اس بات کا پتہ چلا کہ جرمن ٹیلی ویژن کے عملے کو کارسیوکوں نے بری طرح زدوکوب کیا ہے۔ ان کے کیمرے وغیرہ توڑ ڈالے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اگر مفاہمت نہ کی ہوتی تو انہیں جان سے مار دیا گیا ہوتا۔ زدوکوب کرنے والے کہہ رہے تھے کہ یہ بی.بی.سی والے ہیں انہیں مار ڈالو۔ سنگھل جی نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ انہیں سبق سکھانا بہت ضروری ہے۔

صحافیوں کی ٹیم ابھی اس صدمے سے باہر نکل آنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ کوئی دوڑا دوڑا آ کر یہ خبر دیتا ہے کہ ایک خاتون صحافی کو رام کتھا کنج کے کیمپ میں کارسیوکوں نے بند کر کے رکھا ہے

اور اس کے ساتھ نازیبا حرکت کی جا رہی ہے۔ کچھ صحافی دوست فوراً اجودھیا روانہ ہو گئے۔ کافی دیر بعد جب سب لوٹے تو انکشاف ہوا کہ واقعی اس کیمپ کو بہت محفوظ جگہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ وہاں کسی بھی اجنبی شخص کو گھسنے نہیں دیا جا رہا ہے۔ اس خاتون صحافی کو اندازہ نہیں تھا کہ نادانستہ طور پر اس متنازعہ جگہ وہ کیسے پہنچ گئی تھی جہاں کارسیوک ریہرسل کر رہے تھے ریہرسل اس طرح ہو رہی تھی کہ بڑی بڑی رسیاں اور کانٹے اونچائی کی پہاڑیوں پر پھینکے جاتے تھے۔ انہیں اوپر پھنسا کر کارسیوک الٹے لٹکتے ہوئے چوٹی پر چڑھتے تھے۔ پھر بڑی بڑی چٹانوں کو رسیوں سے باندھ کر کھینچا جاتا تھا۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ کارسیوکوں کے علم کے بغیر کچھ فوٹوگرافروں نے ریہرسل کے اس منظر کو اپنے کیمروں میں قید کیا تھا جن میں سے ایک تصویر اتوار کے دن دہلی کے ایک اخبار میں شائع بھی ہوئی تھی۔ ہم تمام صحافی آپس میں گفت وشنید کر کے اس راز کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسی وقت کسی نے اطلاع دی کہ صحافی بھائی کل ذرا سنبھل کر جایئے آپ کے لئے وہاں کچھ مخصوص انتظام کیا جا رہا ہے۔ جن صحافیوں کے پاس رام جنم بھومی نیاس کی طرف سے جاری شناختی کارڈ نہیں تھا وہ حقیقت میں فکرمند ہوئے اور دیر رات تک پاس کا انتظام کرنے میں لگے رہے۔

تب تک میرے پاس بھی شناختی کارڈ نہ تھا ایک بااثر مقامی صحافی کو ساتھ لے کر آدھی رات کو ہم پاس بنوانے کے لئے روانہ ہو گئے۔ رات گیارہ بجے کے قریب پاس دیا گیا تو سوچا کہ کیوں نہ ایک بار متنازعہ احاطہ میں بھی ہو آئیں۔ وہاں پہونچے تو ہم نے دیکھا کہ بجرنگ دل کے چیف ونے کٹیار کسی سے صلاح مشورے میں مصروف ہیں۔ جیسے کہ صحافیوں کی عادت ہوتی ہے ہم کٹیار کی طرف لپکے ہم چار لوگ تھے اور سبھی کٹیار سے پہلے ہی سے واقف تھے اس لئے اس وقت ان سے بات کرنے کی کوشش کرنا ہمیں کچھ غیر معمولی نہیں لگ رہا تھا۔ ہم ابھی ان کی طرف دو قدم ہی بڑھے تھے کہ کچھ طاقتور بازوؤں نے ہمیں پکڑ کر باہر کی طرف پھینک دیا۔ وہ سنگھ کے ورکر تھے۔ خاکی ہاف پینٹ پہنے ان دو افراد کے چاروں طرف آر.ایس.ایس. کے ورکروں کی زبردست بھیڑ تھی۔ وہ بات چیت کرتے ہوئے چل بھی رہے تھے پورا مجمع بھی ان کے ساتھ ہی چلتا تھا اور راستے میں جو بھی بیچ میں آتا انہیں طاقت کی زور سے دور پھینک دیا جاتا تھا۔ ایک مقامی صحافی نے بتایا کہ ونے کٹیار بڑے احترام کے ساتھ جس شخص سے بات کر رہے ہیں وہ چمپت رائے ہیں جو سنگھ کے بہت ہی اہم رکن ہیں اور پوری کارروائی کے انچارج بھی ہیں۔

ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ کارسیوکوں کی بے اطمینانی دور کرنے کے لئے یہ متنازعہ حلقے سے باہر کوئی ایسی جگہ ڈھونڈ رہے ہیں جہاں تعمیری کام بھی شروع کر سکیں تا کہ ان کا جوش کم کیا جائے۔ دوسرے روز صبح جب بی. بی.سی. نے مجھ سے پوچھا کہ وہاں کی حالت کیسی ہے تو میں نے کہا کہ گذشتہ رات کٹیار اور چمپت رائے ایک ایسا کنارہ ڈھونڈ آئے ہیں جہاں کام شروع کر کے انہیں یقین ہے کہ کارسیوکوں کو بھڑکنے سے روک لیں گے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ہم جیسے لوگ بھی اس اعلان سے متاثر ہو گئے تھے کہ اس مرتبہ کارسیوکوں میں کوئی ایسی ویسی بھیڑ نہیں ہے وہ سنگھ کے پرانے لوگ ہیں اور حکم کے خلاف کوئی بھی کام نہیں کر سکتے۔ اس لئے ونے کٹیار اور چمپت رائے کی سرگرمیوں میں ہمیں شک وشبہ نہیں ہوا۔ اس بات کا انکشاف تو ابھی ہو رہا تھا ہے کہ حقیقت میں دیر رات تک وہ وہاں کیا کر رہے تھے اور ان کا حقیقی حکم کیا تھا۔

دوسرے دن صبح سات سے پہلے ہی ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔ چبوترے پر ایک چھوٹا سا بھگوا جھنڈہ لہرا رہا تھا۔ قریب ہی ایک پوجا کا مقام بنا تھا۔ اس وقت تک کوئی خاص بھیڑ نہیں تھی۔ وہاں کچھ کارسیوک زور زور سے پولس والوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ قریب جانے پر پتہ چلا کہ مراٹھی انداز میں ہندی بولنے والا ایک نوجوان پولس کو للکار رہا تھا ''کیا سمجھتا تم لوگ، ہم لوگ خالی جھاڑو پونچھا کے واسطے آیا۔ ہر چھ مہینے پر ہم لوگ ادھر نہیں آئے گا۔ آج اس کو خلاص کر کے جائے گا'' اس کارسیوک کی انگلی کا اشارہ بابری مسجد کی طرف تھا۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ یہ بہت جوشیلے کارسیوک ہیں۔ اور باقی ماندہ یقینی طور پر منظم کارسیوک ہوں گے۔ یہ نوجوان مہاتما گاندھی اور ارجن سنگھ دونوں کو ایک ہی انداز میں گالیاں دے رہا تھا۔

ہم احاطہ کے چاروں طرف چکر لگا کر لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس جوشیلے نوجوان کی زبان بولنے والے وہاں اور بھی دیگر کارسیوک تھے۔ وہ تمام اس خاردار باڑ کے ارد گرد ہی گھوم رہے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا لیکن کارسیوا شروع کرنے کا کوئی خاص جوش کسی میں نظر نہیں آ رہا تھا۔ زیادہ تر صحافی چبوترے پر جمع ہو گئے تھے وہاں ہمیں بہار کے اہم لیڈر ملے انہوں نے بتایا کہ بھاری بھیڑ کے سبب سارا پروگرام تہس نہس ہو گیا ہے۔ اب سریو سے پانی اور ریت لانے کا کام آج بھی نہیں ہوگا۔ شاید کل کریں۔ سوا بارہ بجے کا مہورت بھی بدل

گیا ہے۔ ستاروں کی گردش کے مطابق واسدیو جی نے نئی گنتی کی ہے اور اب کمبھ کے بجائے کارسیوا تولہ لگن میں شروع ہوگی۔

اسی درمیان سنگھ پریوار کے لیڈران اس چبوترے کے پاس آتے رہے۔ غیر ضروری طور پر ادھر اُدھر گھوم کر پھر غائب ہو جاتے تھے۔ سنگھ کے سیوکوں نے چبوترے کے چاروں طرف ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ ساکشی گوپال مندر کی طرف سے ایک جنونی بھیڑ بار بار رکاوٹ کو توڑ کر اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پولس اور دوسرے کارسیوک طاقت سے انہیں روک رہے تھے اسی درمیان ایک بھیڑ دوسری طرف سے اندر داخل ہونے لگی۔ ہاتھ میں ننگی تلواریں اور بندوق لیکر گولیاں چلا رہے تھے۔ کسی باخبر نے بتایا کہ یہ ''شیوسینک'' ہیں۔ مائک پر اعلان کر کے ایک کے بعد دوسرے لیڈر کو اس حلقے سے باہر بلایا جاتا رہا۔ یہ پروگرام گھنٹوں تک چلا۔ لیکن کارسیوکوں کی کوئی تیاری نظر نہیں آ رہی تھی۔ اوران پر دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔

اچانک سیوم سیوکوں کی بھاری بھیڑ نظر آئی جن کے ماتھے پر بھگوا پٹیاں نہیں تھیں۔ سر پر پیلی پٹی باندھے یہ نوجوان اجودھیا میں پہلی مرتبہ نظر آئے تھے۔ مائک پر اعلان ہو رہا تھا کہ بہت ہو چکا۔ بجرنگ دل کے یہ نوجوان چبوترے کو غیر ضروری لوگوں سے خالی کرا دیں۔ اب آپ طاقت کا استعمال کریں۔ تمام نوجوان ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ یہ منظر تقریباً دس منٹ تک چلتا رہا اور پھر انہیں مائک سے حکم ملا کہ آپ واپس آ کر اسٹیج کے بائیں طرف بیٹھ جائیں۔ جس رفتار سے یہ اسٹیج سے آئے تھے اسی رفتار سے واپس لوٹ بھی گئے۔ تمام سینئر لیڈران پہلے ہی دور ہو چکے تھے۔ ان سب کے الگ ہوتے ہی اچانک چاروں طرف سے بھیڑ اندر ٹوٹ پڑی۔ اور ہم اس منظر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک شخص گنبد پر کھڑا نظر آیا اس کے بعد دوسرا بھی اس کے ہاتھ میں بھگوا جھنڈا تھا۔ اور پلک جھپکتے ہی پتھروں کی برسات شروع ہوئی۔ ہزاروں لوگ اوپر چڑھ گئے۔ پولس دو منٹ میں ہی غائب ہوگئی اور مسجد کو مسمار کرنے کا کام شروع ہوا۔

رسیاں باندھ دی گئیں، ہتھوڑے، پھاوڑے، کدال وغیرہ نکل آئے۔ نئے سیوم سیوکوں کا ایک جتھہ وہاں آیا۔ سیٹی بجا کر نیچے سے، انہیں اشارے سے احکامات دے رہے تھے۔ مائک پر اعلان کی زبان بدل گئی، گھنٹے، شنکھ بجنے لگے، آس پاس کے نلوں میں پانی آنے لگا۔ مواصلاتی نظام درہم برہم ہوگیا۔ صحافیوں پر ایک ساتھ حملے ہوئے۔ شناخت کے لئے ان کے پاس ان کے سینوں پر لال

پاس لٹکا ہوا تھا لیکن پھر بھی ان کی پٹائی ہوئی۔ لیڈران دوسری طرف اسٹیج سے کچھ بول رہے تھے۔ وہ نہیں جس کا دعوی کیا جا رہا تھا۔

بلکہ وہ جس کا کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ یہ کام گھنٹوں چلتا رہا، اجودھیا آنے کے چاروں راستوں کو بند کر دیا گیا۔ ایمبولینس گلیوں میں حاضر تھی۔ لوگ اسٹریچر لیکر پہنچ گئے۔

صحافیوں کی پٹائی اور مسجد کی انہدامی کارروائی کا کام زوروں پر تھا۔ پانچ بجے تک تینوں گنبد گر چکے تھے۔ صحافیوں کو یہی کارسیوک بہلا پھسلا کر کہہ رہے تھے کہ اب بھاگ لیجئے، اندھیرا ہونے کے بعد آپ کے ساتھ کیا ہوگا اس کا آپ کو علم نہیں ہے۔ ہم چار صحافی ایک ساتھ نکلے۔ تمام گاڑیاں غائب تھیں صرف ایک گاڑی تھی۔ ابھی گاڑی چلی بھی نہیں تھی کہ کچھ کارسیوک چاروں طرف سے آئے اور گاڑی کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے ساتھ ایک زخمی کارسیوک تھا جسے وہ لوگ گاڑی میں ڈال رہے تھے۔ ہم اُسے بٹھا کر وہاں سے نکلے۔ فیض آباد کے راستے میں کئی رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں۔ لیکن اتنی رکاوٹوں نہیں تھیں کہ ہمیں منزل تک پہنچنے میں دشواری ہوتی اگر ہم اکیلے ہوتے تو شاید راستوں کو پار کرنا مشکل ہوتا۔ لیکن زخمی کارسیوک کی وجہ سے راستے صاف ہوتے گئے اور ہم فیض آباد اسپتال پہنچ گئے۔ وہاں سابق وزیر صحت ہریش چندر شریواستو کی قیادت میں سیوم سیوکوں کا ایک جتھا زخمیوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شریواستو جی اسپتال میں صبح سے ہی موجود تھے اور بارہ بجے سے بے چین ہو کر اپنے ہاتھ کی گھڑی کو دیکھ رہے تھے کہ کوئی زخمی ابھی تک آیا نہیں؟

فیض آباد پہنچنے کے بعد ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ مرکزی سیکورٹی فورسیز نے اجودھیا میں جانے کی کوشش کی یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ صرف ایک بار کچھ سپاہی نکل پڑے تھے لیکن راستے میں پہلی رکاوٹ کو دیکھ کر واپس لوٹ آئے۔ پوری رات ہم اس راستے کے ہی آس پاس تھے لیکن کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا کہ وہاں پہنچنے کی کوئی کوشش ہو رہی ہے۔ آدھی رات تک حالت یہی تھی کہ صحافی پھر بھی وہاں پہنچ رہے تھے۔ رات ایک بجے کچھ صحافیوں نے لوٹ کر بتایا تھا کہ مسجد پوری طرح سے مسمار ہو چکی ہے۔ اسے زمین بوس کر کے رام للا کی مورتی رکھ دی گئی ہے۔ پوجا پاٹھ جاری ہے اور دیوار بنانے کا کام بھی چل رہا ہے۔ صبح سات بجے تین صحافی پھر اجودھیا کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں رکاوٹیں اب بھی تھیں لیکن اتنی نہیں کہ ہمیں اجودھیا پہنچنے میں تکلیف ہوتی۔ ہماری گاڑی

تقریباً دوسو گز دور رک گئی کیوں کہ اس سے آگے لے جانا ممکن نہیں تھا اور ہم پیدل اس طرف چل پڑے۔ راستے میں کئی مقام جلتے نظر آئے۔ ایک مسجد باقی تھی۔ صبح اسے پھر سے جلانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ سڑک پر آگ جل رہی تھی۔ اور پولس کے جوان اپنی ہتھیلیاں سینک رہے تھے۔

متنازعہ مقام پر پر امن طریقے سے کام ہو رہا تھا۔ ایک جتھا ملبے کی صفائی کر رہا تھا، دوسرا مندر کی تعمیر میں مصروف تھا۔ درگا واہنی کی خاتون ممبران گیت گاتے ہوئے احاطے میں داخل ہو رہی تھیں۔ پولس کے ہزاروں نوجوان ہنستے مسکراتے ٹہل رہے تھے۔ آج صحافیوں کو کم خطرہ تھا کیوں کہ سیوم سیوکوں کو بھی یہ حکم دیا جارہا تھا کہ وہ اپنی پٹیاں اُتارلیں۔ بھیڑ میں کون کیا ہے پہچاننا مشکل تھا۔

ہم دوپہر فیض آباد لوٹ آئے۔ صدر راج نافذ کے اٹھارہ گھنٹے پورے ہو چکے تھے۔ لیکن کسی طرح کی کوئی نئی کوشش ہوتی نظر نہیں آئی۔ فیض آباد سے لکھنؤ کے راستے پر پولس کا ایک ٹرک بھی اس طرف جاتا نظر نہیں آیا۔ لکھنؤ میں راج بھون کے سامنے سناٹا تھا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گورنمنٹ ریسٹ ہاؤس میں گورنر کے مشیر آتے ہیں اور انتظامیہ وہیں سے کام کر رہا ہے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مشیر اندر کمرے میں ہیں آس پاس کوئی نہیں ہے۔ بھاجپا کے صدر مرلی منوہر جوشی مسکراہٹ کے ساتھ صحافیوں سے کچھ ضروری باتیں کرتے نظر آئے۔

دہلی پہنچنے پر معلوم ہوا کہ دہلی میں یہ سب اطلاع آتی رہی کہ مرکزی سیکورٹی فورس چھ تاریخ سے وہاں پہنچنے کی بہت کوشش کرتی رہی۔ (روی فیچرز)



## ناکارہ پارلیمنٹ: جو "ہندتو" کے خلاف تجویز بھی پاس نہ کرا سکی

از: اے. راگھون (معروف صحافی)

اجودھیا میں جو ہوا اور پھر اس کے نتیجے میں جو قتل عام ہوا اس کے سبب پارلیمنٹ کوئی کام کئے بغیر ہی ملتوی ہوگئی۔ اور عوامی نمائندے اپنے اپنے حلقوں میں واپس چلے گئے۔

کارسیوکوں کی مذمت تو کیا ہوتی، 'ہندتوا' کی طاقتوں کی غنڈہ گردی کے خلاف بھی کوئی مذہبی تجویز پاس نہ ہو سکی کیونکہ اپوزیشن اور کانگریس تجویز کے لفظوں میں اتفاق نہیں کر رہے تھے۔

یہی نہیں وزیر اعظم پارلیمنٹ میں اُن اقدامات کا اعلان بھی نہیں کر سکے جو اُن کی وزارتی کونسل نے فرقہ پرست جماعتوں کے خلاف کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایک باہمت اخبار شکریہ کا مستحق ہے کہ ہمیں وزیر اعظم کی تقریر کا اقتباس موصول ہوا ہے جو انہوں نے پارلیمنٹ میں نہیں کی، اس میں بڑی تکلیف دہ باتیں کہی گئی ہیں۔

اس تقریر کے مطابق جب ہندتوا کی طاقتوں نے تیسری مرتبہ بات چیت کی کوشش کو ختم کر دیا اور کارسیوا کی ابتدا کر دی تو مرکز کی توجہ اجودھیا اور اجودھیا کے اِرد گرد سیکورٹی کے انتظامات کی طرف کرائی گئی۔ اور اس کے ساتھ نیم فوجی دستوں کی 195 کمپنیاں بھیجی گئیں، لیکن یو. پی. کے وزیر اعلیٰ نے ان کمپنیوں کے تعینات کئے جانے کے دستوری اختیارات کو چیلنج کیا اور انہیں واپس بلانے کا مطالبہ کیا۔

کارسیوا کے روز دو پہر تک 80 کارسیوک مسجد کے گنبد پر چڑھنے میں کامیاب ہو گئے اور پولس نے انہیں نظر انداز کیا۔ سی. آر. پی. ایف جو متنازعہ ڈھانچہ کے اردگرد تھی، احکام کی منتظر رہی۔ یہ ریاستی حکومت کے ماتحت تھی، اور انہوں نے اسے کوئی حکم نہیں دیا۔

مرکز نے جو مزید سنٹرل فورسیز روانہ کیں انہیں فیض آباد ریلوے کراسنگ بند کر کے روک دیا گیا۔

جب مسجد پر حملے کی خبر دہلی پہنچی تو مرکزی داخلہ سیکریٹری نے اجازت چاہی اور ریاستی حکام نے بٹالین مانگی مگر جب یہ روانہ ہوئیں تو انہوں نے مرکز اور سپریم کورٹ کو بار بار یقین دہانی کرائی تھی

کہ مسجد کو نقصان نہیں پہنچے گا۔

اس کے بعد بڑے افسوس کے ساتھ ہی کہا گیا کہ ہر ممکن کوشش کی گئی تھی کہ تخریب کے جنون کو کسی طرح ختم کیا جا سکے تاکہ ہم ان کے ساتھ مفاہمت کر سکیں جو مفاہمت کے قابل نہیں ہیں۔

یہی اعتراف حقیقت ہے۔ وہ ان سے مفاہمت کی کوشش میں تھے جو مفاہمت کی بات نہیں سمجھتے۔ وہ ''مندر کی تعمیر'' کے اعلان کے بعد سے یہ سمجھ ہی نہیں سکے کہ کیا ہونے والا ہے۔

وزیراعظم کو یہ احساس بڑی شدت سے ستا رہا ہے کہ ان کے ساتھ غداری کی گئی ہے۔ دہلی میں ایڈیٹروں کے ساتھ بات کرتے ہوئے انہوں نے بی۔جے۔پی۔، آر۔ایس۔ایس۔، اشتراک کی غلط کاریوں پر بڑی بددلی کا اظہار کیا کہ ''ہندو پریوار'' نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا۔

یہاں اس بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ وزیراعظم سنتوں، مہنتوں اور سیاسی بچولیوں سے جس قسم کی باتیں کر رہے تھے اُس سے ان کی وزارت اور پارٹی کے کئے لوگ متفق نہیں تھے۔

کہا جاتا ہے کہ ان کے ایک رفیق نے ان کے پاس پہلے ہی خط لکھ کر اتوار کو اجودھیا میں جو ہوا اس کی خبر دے دی تھی۔

اس دوران صدر جمہوریہ نہ صرف یہ کہ دہلی میں موجود تھے بلکہ انہوں نے اپنے کئی ملنے والوں سے اندیشوں کا بھی اظہار کیا تھا۔

اور جب اجودھیا میں جو سانحہ ہونا تھا ہو گیا تو انہوں نے سخت لفظوں میں ایک بیان بھی جاری کر دیا اور وزیراعظم کو ہدایت دی کہ قانون کی برتری کے لئے وہ مناسب قدم اُٹھائیں۔

صدر جمہوریہ کے اس اقدام کا سیاسی حلقوں میں یہ مطلب نکالا جا رہا ہے کہ یہاں قومی حکومت بھی قائم ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ نرسمہا راؤ کے پاس انٹلی جنس کے ذریعہ بھی پل پل کی خبریں آ رہی تھیں۔ اٹارنی جنرل ملن بنرجی نے سپریم کورٹ کے سامنے صورت حال واضح کرنے کے لئے ان میں بعض رپورٹیں پیش بھی کی تھیں، لیکن خدا جانے کیوں انہوں نے اس پر زیادہ اصرار نہیں کیا۔

پی آر کمار منگلم جنم بھومی مسئلہ میں نئے کھلاڑی ہیں۔ انٹلی جنس بیورو کی رپورٹ سے صحیح نتیجہ

نکالا گیا تھا لیکن مرکز تو ''دستور'' کے دائرے میں رہتے ہوئے کام کرتا تھا۔

مرکز مسجد کے انہدام کو دستور کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی روک سکتا تھا۔ اگر اس پر سازشی گٹھ جوڑ کرنے والوں کا جادو نہ چل چکا ہوتا۔

مرکز 24 رنومبر سے ہی اجودھیا کے پاس نیم فوجی دستوں کو جمع کر رہا تھا۔ اگر چہ اس کا تعینات کیا جانا ریاستی حکومت کا کام ہے۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ اور ان کے وزیر داخلہ ایس. بی. چوان بار بار کلیان سنگھ سے درخواست کر رہے تھے کہ ان نیم فوجی دستوں کو تعینات کئے جانے کی درخواست دے دیں۔

کلیان سنگھ کے مسلسل انکار کے بعد مرکز کو سمجھ لینا چاہئے تھا کہ ہوا کس رخ بہہ رہی ہے۔ کلیان سنگھ ایک بیرونی ایجنسی کے مشورے پر کام کر رہے تھے اور پھر ان پر دباؤ بھی تھا کہ ''مندر وہیں بنے گا'' یعنی مسجد کے ملبہ پر۔

ریاستی حکومت نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس کو مدنظر رکھتے ہوئے مرکزی حکومت کو دستور کی دفعہ 356 کے تحت اسے پہلی ہی برطرف کر دینا چاہئے تھا۔ لیکن نرسمہا راؤ اس کے لئے تیار نہ تھے۔

دفعہ 355 کے تحت وہ نومبر میں ہی اپنے اقدام کی تشہیر کر سکتے تھے۔ اس دفعہ کے تحت مرکز کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ داخلی انتشار کے وقت دستور کے مطابق حکومت کرنے میں ریاست کی حکومت کی مدد کرے۔

اگر اس کے باوجود ریاستی حکومت اپنی ضد پر اڑی رہتی ہے تو اسے اخلاقی اور قانونی دائرے میں رہتے ہوئے برطرف کیا جا سکتا تھا۔ ملک میں جو ہنگامے ہو رہے ہیں، وہ اسلئے بھی ہو رہے ہیں کہ مسجد کے ''انہدام'' کی بات سبھی کو سمجھ میں آ رہی تھی۔ مگر مرکز نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو ہوا اُس کی اخلاقی ذمہ داری وزیر اعظم پر عائد ہوتی ہے۔

نرسمہا راؤ نے جس طرح مسجد کے انہدام سے قبل کے حالات سمجھنے میں غلطی کی تھی اب بایاں محاذ خصوصاً جنتا دل وہی غلطی کر رہا ہے۔

وی. پی. سنگھ غم زدہ مسلمانوں کی مدد سے ایک بار پھر وزیر اعظم بننے کی کوشش میں ہیں اور وہ بار

بار وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ چندر شیکھر بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں پارلیمنٹ میں جو تعطل پیدا ہوا اس کی یہی وجہ ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بایاں محاذ استعفیٰ کا مطالبہ نہیں کر رہا ہے۔

وی. پی. سنگھ اور چندر شیکھر کی پارٹیوں کا جو حال ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ دن میں خواب دیکھ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کی حالت جتنی بھی خراب سہی آج بھی کانگریس میں راؤ کی جگہ لینے والا کوئی نہیں ہے۔

بعض کانگریسی وزارتِ عظمیٰ اور صدارت کے عہدیداز کو الگ کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ نرسمہا راؤ، وزیر خارجہ بھی ہیں، وزیر تجارت بھی ہیں اور کیا نہیں ہیں۔

اتنا مصروف آدمی پارٹی کے لئے کہاں سے وقت نکال سکتا ہے۔ موجودہ حالات میں وزیر اعظم تلاش کرنا تو بہت مشکل ہے۔ شاید اتنا ہی مشکل جتنا مشکل ولائی لامہ کو تلاش کرنا ہے۔ مگر کانگریس صدر کا انتخاب اتنا مشکل نہیں ہے۔

(استقامت، کانپور، بابری مسجد نمبر، جون 1993)



# بھارت میں نام نہاد جمہوریت کی قلعی کھل گئی

از: مولانا حضور احمد منتظری

6/دسمبر 1992 کو بالآخر وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، بھارتیہ جنتا پارٹی اور شیو سینا کے غنڈوں اور جنونیوں کے ہاتھوں بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ بابری مسجد کی شہادت نے صرف مسلمانانِ ہند ہی کو نہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا بلکہ اس کی دھمک پورے عالم اسلام میں محسوس کی گئی۔ نتیجتاً مظاہرے ہوئے، مارچ ہوئے اور کشت و خون ہوا۔ اس وحشیانہ واقعہ کی مذمت کی گئی، قرار دادیں منظور ہوئیں۔ اور دوبارہ مسجد کی تعمیر نو کا وعدہ ہوا۔ لیکن ان سب کا جواب کیا؟ بابری مسجد کے کھنڈر پر مندر کی عارضی تعمیر، اس میں عدالت کے اعلانیہ پوجا پاٹ، مسلمان مظاہرین پر بے دریغ پولیس فائرنگ، سورت کی سڑکوں پر مسلمان عورتوں کی آبروریزی اور ان کی فلمسازی، بمبئی میں شیوسینکوں کے ذریعہ بربریت، شیطنت اور بہیمیت کا مظاہرہ، ایک نکاتی رائے لینے کا سپریم کورٹ سے ظالمانہ فیصلہ، مسجد اور قبرستان کی آراضی کو مرکزی حکومت کے ذریعہ سرکاری تحویل میں لینے کا سیاہ ترین آرڈیننس، بے یار و مددگار بیواؤں کی سسکیاں، شیرخوار یتیموں کی معصوم آہیں، اپنی آنکھوں میں تابناک مستقبل کی امیدوں و تمناؤں کے روشن رکھنے والے نوجوانوں کے تڑپتے ہوئے لاشے، زندگی بھر کی جمع پونجی کی وردی پوش لٹیروں کے ہاتھوں لوٹ پاٹ۔ یہ ہے آزاد بھارت کا سیکولر کردار ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام　　وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

کیا اب بھی اس میں کوئی شبہ باقی رہا کہ ہندوستان کا حکمراں طبقہ اب مکمل طور پر ہندو کارڈ کھیلنے کی منصوبہ بندی میں مصروف ہے۔ 24/جنوری کا واقعہ ہے کہ میں ایک "سد بھاؤنا" میٹنگ میں شریک ہوا۔ ضلع کلکٹر اور پولیس کپتان مہمانِ خصوصی تھے۔ اور ایک سابق کانگریسی ایم. پی. صدر تھے میں نے اپنی تقریر میں 6/دسمبر کے المیہ کا قصوروار اتر پردیش اور مرکز دونوں ہی سرکاروں کو ٹھہرایا۔ بعد میں صدر صاحب نے اپنی تقریر میں صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ یو. پی. سرکار نے حلف نامہ داخل کیا اور سپریم کورٹ میں وعدہ کیا کہ ہم بابری مسجد کی حفاظت کریں گے تو پھر اسمیں مرکزی سرکار کا کیا قصور؟ اگر جواب دینے کی باری آتی تو میں یہ ضرور پوچھتا کہ صدر راج کے نفاذ کے بعد

اجودھیا میں 36 گھنٹے تک جو کارسیوا چلی تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ میں جانتا ہوں کہ آج کسی بھی کانگریسی میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ پارٹی کے اندر صدائے حق بلند کر سکے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، کانگریس کے اندر اب سوچ جڑ پکڑ چکی ہے کہ اب مسلم ووٹ ہم سے بہت دور جا چکا ہے۔ اس لئے کچھ ایسا کیا جائے کہ ہندو ووٹ ہم سے دور نہ ہو پائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اب سپریم کورٹ سے یہ ایک نکاتی رائے مانگی گئی ہے کہ بابری مسجد کی جگہ پہلے کوئی مندر تھا جسے توڑ کر مسجد کی تعمیر کی گئی۔ اب تو محض اس کا انتظار کرنا چاہئے کہ کب سپریم کورٹ کا فیصلہ آتا ہے اور حکومت بابری مسجد کی جگہ ہندو سماج کی دیرینہ مانگ کی تکمیل کے واسطے "رام مندر" کی تعمیر کرتی ہے۔

کانگریس کی مسلم دشمن پالیسی یہ کوئی نئی پالیسی نہیں کہ جس کا 6 ردسمبر کو بھانڈا پھوٹا ہو، اس کی یہ پالیسی روز اول سے ہے۔ اور اسی پالیسی کے باعث تقسیم ہند کا المیہ رونما ہوا، اور اقتدار میں آنے کے بعد مسلمانوں کو منظم اور غیر محسوس طریقے پر سرکاری اداروں سے برطرف کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ اور یہ سب کانگریس پارٹی نے سیکولرزم کی آڑ میں کیا اور جب رفتہ رفتہ 45 سال کے اندر مسلمانوں کو سرکاری اداروں، خاص کر انتظامیہ اور عدلیہ سے نکال باہر کیا گیا تو 6 ردسمبر کو کانگریس پارٹی نے اپنے چہرے سے سیکولرزم کے لبادے کو اُتار کر پھینک دیا اس نے خوب اچھی طرح سمجھ لیا کہ اب کانگریس نے اپنے مقصد کے حصول میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس نے دودھ پلا کر آر. ایس. ایس. کو اتنا مستحکم کر دیا ہے کہ اب ہندو تنظیم اور اس کی دوسری ذیلی تنظیموں کے ذریعہ ہم پولیس اور فوج کی مدد سے مسلمانوں کا سارا کس بل نکال دیں گے۔ بال ٹھاکرے کا ممبئی کے فسادات کے بعد یہ بیان دینا کہ ہم مسلمانوں کو تہذیب سکھا دی ہے اور ضرورت پڑی تو پھر سکھا دی جائے گی اور اس بیان کے بعد بھی اس کی زہر افشانی کا سلسلہ جاری رہنا کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ اب مسلمان خود کو برابر کا شہری سمجھنا چھوڑ دیں۔ کسی بھی ظلم، بربریت اور ناانصافی پر صدائے احتجاج بلند کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مسجد گرتی ہے تو گرنے دیں، جان و مال کا اتلاف ہوتا ہے تو ہونے دیں۔ لیکن خبردار جو اُف بھی کیا۔ آج ہر طرف اندھیرا ہے، گھٹا ٹوپ اندھیرا، اور اندھیرے میں کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے کہ سفر کے لئے کس سمت کا تعین کیا جائے، کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جائے، کس کو اپنا قائد تسلیم کیا جائے۔ کوئی مشورہ دیتا ہے کہ اب انتہا پسندی اور تشدد کا راستہ اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہم نے عدالت پر بھروسہ کیا، عدالت نے ہم کو دھوکہ دیا۔ ہم نے حکومت

پر بھروسہ کیا اس نے ہمارے آشیانوں میں آگ لگا دی۔ ہم نے امن و آشتی کا راستہ اختیار کیا اس کو ہماری بزدلی سے تعبیر کیا گیا۔ ہم نے اپنے آئینی حقوق کی مانگ کی تو ہماری زبانیں قلم کر دی گئیں، ہم نے یومِ جمہوریہ کو اظہارِ غم کے لئے ''یومِ سیاہ'' کے طور پر منایا تو اس کو وطن دشمنی قرار دیا گیا۔ لہٰذا اب تشدد و ہنگامے اور ہڑبونگ کا راستہ اختیار کرو کہ یہی راستہ مصالحت و مفاہمت کی راہ ہموار کرتا ہے۔ حکومت کے اونچے کان کسی مظلوم کی سسکیوں کو کیا سن سکیں گے۔ اس کے کان تک اپنی آواز پہنچانے کے لئے ایسے طاقتور دھماکوں کی ضرورت ہے جو پورے ملک کو جہنم کدہ بنا دے۔ کوئی مشورہ دیتا ہے کہ اب مسلمانوں کو مزید کوئی ایسا قدم نہیں اُٹھانا چاہئے جس سے مزید نقصان اُٹھانا پڑے۔ ہمیں اس ملک میں ایک امن پسند شہری کی حیثیت سے رہنا چاہئے۔ ایک مسجد کی بازیابی کو لیکر ہمیں اپنی ساری طاقت وقوت کو اسی سمت میں مرکوز کر دینا ہرگز دانشمندی نہیں ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اپنی تمام تر توجہ اپنی اقتصادی، تعلیمی اور سماجی حالت سدھارنے پر مرکوز کریں۔ ایک نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ نئی مندگی کی شروعات کریں۔ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔ اپنے اندر سیاسی شعور وادارک کو ڈھونڈیں اور اس حقیقت کا اعتراف کریں کہ ہندوستان اگر چہ ایک جمہوری و سیکولر ملک ہے لیکن یہاں ہر کام ہماری منشا کے مطابق ہو ہر فیصلہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو یہ ضروری تو نہیں۔ یہاں کی اکثریت ہندو ہے وہی طاقت کا مرکز ہیں۔ یہاں اگر ان کے جذبات کی قدر نہ ہوگی تو پھر کس کی ہوگی؟ آپ جس بات کو ناانصافی اور ظلم کہتے ہیں وہی ان کے نزدیک عین انصاف ہے۔ ایسی صورت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمان صبر وتحمل اور ثابت قدمی کے ساتھ اس طرح کے اور بھی واقعات کو برداشت کرنے کے لئے خود کو تیار رکھیں۔ اگر یہ ظلم ہے تو ایک دن یہ ظلم کی سیاہ رات ضرور ختم ہوگی ۔

ان اندھیروں سے نہ گھبراؤ مرے ہم وطنو    یہ اندھیرے مہِ کامل کا پتہ دیتے ہیں

آج مسلمان انہیں دو سوچوں کے بیچ پھنسا ہوا ہے، وہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ وہ کون سا مشورہ قبول کرے۔ کوئی ایسا رہبر ہے جو اس نازک وقت میں مسلمانِ ہند کی صحیح رہنمائی کر سکے؟



# بابری مسجد کی شہادت کا خون ملک کے درودیوار سے ٹپک رہا ہے

از: مولانا مختار احمد ندوی

بابری مسجد شہید کردی گئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۔شہید مسجد کے مقدس فرش پر رام مندر کا ڈھانچہ کھڑا کر دیا گیا۔ ثُمَّ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ، جہاں اللہ کو سجدہ کیا جاتا تھا اب وہاں رام کی مورتی کی پوجا ہوگی، مسجد کے بلند گنبد چار صدیوں سے ہندوستان میں مذہبی رواداری اور ہندو مسلم اتحاد کی علامت تھے۔ تعصب اور تنگ نظری کے خون سے لت پت جن خونخوار ہاتھوں نے مسجد کو شہید کیا۔ انہوں نے ہندوستان کی عظمت اور سیکولر ڈھانچے کی بنیاد گرادی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت سے ہندوستان کی ایک نئی تاریخ شروع ہوئی ہے۔ ملک میں ایک نئے انقلاب نے جنم لیا ہے۔ اس ملک نے صرف ایک مسجد نہیں کھوئی ہے، اپنی سیکولر روایات، ملی جلی تہذیب، پریم اور محبت اور بھائی چارہ سے بھرپور ہندوستانی سماج کی آبرو کھودی ہے۔ مسجد کے میناروں کے زمین بوس ہونے سے ملک کے اتحاد اور سالمیت کو جو جھٹکا لگا ہے اس زخم کو بھرنے میں صدیاں لگیں گی۔

مسجد کی شہادت کا تو ایک غم تھا ہی جس سے پوری ملت اسلامیہ نڈھال تھی کہ اچانک پورے ملک میں خون، تباہی، بربادی، ہلاکت اور معصوموں اور بے گناہوں کی شہادت کا دوسرا طوفان اٹھ کھڑا ہوگیا۔ ایسا لگتا ہے کہ مسجد کی شہادت کا خون پورے ملک کے درودیوار سے ٹپک رہا ہے۔

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسجد کو شہید کرنے والے مجرمین پر تو پولیس نے لاٹھی چارج تک نہیں کیا، لیکن اس کے غم میں آنسو بہانے والوں پر گولیاں برسائیں، ایک شہادت سے کتنی شہادتوں نے دارورسن کو شرف بخشا۔

یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہوا جب ملک افلاس کی چادر اوڑھے دربدر قرضوں کی بھیک مانگ رہا ہے۔ مہنگائی، بے روزگاری، افلاس اور جہالت سے پورا ملک کراہ رہا ہے۔ لیکن تمام حقائق سے منہ موڑ کر ''مسجد گرانے'' کو ملک کی سب سے بڑی ضرورت سمجھی گئی۔ یہ ننگے بھوکے مقروض اور بیمار عوام کی بے کسی کا مذاق اُڑانا ہے۔

اب پوری دنیا ایک محلہ بن گئی ہے۔ ہر ملک گلی کے ایک مکان کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ کسی گھر میں بلی بھی کودے تو پورے محلے والے بیدار ہو جاتے ہیں۔ آج بابری مسجد کی تباہی کا منظر پوری

دنیا نے کھلے عام دیکھا اور ہمارے ملک کی وحشت اور مذہبی دیوانگی کی نہایت بھیانک صورت ساری دنیا کے سامنے آئی۔ ملک صدیوں پیچھے چلا گیا۔ دنیا چاند پر بیٹھی مسجد توڑتے ہوئے ہمیں دیکھ کر مسکرا رہی ہے کہ ان غریبوں کے پاس مسجد گرانے اور مندر بنانے کے سوا کوئی دوسرا مسئلہ نہیں ہے۔

مسجد گرانے والے جنونی لوگ رام مندر کی دہائی دے کر ہندوستان کو ہندو اسٹیٹ بنانے کیلئے جنگ شروع کر چکے ہیں۔ اگر بدقسمتی سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو اس ملک کی صدارت سادھو اور وزارت پر مہنت لوگ براجمان ہوں گے پھر دن بھر بھجن ہوگا اور ترقی پذیر ملکوں کو صلواتیں سنائی جائیں گی۔

سوال یہ ہے کہ کیا اب صرف ماتم ہی کیا جائے گا۔ یا مل جل کر ملک کو تباہی سے بچانے اور ترقی پذیر دنیا کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھنے کی تدبیر کی جائے گی۔

بابری مسجد کے اس سانحہ کے باوجود ہم خاص طور پر مسلمانانِ ہند کو مخاطب کر کے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمان دنیا کی تاریخ ساز مصلح امت ہیں۔ انہیں ہر حادثے سے سبق لینا چاہئے۔ جو کچھ ہوا یقیناً برا ہوا، لیکن اب بد کو بدتر ہونے سے بچانے کی تدبیر کرنی چاہئے جس کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ علماء آپس میں اتحاد کو فروغ دیں اور ملت کے اتحاد کو مضبوط کریں۔ مسلک حقہ اتحاد کی بنیاد ہے۔ تاکہ ہندوستانی مسلمان ایک متحدہ امت بن کر ملک میں ایک ناقابل تسخیر طاقت بن کر اُبھریں۔

اتحاد ملت کے بعد مسلمانوں کے معاشرے کی اصلاح کی جدو جہد کو فریضہ سمجھ کر انجام دیا جائے، بلاشبہ مسلمان اس ملک کی دوسری بڑی قوم ہیں۔ جن کے اخلاق و کردار کا ملک پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اگر مسلمان ہر قسم کے جرائم، فضول خرچی، خرافات اور فضول حرکات سے تائب ہو کر سیدھے سادھے مومن، صاحب عزم و عمل مسلمان بن جائیں تو ان کے کردار سے پورا ملک متاثر ہوگا اور ان کی قومی اور ملی دھاک ملک پر قائم ہوگی۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ ملک کی تعمیر میں بھرپور حصہ لیں۔ ملک کے عوام و خواص کے دلوں میں اپنی جگہ پیدا کریں۔ ان تمام مباح کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں جن سے ملک میں امن، ترقی، اعتماد اور صلح جوئی کا جذبہ پیدا ہو، مسلمان اپنے مذہبی تشخص کو باقی رکھتے ہوئے اس ملک کو توڑنے

اور برباد کرنے والی ہر مذموم کوشش اور عمل کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور سچے ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے اپنے وطن مالوف کو ہر معروف سے معمور اور ہر منکر سے پاک کرنا اپنا اسلامی فریضہ سمجھیں۔

اتحاد ملت اور اصلاح معاشرہ کی تحریک کو گھر گھر پہنچانے کی بھرپور کوشش کریں۔ یہی ہماری ملّی اور قومی سعادت کی نشانی ہے جس سے ایک نہیں ہزاروں مساجد معمورۂ ہند پر تعمیر ہو سکیں گی۔

(شہادت بابری مسجد نمبر، ماہنامہ استقامت، جون ر 1993)



# مسٹر راؤ غلطی نہیں گناہ

از: آر. کے. کرنجیا☆
(معروف صحافی اور سابق مدیر بلٹز، ممبئی)

ارجن سنگھ کی بات میں صداقت تھی۔ ممکن ہے چند ماہ پیشتر ہم میں سے کچھ لوگوں کو ان کی اس بات سے اتفاق نہ رہا ہو کہ بی جے۔ پی، وی.ایچ.پی، اور آر.ایس.ایس والوں کا ٹولہ اجودھیا میں فساد برپا کرے گا۔ لیکن وہ بار بار یہ جتا رہے تھے۔ یہاں تک کہ وزیر اعظم کے سیاسی سکریٹری جتندر پرساد کے نام اپنے خط میں بھی انہوں نے یہی اصرار کیا تھا۔ مگر خود ان کی پارٹی والے ان سے اتفاق کرنے کے بجائے ان پر لعن طعن کرنے لگے تھے۔

مگر انسانی وسائل کے وزیر ارجن سنگھ اپنی بات پر اٹل رہے۔ یہاں تک کہ 'بلٹز' کو انہوں نے جو انٹرویو دیا اس میں بھی انہوں نے اس کا اعادہ کیا۔ اس انٹرویو میں بہت ہی انکساری سے انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ پورا ملک چاہتا ہے کہ اجودھیا میں رام مندر ضرور بنے، مگر بابری مسجد پر آنچ نہ آئے۔ مگر بی.جے.پی. کو امن و آشتی کا وہ راستہ کہاں پسند ہے جس پر چل کر منصفانہ حل ڈھونڈھا جائے۔

لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہم میں سے بھی کچھ لوگ بی.جے.پی. والوں کی حق گوئی اور شرافت پر یقین رکھتے تھے۔ لیکن آج وہ لوگ فریب خوردہ اور ہراساں ہیں۔ لیکن جن کی باتوں پر یقین کیا گیا تھا وہ بہت تجربہ کار اور میدان سیاست کے آزمودہ کار کھلاڑی تھے۔ وہ جب یہ کہتے تھے کہ ملک کے قانون کا احترام کیا جائے گا۔ آئین کی بالادستی تسلیم کی جائے گی اور عدالت کے فیصلہ سے انحراف نہ کیا جائے گا تو اسے کیسے نہ مانا جاتا؟

لیکن ان میں سے کسی پر عمل نہیں کیا گیا۔ عمل تو دور رہا ان یقین دہانیوں کی کھلی خلاف ورزیاں کی گئیں۔ خلاف ورزی ہی نہیں وعدوں کی دھجیاں اُڑائیں گئیں، تب ہی تو پہلے یہ کہا گیا تھا کہ بی.جے.پی. کے وزراء اعلیٰ اور ممبرانِ پارلیمنٹ کارسیوا میں کوئی حصہ نہیں لیں گے۔ لیکن دیکھنے میں

---

☆ موصوف کا حال میں انتقال ہوگیا ہے۔

یہ آیا کہ اور تو اور مرلی منوہر جوشی اور ایل. کے. اڈوانی جیسے بی. جے. پی. کے جغادری لیڈروں نے بھی کارسیوا کی حامی بھری۔

اِن لیڈروں کے دورخے پن سے اندازہ ہو چلا تھا کہ اجودھیا میں کیا ہوگا؟ یعنی کارسیوا کی آڑ میں رام مندر کی تعمیر نہیں بلکہ غنڈہ گردی ہوگی اور وہ بھی انتہائی بدترین قسم کی۔ یو. پی. کی حکومت نے اجودھیا جانے والے کانگریسیوں کو روکنے کے لئے تو دفعہ 144 لگا دی تھی مگر اپنی پارٹی کے کارکنوں کے لئے جو کارسیوا کرنے جارہے تھے۔ کوئی مزاحمت نہیں پیدا کی تھی۔ حالاں کہ وہ لوگ ایک جم غفیر کی شکل میں اور مہلک ہتھیاروں سے لیس وہاں جمع ہورہے تھے۔ سوال یہ ہے کہ بی. جے. پی. کی حکومت کا کارسیوکوں اور دوسرے شہریوں کے لئے کیا الگ الگ قانون تھا؟ اس کے بعد کلیان سنگھ کی گورنمنٹ کو برطرف کر کے بہت صحیح کام کیا گیا۔ اور جو کوئی یہ کہتا ہے کہ بابری مسجد میں تو 1949ء سے نماز نہیں ہو رہی تھی اور وہاں مورتیاں رکھی ہوئی تھیں تو اُسے یہ جان لینا چاہئے کہ اگر وہ مندر تھا تو مندر ہی کو توڑنا کہاں کا انصاف ہے؟ یہ کیا کم گناہ ہے؟ غرض یہ کہ جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے یہ واقعہ غنڈہ گردی کی مثال تھا۔

کانگریس کے بھی اپنے مسائل ہیں۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ بی. جے. پی. والوں کی جھوٹی تسلیوں میں آکر مات کھا چکے ہیں۔ ان کے حال پر افسوس آتا ہے کہ انٹلی جنس کی جو رپورٹیں آرہی تھیں اس کے بعد بھی وہ کیوں بھروسہ کئے ہوئے تھے؟ خود ان کی پارٹی کے لوگ شبہ ظاہر کرتے تھے مگر وزیر اعظم کو تو بی. جے. پی. میں موجود اپنے دوستوں پر زیادہ بھروسہ تھا۔ اس لئے انہیں منہ کی کھانی پڑی ہے۔ ان سے جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کا انہیں اب خمیازہ بھی بھگتنا پڑے گا۔

وزیر اعظم کا آغاز بہت اچھا تھا۔ انہیں کامیابیاں بھی مل رہی تھیں۔ مگر ان کامیابیوں کا کیا فائدہ، جب معاشی محاذ پر انہوں نے ملک کو اندھی گلی میں ڈھکیل دیا تھا یا دلدل میں پھنسا دیا تھا۔ اب انہیں سیاسی محاذ پر بھی زک اُٹھانی پڑی ہے۔ حالاں کہ اس انجام سے بچنے کی انہوں نے بھرپور کوشش کی۔ مگر انہیں تباہ کن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس سے انہیں کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

کانگریس والوں کو اب اپنی پالیسی اور اس کے نتائج وعواقب پر از سرِ نو غور کرنا ہے۔ معاشی میدان میں ان لوگوں نے بین الاقوامی مالی فنڈ اور عالمی بینک کی اطاعت قبول کی تو سیاست میں بی. جے. پی. اور دوسری فرقہ پرست قوتوں کے سامنے سر جھکا دیا۔ اب اس سلسلہ کو باقی رکھنا صحیح نہیں۔

اسے بلاتاخیر ختم کرنا ہوگا۔

وزیر اعظم کی عمر تو زیادہ ہے ہی ان کی ساکھ بھی کمزور ہو چکی ہے لہٰذا انہیں خود قیادت سے دستبردار ہو کر ایسے شخص کو یہ ذمہ داری سونپ دینی چاہئے جس پر اجودھیا کی ناقص پالیسی پر عمل کرنے کا الزام نہ ہو اور جسے بی۔جے۔پی۔ کے علاوہ اور دوسری تمام اپوزیشن پارٹیوں کا بھی اعتماد حاصل ہو اور جو تمام کانگریسیوں کو لے کر اس طرح چلے کہ نئی اقتصادی پالیسی کا بھی رُخ بدل سکے۔

(بلٹز، دسمبر 1992، ممبئی)



# منصوبہ بند سازش

از: اروند کمار سنگھ

وشو ہندو پریشد اور سادھو سنتوں نے 9 رجولائی 1992ء کو ہی بابری مسجد کو منہدم کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا اور مندر مخالف لوگوں کو بڑی چالاکی کے ساتھ قربانی کا بکرا بنانے کے لئے جال بن لیا تھا۔ لیکن حالات اور واقعات نے یکسر کروٹ لی اور بی۔جے۔پی کی مداخلت سے یہ معاملہ ٹل گئی اور اس طرح بابری مسجد کی زندگی چار ماہ تک اور بڑھ گئی۔ راقم الحروف کو کچھ ایسے ثبوت ملے ہیں جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ 13 رمئی 1992 کو اجین میں ہوئی مارگ درشک منڈل کی خفیہ میٹنگ میں اس منصوبے پر سنجیدگی کے ساتھ تبادلہ خیال ہوا۔ مارگ درشک منڈل کی کارروائی خفیہ طور پر بند کمرے میں ہوتی ہے اور عام طور پر وہی باتیں منظر عام پر آتی ہیں جن کا اعلان کیا جاتا ہو۔ بابری مسجد کو اُڑانے کے سلسلے میں ہوئی گفتگو میں وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری اشوک سنگھل بھی شریک تھے۔ بات چیت کی تفصیل اس طرح ہے۔

شنکر آچاریہ سوامی ستیہ متر آنند

''آج مندر کی تعمیر کے سوال پر عوام میں عقیدت اور بھکتی کے جذبات موجود ہیں۔ وہ صرف تجویزوں سے زیادہ دیر تک نہیں ٹک سکیں گے۔ اس سلسلہ میں ہمیں کچھ ٹھوس کام کرنے ہی ہوں گے۔ یہ مناسب ہوگا کہ ہم عدالت کی بات نہ مان کر رام للہ کی مورتی کو وہاں سے منتقل کر دیں اور بلڈوزر چلا کر موجودہ ڈھانچہ کو گرادیں۔ اس کی وجہ سے بھلے ہی اتر پردیش کی حکومت گرتی ہے تو گرے''۔

اشوک سنگھل

''رام جنم بھومی پر واقع ڈھانچہ کے سلسلے میں لوگوں کے خیالات الگ الگ ہیں۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ مندر کا گربھ گرہ وہی ہوگا جہاں آج رام للاّ براجمان ہیں۔ اب ڈھانچے کو گرانے کی بات چل رہی ہے لیکن اس سلسلہ میں حتمی فیصلہ کرنے سے قبل کمیٹی کو اس سلسلہ میں سنجیدگی اور توازن کے ساتھ غور کرنا ہوگا''۔

### رام چندر داس پرم ہنس

''متنازعہ ڈھانچہ کو گرا دیا جائے۔ آج تاریخ مقرر کر دی جائے، مبینہ بابری مسجد کو اُکھاڑ پھینکا جائے''۔

### سوامی سریش آنند (بی۔ جے۔ پی۔ ایم۔ پی)

''ڈھانچہ توڑنا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر ایسا ہوگا تو آئندہ صورت حال کیا ہوگی ابھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس کام میں ہمیں قدم بہ قدم آگے بڑھنا ہے۔ جو بھی کام ہو وہ منصوبہ بند ہو زیادہ بے تابی سے نامناسب قدم بھی اُٹھ سکتا ہے''۔

### سوامی بام دیو

''جو مہاتما قومی اور بین الاقوامی صورت حال کا علم رکھتے ہیں وہ اس بات غور کر لیں اگر موجودہ ڈھانچہ توڑ دیا گیا تو کئی ممالک میں جھگڑا ہو سکتا ہے۔ اس سے مرکزی حکومت پر بھی دباؤ بڑھ سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے ہمیں براہِ راست مرکزی حکومت سے جھگڑا مول لینا پڑے گا۔ اس سلسلہ میں سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس پر بھی اتفاق رائے سے ڈھانچہ توڑنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو میں سب سے پہلے تیار ہوں''۔

### سوامی وجے آنند (بھارت سیوا سنگھ)

''اگر ہم ایک سال میں مندر کی تعمیر نو کر کے نہیں دکھائیں گے تو ٹھیک نہیں ہوگا۔ ہمیں مرکزی حکومت کا چیلنج بھی قبول کر لینا چاہئے اور ڈھانچہ توڑ دیا جانے چاہئے''۔

اس موضوع پر رام جنم بھومی مکتی یگیہ سمتی کے سربراہ مہنت اویدھ ناتھ، سوامی اونکار ناتھ، سنت اجودھیا داس، دھرم داس، سوامی رام بھدر آچاریہ اور پرکاش آنند وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بیشتر سنت ڈھانچہ کو ہٹانے اور ڈھانے کے حق میں تھے۔ پوری ہوشیاری کے ساتھ پلان بنایا گیا اور اسے بہت ہی خفیہ رکھا گیا۔ 13 مئی کی میٹنگ میں صرف دو تجویزیں آئیں۔ ایک میں اجین کے مہا کنبھ میں موجود تمام دھرم آچاریوں سے مارگ درشک منڈل نے اپیل کی کہ مندر بنانے کے ساتھ دیوی شکتیوں کی آرادھنا بھی ضروری ہے۔ سنت اچاریہ اپنی اپنی کلاسیکی روایتوں

کے مطابق مذہبی رسوم ادا کریں اور اس سال کا چاتورماس اجودھیا میں ہی کرنے کی مہربانی کریں۔

اس کے بعد منصوبہ بند طریقے سے 9/جولائی کا پروگرام طے ہوا۔ 9/جولائی سے قبل اجودھیا میں ہی مارگ درشک منڈل کی سہ روزہ میٹنگ 6/سے 8 جولائی تک چلی۔ 6/جولائی کی میٹنگ کے لئے پہلے ہی ڈھانچہ ڈھانے کی ایک کاٹ تیار کر لی گئی اور تجویز میں باقاعدہ ''ممکنہ سازش'' کی کہانی بھی گڑھ لی گئی۔ تجویز کے مطابق ''رام مخالف تنظیموں اور مندر مخالف سیاسی جماعتوں کے تخریب پسند لیڈر، کچھ سماج دشمن عناصر'' کو سادھوؤں کے حلیے میں رام جنم بھومی احاطہ (بابری مسجد) میں بھیج کر رام للاّ کی پوجا اور موجودہ ڈھانچہ کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے تاکہ جیرنو دوار کا کام اور سرو دیو انستھان کے کاموں کو تتر بتر کیا جا سکے۔

اسی دن مندر جیرنو دوار کرم سمتی کی تشکیل ہوئی۔ پہلے اس کا نام مندر نرمان سمیتی تھا۔ اس میں اشوک سنگھل، بام دیو، واسو دیو آنند، مہنت اویدھ ناتھ، پرم ہنس، نتیہ گوپال داس، ودیا نند، ستیہ مترانند اور پرمانند ہیں۔ بعد میں بام دیو کو کمیٹی کا صدر بنایا گیا اور اعلان کیا گیا کہ یہ کمیٹی سارا کام دیکھے گی۔

اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے وشو ہندو پریشد فی الحال ڈھانچہ (مسجد) کی حفاظت کرنا چاہتی ہے اس لئے ایک تجویز میں کہا گیا کہ ''رام للاّ کے پرکٹ ہونے کے بعد سے بابر کا بنایا ہوا ڈھانچہ ہندو سماج کے لئے سب سے زیادہ عقیدت کا مرکز بن گیا ہے۔ مجوزہ نقشے کے مطابق مندر بننے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس لئے ڈھانچہ کو بچانا ضروری ہے۔ لیکن رام مخالف رام للہ کے پاک پوجا استھان اور موجودہ گربھ گرہ کو نقصان پہنچا کر سارے کام کو منتشر کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسی کوئی بھی کوشش مذہب، ذات اور دھرم کے تئیں سنگین جرم ثابت ہوگا۔ اس منصوبہ میں رخنہ اندازی کی سازش سنگین جرم تصور کی جائے گی۔

واضح رہے کہ 9/جولائی سے اجودھیا میں مندر بنانے کی غیر معینہ تاریخ رکھی تھی۔ کیوں کہ دشواری پیش آسکتی تھی لیکن وشو ہندو پریشد اور سنتوں کی فوج اکٹھا کرکے یہ پوری کوشش کی گئی کہ یہاں کارسیوکوں کا سیلاب امڈ پڑے اور ڈھانچہ (مسجد) ٹوٹ جائے۔ لیکن اس وقت یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بی۔ جے۔ پی۔ کے سینئر لیڈروں کو بھی اس کی بھنک مل گئی تھی اور وہ بے چین ہو گئے اور مشترکہ کوششوں سے سادھوؤں کو راضی کرکے تین ماہ تک کے لئے اس

معاملہ کو ٹال دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود ڈھانچہ منہدم کرنے کا ٹھوس منصوبہ برقرار رہا۔

دھرم سنسد میں 6/دسمبر کی تاریخ طے ہونے کے پہلے اور بعد میں بام دیو کے یہاں بہتر ے لوگوں نے حاضری لگائی اور جیرنو دوار سمیتی کی درجنوں میٹنگیں ہوئیں اس دوران وزیر اعظم کو جھانسہ دینے کی کوششیں بھی کی جاتی رہیں۔ اس دھرم سنسد کے مطابق سادھوؤں کی تیکھی ناراضگی کو دیکھتے ہوئے سنگھل کے بھی کان کھڑے ہوگئے اور یہ طے پایا گیا کہ اجودھیا میں اس دفعہ سنتوں کی آڑ میں زبردست دباؤ بنایا جائے اور کارسیوکوں کا سیلاب اُمڈ پڑے۔ اس کے بعد ہی آر.ایس.ایس.، بی. جے. پی. کی چاروں حکومتوں اور بی.جے.پی. کی دوسری تنظیموں کے ساتھ سادھو سنتوں کی مشترکہ کوششوں کے نتیجہ میں کارسیوکوں کا بہت بڑا مجمع لگایا گیا۔ لیکن ڈھانچہ توڑنے کی اسکیم معدودے چند لوگوں کے درمیان اور بہت ہی خفیہ انداز سے بنائی گئی۔ اور لال کرشن اڈوانی کو بھی اس کی بھنک نہیں مل سکی۔ لیکن سنگھل، ونے کٹیاز، اوما بھارتی، رتمبھرا اور اچاریہ دھرمیندر پرم ہنس اور شوسینا کے موریشور ساوے وغیرہ اس سے آگاہ تھے۔

یو. پی. کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کو بھی جب اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اب ان کی حکومت محفوظ نہیں رہے گی تو وہ اپنے جلسوں میں اس بات کا اظہار کرنے لگے کہ رام مندر جلد بنانے کے لئے مرکز میں بھی بی.جے.پی. حکومت ہونی چاہئے اور ملک میں ہندوتو کی حفاظت کے لئے بی.جے.پی. کو چار ریاستی حکومت تک محدود رکھنے سے کام نہیں چلے گا۔

متھرا کے ایم.پی. سچدانند ہری ساکشی نے حال ہی میں اس سلسلہ میں انکشاف کیا ہے کہ 5/ دسمبر کو دھرم آچاریوں کی کیندریہ مارگ درشک منڈل کی میٹنگ میں ہی متنازعہ ڈھانچہ کو توڑنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ لیکن یہ غلط ہے۔ یہ فیصلہ 3/دور میں اجودھیا میں ہوئے مندر جیرنو دوار کرم سمیتی نے کیا اور مارگ درشک منڈل کے بیشتر سادھوؤں کو اس کی بھنک بھی نہیں ملی۔ میٹنگ میں 110 سنتوں کی ریکارڈ حاضری تھی۔ لیکن پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک گھنٹہ کے دوران میٹنگ ختم ہوگئی۔ اور اشوک سنگھل کی پڑھی ہوئی تجویز سے علامتی کارسیوا کا ایک ایسا شگوفہ سامنے آیا کہ صرف 4 سنتوں آچاریہ دھرمیندر، چمے آنند، بام دیو اور وشوے تیرتھ کی تقریر میں سب ختم ہو گیا۔ دکھانے کے لئے سیوکوں کے لئے صبر وضبط کی تجویز آئی۔ تجویز پیش کرنے والے یہی بام دیو توڑ پھوڑ میں سب سے زیادہ مصروف اور سرگرم تھے۔

بی۔ جے۔ پی۔ کے لیڈر اس واقعہ کو غیر متوقع، بدقسمتی اور شیوسینکوں کی کرتوت سمجھتے تھے لیکن حقیقتاً ڈھانچہ منہدم کرنے کے منصوبہ میں اس کے ٹکٹ پر رکن پارلیمنٹ بننے والے لوگ شامل تھے۔ حلقہ مشرقی دلی کے رکن پارلیمنٹ بی۔ایل۔ شرما پریم نے تو آگرہ میں واضح طور پر کہا تھا کہ متنازعہ ڈھانچہ کو گرا کر مندر کی تعمیر مکمل ہوگی۔ اس کارستانی میں جنوب کے کارسیوکوں کو آگے کیا گیا تا کہ کسی طرح سے تشدد ہو تو نرسمہا راؤ کی بدنامی ہو اور یہ الزام بھی لگایا جا سکے کہ ان ہی کے لوگوں نے ڈھانچہ کو توڑا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس واقعہ کے پس پشت سنجیدہ ذہن کارفرما تھا۔ یہ بلا وجہ نہیں ہے کہ سنگھل، اوما بھارتی سے لے کر بہت سے لوگ اس واقعہ سے خوش ہیں اس کی تہہ میں جانے سے بہت سی چیزیں اُجاگر ہوتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ پولیس والوں کی پٹائی سے لے کر سارے کام کس قدر منصوبہ بند تھے۔ (شہید بابری مسجد، مرتب: معصوم مرادآبادی)



# بابری مسجد کے تنازعہ کو بین الاقوامی مسئلہ بنانے والے اہم فیصلے

از: اے.جی نورانی
(معروف صحافی اور دانشور)

## بابری مسجد کی شہادت سے قبل لکھا گیا ایک تجزیاتی مضمون

اتر پردیش کی سرزمین ہندو مسلم اتحاد اور دو قوموں کے درمیان اخوت اور بھائی چارگی کی بنا پر - اس تہذیب کی نمایاں ترین مثال تھی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کہتے تھے۔ 1850ء کی بات ہے جب اتر پردیش اودھ کہلاتا تھا اور وہاں نواب واجد علی شاہ کی حکومت تھی۔ اس وقت فیض آباد کا اجودھیا ہندو اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی والا ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ جہاں دونوں فرقوں کے درمیان باہمی محبت اور رواداری کے سبب بڑا خوش گوار اور پرسکون ماحول تھا۔

فرقہ پرستی کے زہر نے ماحول کو آلودہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی بغض وعناد کی چنگاری کسی کے دل میں سلگ رہی تھی مگر ایک ایسا طبقہ تھا جو اس اتحاد اور اتفاق کو انتشار اور نفاق میں تبدیل کرنا چاہتا تھا تاکہ عوام کے درمیان پھوٹ ڈال کر ان پر حکومت کی جائے یہ طبقہ برسرِ اقتدار فرنگیوں کا طبقہ تھا۔

انگریز یکے بعد دیگر ہندوستان کے تقریباً تمام علاقوں کو ہڑپ کر چکے تھے صرف اودھ ہی کی حکومت بچ گئی تھی لہٰذا ایک منصوبے کے تحت ڈسٹرکٹ گزیٹیر میں یہ عجیب وغریب انکشاف کیا گیا کہ جہاں اس وقت بابری مسجد واقع ہے وہ دراصل شری رام کا اجنم استھان ہے۔

(گزیٹیر صوبہ اودھ، فیض آباد، جلد 48، مرتبہ: ایچ.آر.نیوال)

اس وقت تک کسی بھی سرکردہ ہندو مورخ، یا ہندو مذہبی رہنما نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ اجودھیا کا وہ مقام جہاں بابری مسجد واقع تھی رام کا جنم استھان تھا مگر گزیٹیر کے انکشاف کے بعد ہی ہنومان گڑھی کے مہنت نے واویلا شروع کر دیا کہ ان کے بھگوان سری رام چندر کی پیدائش اس مقام پر ہوئی تھی مہنت کے اس مسلسل شور شرابے سے پہلی مرتبہ اجودھیا کی فضا میں فرقہ پرستی کی بو پھیلنے لگی۔

جب ہندو مسلم کشیدگی بہت بڑھ گئی تو لکھنؤ میں برطانوی ریزیڈنٹ کرنل سلمن نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ صوبہ میں امن وامان کی صورت حال خد درجہ خراب ہے۔ اور نواب واجد علی شاہ کی گرفت

اپنی رعایا پر بہت کمزور ہو گئی ہے۔ دراصل اس بہانے سے انگریز واجد علی شاہ کو برطرف کر کے اودھ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ صورت حال اس وقت او زیادہ خراب ہو گئی جب ایک مہنت کو ان کے بھائیوں نے مہنتوں کی گدی سے خارج کر دیا اور وہ لکھنؤ پہنچ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔ اس نو مسلم نے لکھنؤ کی مشہور شخصیت مولوی امیر علی سے تعلقات پیدا کر کے مسلمانوں کے درمیان یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ اجودھیا میں ہندوؤں نے بابری مسجد کو شہید کر دیا۔ مولوی امیر علی نے مسلح مسلم دستوں کے ساتھ اجودھیا میں بیراگیوں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا۔ واجد علی شاہ نے اس فتنہ کو ختم کرنے کے کئے برطانوی ریزیڈنٹ سے مدد مانگی۔ اور اجودھیا میں امن قائم کرنے کے لئے ایک فوج روانہ کر دی۔ زبردست لڑائی کے دوران مولوی امیر علی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور ان کی فوج منتشر ہو گئی۔ اس واقعہ نے اجودھیا اور فیض آباد کی نفرت اور بغاوت کی چنگاری کو بھڑکا دیا اور کئی بار وہاں جھڑپیں ہوئیں۔ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر مرتبہ مہنتوں نے انگریزی فوج کا ساتھ دیا۔ انگریزوں کی اسی حمایت کا نتیجہ تھا کہ بابری مسجد کے سامنے زمین پر مہنتوں کو مالکانہ حقوق دے دیئے گئے اور مسجد کے بالکل قریب رام چندر جی کی جائے پیدائش کی علامت کے طور پر رام چبوترہ بنانے کی اجازت دے دی گئی۔

ہندوؤں نے اس چبوترہ پر رام کیرتن شروع کر دی اور اس کے بعد وہاں کا فرقہ وارانہ ماحول کسی حد تک خوشگوار ہو گیا۔ جو ہندوستان کی آزادی کی جنگ کے زمانے تک قائم رہا۔ 15 راگست 1947ء کا دن ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم باب تھا۔ اس روز ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات ملی تھی مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ دن ہندوستان کی تاریخ میں سیاہ ترین دن بھی تھا جب ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خوں ریز فسادات میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس وقت اجودھیا میں بھی شر پسندوں نے فساد برپا کرنے کی کوشش کی۔ 13 رنومبر 1949ء کو اکشے برہمچاری کو معلوم ہوا کہ بابری مسجد کے پاس قبرستان کے بیچ واقع ایک گنبد کو ہندوؤں نے توڑ دیا اور اس کی جگہ ایک چبوترا بنانے لگے۔ تعزیرات ہند کی دفعہ 145 کے تحت انہوں نے سٹی مجسٹریٹ کے یہاں اس ظلم کے خلاف پٹیشن دائر کی لیکن مجسٹریٹ نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ گنبدوں کی کھدائی کی جگہ 9 ردن تک رامائن پاٹھ ہوتا رہا اور بابری مسجد کے سامنے جشن دعوت کا اہتمام ہوتا رہا۔ تانگوں اور موٹر کاروں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ رام کا جنم

استھان واپس لے لیا گیا ہے۔ ہندوؤں نے کچھ پرانے مقبروں کو بھی ڈھا دیا اور ان کی جگہ مورتیاں نصب کر دیں۔

اس واقعہ کے ایک ماہ کے بعد 22 دسمبر 1949ء کو رات کے اندھیرے میں بابری مسجد کے اندر رام کی مورتیاں رکھ دی گئیں۔ حالانکہ گزشتہ واقعات کے پیش نظر اس پورے علاقے میں دفعہ 144 نافذ تھی۔ اس سنسنی خیز اور اشتعال انگیز کارروائی کے خلاف ضلع مجسٹریٹ نے کسی قسم کی تحقیقات ضروری نہیں سمجھی اور نہ ہی مسجد سے مورتیاں ہٹانے کا حکم صادر کیا حالانکہ اس دن 12 بجے دن صرف چند آدمی وہاں موجود تھے اور مورتیاں آسانی سے ہٹائی جا سکتی تھیں۔

ایسے کشیدہ ماحول میں عدالت سے دفعہ 145 کے تحت ایک آرڈر پاس کیا گیا جس کے مطابق مسجد میں مورتیوں کی پوجا جاری رہی۔ جبکہ مسلمانوں کو وہاں جانے اور نماز پڑھنے سے روک دیا گیا۔ پھر 1950ء ایک عدالتی حکم کے ذریعہ مسجد میں تالا لگا دیا گیا۔

اس کے بعد 40 برسوں تک عدالت نے اجودھیا کے مقدمے کو سرد خانے میں رکھا۔ اور پھر 25 جنوری 1986ء کو یہ مسئلہ ایک بار پھر منظر عام پر آیا جب یو.سی. پانڈے نے مسجد میں پوجا کرنے پر لگی ہوئی پابندی ہٹانے کے لئے پٹیشن داخل کیا، ہائی کورٹ نے پوجا پر پابندی لگا دی تھی اس پٹیشن کے بعد عدالتوں نے جو اہم فیصلے کئے اس نے اجودھیا کے معاملے کو قومی بلکہ بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا۔ اور ہندوستان کے دو فرقوں کے درمیان نفرت کی ایک آگ بھڑکا دی ہے جس کے بجھنے کے امکانات کم از کم مستقل قریب میں نظر نہیں آتے۔ عدالتوں کے جن فیصلوں نے اجودھیا کو ملک کا سب سے اہم مسئلہ بنا دیا اس کی مختصر تفصیل حسب ذیل ہے۔

یکم فروری 1986ء: یو.سی. پانڈے کی اپیل پر ڈسٹرکٹ جج کے .ایم. پانڈے نے مسجد میں لگے ہوئے تالے کو کھولنے کی اجازت دے دی، اس مقدمے میں مسلمانوں کی سماعت نہیں کی گئی اور اس کے خلاف جو درخواست داخل کی گئی اسے مسترد کر دیا گیا۔

تالا کھولنے کا حکم جس مقدمے میں دیا گیا اس میں یو.سی. پانڈے فریق نہیں تھا۔ مدعی کی موت کے بعد مقدمے کو منسوخ کر دیا گیا اور مدعی کی جگہ اس کا کوئی جانشین نہیں مقرر کیا گیا۔

3 فروری 1986ء: ہائی کورٹ کے واحد جج نے سابقہ آرڈر کو منسوخ کرنے کے لئے

داخل ہونے والے رٹ پٹیشن کو مسترد کر دیا اور یہ حکم صادر کیا کہ ''متنازعہ جائیداد کی موجودہ نوعیت تبدیل نہیں ہوگی جب تک کہ عدالت کی جانب سے مزید حکمنامے جاری نہ کئے جائیں''۔ اس فیصلے کے بعد بابری مسجد کا مسئلہ قومی نوعیت کی حیثیت اختیار کر گیا۔

23/جولائی 1987ء: ہائی کورٹ نے متنازعہ جائیداد (بابری مسجد اور اس سے منسلک قطعات اراضی) کے لئے ایک نگراں مقرر کر دیا۔

12/جولائی 1989ء: اجودھیا تنازعہ کے تعلق سے 12/جولائی 1989ء کا فیصلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ لکھنؤ بنچ نے ہائی کورٹ کی ایک پوری بنچ کے ذریعہ مسجد کے تعلق سے تمام پانچوں مقدمات کی سماعت کے لئے سمن جاری کر دیئے۔ واضح رہے کہ پانچواں مقدمہ 1989ء میں دائر کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے چار مقدمات جو وی.ایچ.پی. کے حامیوں نے دائر کئے تھے اس میں کسی بھی مقدمے میں یہ دعویٰ نہیں کیا گیا تھا کہ بابری مسجد کسی مندر کو منہدم کر کے تعمیر کی گئی تھی۔ یہ دعویٰ پہلی بار 2/دسمبر 1989ء کو مسلمانوں نے دائر کیا تھا۔ اور 9/نومبر کو اجودھیا میں شلانیاس کرنے کا منصوبہ بنایا۔

14/اگست 1989ء: ریاست کی درخواست پر ہائی کورٹ نے حکم صادر کیا کہ جب تک عدالت مزید کوئی حکم صادر نہ کرے مقدمے کے فریقین جوں کی توں صورت حال برقرار رکھیں گے۔ اور متنازعہ جائیداد کی نوعیت کو تبدیل نہیں کریں گے۔

27/ستمبر 1989ء: وزیر داخلہ بوٹا سنگھ اور وزیر اعلیٰ این.ڈی. تیواری نے وی.ایچ.پی. کے ساتھ معاہدہ کر لیا جس میں شیلانیاس کی اجازت دے دی گئی۔ وی.ایچ.پی. نے عدالت کے 14/اگست کے آرڈر پر قائم رہنے کا اعادہ کیا۔

7/نومبر 1989: عدالت نے یہ واضح کر دیا کہ اس کا حکم مقدمہ کے کاغذات میں داخل شدہ تمام جائیداد کا احاطہ کرتا ہے۔ یعنی مسجد اور اس سے منسلک خالی قطعات اراضی جو مسلمانوں کی طرف سے داخل کی گئی درخواست میں شامل تھی۔

10, 7/اکتوبر 1991ء: ''اجودھیا میں سیاحت اور یاتریوں کو سہولتیں فراہم کرنے کی خاطر علاقے کی ترقی کے لئے ''لینڈ ایکیوزیشن'' ایکٹ 1884ء کی دفعہ 4 اور 6 کے تحت یو.پی. حکومت نے مسجد سے منسلک قطعات اراضی حاصل کر لئے۔

25/اکتوبر 1991ء: حکومت کی طرف سے بابری مسجد سے منسلک قطعات اراضی اکوائر کرنے کے عمل کو چیلنج کرنے والے ایک رٹ پٹیشن پر ہائی کورٹ نے ایک عارضی حکم نامہ صادر کیا جس میں ریاست کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ متنازعہ قطعات اراضی پر قبضہ رکھنے کی اجازت دے دے۔ یہ اجازت اعلامیہ میں درج کردہ مقصد کی تکمیل کے لئے دی گئی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت بھی کی گئی کہ وہاں پر مستقل نوعیت کی کوئی تعمیر نہ کی جائے حالانکہ عارضی نوعیت کی تعمیر کے لئے اجازت تھی۔ عدالت کو اراضی پر قبضہ کے تعلق سے مزید حکم نامے جاری کرنے کا حق تھا۔ عدالت نے یہ بھی ہدایت کی کہ حاصل شدہ زمین کو نہ تو کسی دوسری پارٹی کو دی جائے گی اور نہ ہی اسے الگ کیا جائے گا۔

15/نومبر 1991ء: 31/اکتوبر کو مسجد پر بھگوا جھنڈا لہرانے کے بعد زمین حاصل کی اور قانونی چارہ جوئی کو چیلنج کرنے والے پٹیشن پر سپریم کورٹ نے ایک آرڈر جاری کیا۔ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے 2/نومبر کو قومی یک جہتی کونسل کو یقین دلایا تھا کہ جب تک آخری فیصلہ نہیں ہو جائے گا ان کی حکومت رام جنم بھومی/بابری مسجد کی عمارت کی حفاظت کے لئے خود کو ذمہ دار سمجھے گی نیز اور زمین کی حصولیابی کی کارروائی میں عدالت کے احکامات کو پوری طرح لاگو کیا جائے گا اور الہ آباد ہائی کورٹ میں پہلے سے پڑے ہوئے مقدمات پر عدالت کے فیصلے کی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔

27/اپریل 1992ء: قومی یک جہتی کونسل کی اسٹینڈنگ کمیٹی اور ایس. آر. بومئی کی قیادت میں ممبران پارلیمنٹ کے وفد نے اس خیال کا اظہار کیا کہ موجودہ عمارت کو منہدم کرنے اور اسے زمین بوس کرنے کی تیاری کے تعلق سے یو. پی. حکومت کے اقدامات سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے احکامات کے بالکل متوازی ہیں۔

9/جولائی 1992: متنازعہ زمین پر وی. ایچ. پی. نے مندر کے لئے ایک پلیٹ فارم کی تعمیر شروع کر دی۔

11/جولائی 1992ء: سپریم کورٹ کے جج این. وینکٹ چلیا نے اپنی رہائش گاہ پر ایک خصوصی میٹنگ میں وارننگ دی کہ عدالت کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اگر کوئی مستقل تعمیر کی گئی تو اسے گرایا جا سکتا ہے۔

13/جولائی 1992ء: الہ آباد ہائی کورٹ کی خصوصی بنچ نے ایک (جسٹس ایس.ایچ.اے رضا) کے مقابلے میں دو (جسٹس ایس.سی. ماتھر اور جسٹس برجیش کمار) ججوں نے درخواست کو مسترد کر دیا جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ مسجد کے اطراف میں ہونے والی کھدائی کے خلاف ہدایت جاری کرے۔

15/جولائی 1992ء: بنچ نے متفقہ طور پر ایک حکمنامہ جاری کیا کہ مخالف پارٹی ایکوائر کی ہوئی زمین پر تعمیر کی کارروائی سے احتراز کرے۔

22/جولائی 1992ء: سپریم کورٹ نے اپنے 15/نومبر 1991ء کے حکمنامے کی خلاف ورزی کے تعلق سے داخل کردہ پٹیشن پر سماعت کے بعد اتر پردیش حکومت سے ایکوائر کی ہوئی زمین پر تعمیراتی کاروائی کو غیر مشروط طور پر روکنے کی ہدایت کی اور اس نے خود ہی ایکیوزیشن زمین کی حصولیابی اور یہ کہ آیا ہندو زمین پر تعمیراتی کام کر سکتے ہیں مقدمات کی تیاری کا اعادہ کیا۔ مگر یہ تجویز اتر پردیش حکومت نے منظور نہیں کی۔ مسٹر جسٹس وینکٹ چلیا نے کہا کہ ''اگر ریاستی حکومت سنتوں، مہنتوں اور وشو ہندو پریشد کو مسجد کمپلکس تعمیراتی کاروائی روکنے میں ناکام رہی تو عدالت یہ فیصلہ کرے گی کہ ریاستی حکومت آئین کی دفعات کے ماتحت کام کر رہی ہے یا نہیں۔

26/جولائی 1992ء: کارسیوا روک دی گئی۔

27/جولائی 1992ء: وزیر اعظم پی.وی.نرسمہا راؤ نے پارلیمنٹ میں ایک بیان دیا کہ وہ 4 ماہ کی مدت کے دوران ''اجودھیا کا مسئلہ حل کرلیں گے''۔

5/اگست 1992ء: سپریم کورٹ نے اجودھیا کا دورہ کرنے اور حاصل شدہ زمین پر تمام تعمیرات کی نوعیت، سائز اور دیگر تفصیل کا جائزہ لینے نیز یہ بھی تحقیق کرنے کے لئے کہ زمین پر تعمیر شدہ پلیٹ فارم یاتریوں کی سہولت کی خاطر تھا یا مندر کی بنیاد تھا تین ممبروں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا۔

16,3 اور 29 اکتوبر 1992ء: حکومت کی سرپرستی میں وشو ہندو پریشد اور آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے درمیان بابری مسجد کے تنازعہ پر گفت شنید۔

30/اکتوبر 1992ء: وی.ایچ.پی. کی ذیلی تنظیم دھرم سنسد (مذہبی پارلیمنٹ) نے 6/

دسمبر سے اجودھیا میں کارسیوا شروع کرنے کا اعلان کیا۔

8/نومبر 1992ء: وشو ہندو پریشد اور آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے درمیان گفت و شنید ناکام ہوگئی۔

23/نومبر 1992ء: قومی یک جہتی کونسل نے متفقہ طور پر وزیراعظم نرسمہا راؤ کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ اجودھیا کے مقابلے میں وزیراعظم دستور ہند کی بالادستی قائم رکھنے، امن وامان برقرار رکھنے اور عدالتوں کے امکانات کو لاگو کرنے کے لئے جو بھی ضروری اقدامات کریں گے اُن کی مکمل حمایت کرے گی۔ بی۔جے۔پی۔ اور وی۔ایچ۔پی نے میٹنگ کا بائیکاٹ کیا۔

6/دسمبر 1992ء: وزیراعظم نرسمہا راؤ اور یو۔پی۔ کے وزیراعلیٰ کلیان سنگھ کی طرف سے مسجد کے تحفظ کی بارہا یقین دہانی کے باوجود مغل طرزِ تعمیر کا نمونہ بابری مسجد کو کارسیوکوں نے شہید کر دیا۔

11/دسمبر 1992ء: الہ آباد ہائی کورٹ کی خصوصی بنچ نے برطرف شدہ کلیان سنگھ سرکار کی طرف سے منہدم شہید بابری مسجد کے اردگرد 2.77 ایکڑ رقبہ کو ایکوائر کرنے کا فیصلہ کر دیا۔






## بابری مسجد کی شہادت پر صدر جمہوریہ ہند کا اظہارِ رنج

نئی دہلی: 6 ردسمبر۔ صدر شنکر دیال شرما نے اس ہلڑ بازی پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے جس کی وجہ سے اجودھیا میں مسجد کو نقصان پہنچا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس قسم کے فعل ہندو دھرم اور دیگر تمام عظیم مذاہب کے اصول کے خلاف ہیں۔

راشٹر پتی بھون سے جاری ایک بیان میں جو شاذ ہی جاری کیا جاتا ہے اور جو صورت حال کی سنگینی کا غماز ہے۔ ڈاکٹر شرما نے کہا کہ وہ لوگ جنہوں نے مسجد کی عمارت کو نقصان پہنچایا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی صدیوں پرانی روایت کو داغدار کیا ہے جسے قومی تشکیل اور ہندوستان کی تحریک آزادی کے عظیم رہنماؤں اور شہیدوں نے سینچا تھا اور مضبوط بنایا تھا۔

ایک سخت بیان میں ڈاکٹر شرما نے کہا کہ ان لوگوں نے قانون کی حکمرانی، تمام مذاہب کے باہمی احترام کی ہندوستانی روایت اور ہندو طریق زندگی کے بنیادی اصولوں اور اقدار کی خلاف ورزی کی ہے۔

صدر جمہوریہ نے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ امن وقانون قائم رکھیں اور ملک میں قوم دشمن عناصر پر قابو پانے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔



## بابری مسجد کی شہادت پر عالمی ردِ عمل

ہندوستانی سپریم کورٹ کے منصف جسٹس وینکٹ چلیا نے 6 ردسمبر کی شام ایک ساعت میں کہا: ''جو نقصان پہنچایا گیا ہے اس کی تلافی کے لئے کوئی بھی اقدام اب کفایت نہیں کرسکتا۔ یہ کوئی حادثہ نہیں تھا بلکہ ایک سوچا سمجھا عمل تھا۔'' سابق صدر جمہوریہ سنجیوا ریڈی نے دوبارہ فوری تعمیر کے لئے زور ڈالتے ہوئے کہا ہے کہ یہ مرکز کی ''کھلی لاپرواہی'' تھی۔ 10 ردسمبر کے مراسلہ میں امریکہ کے سابق ہندوستانی سفیر ٹی.این. کول نے لکھا: ''اجودھیا کے حالیہ واقعات ہماری مالامال وراثت، ہمارے مشترکہ کلچر، ہماری رواداری کی روایت، ہماری سیکولر جمہوریت اور ہمارے دستور وسماج کے

بنیادی اصولوں کی اہانت اور نفی ہیں۔ یہ ہمارے ملک کے اتحاد، سالمیت اور استحکام کے لئے ایک سنگین اور فوری خطرہ کی نشاندہی کرتے ہیں"۔ دستور ہند کے دیرینہ ماہر نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا کہ "پہلی مرتبہ دستور (Constitution) کی ایک مخلوق (یو. پی. سرکار) نے خود اسی کو تباہ کر دی ہے۔ یہ تو ایک ایسا واقعہ ہے کہ خود بچہ نے اپنی ماں کو چھرا گھونپ دیا ہو"۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تو یہ مسئلہ دوہری کوفت کا سبب ہے۔ ایک طرف تو ملک کے عدالتی نظام اور دستور کو 6 ردسمبر کو جن لوگوں نے چیلنج کیا، ان کے پیدا کردہ نقصانات کی کوئی تلافی ابھی تک نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مزید جانی و مالی نقصان ہی ہوا ہے۔ دوسری طرف انہیں لوگوں کی کرتوتوں کی وجہ سے ہندوستان کی مذمت امریکہ سے لے کر چین تک اور برطانیہ سے لے کر تھائی لینڈ تک ہر قابلِ ذکر ملک کے عوام کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان کی سیکولر امیج بری طرح مسخ ہوگئی ہے۔ خاص طور سے امریکہ جیسے ملک کے نزدیک بھی۔

## امریکہ

اجودھیا میں جو دستور شکن دہشت گردی جاری تھی، وہ ہمارے وزیر اعظم کے علم میں آنے سے پہلے ہی سی. این. این. کے ذریعہ امریکی عوام کے علم میں آ چکی تھی۔ سوموار کی صبح امریکی اخبارات کے پہلے صفحہ پر اس سانحہ کی خبریں موجود تھیں۔ نیویارک ٹائمز میں پہلے نمبر کی خبر تھی اور واشنگٹن پوسٹ میں اسے دوسری بالائی سرخی بنایا گیا تھا۔ واشنگٹن ٹائمز نے پورے ایک صفحہ کی رپورٹ شائع کی تھی۔ اخبارات میں اجودھیا میں صحافیوں کی درگت کو کافی اہمیت دی تھی جبکہ وائس آف امریکہ نے گزشتہ شب ہی یہ خبر دی تھی کہ اس کے ہندوستانی نمائندہ پیٹر ہین لین کو ہندو بھیڑیے نے مارا پیٹا ہے۔ لاس اینجلز ٹائمز کے باب ڈوگن کے زدوکوب کی رپورٹ بھی موجود تھی۔ واشنگٹن سے 7 ردسمبر کے مراسلہ میں گوتم ادھیکاری نے لکھا: "کل اور آج جب اجودھیا کی خبریں پھیلیں تو ہندوستان کی بین الاقوامی امیج پر ایک سخت ضرب لگی۔ ان ہندوستانیوں کے لئے جو یہاں رہتے اور کام کرتے ہیں، اتوار کا دن اپنی گردنیں جھکائے رکھنے کا دن تھا۔"

امریکہ میں مقیم ہندوستانی دانشوروں، سماجی خدمت گزاروں اور طلباء نیز ان کی متعدد تنظیموں نے اس سانحہ کی مذمت کی اور احتجاجی مظاہرے کئے۔ واشنگٹن کی کمیٹی برائے تحفظ صحافیان نے

اجودھیا میں پیٹے جانے والے صحافیوں کی ایک جزوی فہرست جاری کرتے ہوئے نرسمہا راؤ کے خلاف ایک احتجاجی خط لکھا۔ امریکی حکومت نے بھی اس واقعہ کی مذمت کی۔ دفتر خارجہ کے ایک ترجمان نے بُش انتظامیہ کا موقف واضح کرتے ہوئے کہا: ''بُش انتظامیہ 16ویں صدی کی اس تاریخی عمارت کو زمین بوس کئے جانے سے پیدا ہونے والی صورت حال پر گہری نظر رکھے ہوئے ہے اور ہندوستان کے امریکی سیاحوں سے کہا گیا ہے کہ وہ آگرہ اور یو. پی. کے دیگر مقامات میں جانے سے احتراز کریں۔ امریکی ہدایت نامہ میں کہا گیا: ''6/دسمبر کو ہندو انتہا پسندوں نے اجودھیا (اتر پردیش) کی بابری مسجد کو ڈھا دیا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات اور تشدد پورے ہندوستان میں پھیل گئے ہیں۔'' 9/دسمبر کو مشہور امریکی جریدہ وال اسٹریٹ جرنل نے اس سانحہ کے تعلق سے لکھا: ''ہندوستان کے موجودہ بحران کی جڑ میں مذہبی اختلافات سے کہیں زیادہ تکلیف دہ معاشی دردسری میں پنہاں ہیں۔ اگر اڈوانی اور حزب اختلاف کے ان کے ساتھیوں نے اجودھیا کے لئے فوج کشی کے بجائے معاشی آزادیوں کے لئے اپنی توانائی صرف کی ہوتیں تو ہندوستان ایک مالا مال زندگی گزار رہا ہوتا۔'' ہندوستانی انتظامیہ کے لئے امریکہ میں ایک مشکل یہ بھی پیدا ہوگئی تھی کہ جس دن ان لوگوں نے امریکی سرمایہ کاروں کی میٹنگ بلائی تھی، ٹھیک اسی دن اجودھیا فسادات کی خبریں ہر طرف پھیل رہی تھیں۔

## پاکستان و بنگلہ دیش

پاکستان کی جانب سے ایک بڑی شکایت یہ تھی کہ اس سانحہ نے نہرو جناح پیکٹ کی روح کو مجروح کر دیا ہے۔ پاکستانی کابینہ کی میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا کہ 18/دسمبر کو پاکستان بند ہوگا اور ہندوستانی مسلمانوں کی خیر و عافیت کے لئے خصوصی دُعائیں مانگی جائیں گی۔ کابینہ میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ بین الاقوامی برادری سے بالعموم اور اقوام متحدہ نیز تنظیم اسلامک آرگنائزیشن سے بالخصوص یہ اپیل کی جائے گی کہ وہ اس سانحہ پر نوٹس لیں۔ حزب اختلاف کی لیڈر بے نظیر بھٹو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا: ''وحشی پن کے اس فعل نے نہ صرف مسلم جذبات کو مجروح کیا ہے بلکہ ہندوستان کے سیکولرزم کے تئیں وعدوں کے بارے میں بنیادی سوالات اُٹھا دئے ہیں۔'' سرحدی صوبہ کے افراد اس سانحہ سے سب سے زیادہ غمگین تھے۔ ان کو غصہ اس بات پر تھا کہ اگر ایک سیکولر

ملک میں جذبات کو مجروح ہونے سے بچانے کیلئے ایک مسجد کے انہدام کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے تو پھر ایک اسلامی ملک کے عوام سر راہ شرک اور بت پرستی پھیلانے والے مندروں کو کس دلیل کی بنیاد پر برداشت کر کے اپنے جذبات کو مجروح ہوتے رہنے دیں؟

بنگلہ دیش کی قومی کمیٹی برائے تجدید روحِ جنگِ آزادی کی جانب سے بھی 8/دسمبر کو کل بنگلہ دیش ہڑتال کی گئی تھی۔ بے قابو عوام کو قابو میں رکھنے کے لئے بنگلہ دیشی پولیس نے آنسو گیس اور ربر کی گولیاں چلائیں۔ پورے ملک میں احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ بالخصوص چٹا گانگ، راج شاہی اور کھلنا میں بہت شدت رہی۔ 7/دسمبر رپورٹ کے مطابق صرف چٹا گانگ میں 233 عمارتوں کو نقصان پہنچا۔ بنگلہ دیشی کابینہ نے اپنی قرارداد میں اپنے احساس کا ذکر کیا کہ امن و امان اور نظم و استحکام کی بحالی کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ حکومت ہند مسجد کی ''ٹھیک اسی جگہ'' پر تعمیر نو کا کام جلد از جلد پورا کر دے۔ حکومت نے مسلمانوں کو یہ تلقین بھی کی کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق مذہبی رواداری برتیں۔ تاہم بنگلہ دیش اور پاکستان کے پُرتشدد واقعات کے تعلق سے ہندوستانی حکومت جو دوسرے ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی نفی کرتی رہی ہے، اس نے ان دونوں ممالک سے اپنی تشویش جتائی ہے۔ اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانی گروہ بندیوں میں مذہب کی اساس اپنی جگہ پر درست اور مسلّم ہے۔

## انگلینڈ اور یوروپ

یوروپی ممالک میں سب سے زیادہ ردعمل برطانیہ میں دیکھنے میں آیا۔ وشو ہندو پریشد نے اپنی چندہ مہم کے دوران پورے متحدہ ولایت انگلستان (U.K.) میں 145 اور صرف برطانیہ میں 13/ شاخیں قائم کر لی تھیں۔ جن کے گمراہ کن پروپیگنڈے کی بنا پر یہاں کی فضا پہلے ہی سے مسموم تھی۔ چنانچہ 6/دسمبر کے سانحہ کے بعد یہاں کے مسلمان بے قابو ہو گئے اور انہوں نے بڑے پیمانہ پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا۔ برطانیہ کی ہندوستانی برادری نے اجودھیا سانحہ کی مذمت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں سے پُرسکون رہنے کی اپیلیں بھی کیں، لیکن مظاہرے کئی دن تک کئی شہروں میں جاری رہے۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ تھی کہ انتہا پسند نسل پرست برطانوی نوجوان اس سانحہ سے فائدہ اُٹھا کر ہندو اور مسلمان دونوں کو ہی برطانیہ سے باہر نکالنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ جیسا کہ

برطانوی پولیس نے بتایا کہ اس نے دو سفید نوجوانوں کو دیکھا کہ وہ ایک مندر میں پٹرول بم ڈال کر بھاگ گئے تھے۔

انگلینڈ کی طرح ویٹکن کی حکومت نے بھی اس سانحہ سے پیدا صورت حال کا نوٹس لیا ہے۔ ویٹکن ریڈیو سے ویٹکن حکومت کے ایک اعلیٰ عہدہ دار کارڈنیل طرانس نے اپیل کی کہ فسادات کا سلسلہ بند کیا جانا چاہئے اور انسانی جان و املاک کا زیادہ سے زیادہ احترام ملحوظ رکھنا چاہئے۔ یورپ کے دیگر ممالک میں کوئی خاص ردعمل ظاہر نہ ہونے کی کئی وجوہات ہیں۔ اوّل تو یہاں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے اور پھر لوگوں کو اصل واقعہ معلوم بھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سابق خارجہ سکریٹری نٹور سنگھ کے مشورہ پر نرسمہا راؤ نے ان ممالک کے سربراہوں سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ لندن میں مقیم ہندوستانی سفیر نے بھی ڈنمارک، پرتگال، اور جرمنی کی حکومتوں پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اجودھیا میں جو کچھ ہوا ہے، مرکزی حکومت کی لاعلمی میں ہوا ہے اور مرکز اس کی تلافی کا پوری طرح سے پابند ہے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اکثر ملک اسے ہندوستان کا اندرونی معاملہ تو سمجھتے رہے ہیں، کیونکہ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ بابری مسجد آثار قدیمہ کی فہرست میں شامل ہے لہٰذا دنیا کے ہر انسان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس انسانی وراثت کی بھی اتنی تندہی سے نگہداشت رکھے جتنی کہ مصر کے اہرام اور افریقی جنگلوں کی باقیات کی رکھتا ہے۔ تاہم مغربی جرمنی کے روزنامہ ''فرینک فرٹ انڈشا'' نے اپنے اداریہ میں ہندوستان میں سیکولرزم کی موت پر آنسو بہائے۔ برلن کے روزنامہ ''درتا گسپی گل'' نے لکھا: ''کوئی صرف یہ امید ہی کر سکتا ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے خلاف کانگریسی وزیر اعظم کی کارروائیاں بہت دیر طلب نہیں ہوں گی''۔

فرانس کے اخبار ''لاموندے'' نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ اس جمہوری ملک کے ثبوت کے بطور باقی یہ مسجد باقی نہ رہنے سے ''سیکولرزم'' کے تصور کو شدید ضرب لگی جو کہ ہندوستانی دستور کا ایک ستون تھا۔ اٹلی میں ٹیورن سے شائع ہونے والے اخبار ''لااسٹیمپا'' نے سانحہ اجودھیا پر اس اندیشہ کا اظہار کیا: ''اجودھیا کی مسجد کی تباہی نے ہندوستانی سیکولرزم کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں''۔ یوروپی برادری کے وزرائے خارجہ کی جانب سے انگلینڈ میں جاری کئے گئے ایک بیان میں کہا گیا ہے:

''برادری اور اس کے ممبر ممالک ہندوستان میں اور دیگر مقامات پر ہونے والے جانوں کے اس ضیاع پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں جو کہ ایک قدیم عبادت گاہ بابری مسجد (اجودھیا) کی جان بوجھ کر

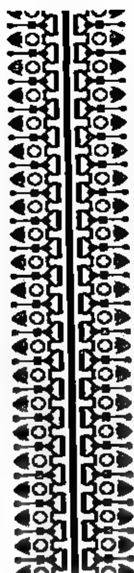
کی گئی تباہی کے بعد ہوا"۔ 15 دسمبر کے ایک بیان میں روس کی وزارت خارجہ نے اجودھیا کی بابری مسجد کی تباہی کی باغیانہ کوششوں کی مذمت کرتے ہوئے ان غیر ذمہ دار سیاست دانوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ جو عوام کے مذہبی جذبات کا اپنے خودغرضانہ مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال یہ افسوسناک بات ہے کہ امریکہ کے سابق صدر رونالڈ ریگن، جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ اس سے دلچسپی رکھتے ہیں انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا۔

## ایران

ایران کے فقیہ ولایت آیت اللہ علی خامنہ ای نے اس سانحہ کو ہندوستان اور دنیا بھر میں مسلمانوں کو ذلیل کرنے کی سازش قرار دیا۔ ایرانی اخبارات نے بھی اس تباہی کی پُرزور مذمت کی اور پورے ملک میں ایک دن کی ہڑتال رہی۔ 8 دسمبر کو وزیر خارجہ علی اکبر ولایتی نے ہندوستانی سفیر کو طلب کر کے کہا: "مسجد کی تباہی سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں ناراضگی کی لہر دوڑ گئی ہے"۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مسجد کی تعمیر دوبارہ شروع کی جائے۔ وزیر خارجہ نے اس مسئلہ پر مشترکہ حکمت عملی اختیار کرنے کی غرض سے اپنے ہم منصب پاکستانی وزیر سے ٹیلیفون پر گفتگو بھی کی۔ تہران میں عوام کی مشتعل بھیڑ نے ہندوستانی سفارتخانہ پر پتھر بھی برسائے۔ قم کے عالمی دارالعلوم کے علماء اور طلباء نے ہندوستانی سفارت خانہ کے باہر دھرنا بھی دیا وہ ہندو دہشت گردوں کی مذمت میں نعرے لگا رہے تھے ان کا مطالبہ تھا کہ مسجد کی تعمیر نو مسجد کے مقام پر ہی فی الفور کی جائے اور مجرموں کو سزا دی جائے۔

(بشکریہ: شہید بابری مسجد، مرتب: معصوم مرادآبادی)








# اجودھیا تنازعہ
# اور وزیراعظم باجپئی کے بیانات

تبصرہ، تجزیہ، ردّعمل





سنگھ پریوار سے تعلق رکھنے والے بزرگ اور تجربہ کار سیاست داں وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ "نرم ہندتو" کے علمبردار ہیں. لیکن یکم اگست 2003ء کو ان کے ایک بیان سے اندازہ کیاجا سکتا ہے کیہ وہ کس قدر گھرے اور سنگھ پریوار کے کتنے قدیم وفادار ہیں.

(مرتب)

## حرف بہ حرف

# اجودھیا تنازعہ اور وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کے بیانات

### بیان ①

پرم ہنس کی آخری خواہش تھی کہ مندر کی تعمیر ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس سلسلہ میں آنے والی تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں گی اور رام مندر کی تعمیر کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں ایک روز ان کو عقل آ جائے گی اور سب لوگ مل کر پرم ہنس کی آخری خواہش پوری کریں گے۔ جتنا بڑا کام ہوتا ہے اتنی ہی بڑی مشکلات درپیش ہوتی ہیں لیکن ایسی کوئی مشکل نہیں جس پر کامیابی نہ حاصل کی جا سکے۔ پرم ہنس کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کی ساری زندگی تپسیا، سادھنا اور سنگھرش میں گزری۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ ملک عظیم بن جائے اور اس کے شہری بھی عظیم بن جائیں۔ وہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں رام جنم بھومی پر رام مندر بنوانے کے سنگھرش میں تھے۔ انہوں نے سماج کو جوڑا اور مخالفین کو ساتھ لیا۔ وہ آنے والی مشکلات کو جانتے تھے اور ان کو یقین تھا کہ یہ مشکلات ایک دن دور ہو جائیں گی۔ جب میں غیر ممالک کے دورہ پر جا رہا تھا تو میں نے پرم ہنس سے آشیرواد مانگا تھا۔ انہوں نے آشیرواد دیا بھی تھا اور کہا تھا کہ آپ اجودھیا آئیں، مندر نرمان کا کام آگے بڑھے گا۔

اٹل بہاری باجپئی یکم اگست 2003ء

(پرم ہنس کی آخری رسومات کے موقع پر)

### بیان ②

حکومت کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہے اور اس بارے میں کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ حکومت کا پہلے بھی یہی کہنا تھا کہ اجودھیا میں باہمی خیر سگالی اور تعاون سے مندر بنے اور سماج کے دونوں طبقات مل کر اس بارے میں طے کریں کہ آیا اس بارے میں عدالت کا فیصلہ تسلیم ہو، اس کے علاوہ اس تنازعہ کے حل کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں دونوں فریق مل کر کوئی راستہ نکال سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں کوششیں جاری ہیں لیکن میرے اوپر کسی کا کوئی دباؤ نہیں ہے۔ جس دن دباؤ کی مجبوری ہوگی سارا راج پاٹ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ ایوان میں کسی کو مجرم یا کسی کو بے قصور ٹھہرانے کا سلسلہ بند ہونا چاہئے۔ میں نے پرم ہنس کی آخری رسومات کے موقع پر ایسا کچھ نہیں

کہا جو حکومت کے ذریعے اختیار کردہ موقف سے مختلف ہو۔ اس پر خوامخواہ ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ان کی موت پر اگر میں نے یہ کہہ دیا کہ ان کی آخری خواہش ضرور پوری ہوگی تو کیا برا کہہ دیا۔ یہ تو میں نے نہیں کہا کہ مندر کہاں بنے گا۔ میں نے وہاں آخری رسومات کے مقام پر کتنے ضبط سے جملے ادا کئے اس کی کوئی تعریف نہیں کر رہا ہے۔ وزیراعظم بھی اس ملک کا شہری ہے وہ بھی گوشت پوست سے بنا انسان ہوتا ہے۔ اس کے بھی جذبات ہوتے ہیں اور وہ انہیں ضبط میں رکھنا بھی جانتا ہے۔

اٹل بہاری واجپئی 3راگست 2003

(پارلیمنٹ میں بحث کے دوران)

---

## وزیراعظم اپنے بیانات کے آئینے میں

وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی پر یہ الزام عائد ہوتا رہا ہے کہ وہ دو چہرے رکھتے ہیں اور جب جیسا موقع دیکھتے ہیں ویسا ہی بیان دے دیتے ہیں، لیکن اجودھیا کے سلسلہ میں انہوں نے کبھی شعلہ اور کبھی شبنم کا جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بی.جے.پی. نے اپریل 1991ء میں مسئلہ اجودھیا پر فعال تحریک شروع کی تو اس وقت سے آج تک وزیراعظم نے بار بار اپنا موقف بدلا ہے اور اپنی ہی زبان کو جھٹلایا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ انہوں نے مسئلہ اجودھیا پر کب کیا کہا؟

- اپریل 1991: اپوزیشن لیڈر واجپئی نے وی.ایچ.پی. کی ریلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ رام جنم بھومی پر رام مندر کی تعمیر ضروری ہے تاکہ راشٹریہ سمان (قومی وقار) کو بحال کیا جا سکے۔
- 7ردسمبر 1992: بابری مسجد کی شہادت کے ایک دن بعد واجپئی جی نے کہا کہ 6ردسمبر میری زندگی کا سب سے بدترین دن تھا۔
- مئی 1996: ٹیلی ویژن چینل پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اگر مذہب سے جڑے ہوئے مسائل ایک لمبے عرصہ تک حل نہیں کئے جاتے تو نتیجہ وہی نکلتا ہے جو اجودھیا میں رونما ہوا۔
- دسمبر 1997: بھونیشور میں انہوں نے کہا کہ جس طرح پچھلے الیکشن میں اجودھیا ایک انتخابی ایشو تھا اس بار نہیں ہوگا۔
- فروری 1998: بی.جے.پی. کے انتخابی منشور میں واجپئی نے اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کو سر

فہرست رکھا۔

- جون 1998: اجودھیا میں رام مندر کی تعمیری سرگرمیوں میں جب تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا تو واجپئی نے (بہ حیثیت وزیر اعظم) کانگریس کی صدر (اپوزیشن لیڈر) سونیا گاندھی کو ایک خط لکھ کر کہا کہ ''اجودھیا کے سلسلہ میں اپنے فرائض ادا کرنے کے لئے عدلیہ تمام بندشوں سے آزاد ہوگی''۔ لوک سبھا میں انہوں نے کہا کہ بابری مسجد کا انہدام ایک بدبختانہ واقعہ تھا اور ایسے بدبختانہ واقعہ کا اعادہ نہیں ہوگا۔
- 21 راگست 1999: تھیروانںت پورم میں ایک انتخابی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے واجپئی نے کہا کہ اجودھیا ایشو بی.جے.پی. کے انتخابی منشور کا اہم حصہ ہے۔
- 27 راگست 1999: لکھنؤ میں واجپئی نے نامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہماری حکومت اجودھیا ایشو نہیں اُٹھائے گی خواہ بی.جے.پی. بھاری اکثریت میں آجائے۔
- 10 رستمبر 1999: نیویارک میں اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کا مطالبہ کرنے والے سادھوؤں کے ایک پروگرام میں واجپئی جی نے کہا کہ اگر بی.جے.پی. مکمل اکثریت حاصل کر کے سرکار بنانے میں کامیاب ہوگئی تو ہندوستان کے خوابوں کو پورا کرے گی۔
- 11 رستمبر 1999: واجپئی جی نے کہا کہ ہندوستان کے خوابوں سے مراد اجودھیا نہیں تھی۔ مندر کی تعمیر قومی جمہوری محاذ کے ایجنڈہ پر نہیں ہے۔
- 6-7 ردسمبر 2000: واجپئی جی نے پوری قوم کو اس وقت متحیر کر دیا جب انہوں نے کہا کہ اجودھیا کا ایجنڈہ آج بھی نامکمل ہے۔ انہوں نے رام جنم بھومی تحریک کو ان ''قومی جذبات کے اظہار'' سے تعبیر کیا جن کو ابھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ انہوں نے نامہ نگاروں سے یہ بھی کہا کہ مندر متنازعہ مقام پر تعمیر کیا جا سکتا ہے اور مسجد اجودھیا میں ہی کسی اور مقام پر۔
- 10-19 ردسمبر 2000: اپوزیشن اور اتحادگروپوں کے دباؤ کے آگے جھکتے ہوئے انہوں نے اپنا موقف واپس لیا اور قومی جمہوری محاذ کے ذریعہ ایک قرارداد پاس کرائی جس میں کہا گیا کہ متنازعہ جگہ پر ''جوں کی توں حالت'' برقرار رکھی جائے گی جب تک سپریم کورٹ فیصلہ نہ کر دے۔ پارلیمنٹ میں انہوں نے مزید کہا کہ میں نے منہدم شدہ بابری مسجد کی جگہ پر رام مندر

بنانے کی بات کبھی نہیں کہی۔

- 31 دسمبر 2000: کمار کوم میں (اپنی چھٹیاں گزارنے کے دوران) اپنے خیالات (مضامین جو اخبارات میں چھپے) میں انہوں نے وضاحت کی کہ رام مندر اور ''قومی جذبات'' کی بات عہد ماضی کے تناظر میں تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم ہمیشہ انہدام کی بحث میں نہیں اُلجھے رہ سکتے۔ خواہ وہ ماضی قریب میں ہوا ہو یا ماضی بعید میں، ملک کو آگے کی طرف بڑھنا چاہئے۔ □ □

## ''وزیر اعظم کا بیان غیر آئینی''

از: سید شہاب الدین (سابق رکن پارلیمنٹ)

اٹل بہاری واجپئی غالباً اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ اس ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ اجودھیا میں انہوں نے رام مندر کی تعمیر سے متعلق جو بیان دیا وہ کوئی عام انسان تو اس قسم کا بیان دے سکتا ہے لیکن وزیر اعظم نہیں۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے ان کو کہنا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ اجودھیا کے متنازع مسئلہ کے سلسلے میں آئین اور قانون پر عمل ہونا چاہئے، اگر بات چیت سے کوئی راستہ نہیں نکلتا۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے انہوں نے جو کچھ کہا وہ قطعی مناسب نہیں تھا، بلکہ غیر آئینی تھا۔ ایک وزیر اعظم جس نے آئین کی پاسداری کی قسم کھائی ہے، اگر آئین اور قانون کے دائرے سے باہر نکل کر بات کرے تو ظاہر ہے کہ اس بیان کو غیر آئینی اور غیر قانونی ہی کہا جائے گا۔ دراصل اجودھیا میں انہوں نے جو کچھ کہا اس کا مقصد صرف اور صرف سیاسی تھا۔ وہ وہاں موجود سنگھ پریوار کے قائدین کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ میں آپ کا تابعدار ہوں اور وہی کرنا چاہتا ہوں جو آپ کی خواہش ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے رائے دہندگان کو بھی واضح طریقے سے یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ مندر کی تعمیر ان کا اصل مقصد ہے لیکن بی۔ جے۔ پی۔ کا اکثریت میں نہ ہونا سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لئے وہ آئندہ انتخابات میں بی۔ جے۔ پی۔ کو اکثریت کے ساتھ پارلیمنٹ میں پہنچائیں تاکہ مندر تعمیر کی راہ آسان ہو سکے۔ بعد میں وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں خود ہی کہا کہ میں بھی تو انسان ہوں کبھی کبھی جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اجودھیا میں انہوں نے جو کچھ کہا اور پھر پارلیمنٹ میں جو بیان دیا، وہ سب سیاست کے حربے ہیں کیونکہ سنگھ پریوار نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ رام مندر کے سوال کو آئندہ انتخابات میں اہم موضوع کے طور پر استعمال کرے

گی اور سنگھ پریوار کے فیصلہ پر عمل درآمد کرنا اور کرانا ظاہر ہے کہ وزیراعظم کی اولین ذمہ داری ہے۔ کیونکہ وہ فخر سے خود بھی سنگھ پریوار کا رکن ہونے کا اعلا کرتے ہیں اور یہ بات کوئی پوشیدہ بھی نہیں ہے، تمام لوگ اس سے واقف ہیں۔ بی۔ جے۔ پی۔ نے پوری طرح اب یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ عوام سے رام مندر کی تعمیر کرانے کا ایک بار پھر وعدہ کریں گے اور اس کی بنیاد پر انہیں ووٹ دینے کے لئے کہیں گے تاکہ جب وہ اکثریت کے ساتھ پارلیمنٹ میں پہنچ جائیں تو قانون بنا کر یا جس طریقے سے بھی ممکن ہو سکے، اجودھیا میں متنازعہ مقام پر رام مندر کی تعمیر کراسکیں۔ بی۔ جے۔ پی۔ کے پاس حکومت کی حصولیابی کے نام پر عوام کو دکھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ بی۔ جے۔ پی۔ کی قیادت والی این۔ڈی۔اے۔ حکومت ہر محاذ پر ناکام رہی ہے۔ خواہ ملک میں امن و امان کا مسئلہ ہو، قانون کی حکمرانی کا معاملہ ہو، خارجہ پالیسی کا تعلق ہو یا مہنگائی، بیروزگاری جیسے مسائل، کسی بھی میدان میں حکومت نے کوئی کام نہیں کیے۔ وہ اس بات سے بھی بخوبی واقف ہے کہ رام مندر کا مسئلہ ہی اسے اقتدار میں لایا ہے اور دوبارہ اقتدار میں آنا ہے تو ایک بار پھر اسی مسئلہ کو پوری شدت کے ساتھ اُٹھانا ہوگا ورنہ اقتدار کا حصول ناممکن ہے۔ اپوزیشن کی سیکولر جماعتوں اور خاص کر این۔ڈی۔اے۔ میں شامل سیکولر جماعتوں کو چاہئے کہ وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے اس سیاسی حربے کو سمجھیں اور اسے بے نقاب کریں تاکہ ملک میں امن و امان کی فضا قائم رہے۔ (گفتگو پر مبنی)

---

## ''سنگھ کے دباؤ کا شاخسانہ''

از: پروفیسر زیڈ۔ ایم۔ خان (پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ)

یکم اگست کو اجودھیا میں وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی نے یہ بیان دیا ہے تھا کہ رام چندر پرم ہنس کی آخری خواہش (متنازعہ مقام پر رام مندر تعمیر کرانے کی) پوری کی جائے گی۔ اس کے دوسرے دن وزیراعظم نے کہا کہ ان کا وہ مقصد نہیں تھا جو پریس نے سمجھا یا اپوزیشن نے جس پر واویلا مچایا۔ انہوں نے کہا کہ دراصل میں پرم ہنس کی خواہش کی غمازی کررہا تھا اپنی خواہش کی نہیں اور چونکہ این۔ڈی۔اے۔ کے ایجنڈے میں رام مندر کی تعمیر شامل نہیں ہے اس لئے میں یوں بھی اس موضوع پر کچھ بولنے سے قاصر ہوں۔ دراصل وزیراعظم کے بیانات کے ریکارڈ دیکھیں، خاص کر اجودھیا تنازعہ سے متعلق تو یہ ان کی عادت رہی ہے کہ وہ اپنے بیانات بدل دیتے ہیں۔ کبھی تو آستھا

کی بات کرتے ہیں کبھی قومی جذبات کی بات کرتے ہیں اور پھر اس سے مکر جاتے ہیں۔ دراصل یہ سب وزیر اعظم کی مجبوریاں ہیں۔ وہ 24 جماعتوں کی متحدہ حکومت کو چلا رہے ہیں اور جس حلیف کا جیسا دباؤ ہوتا ہے اس کے تحت وہ بیان دیتے ہیں یا دیئے ہوئے بیان سے مکر جاتے ہیں۔ 24 جماعتوں کی 24 آراء ہوتی ہیں اور اتنے ہی قسم کے حالات ہوتے ہیں اور مخلوط سرکار کو کامیابی سے چلانے کا آسان نسخہ اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے کہ ہر ایک کے دباؤ کو قبول کرتے ہوئے ان کی خواہشوں کی تکمیل کی جائے۔ جب بھی کسی حلیف سے ٹکراؤ ہوگا تو دوصورتیں سامنے آئیں گی یا تو حلیف ناراض ہو کر سرکار گرائے گا یا پھر سربراہِ حکومت کو اس کے مطالبات پورے کر کے سرکار کو برقرار رکھنا ہوگا۔ لہٰذا وزیر اعظم کا متنازعہ امور پر بیان دینا یا پھر اس بیان سے مکر جانا دراصل ان کی سیاسی مجبوریوں کا ایک حصہ ہے۔ رام مندر کی تعمیر سے متعلق وزیر اعظم کے حالیہ بیان کو بھی اسی تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ وزیر اعظم کا ذاتی نظریہ دیکھیں تو کسی بھی معاملہ میں متوازن معلوم ہوتا ہے لیکن دباؤ میں اس کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کو اکثر حلیف جماعتوں کا دباؤ تو رہتا ہی ہے، اس سے بڑھ کر اس پر سنگھ کا دباؤ ہوتا ہے۔ یہ دباؤ کوئی ڈھکا چھپا نہیں بلکہ پورا ملک اس سے آگاہ ہے۔ لیکن آج بی۔جے۔پی۔ جس مقام پر ہے اسے سیاسی پارٹی ہونے کی حیثیت سے یہ طے کرنا پڑیگا کہ وہ سنگھ پریوار سے کتنا فاصلہ رکھے۔ جہاں تک سنگھ پریوار کا تعلق ہے، اس کے نظریات یکسر مختلف ہیں۔ بیشک بی۔جے۔پی۔ سنگھ پریوار کا ہی سیاسی دھڑا ہے لیکن اس کے باوجود حکمران ہونے کی مجبوریوں کے سبب وہ سنگھ کے نظریات پر عمل پیرا نہیں ہوسکتی۔ بی۔جے۔پی۔ میں گروپ بندی بھی اسی وجہ سے ہے کہ بعض لیڈر سنگھی نظریات پر عمل کرنا چاہتے ہیں جبکہ بعض متوازن راہ اختیار کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ باجپئی جی اس لئے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے سنگھ پریوار سے ایک محفوظ دوری برقرار رکھی ہے۔ بی۔جے۔پی۔ کے دوسرے لیڈروں کو بھی یہ سوچنا چاہئے کہ اگر انہیں اپنی پارٹی کو ایک قومی حیثیت دینا ہے تو انہیں سنگھ پریوار یا حلیف جماعتوں کے دباؤ کے آگے نہیں جھکنا چاہئے بلکہ ملک اور قوم کی ضروریات کے تحت آئین کے دائرہ میں رہ کر کام کرنا چاہئے۔ (گفتگو پر مبنی)

❖ ❖ ❖

## سنگھ کو خوش کرنے کا حربہ

از: آئی. یو. خان (ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا)

وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے یکم اگست کو اجودھیا میں پرم ہنس کی آخری رسومات کے موقع پر جو تقریر کی تھی وہ وہاں موجود سنگھ پریوار کے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے تھی، وہاں موجود سامعین کے جذبات کو مدِ نظر رکھ کر انہوں نے کہا تھا کہ پرم ہنس کی خواہش کے مطابق متنازعہ مقام پر رام مندر کی تعمیر کی جائے گی۔ بعد میں انہوں نے نئی دہلی آکر جب یہ محسوس کیا کہ نہ صرف اپوزیشن بلکہ این.ڈی.اے. کی حلیف جماعتیں بھی ان کے بیان پر اعتراض کر رہی ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ دباؤ ان کے لئے ناقابل برداشت تھا چنانچہ انہوں نے حسب سابق اپنا بیان بدلا اور فوراً یہ کہا کہ ان کی بات کا مقصد یہ نہیں تھا جو میڈیا نے پھیلایا ہے بلکہ اجودھیا کا مسئلہ عدالت کے ذریعہ ہی حل ہونا چاہئے یا پھر فریقین باہمی بات چیت یا رضا مندی سے اس مسئلہ کو حل کریں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اجودھیا تنازعہ پر بھارتیہ جنتا پارٹی کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس وقت وزیر اعظم کے پیش نظر بعض ریاستوں میں اسمبلی انتخابات اور پھر لوک سبھا کے انتخابات ہیں۔ انہوں نے اجودھیا میں تقریر کر کے اپنے ووٹروں کو یہ پیغام دیا کہ وہ ہر حالت میں ہندوؤں کی آستھا کے عین مطابق متنازعہ مقام پر مندر بنائیں گے۔

دراصل کوئی بھی معاملہ جب عدالت میں زیر غور ہو تو اس پر پارلیمنٹ کے علاوہ کہیں اور اظہار خیال نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی عام آدمی تو اس پر بول سکتا ہے لیکن وزیر اعظم نہیں۔ خاص کر ایسے مسئلہ پر جس کی حساس نوعیت سے تمام لوگ واقف ہیں۔ لہٰذا وزیر اعظم نے رام مندر تعمیر کرنے کا جو بیان دیا، اس کی ان سے بہرحال توقع نہیں کی جا سکتی تھی لیکن جو کچھ انہوں نے کہا اسے بدلا بھی نہیں جا سکتا۔ وزیر اعظم کے بارے میں اب تو یہ بات مشہور ہو چکی ہے کہ وہ پہلی مرتبہ جو بیان دیتے ہیں وہ ان کی اپنی دل کی آواز ہوتی ہے لیکن جب وہ دوسرا تردیدی بیان دیتے ہیں تو دباؤ یا مجبوری کے تحت۔ لہٰذا یہ سمجھنا غلط نہ ہوگا کہ وزیر اعظم سنگھ پریوار کا رکن ہونے کی حیثیت سے اجودھیا میں متنازعہ مقام پر مندر بنانا چاہتے تو ہیں لیکن فی الحال مجبور ہیں۔ مسلمانوں اور سیکولر جماعتوں کا یہ اندیشہ غلط نہیں ہے کہ جس دن بھارتیہ جنتا پارٹی پوری اکثریت کے ساتھ اقتدار میں آئے گی وہ

متنازعہ مقام پر رام مندر تعمیر کرنے کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کر کے وہاں مندر تعمیر کرے گی خواہ اس حکومت کے قائد اٹل بہاری واجپئی ہی کیوں نہ ہوں۔ (گفتگو پر مبنی)

## مسلم تنظیموں کا ردِ عمل

➤ اجودھیا میں متنازعہ مقام پر رام مندر کی تعمیر کی بات کہہ کر وزیر اعظم اور نائب وزیر اعظم نے سنگھ پریوار کے لیڈروں کی طرح بیان دیا ہے۔ اگر وہ پرم ہنس کے خوابوں کو پورا کرنے کے لئے اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کریں گے تو پھر لاکھوں مسلمانوں کے خوابوں کا کیا ہوگا جو عدالتی فیصلہ کے منتظر ہیں۔ بی۔ جے۔ پی۔ رہنماؤں نے مندر تعمیر کی بات کہہ کر اتحاد کے اصولوں سے بھی انحراف کیا ہے اور این۔ ڈی۔ اے۔ کے ایجنڈے پر عمل کرنے کے بجائے اپنا ایجنڈہ تھوپنے کی کوشش کی ہے۔

وزیر اعظم نے پرم ہنس رام چندر داس کی آخری رسومات کے موقع کو اپنا یہ موقف ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا کہ مندر مسئلہ پر پارٹی کی سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ انہوں نے پارلیمنٹ میں این۔ ڈی۔ اے۔ حلیفوں کے دباؤ میں جو کچھ کہا تھا اجودھیا میں اس سے متضاد اور مختلف بیان دیا۔ اس طرح کا بیان دے کر انہوں نے زیر سماعت مقدمہ کی کارروائی پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی ہے۔ (آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی)

➤ آئندہ لوک سبھا اور بعض ریاستوں میں اسمبلی انتخابات کو پیش نظر رکھ کر بھارتیہ جنتا پارٹی ایک بار پھر اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کے عزم کا اظہار کر کے اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ نومبر میں ہونے والے اسمبلی انتخابات میں عوام کے درمیان جانے کے لیے حکومت کے پاس کوئی حصولیابی نہیں ہے۔ اس لیے وزیر اعظم نے رام جنم بھومی نیاس کے صدر مہنت رام چندر پرم ہنس کی آخری رسومات کے موقع کا استعمال ووٹروں کو رجھانے کے لیے کیا۔ اجودھیا تنازعہ کے تعلق سے فریقین نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ وہ عدالت کے فیصلہ کو تسلیم کریں گے۔ وزیر اعظم کا بیان اس کے برخلاف اور ان کے عہدہ کے وقار کے منافی ہے۔ (آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

➤ وزیر اعظم کا بیان لاکھوں لوگوں نے سنا، ان کے بیان سے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے۔ یہ معاملہ عدالت کے زیر غور ہے اور ایک ذمہ دار فرد ہونے کے ناطے وزیر اعظم کو ایسا بیان نہیں

دینا چاہئے تھا۔ (سلطان صلاح الدین اویسی) آل انڈیا مجلس اتحاد المسلمین

---

## اپوزیشن پارٹیوں کا ردِ عمل

➤ ملک کا لیڈر رہوتے ہوئے بھی واجپئی بہت مجبور ہیں آخر ان کو کون مجبور کرتا ہے؟ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بی۔جے۔پی۔، آر۔ایس۔ایس۔، وی۔ایچ۔پی۔ کے ہی لیڈر نہیں ہیں بلکہ پورے ملک کے لیڈر ہیں۔ ملائم سنگھ یادو (سماجوادی پارٹی)

➤ وزیر اعظم بار بار اپنا بیان بدلتے ہیں، انہوں نے مسئلہ اجودھیا پر نو دس بار اپنا بیان بدلا ہے۔ میرے پاس اس کا ریکارڈ ہے، واجپئی کے ہر بیان کے بعد یہ سوچنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے اس بیان پر کتنے دن قائم رہیں گے۔ پریہ رنجن داس منشی (کانگریس)

➤ ہم نے کسی وزیر اعظم کو کسی کی چتا کے پاس کھڑا ہوا نہیں دیکھا جو اتنا خطرناک بیان دے۔ وزیر اعظم کا بیان بہت خطرناک ہے، وزیر اعظم کا یہ کہنا ہے کہ پرم ہنس کی آخری خواہش ضرور پوری ہوگی اور اس کے بعد یہ کہنا کہ کوئی طاقت مندر زمان کو نہیں روک سکتی۔ یہ دونوں بیان پوشیدہ سیاسی اور انتخابی مفادات کو سامنے رکھ کر دیئے گئے ہیں۔ آخری رسومات کے موقع پر تعزیتی نشست کا انعقاد اور اس طرح کے بیان کا مقصد فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے سوا کچھ نہیں۔ وزیر اعظم کو اس بیان پر افسوس ظاہر کرنا چاہئے۔ سومناتھ چٹرجی (مارکسوادی کیمونسٹ پارٹی)

➤ وزیر اعظم نے اجودھیا میں جو کچھ کہا ہے وہ تعجب خیز نہیں ہے۔ وہ جو بات دل سے کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں مگر جب بی۔جے۔پی۔ کی بھیڑ دیکھتے ہیں تو بدل جاتے ہیں۔ جب وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی فسادات کے دوران گجرات گئے تھے تو نریندر مودی کے بارے میں درست بیان دیا تھا مگر جب گوا گئے تو بدل گئے۔ اگر ان میں ہمت ہے تو مندر کی تعمیر کے لئے قانون لے کر آئیں۔

رام ولاس پاسوان (لوک جن شکتی پارٹی)

(بشکریہ: راشٹریہ سہارا، اُردو)

---

# ''وزیر اعظم نے عدلیہ کا وقار مجروح کیا''

از: انور علی ایڈوکیٹ

ہمارے پرائم منسٹر اٹل بہاری واجپئی صاحب شاعرانہ مزاج کے ہیں۔ مصرعہ بند اور آزاد شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کا یہ شاعرانہ مزاج سیاسی بیانوں میں اُبھر کر آتا ہے اور لفظوں کی جھوم جھوم میں وہ ایک سچے شاعر کی طرح بھول جاتے ہیں کہ وہ پہلے جو مصرعہ کہہ چکے ہیں دوسرا مصرعہ اس کے متضاد ہے۔ بی۔ جے۔ پی۔ نے 1989 میں پالم پور اجلاس میں رام مندر کا مدعا گود لے لیا تھا۔ تب سے اس ایشو پر وہ سیاست دان سے زیادہ شاعرانہ انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں اور ہر قدم پر انہوں نے دوہرے الفاظ اور دوہرے جملوں میں اظہار خیال کیا ہے۔ 6/دسمبر 1992ء کو مسجد کی شہادت کے بعد وہ خاص طور پر دوہرے جملوں میں باتیں کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کا ہر بیان اس موضوع پر پہلے جارحانہ ہوتا ہے اور اس کے بعد شاخ زیتون کی طرح لچیلا اور ملائم۔

واجپئی جی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں وزیر اعظم ہیں۔ وہ آئینی طور پر ہندوستانی ریاست کے ایگزی کیوٹو ونگ کے سربراہ ہیں۔ ایک تجربہ کار سیاست داں ہیں۔ سینئر پارلیمنٹرین ہیں۔ پچاس سال سے زیادہ عرصہ سے وہ پارلیمنٹ کی شوبھا بڑھا رہے ہیں۔ بخوبی جانتے ہیں کہ عدلیہ ایک آئینی ادارہ ہے۔ عدلیہ کا وقار پوری دنیا میں ہے۔ رام چندر پرم ہنس کی ارتھی پر انہوں نے جو تقریر کی ہے اس کو محض جذباتی تقریر نہیں کہا جا سکتا یہ تقریر ایک پختہ ارادہ اور معتبر اقرار (Solemn Declaration) ہے ایک مقصد کو پورا کرنے کا، خواہ نتیجہ کچھ بھی ہو (نہرو جی کی تقریر 15/اگست Destiny with the Trust کے مماثل ہے۔ واجپئی جی کا یہ اعلان)۔ وزیر اعظم بخوبی جانتے ہیں کہ تنازعہ جوڈیشیل فیصلہ کے لئے اسٹیٹ کی سب سے بڑی عدالت کے روبرو ہے اور پروسیڈنگس چل رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ Contempt of Courts کی تعریف میں آتا ہے۔ Contempt of Courts Act 1971 کی دفعہ 2C میں کہا گیا ہے کہ ایسا کوئی بھی میٹر، الفاظ، اشارات یا کسی بھی طریقہ سے پھیلانا، اشاعت کرنا، جس سے عدالت کی عزت اور وقار میں کمی آئے، یا ایڈمنسٹریشن آف جسٹس میں مداخلت ہوتی ہو تو وہ عدالت کی Contempt ہے۔

وزیر اعظم کا مذکورہ بیان یکم اگست 2003 جمعرات، الیکٹرونکس، اخباری اور ریڈیائی میڈیا نے پورے ملک میں اور دنیا بھر میں نشر کیا اور یہ پورے ملک کے علم میں ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ معاملہ لکھنؤ بنچ ہائی کورٹ کے سامنے ہے اور لکھنؤ سے ملے مقام پر یہ اہم بیان دیا گیا۔ وزیر اعظم ملک کی ایگزی کیٹیو کے سربراہ ہیں۔ آئینی طور پر عدلیہ ریاست کا دوسرا بازو ہے۔ تو کیا یہ سنگل ملک کے عوام کو نہیں دیا گیا کہ وزیر اعظم عدلیہ کی اہمیت سے بے پروا رام مندر تعمیر کرنے کا پختہ عزم کیے ہوئے ہیں۔ یہ صریحاً Interference in Administration of Justice ہے اور عدلیہ کا اس بیان سے وقار مجروح ہوا ہے۔ ملک کے قانونی ماہرین کو جو اس ملک میں قانون کی حکمرانی کے اصول کے علمبردار ہیں اس جہت میں کارروائی کرنے کے لیے غور وفکر کرنا چاہیے۔

(بشکریہ: راشٹریہ سہارا)



# سویم سیوک وزیراعظم کی مجبوری یا کوٹ نیتی

از: محفوظ الرحمٰن
(سابق مدیر سہ روزہ دعوت، نئی دہلی)

وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی سنگھ کے سچے سویم سیوک ہیں اور ایک سچے سویم سیوک کی امتیازی شناخت یہی اور صرف یہی ہوتی ہے کہ وہ سنگھ کی آنکھ سے دیکھتا، سنگھ کے کان سے سنتا، سنگھ کی زبان سے بولتا اور سنگھ کے دماغ سے ہی سوچتا ہے۔ شاکھاؤں میں اور بودھ کی مجلسوں میں ذہنی تطہیر کے ایک طویل اور مسلسل عمل سے گزرنے کے بعد کوئی سویم سویک اگر چاہے بھی تو وہ سنگھ کی سوچ سے الگ ہٹ کر نہ اپنے لئے کوئی نیا راستہ بنا سکتا ہے اور نہ ہی ان فیصلوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ جن کی صورت گری ناگپور میں عمل میں آئی ہو اور واجپئی جی تو بہت ہی اچھے انسان ہیں، ان کے بارے میں تو یہ سوچنا بھی محال ہے کہ وہ اس پیمانِ وفا کو بھول جائیں گے جو انہوں نے کبھی سنگھ کے ساتھ باندھا تھا۔

وزیراعظم اٹل بہاری واجپئی نے زندگی کے ہر موڑ پر اس بنیادی حقیقت کو حرزِ جاں بنائے رکھا کہ وہ سنگھ کے ساتھ ایک ایسے اٹوٹ رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں جسے توڑ دینے کی صورت میں وہ اپنی شخصیت کے سحر، اس کے وزن اور اس کی معنویت تک سے یکسر محروم ہو کر رہ جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ کبھی اس رشتہ کو نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہمیشہ کسی استثناء کے بغیر وہ اپنے قول و عمل سے اس کی تائید و توثیق بھی کرتے رہے ہیں۔ جب بھی اس رشتے کے اظہار کا کوئی ادنیٰ سا موقع بھی آیا تو انہوں نے کسی پس و پیش کے بغیر اپنا پورا وزن سنگھ کے پلڑے میں ڈال دیا۔ انہوں نے وزارتِ عظمٰی کا منصب سنبھالنے کے بعد بھی اس معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔

مرکز میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی قیادت میں این.ڈی.اے. کی سرکار بننے کے بعد جب کبھی بھی 24 گھوڑوں کے اس رتھ کے ساربان وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کو یہ لگا کہ مخلوط حکومت کی مجبوریاں انہیں سنگھ پریوار کی طے شدہ لائن سے کچھ دور لے جا رہی ہیں یا کچھ اس طرح کا تاثر پیدا کر رہی ہیں کہ وہ سنگھ کے فیصلوں کی عمل آوری میں کچھ بہت زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تو انہوں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر پبلک پلیٹ فارم سے یہ یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی کہ وہ آج بھی

سنگھ کے سچے سویم سیوک ہیں اور یہی ان کی امتیازی شناخت ہے۔ اپنے سویم سیوک ہونے کی بات انہوں نے ہندوستان میں بھی متعدد بار کہی اور امریکہ میں بھی اس کا بھرپور یقین دلایا کہ وہ از اوّل تا آخر ایک سویم سیوک ہی ہیں۔ وہ سویم سویک ہی تھے، سویم سیوک ہیں اور سویم سیوک رہیں گے۔ چاہے وزیر اعظم رہیں یا نہ رہیں۔

ہمارے وزیر اعظم ایک سچے سویم سیوک ہیں، اس سے نہ انہیں انکار ہے اور نہ اس سلسلے میں کسی اور کو کوئی غلط فہمی ہونی چاہئے۔ سنگھ کی پٹی پٹائی لیک سے ہٹ کر جب کبھی بھی وہ کوئی ایسا قدم اُٹھاتے ہیں جو ان کے لبرل اور جمہوریت پسند ہونے کی تائید کرتا نظر آتا ہے تو اسے یا تو 24 گھوڑوں کے رتھ کو مستقل چلاتے رہنے کی مجبوری کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے یا اقتدار کے توسط سے سنگھ پریوار کے دیرینہ عزائم کی تکمیل کی راہ میں ایک اہم قدم تصور کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اسے بہت ہی خوبصورت اور انتہائی ذہانت کے ساتھ ترتیب دیا جانے والا ڈرامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک ایسا ڈرامہ جواز اوّل تا آخر چانکیہ کی ''کوٹ نیتی'' پر مبنی ہو۔ یہ کوٹ نیتی بعض حالات میں دِجل وفریب اور کہہ مکرنی کے ایک مؤثر ہتھیار کے روپ میں استعمال کو نہ صرف یہ کہ روا اور جائز قرار دیتی ہے بلکہ اسے نظر انداز کرنے کو پاپ یا ناقابل معافی جرم بھی گردانتی ہے، خاص کر اس صورت میں جبکہ اس کے نتیجہ میں کسی بنیادی مقصد یا مقاصد پر ضرب پڑتی ہو۔

جہاں تک ہمارے محترم وزیر اعظم کا تعلق ہے ان کے بارےمیں یہ کہنا یقیناً غلط نہیں ہوگا کہ وہ کوٹ نیتی کے ماہر ہیں اور اس معاملے میں کم از کم ہمارے اس ملک میں ان کا کوئی ثانی مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ بابری مسجد/رام جنم بھومی کے تعلق سے وہ کہہ کر مکر جانے یا اپنے بیانات کی من چاہی توجیہ و تاویل کی جس راہ پر گامزن رہے ہیں وہ بہت ہی واضح انداز میں اسی کوٹ نیتی کی جانب ہی اشارہ کرتی نظر آتی ہے۔

وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی ایک اچھے، سچے اور مخلص سویم سیوک ہیں۔ وہ اگر چاہیں بھی تو آر. ایس. ایس. کے مقرر کردہ اہداف کو نہ تو نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ بالواسطہ طور پر ہی سہی کوئی ایسی روش اختیار کر سکتے ہیں جس سے ادنیٰ درجے میں بھی ان اہداف کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہو۔ وزیر اعظم یہ بات نہ صرف اچھی طرح جانتے ہیں کہ اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر آر. ایس. ایس. کا ایک ایسا ہدف ہے جسے حاصل کرنے کے لئے سنگھ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی

جانتے ہیں کہ سنگھ پریوار یہ مندر وہیں تعمیر کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے جہاں کبھی بابری مسجد کھڑی تھی اور اس مسجد کے انہدام کی سازش کو عملی جامہ بھی اسی لئے پہنایا گیا ہے کہ مسجد کی جگہ پر ایک شاندار مندر کی تعمیر عمل میں آ سکے۔ سنگھ پریوار نے اس مقصد کے حصول کے لئے اپنے وسیع وسائل کے ساتھ ساتھ اپنی پوری افرادی قوت بھی جھونک دی ہے اور ہر سچے سویم سیوک کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی حد تک اپنے طور پر اس مقصد کے حصول کی سعی میں تعاون دے۔

وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی بھی ظاہر ہے ان کوششوں سے اپنے آپ کو لاتعلق نہیں رکھ سکتے۔ وہ چوبیں گھوڑوں کے رتھ کے ساربان بھی ہیں اور وزارت عظمیٰ کے منصب کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھنا بھی ان کے لئے ضروری ہے۔ یہی نہیں بلکہ سنگھ کے وسیع تر مفاد میں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ایوان اقتدار میں یہ ہر صورت ان کی اور ان کے ساتھیوں کی موجودگی بنی رہے۔ اس میں کوئی رخنہ پڑے۔ لیکن ان کی مجبوری یہ بھی ہے کہ وہ ایک اچھے پختہ کار اور پختہ فکر سویم سیوک بھی ہیں۔ ان کے اندر کا سویم سیوک کبھی کبھی سنگھ کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر بابری مسجد/رام جنم بھومی کے مسئلہ پر بھی لب کشائی پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور یہ مجبوری آر.ایس.ایس. سے رشتۂ وفا کی کوکھ سے ہی جنم لیتی ہے لیکن اسی رشتۂ وفا کی بنا پر ایک اور مجبوری بھی ان کے دامن گیر ہو جاتی ہے اور یہ مجبوری بھی اسی رشتۂ وفا کے حوالے سے یعنی اقتدار کو قائم رکھنے کے حوالہ سے سامنے آتی ہے اور اس مجبوری کے تحت ہی وہ اپنی کہی ہوئی باتوں کی توجیہ و تاویل یعنی کوٹ نیتی کا حربہ استعمال کرتے ہیں، کہہ مکرنی کا سہارا لیتے ہیں۔

رام جنم بھومی پر مندر بنے گا اور وہیں بنے گا جہاں کبھی بابری مسجد کھڑی تھی۔ یہ بات وہ 1991 سے جبکہ وہ اپوزیشن لیڈر تھے کہتے چلے آ رہے ہیں۔ اپریل 1991ء میں انہوں نے وشو ہندو پریشد کی ریلی کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ رام جنم بھومی (بابری مسجد کی جگہ) پر رام مندر کی تعمیر قومی وقار کی بحالی کے لئے ضروری ہے۔ پھر وزیر اعظم کا منصب سنبھالنے کے بعد 6/دسمبر 2000 کو انہوں نے راشٹر پتی بھون کے سامنے اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے بہت ہی واضح لفظوں میں کہا کہ رام جنم بھومی تحریک قومی جذبات کا اظہار تھی، جو ابھی نا تمام ہے یعنی اس تحریک کو ابھی اس کے منطقی انجام تک پہنچانا باقی ہے اور کون نہیں جانتا کہ رام جنم بھومی تحریک اپنے منطقی انجام تک اسی صورت میں پہنچ سکتی ہے جب اجودھیا میں بابری مسجد کی جگہ رام جنم بھومی مندر کی تعمیر عمل میں آ جائے۔ دوسرے

لفظوں میں یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ وزیر اعظم نے یہ کہے بغیر کہ رام مندر وہیں بنے گا جہاں کبھی بابری مسجد کھڑی تھی وہ سب کچھ کہہ گئے جو سنگھ پریوار کے لوگ یہ بانگِ دہل کہتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن دوسرے دن یعنی 7 ردسمبر کو مرکزی وزیر شاہ نواز حسین کی افطار پارٹی میں انہوں نے اشاروں کنایوں میں بات کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ ''مندر متنازعہ جگہ پر بنایا جا سکتا ہے جبکہ مسجد کے لئے اجودھیا میں کوئی اور جگہ تلاش کی جا سکتی ہے''۔

این.ڈی.اے. حکومت میں شامل پارٹیوں کا جب دباؤ بڑھا اور اقتدار کی کشتی بھنور میں پھنستی دکھائی دینے لگی تو انہوں نے 19 ردسمبر کو پارلیمنٹ میں کہہ مکرنی کا حربہ استعمال کیا اور کہا کہ انہوں نے ''بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنانے کی بات کبھی کہی ہی نہیں''۔ کوٹ نیتی کی یہ چال اس اعتبار سے کامیاب رہی کہ حکومت کی ڈانواں ڈول کشتی پھر پرسکون پانیوں میں تیرنے لگی۔ وہ لوگ جو خود فریبی کو سیاسی حکمت و دانائی کی معراج سمجھتے ہیں مطمئن ہو کر بیٹھ رہے اور سنگھ پریوار کے ڈھکے چھپے نقارچیوں نے حسب سابق ایک بار پھر سویم سیوک وزیر اعظم کی سیکولر سوچ اور ان کی انصاف پسندی کا ڈھول پوری قوت سے پیٹنا شروع کر دیا۔

اب اجودھیا میں رام جنم بھومی تحریک کے روحِ رواں رام چندر پرم ہنس کے جسدِ خاکی کو نظر آتش کرنے کے موقع پر سوگواروں کی ایک بھیڑ کو خطاب کرتے ہوئے ان کے اندر کا سیوم سیوک ایک بار پھر ساری مصلحتوں کو نظر انداز کر کے پوری قوت سے جاگ اُٹھا۔ اُنہوں نے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کا کہ پرم چندر ہنس جی کے دیرینہ خواب یعنی مندر کی تعمیر کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے مخالفین سے 'سد بدھی' یعنی عقلِ سلیم سے کام لینے کی توقع کا اظہار بھی کیا۔ ان کے اس بیان پر اپوزیشن کا برہم ہونا ایک فطری بات تھی اور این.ڈی اے. میں شامل کچھ پارٹیاں بھی زیرلب ناگواری کا اظہار کرتی نظر آئیں۔ معاملہ لوک سبھا میں اُٹھایا گیا تو وزیر اعظم نے ایک بار پھر کہہ مکرنی کا سہارا لیا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے موقف سے ذرہ برابر بھی پیچھے نہیں ہٹے ہیں اور شاید ان کی یہ بات درست بھی ہے کیونکہ وہ آپسی بات چیت کے ذریعے اس مسئلہ کو حل کر لینے کی وکالت اب بھی کرتے سنائی دے رہے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ پورا سنگھ پریوار جس میں ہمارے وزیر اعظم بھی شامل ہیں جب آپسی بات چیت کی بات کہتا ہے تو اس میں یہ بنیادی نکتہ بھی مضمر ہوتا ہے کہ فریق ثانی عدالت کے فیصلہ کا انتظار کرنے کے بجائے

آپس میں مل بیٹھ کر بہ رضا و رغبت بابری مسجد کی جگہ پر رام مندر کی تعمیر کے اس کے فیصلے کو مان لے۔ وزیراعظم واجپئی نے پرم ہنس جی کی چتا پر فریق مخالف کو سدبدھی (عقلِ سلیم) کا مظاہرہ کرنے کا جو مشورہ دیا تھا اس کا مفہوم یہی تھا کہ وہ رام مندر کی مخالفت کا راستہ ترک کر کے بابری مسجد کی جگہ پر اس کی تعمیر کی راہ ہموار کرنے میں تعاون دے۔ وزیراعظم کے نزدیک سدبدھی کے جو معنی و مضمرات ہیں اسی پر پوراسنگھ پریوار بھی یقین رکھتا ہے۔ کل ملا کر جو تصویر بنتی ہے وہ یہی ہے کہ وزیراعظم روزِ اوّل سے بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کے لئے متمنی رہے ہیں۔ اب یہ بات الگ ہے کہ وہ اپنا مدعا کوٹ نیتی کی زبان میں بیان کرتے رہے ہیں۔ یہ کوٹ نیتی ان کی مجبوری ہے، کہہ مکرنی کا سہارا لینا ان کی مجبوری ہے اور اس مجبوری نے آر.ایس.ایس. کے ساتھ ان کے رشتۂ وفا کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ جب تک آر.ایس.ایس. کا وسیع تر مفاد اس کا تقاضہ کرتا رہے گا یہ مجبوری اپنی جگہ پر بنی رہے گی اور وہ کوٹ نیتی کا سہارا لیتے رہیں گے۔ کہہ مکرنی کا دامن تھامے رہیں گے۔



# وزیراعظم دو قدم آگے: ایک قدم پیچھے

از: عتیق مظفر پوری (صحافی)

بلا شبہ اٹل بہاری واجپئی صاحب ملک پر سب سے زیادہ دنوں تک حکومت میں رہنے والے تیسرے وزیر اعظم بن چکے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وقت کا مورخ ان کی اس تاریخ ساز کامیابی کا سہرا ان کی ڈھلمل شخصیت یا ان کی پارٹی بی۔جے۔پی۔ کے سر باندھنے کے بجائے پہلے نمبر پر فکری اعتبار سے دیوالیہ پن کا شکار کانگریس کے سر باندھے گا جو سب سے بڑی اپوزیشن پارٹی ہوتے ہوئے بھی موجودہ مرکزی حکومت کی غیر مرئی حلیف کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اس کے بعد این۔ ڈی۔ اے۔ حکومت میں شامل اور اسے اپنے حمایت دینے والے ان سیاسی گروپوں کو اس کا کریڈٹ دے گا جو وقت کی ضرورت اور حالات کے تقاضوں سے کہیں زیادہ اپنے اپنے سیاسی مفادات اور اپنی اپنی سیاسی مجبوریوں کے تحت اپنے اصولوں کا گلا گھونٹ کر حکومت میں شامل ہوئے اور اس سے چپکے رہے۔

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگ اس صورت حال کے لئے بھی کانگریس کو ہی ذمہ دار قرار دیں جس نے سونیا گاندھی کو وزیر اعظم بنانے کی ضد کر کے سیکولر سیاسی پارٹیوں کے اتحاد کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر کے متعدد ایسی سیاسی پارٹیوں کو بھی بی۔جے۔پی۔ کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا جنھوں نے سابقہ واجپئی حکومت کو گرانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا۔ حالانکہ اس کے لئے سیکولرزم کی دعویدار ساری سیاسی پارٹیاں ہی ذمہ دار ہیں۔

تاہم سیکولرزم کی دعویدار سیاسی پارٹیوں کی اس کوتاہی کو این۔ڈی۔اے۔ حکومت میں شامل سیاسی پارٹیوں کے لئے اپنے اصولوں کا گلا گھونٹنے کا جواز نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اپنے عہدے کی اس طویل مدت میں سنگھ پریوار کے غیر اعلانیہ ایجنڈے پر ڈائریکٹ یا، اِن ڈائریکٹ عمل پیرا رہنے کو چھوڑ کر بمشکل ہی ایسی کوئی مثال پیش کی جا سکتی ہے جس پر وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی پوری طرح ثابت قدم رہے ہوں۔ خواہ وہ معاملہ ان کے سیکولر کردار سے متعلق ہو یا آر۔ایس۔ایس۔ کے ساتھ ان کی وابستگی سے، وہ ہمیشہ دو قدم آگے بڑھنے کے بعد ایک قدم پیچھے ضرور ہٹے ہیں۔ مثال کے طور پر

جب وہ سنگھ سیوکوں کے بیچ ہوتے ہیں تو انہیں یہ کہنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی کہ وہ پہلے سنگھ سیوک ہیں بعد میں وزیر اعظم اور جب انہیں اپنے سیکولر ہونے کا ثبوت دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو وہ سنگھ پریوار اور اس کی فکر سے اپنا دامن جھاڑنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ ذرائع ابلاغ میں آئے دن اس طرح کے سوالات اُٹھائے جاتے رہتے ہیں کہ کیا اجودھیا معاملہ میں وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اور نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی کے مابین شدید اختلافات پائے جاتے ہیں؟

ہوسکتا ہے کہ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے مہنت رام چندر داس پرم ہنس کی آخری رسومات کی ادائیگی کے موقع پر اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر سے متعلق جو باتیں کہی ہیں ان کے پیچھے ان کا مقصد اجودھیا تنازعہ سے متعلق مذکورہ بالا الزامات کا ہی ازالہ کرنا اور سنگھ پریوار کے لوگوں کو یہ بتانا ہو کہ وہ ان کی اعتدال پسندی کے تعلق سے میڈیا میں شائع ہونے والی افواہوں سے قطعی کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں کیونکہ گزشتہ جون ماہ میں بی۔جے۔پی۔ کے جنرل سکریٹری پرمود مہاجن کو بار بار یہ یقین دہانی کرانی پڑی تھی کہ اجودھیا تنازعہ کے سلسلہ میں وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی اور نائب وزیر اعظم ایل۔کے۔اڈوانی کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وشو ہندو پریشد کے کارگزار صدر اشوک سنگھل اور جنرل سکریٹری پروین توگڑیا نے یہ الزام عائد کیا تھا کہ حکومت اجودھیا تنازعہ حل کرنے کے لئے مسلمانوں کے ساتھ کوئی سودا کر رہی ہے۔ ایسا کوئی پہلی بار نہیں ہوا ہے۔ جب بھی ان کی اعتدال پسندی پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی کوشش کی گئی ہے تو وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے اس کا نوٹس لیا ہے۔ چند برس پہلے کی بات ہے اپنی تیرہ روزہ حکومت کے آخری دن اعتماد کے ووٹ پر ہوئی بحث کا جواب دیتے ہوئے اٹل بہاری واجپئی نے اس بات پر خاصا بُرا منایا تھا کہ انہیں بحث کے دوران بار بار اچھا آدمی کہا گیا۔ ان کے کہنے کا قطعی یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ برے ہیں بلکہ وہ یہ جتانا چاہتے تھے کہ اگر میں اچھا آدمی ہوں تو میری پارٹی کیسے بری ہوسکتی ہے۔

گویا کہ جیسی اچھی یا بری ان کی پارٹی ہے وہ بھی ویسے ہی ہیں۔ اگر ان کی پارٹی سیکولر ہے تو وہ بھی سیکولر ہیں۔ اگر ان کی پارٹی فرقہ پرست ہے تو وہ بھی فرقہ پرست ہیں۔ انہوں نے کبھی بھی اپنی پارٹی کے موقف سے ذرہ برابر اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔

اس کے باوجود اگر میڈیا ان کی شاعرانہ اور ساحرانہ شخصیت سے مسحور ہوکر انہیں اعتدال پسند لیڈر ثابت کرنے پر کمر بستہ ہے تو اس میں بھلا وزیراعظم کا کیا قصور ہے؟ جبکہ انہوں نے کبھی اور کسی موقع پر بھی اعتدال پسندی کا کوئی ثبوت دیا ہی نہیں ۔ اگر مسلم ووٹوں کی بات نکلی تو انہوں نے دو ٹوک لفظوں میں اور جھٹ سے کہہ دیا کہ انہیں اس کی ضرورت ہی نہیں۔ کیا کوئی اعتدال پسند لیڈر بھی ایسا کہہ سکتا ہے؟

چلیں اس کو چھوڑ دیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے وزیراعظم مذہبی اور جذباتی نوعیت کے مسائل پر خود جذباتی ہو جاتے ہوں۔ لیکن ایسا بھی تو نہیں ہے بہ نظر غائر دیکھیں اور ان کے عہدے کی اس لمبی اننگ کا جائزہ لیں تو بشمول خارجہ امور دوسرے اہم مسائل کے تعلق سے بھی ان کا رویہ بالکل جارحانہ معلوم ہوتا ہے ۔ وہ پل میں شعلہ اور پل میں شبنم بن جاتے ہیں۔

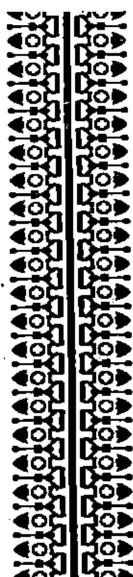
مثال کے طور پر ہند۔ پاک تعلقات اور دہشت گردی کے معاملات کو ہی لے لیں۔ وہ بھی ان کے دور حکومت میں لال قلعہ اور پارلیمنٹ کے اوپر حملہ کی شکل میں اپنی انتہا کو چھوگئی۔ وہ کبھی اس دہشت گردی کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کا عزم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تو کبھی ایک دم سے موم بن جاتے ہیں۔ کبھی پاکستان کے ساتھ سارے سفارتی تعلقات توڑ لیتے ہیں تو کبھی بحال کر لیتے ہیں۔ کبھی ناراض محبوب کی طرح ایک جھٹکے کے ساتھ ریل، ہوائی اور سڑک سمیت سارے رابطے توڑ لیتے ہیں اور کبھی ان رابطوں کو بحال کرنے کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے۔ کبھی پابندی عائد کرنا لازمی قرار دیتے ہیں تو کبھی مہمل۔ کبھی دہشت گردی کو ناقابل برداشت قرار دیتے ہیں اور کبھی یک طرفہ فائر بندی کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کا رویہ انتہائی بلندی اور انتہائی پستی کے بیچ جھولتا نظر آتا ہے۔ ایک روز کہتے ہیں کہ مشرف کی وجہ سے رمضان کی فائر بندی ناکام ہوئی تو دوسرے ہی دن پاکستان کے اس فوجی حکمراں کو آگرہ تشریف لانے کی دعوت دے ڈالتے ہیں۔ کبھی فوج کو فیصلہ کن جنگ کے لئے سرحد پر تعینات کر دیا جاتا ہے اور 9 مہینے تک لڑائی کے لئے تیار رکھنے کے بعد واپس بلا لیا جاتا ہے۔ کسی دن کہتے ہیں کہ اسلام آباد کے اوپر ہندوستانی دباؤ کام کر رہا ہے اور اس کے بعد ہی سری نگر جا کر پاکستان کی پالیسی کے برعکس ہندوستان کی طرف سے دوستی کا ہاتھ بڑھا کر اپنے وزیر خارجہ سمیت پوری دنیا کو انگشت بدنداں کر دیتے ہیں۔ یہاں یہ تذکرہ بھی غیر ضروری نہیں ہوگا کہ وزیراعظم نے سری نگر سے دہلی واپس آکر پاکستان کے ساتھ اپنے اس دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی

وضاحت بھی کچھ اسی انداز میں کی تھی جس انداز میں انہوں نے اجودھیا تنازعہ سے متعلق اپنے حالیہ بیان کی وضاحت کی ہے۔ اس وقت بھی کچھ اسی طرح کی بات کہی گئی تھی کہ ان کے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کا مطلب قطعی غیر مشروط نہیں۔ پاکستان کو تعلقات بحال کرنے کے لئے سرحد پار کی دہشت گردی ختم کرنی ہوگی۔

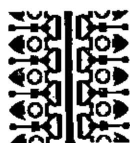
اب میڈیا کو کہاں اتنی فرصت ہے یا اس بات کی ضرورت کہاں محسوس کرتا ہے کہ وہ وزیراعظم سے یہ دریافت کرے کہ کیا سرحد پار کی دہشت گردی ختم ہوگئی یا جن وجوہات کی بنا پر پاکستان کے ساتھ تعلقات منقطع کئے گئے تھے کیا ان وجوہات کا ازالہ ہوگیا؟ وہ تو بس وزیراعظم کو 'اٹل' ثابت کرنے کی کوششوں میں لگا ہے۔ حالانکہ وہ نہ تو 'اٹل' ہیں نہ 'بہاری'۔ وہ تو بس ایک مکھوٹا ہیں، جسے بی۔ جے۔ پی۔ نے اپنے چہرے پر لگا رکھا ہے۔ ورنہ وزیراعظم تو جو بولتا ہے وہ قانون ہوتا ہے۔ وہ حاضرین کے موڈ اور اس کی 'آستھا' سے مرعوب ہو کر ایسی کوئی بات نہیں بولتا جس کی ملک کے سامنے صفائی پیش کرنی پڑے اور لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہوں۔

(بشکریہ: راشٹریہ سہارا، اُردو)







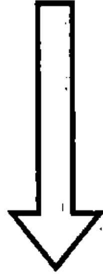





# متنازعہ مقام کی کھدائی

## اور محکمہ آثارِ قدیمہ (A.S.I.) کی رپورٹ

## تجزیہ، تبصرہ، رَدِّ عمل



بابری مسجد کے انہدام نے ہماری قوم کے چہرے پر بدنما داغ لگا دیا تھا اب ہندوستانی محکمہ آثارِ قدیمہ (A.S.I.) کا اعتماد بھی جاتا رہا۔ اس اعتماد کو بحال کرنا یقیناً آسان نہیں ہوگا۔ جانے کب یہ کیسریا رنگ میں رنگنے کی تباہ کن کارروائی ختم ہوگی۔

(عرفان حبیب، معروف مؤرخ)

# متنازعہ مقام کی کھدائی

اہم تاریخیں:

21رفروری 2003: وشو ہندو پریشد نے متنازعہ زمین پر مندر ہونے کے واضح ثبوت ملنے کا دعویٰ کیا۔

23رفروری: وشو ہندو پریشد نے دھرم سنسد میں مندر کے لئے عوامی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا۔

5رمارچ: الہ آباد ہائی کورٹ نے متنازعہ مقام پر توجو کاس انٹرنیشنل کی رپورٹ کو بنیاد بنا کر اے.ایس.آئی کو رپورٹ دینے کے لئے کہا۔

9رمارچ: آرکیالوجیکل سروے کی ٹیم اجودھیا پہنچی کھدائی کے لئے جگہ کا انتخاب کیا اور سروے شروع کیا۔

24رمارچ: اے.ایس.آئی نے عدالت کو اپنے کام کے سلسلے میں رپورٹ پیش کی اور بربل ساہنی سائنس انسٹی ٹیوٹ سے ثبوتوں کی کاربن ڈیٹنگ جانچ کرانے کی اجازت طلب کی۔

25رمارچ: کھدائی روکنے کے لئے دائر ایک درخواست سپریم کورٹ نے مسترد کی۔

28راپریل: اے.ایس.آئی نے اپنی پہلی عبوری رپورٹ عدالت کو پیش کی۔

15رجون: اے.ایس.آئی نے عدالت سے 15 دنوں کی مزید مہلت مانگی۔

یکم جولائی: اے.ایس.آئی نے مزید مہلت کی درخواست کی۔

22راگست: اے.ایس.آئی نے متنازعہ مقام پر کی گئی کھدائی کے ثبوتوں اور نتائج سمیت اپنی فائنل رپورٹ الہ آباد ہائی کورٹ میں پیش کر دی۔

25راگست: کھدائی کی رپورٹ عام کی گئی جس میں اس بات کے اشارے دئے گئے کہ متنازعہ مقام کے نیچے دسویں اور سولہویں صدی کی کسی عمارت کے باقیات موجود ہیں اور وہ ہندو مندر ہو سکتا ہے۔

26 سے 30 اگست: مسلم پرسنل لاء بورڈ نے کہا کہ وہ اس رپورٹ کو چیلنج کرے گا۔ سنی وقف بورڈ نے اس رپورٹ کو سرکاری دباؤ میں تیار اور سیاسی کھیل قرار دیا۔



## اے.ایس.آئی.کی رپورٹ کے اہم نکات

پہلی سطح: 300 قبل مسیح سے لے کر 1000 قبل مسیح تک اجودھیا میں کوئی تعمیری سرگرمی نہیں تھی لیکن کھدائی میں قدیم خصوصیات ظاہر کرنے والی دیویوں کی مٹی سے بنی چھوٹی مورتیاں اور اس دور کی عکاسی کرنے والے برتن وغیرہ ملے۔

دوسری سطح: کھدائی میں پہلی سے دوسری صدی قبل مسیح کی مٹی کی ماتر دیوی کی مورتی اور کچھ تعمیر کی جانکاری ملنے کا اے.ایس.آئی. نے دعویٰ کیا۔

تیسری سطح: کشان دور سے متعلق پہلی صدی سے تیسری صدی کے دوران لمبے سائز والی تعمیرات ملیں۔ گپتا عہد (چوتھی سے چھٹی صدی) کی عمارتیں وغیرہ کی تعمیر یا تبدیلی سے متعلق کوئی ثبوت نہیں ملا۔

چوتھی سطح: ساتویں سے دسویں صدی کے درمیان راجپوت مابعد گپتا عہد کے رہائشی ثبوت ملنے شروع ہوئے جو پکی اینٹوں سے بنے ہیں۔ اس میں ایک دائرہ نما اینٹ کے مندر کی باقیات ہیں۔ یہ مندر باہر سے دائرہ نما لیکن اندر سے مربع نما تھا۔ حالانکہ یہ ڈھانچہ منہدم ہوگیا لیکن شمالی دیوار میں پرنالہ کی باقیات محفوظ ہیں۔ یہ 10-7ویں صدی میں گنگا جمنا میدان میں بنائے جانے والے مندروں کی خصوصی علامت ہیں۔

پانچویں سطح: اسی مقام پر گیارہویں، بارہویں صدی میں تعمیر شدہ ایک بڑا ڈھانچہ ملا۔ اس کا سائز شمال سے جنوب کی جانب 50 میٹر تھا۔ لیکن یہ ڈھانچہ کچھ وقت تک ہی رہا اس کے اوپر ایک دوسرا وسیع ڈھانچہ تعمیر کیا گیا جس کی تعمیر کی تین بنیادیں ملتی ہیں۔ اس میں تین فرشوں کے بھی ثبوت ملے ہیں۔ یہ تعمیری ڈھانچے رہائشی ڈھانچوں جیسے نہیں تھے اور ان کا وجود آئندہ دور میں بھی برقرار رہا۔

چھٹی اور ساتویں سطح: 16ویں صدی سے قبل اس تعمیر کے اوپر یہ متنازعہ ڈھانچہ (بابری مسجد) تعمیر کرا دیا گیا۔ متنازعہ ڈھانچے کے بیچ کا چیمبر اس دیوار کے وسط میں پڑتا ہے۔ یہاں رام للا کی مورتی نصب ہونے کے باعث ماہرین آثار قدیمہ کھدائی نہیں کر سکے۔ اس مرکزی کے قریب ایک دائرہ نما تعمیر ہے۔ یہاں شیرا کوٹہ لیپ ملے ہیں۔ □ □

# اے.ایس.آئی.کی رپورٹ جھوٹ کا پلندہ

از: عرفان حبیب
(معروف مورخ اور سابق استاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

محکمہ آثارِ قدیمہ نے اپنی رپورٹ میں فی الواقعہ آر.ایس.ایس. اور وشو ہندو پریشد جیسی تنظیموں کے موقف کی تائید کی ہے لیکن اس نے اپنی رپورٹ میں جو کچھ تحریر کیا ہے وہ درست بھی ہوتا اجودھیا میں کھدائی کے کام پر بیرونی ماہرین آثار قدیمہ مسلسل نظر رکھے ہوئے تھے کیونکہ اس بات کے احکامات خود ہائی کورٹ کی طرف سے جاری کئے گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کھدائی کے دوران کیا کیا چیزیں ملیں اور کس طرح ملیں، اس چیز کو بابری مسجد مقدمہ کے فریقین کی طرف سے نامزد کردہ مشاہدین نہ صرف بچشم خود دیکھ رہے تھے بلکہ اکثر و بیشتر ان سے ان دریافتوں کی تصدیق بھی کرائی جاتی تھی۔ نتیجتاً ہم ان دریافتوں سے متعلق محکمۂ آثارِ قدیمہ کے سارے ریکارڈ اور اس کی بنیاد پر قائم کی جانے والی ہر رائے کا بخوبی تجزیہ کر سکتے ہیں۔

محکمہ آثارِ قدیمہ کا دعویٰ ہے کہ ہائی کورٹ نے اسے یہ بات معلوم کرنے کا کام تفویض کیا تھا کہ کیا بابری مسجد اپنی جائے وقوع پر پہلے سے موجود کسی مندر کو توڑ کر تعمیر کی گئی تھی یا نہیں۔ لیکن محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ میں ہائی کورٹ کے استعمال کردہ لفظ ''کیا'' کو ملحوظ نظر رکھنے کا کوئی تاثر نہیں ملتا اور لگتا یوں ہے کہ اس کا اصل کام بہر صورت یہ بات ثابت کرنا تھا کہ بابری مسجد کی جائے وقوع پر بلا شبہ ایک مندر موجود تھا اور یہ کوئی معمولی نہیں بلکہ ایک عظیم الشان مندر تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران پہلا کام تو یہ کیا ہے کہ کھدائی کے دوران متنازعہ مقام پر مندر کی موجودگی کے خلاف برآمد ہونے والے تمام ثبوتوں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

اس سلسلے میں اولاً برآمد شدہ جانوروں کی ہڈیوں کے معائنہ کے کام کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور 270 صفحات پر مشتمل رپورٹ کی تلخیص میں اس باب میں انتہائی غیر اہم انداز میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ ''کھدائی کے دوران مختلف ادوار سے متعلق ارضی تہوں میں جانوروں کی ہڈیاں بھی برآمد ہوئی ہیں''۔ لیکن اصل رپورٹ میں ان ہڈیوں کی موجودگی کا کوئی تذکرہ یا تجزیہ موجود نہیں ہے۔ علاوہ ازیں رپورٹ میں اس بارے میں بھی خموشی اختیار کی گئی ہے کہ یہ ہڈیاں (جن میں سے بیشتر بھیڑ اور بکریوں کی معلوم ہوتی ہیں) کن جانوروں کی ہیں اور انہیں کتنی گہرائی سے نکالا گیا ہے،

محکمہ آثارِ قدیمہ کا یہ طرزِ عمل اُن ہڈیوں کے بارے میں اور بھی زیادہ نمایاں ہے جن پر موجود کٹنے کے نشانات سے موجودہ مقام پر گوشت خوری کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان تمام چیزوں کی روشنی میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کی نیت بالکل واضح ہے۔ اس کا مقصد دراصل ان معضروب ہڈیوں کی موجودگی پر پردہ ڈالنا ہے۔ کیونکہ ان سے مسجد کی جائے وقوع پر مندر ہونے کے نظریہ کی نفی ہوتی ہے۔ بلا شبہ جانورون کا گوشت کھانے کے بعد ان کی ہڈیاں مندروں میں دفن نہیں کی جاتیں۔ اس کے علاوہ ہڈیاں دراصل ایک Organic مادہ ہیں اور Carbon Dating کے ذریعہ بآسانی ان کی قدامت معلوم کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ یہ بات خاصی تعجب خیز ہے کہ اس طریقۂ کار کے ذریعہ ان ہڈیوں کی عمر کا تخمینہ لگانے کے معاملے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی گئی ہے حالانکہ اگر اس بات کا تعین کرلیا جاتا تو یہ بات یقینی طور سے ثابت کی جاسکتی تھی کہ کیا اس سرزمین پر مذکورہ ہڈیوں کی تدفین کے وقت وہاں مندر موجود تھا یا نہیں؟

مندر کے وجود کی نفی کرنے والی ایک دوسری اہم شہادت یہاں زیرِ زمین ہر سطح پر پائے جانے والے عہدِ وسطیٰ کے پالش شدہ آثار اور نوادرات سے بھی ملتی ہے اور اس میں وہ فرش بھی شامل ہے جسے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے مبینہ مندر سے وابستہ کیا ہے۔ ان نوادرات کا بھی جہاں جہاں اندراج کیا گیا ہے وہاں ایسے حوالے دینے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی ہے۔ جن سے معلوم ہوتا کہ انہیں زمین سے کتنی گہرائی میں جاکر حاصل کیا گیا ہے۔ اسی طرح رپورٹ میں چکنے اور چمکیلے نوادرات کے ٹکڑوں کے حصول کی سطحوں کا بھی کوئی اندراج نہیں ہے۔ جس کی وجہ بھی صاف ظاہر ہے۔ مبینہ مندر کے عین نیچے مسلم دور کے ان آثار کی موجودگی سے بھی مندر کا افسانہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر محکمۂ آثارِ قدیمہ نے ایک طرف مندر کے وجود کی نفی کرنے والی تمام شہادتوں کو پس پشت ڈال دیا ہے تو دوسری طرف اس نے مندر کو ایک حقیقت ثابت کرنے کے لئے متنازعہ ڈھانچہ کے نیچے ایک عظیم الجثہ ''قدیمی ڈھانچہ'' کی موجودگی کا افسانہ بھی تراش لیا ہے۔ لیکن اگر اس نظریہ کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ سارا جھوٹ فی الفور اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔

متنازعہ جائے وقوع کے نیچے ابھی تک چار فرش دریافت کئے جاچکے ہیں۔ لیکن اس سب میں Lime Mortal Bonding کا استعمال کیا گیا ہے جو کہ مغلیہ دور سے پہلے کی مسلم سلطنت کی روایت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے نچلے یعنی چوتھے فرش اور اس سے ملحق دیوار میں لائم مورٹار کا پایا جانا

انہیں مسلم سلطنت کی ہی باقیات ثابت کرتا ہے۔ رپورٹ میں ملحقہ دیوار میں ایک محراب کی موجودگی کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے جو کسی زمانہ میں بلا شبہ قبل از مغلیہ دور کی کسی کھلی ہوئی مسجد یا عیدگاہ کا حصہ رہی ہوگی۔ رپورٹ میں ایسے تمام ''ناخوشگوار واقعات'' کی پردہ پوشی یا دوسرے الفاظ میں مسجد کے فرش کو مندر کا فرش ثابت کرنے کے لئے "Period VI, Medieval Sultanate Level" کے نام سے ایک نئے تاریخی دور کو بھی جنم دیا گیا ہے، جو مبینہ طور سے گیارہویں اور بارہویں صدی سے متعلق ایک دور تھا۔ لیکن ہمارا محکمۂ آثارِ قدیمہ آج کل علم کے سمندر میں کچھ اس طرح غرق ہے کہ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ خود دہلی سلطنت کا قیام 1206 یعنی تیرہویں صدی میں عمل میں آیا تھا اور سلطنت سے پہلے کے ادوار میں لائم مورٹار کے فرش کی موجودگی ممکن ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ گیارہویں اور بارہویں صدی میں جو کہ ہندوستان کی تاریخ کا Gahadavala دور ہے، مذکورہ اس تعمیری ساز و سامان کے استعمال کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ مزید برآں یہ کہ مندر کے اس ''عظیم الجثہ ڈھانچہ'' کے ستونوں کی مبینہ طور سے صرف چار بنیادیں پائی گئی ہیں جن کی بنیاد پر رپورٹ میں بڑے تاسف کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ مندر نامکمل (''تھوڑے عرصہ قائم'') رہا ہوگا۔ (صفحہ 40)۔ اس طرح اس نام نہاد مندر کے باقی ماندہ 46 ستونوں کی بنیادیں 1200 کے بعد کی تعمیر قرار پاتی ہیں اور ان میں Mud Bonding ہی نہیں بلکہ لائم مورٹار جیسے ساز و سامان کو زیر استعمال لایا گیا ہے جس کا استعمال سلطنت کے دور کا خاصہ تھا۔

محکمۂ آثارِ قدیمہ کے نزدیک مبینہ رام مندر کے وجود پر واحد دلیل اس کے 50 ستونوں کی بنیادیں ہیں خواہ ان میں سے 46 کو مسلم سلطنت کے دور میں ہی تعمیر کیوں نہ کیا گیا ہو۔ یہ بنیادیں ان معنوں میں ایک عجوبہ ہیں کہ ان کا فی الواقعہ کسی بھی ستون سے کوئی حقیقی تعلق نہیں بنتا۔ یہ بنیادیں بالعموم Cal Crete Stone کی بنی ہوئی اینٹوں پر قائم ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسی کوئی بھی بنیاد پتھر یا اینٹوں سے تعمیر کئے جانے والے کسی ایسے ستون کو تھام سکتی ہے جس پر ایک بھاری چھت ٹکی ہوئی ہو۔



# محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ کی حقیقت

از: سیّد شہاب الدین

(سابق ممبر پارلیمنٹ) کنوینر بابری مسجد کوآرڈینیشن کمیٹی

مارچ سے اگست 2003 کے دوران اجودھیا میں بابری مسجد کی جگہ پر کی گئی کھدائی کے بارے میں آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا (محکمۂ آثارِ قدیمہ، حکومت ہند) کی رپورٹ میں مندرجہ ذیل اہم نتائج اخذ کئے گئے ہیں:

''اجودھیا کے آثارِ قدامت کو پہلی بار تیرہویں صدی قبل مسیح کے زمانے کا بتایا گیا''۔

''مجموعی نقطۂ نظر اور متنازعہ ڈھانچے کے عین نیچے ایک زبردست ڈھانچے کی موجودگی اور دسویں صدی کے بعد ساختیاتی ادوار میں تسلسل جیسے آثاریاتی شواہد کے پیش نظر اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو باقیات موجود ہیں ان کی نمایاں خصوصیات شمالی ہندوستان کے مندروں (کی ساخت) کے مماثل ہیں''۔

آیئے پہلے اسی کا جائزہ لیا جائے۔ بی.بی.لال نے اجودھیا میں 1975ء میں کھدائی کی تھی جس کے بارے میں محکمۂ آثار قدیمہ نے 77-1976ء میں رپورٹ پیش کی تھی۔ یہ رپورٹ رامائن میں بتائی گئی جگہوں کے تعین کے منصوبے کے سلسلے میں کی گئی کھدائی کی رپورٹ کا ایک حصہ تھی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ساتویں قبل مسیح سے پہلے اجودھیا میں کسی انسانی آبادی کے آثار نہیں ملتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موجودہ اجودھیا جس سے ہم واقف ہیں رام کی اجودھیا ہے ہی نہیں۔ لہٰذا اب اس (نئی) دریافت کو اجودھیا کے ساتھ دشرتھ کے بیٹے شری رام کی وابستگی کے لئے استعمال کیا جائے گا۔ تاریخی طور پر گوتم بدھ کا زمانہ چھٹی ساتویں صدی قبل مسیح متعین کیا گیا ہے اور یہ مانتے ہوئے کہ رام ایک تاریخی کردار ہیں اور وہ بدھ سے پہلے گزرے ہیں۔ لہٰذا یہ ایک صریحی کوشش نظر آتی ہے کہ رامائن کے رام کی جائے پیدائش اجودھیا ثابت کی جائے اور اس کو ان کی جنم بھومی قرار دے کر اس پران کی یاد میں مندر تعمیر کیا جائے۔ مگر یہ کوشش رپورٹ میں مذکور تضاد بیانی کی وجہ سے کالعدم ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ گپتا عہد کے خاتمے تک (چھٹی صدی عیسوی) بڑے بڑے ڈھانچے تعمیر کرنے کی شہادت نہیں ملتی۔

'بڑے ڈھانچے' کے بارے میں آثارِ قدیمہ کی رپورٹ میں کہا گیا ہے: ''دورمتوسط دور سلاطین (جسے بعد میں متوسط عہد کا اولین دور گیارہویں سے بارہویں صدی عیسوی کہا گیا ہے) میں ایک وسیع وعریض ڈھانچہ تقریباً پچاس میٹر لمبا شمال جنوب رخ کا پایا گیا جس کا فرش چونے اور سرخی سے بنایا گیا تھا اور اب اس کے صرف چار ستون نظر آتے ہیں''۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ڈھانچہ زیادہ دیر پا ثابت نہیں ہوا۔ اس ڈھانچے کے باقیات پر ایک زبردست ڈھانچہ تعمیر کیا گیا۔ کم از کم تین تعمیراتی مراحل ہیں اور یکے بعد دیگرے تین منزلیں بنائی گئی جو ایک عظیم الشان ڈھانچے (30x50 میٹر) کی شکل میں اختتام پذیر ہوا۔ جس میں بڑے بڑے ستون والے ہال (یادو ہال) عوامی استعمال کے لئے تھے جو دورِ متوسط ہیں بہت دنوں تک یعنی وسطی سلاطین دور (بارہویں سے سولہویں صدی عیسوی تک) موجود رہے۔

لہٰذا محکمۂ آثارِ قدیمہ نے جو زبردست ڈھانچہ دریافت کیا ہے اس کی تعمیر دسویں اور گیارہویں صدی میں شروع ہوئی اور اس کی تکمیل چار مرحلوں میں بارہویں سے سولہویں صدی عیسوی کے درمیان ہوئی۔ اس کی وجہ سے وشو ہندو پریشد کے اس دعویٰ کی مکمل تکذیب ہو جاتی ہے کہ رام مندر راجہ بکرمادتیہ نے پچاسویں صدی قبل مسیح میں تعمیر کرایا تھا اور یہ مندر اس وقت تک موجود تھا جب تک کہ بابر نے اسے گرا کر مسجد تعمیر نہیں کرائی۔ یہ دعویٰ تاریخی طور پر ہرگز مستند نہیں ہے اور ہیون مانگ اور فاہیان نے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

## وی.ایچ.پی. کی نئی تھیوری

وی.ایچ.پی. نے اب اپنی دعویٰ بدل دیا ہے اور یہ تھیوری گھڑی ہے کہ رام مندر کی تعمیر گہادا ولاس کے راجہ گوند چندر نے (1114-1154ء) نے کی تھی۔ 1992ء میں مسجد شہید کرنے والے کارسیوکوں کو بابری مسجد کے ملبے میں سے چونے کے پتھر کی ایک لوح (بلیک) ملی تھی جس کی زبردست ثبوت کے طور پر نمائش کی گئی مگر بعد میں پتہ لگا کہ اسے لکھنؤ کے میوزیم سے مل کر لیا گیا تھا اور اس کا تعلق اس دوسرے دَور سے ہے۔ لیکن اب اس پرانی تھیوری کو محکمۂ آثارِ قدیمہ نے نئی زندگی دے دی ہے۔

بابری مسجد کے عین نیچے جو زبردست ڈھانچہ ملا ہے اب اس پر نظر ڈالیں۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے

اس کا زمانہ مابعد گپتا راجپوت عہد اور ابتدائی متوسط سلاطین دور تعین کیا ہے۔ تاریخ کے مستند حقائق اس کی نفی کرتے ہیں۔ اودھ پر افغانوں کا حملہ دسویں صدی عیسوی میں شروع ہوا اور گیارہویں صدی تک اس علاقے میں ان کے قدم جم گئے۔ 1192ء میں تارین کی جنگ میں پرتھوی راج کے شکست کے بعد یہ علاقہ مسلم سلطنت کے زیر نگیں ہوا۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ کا یہ کہنا کہ اس زبردست ڈھانچے کی تعمیر اس عہد کے شروع ہونے سے فوراً پہلے ہوئی اور اس سرحدی علاقے میں جو انتشار اور بار بار حملوں کی زد میں اہم تعمیر کا کام گیارہویں اور بارہویں صدی کے دوران برابر ہوا ہے بعید از قیاس ہے۔ اس کے علاوہ ان تمام کوششوں کے باوجود وی. ایچ. پی. کوئی معاصر ادبی دستاویزی یا تحریری ثبوت پیش نہیں کر سکی اور نہ کوئی باقیات ملی ہے جس کی بنیاد پر کہا جا سکے کہ یہاں ایک شاندار مندر موجود تھا جو 450 برسوں تک موجود رہا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے افغان سلطانوں، ان کے گورنروں اور سلاطین دور کے مقامی فرماں رواؤں کی مذہبی رواداری کی تعریف کی ہے کہ انہوں نے مندروں کی تعمیر اور ان کے استعمال سے کبھی کوئی تعرض نہیں کیا تا آنکہ 1528ء میں بابر مغل نمودار ہوا ہے۔

بابر نے ہندوستان کو افغانوں سے جیتا تھا، ہندو راجہ سے نہیں۔ لہٰذا اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ ہندوؤں کے اقتدار سے جڑی ہوئی کسی مقدس جگہ کو مسمار کرتا۔ بلا شبہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اپنے اقتدار کے پہلے چار برسوں میں اس نے کوئی بھی مندر مسمار کیا ہو۔ لہٰذا جس عظیم الشان مندر کو محکمۂ آثارِ قدیمہ نے دریافت کیا ہے اور وی. ایچ. پی. جس غیر موجود مندر کا ذکر کرتی رہی ہے اگر 1528ء میں موجود ہوتا تو بابر نے مسجد تعمیر کرنے کے لئے اسے ہرگز نہیں توڑا ہوگا۔ اگر وہاں پر کبھی کوئی مندر رہا ہوگا تو اس وقت کھنڈر بن چکا ہوگا اور سولہویں صدی میں اوپری طور پر نظر بھی نہیں آ رہا ہوگا۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے جو نتائج نکالے ہیں اگر ان کو مان بھی لیا جائے کہ ایک عظیم الشان ڈھانچہ تعمیر کیا گیا تھا اور 3 سے 4 سو برسوں کے مسلمانوں کے دورِ حکومت (گیارہویں صدی سے پندرہویں صدی عیسوی تک) میں برقرار ہی رہا تو اس رپورٹ میں ایسی کوئی شہادت نہیں درج کی گئی ہے کہ تعمیراتی، ساختیاتی یا استعمال کے لحاظ سے یہ ڈھانچہ مندر تھا یا یہ مندر رام مندر تھا یا یہ رام مندر دشرتھ کے بیٹے رام کے جنم استھان پر بنا تھا۔ لہٰذا محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ وی. ایچ. پی. کے اس بنیادی ادعا کی تائید نہیں کرتی کہ بابری مسجد رام کے جنم استھان پر بنائی گئی تھی۔

ہائی کورٹ نے جو سوال قائم کئے ہیں کیا محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ میں اس کا جواب ہے؟
خصوصی عدالت نے 22 سوالات قائم کئے ہیں جن میں ایک سوال بنیادی نوعیت کا ہے جو یہ ہے کہ کیا مسجد کو موجودہ جگہ پر تعمیر کرنے کے لئے کسی موجود مندر کو ڈھایا گیا ہے؟
جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ میں ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ اس جگہ پر 1528 میں ایک مندر موجود تھا جسے ڈھایا گیا۔ کوئی بھی ایسی چیز بشمول مورتی کے ٹوٹے ٹکڑوں وشنو یا ان کے اوتار رام کا یا ان کی شریک حیات سیتا، یا بھائی لکشمن اور رفیق ہنومان کا کوئی مجسمہ، مورتی یا شبیہہ جس کا تعلق مندر سے ہوتا ہے، دستیاب نہیں ہوا۔ بابر نے اپنا توپ خانہ استعمال کیا ہوتا تو کوئی جلا ہوا پتھر یا اینٹ بھی ملنی چاہئے تھی، ٹوٹی ہوئی دیواریں اور چھتیں اور بارودوں کے نشانات بھی ہونے چاہئے تھے۔

## ستون کی بنیادیں:

محکمۂ آثارِ قدیمہ نے اپنے مفروضے کی بنیاد 'ستون کی بنیادوں' پر رکھی ہے اور کہا ہے کہ یہ ستون اینٹوں اور پتھروں کے ہیں اور بغیر کسی ترتیب کے بنے ہیں جنہیں خالی جگہوں اور نشیب کو بھرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ بعض چپٹے پتھروں سے ڈھکے ہوئے ہیں تاکہ اس جگہ کو یا پہلے سے بنے فرش کو مسطح کیا جا سکے۔ ان چپٹے پتھروں پر ایسا کوئی نشان نہیں ہے کہ یہ کھمبوں کو سہارا دے رہے تھے۔ مانے بغیر مگر قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایسی بنیاد کا کام دیتے تھے کہ ان کے اوپر پتھر کے ستون کھڑے کئے گئے تھے تاکہ عظیم الشان ڈھانچے کو سہارا دے سکیں کیونکہ بڑا ڈھانچہ چھوٹے ستونوں پر نہیں ٹک سکتا تھا، مگر ان کی اونچائی موٹے طور پر 6x6 یا 6x8 فٹ تھی۔ پھر یہ ستون کہاں چلے گئے؟ صرف ایک ستون کا کچھ حصہ ملا، غالباً یہ ان 14 مختلف آرائشی ڈیزائن والے ستونوں کا حصہ ہوگا جنہیں بابری مسجد میں استعمال کیا گیا تھا۔ 40 سے 65 دیگر ستون کیا ہوئے؟ کیا انہیں بابری مسجد کی تعمیر کے وقت توڑ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں/حصوں میں تبدیل کر دیا گیا یا انہیں مٹی بنا کر سرخی اور چونے کے مسالے میں ملا دیا گیا۔ یہ انتہائی عجیب بات ہے کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے اینٹ کے ڈھیلے ڈھالے جماؤ کو ستون کی بنیاد کہا ہے اور 70-60 بنیاد ڈھونڈ لی ہیں جن کے اوپر کوئی ستون نہیں ہے۔
اس سے زیادہ حیران کن بات یہ ہے کہ ستون کی یہ بنیادیں صرف ایک سطح پر نہیں بلکہ چار مختلف

سطحوں پر پائی گئی ہیں جو چار صدیوں پر محیط ہیں۔ ان میں کسی قسم کی قطار بندی نہیں ہے جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے۔ بلاشبہ ان میں بعض بنیادوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں کھدائی کے وقت گھڑا گیا ہے۔ ایک ممتاز ماہر آثاریات نے اختلافی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ بنیادیں غالباً لکڑی کے ستونوں کو کھڑا کرنے کے لئے بنائی ہوں گی اور جھونپڑوں، دکانوں یا گؤ سالوں کی تعمیر کے لئے ہوں گی، لیکن لکڑی کے یہ ستون وقت گزرنے کے ساتھ کب کے گل سڑ گئے ہوتے اور اب تک ان کا کوئی نام ونشان نہ ہوتا۔

## متبادل نظریہ

کروکشیتر یونیورسٹی کے پروفیسر سورج بھان نے ایک متبادل تھیوری پیش کی ہے جو تاریخی حقائق اور کھدائی کے نتائج کے بالکل مخالف ہے۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ کا زبردست ڈھانچہ ایک مسجد کا ہے جسے بارہویں صدی کے خاتمے پر افغان عہد میں اجودھیا میں تعمیر کیا گیا تھا۔ گپتا راجاؤں اور نہ ہی قنوج کے راجاؤں نے اجوھیا کی طرف کوئی توجہ کی۔ اجودھیا اپنے سابقہ فرماں رواؤں کی بے توجہی کی وجہ سے کھنڈر بن چکا تھا۔ تب افغان یہاں پہنچے۔ افغانوں نے اجودھیا کو ترقی دے کر علاقائی راجدھانی کی حیثیت دی۔ سلطانوں کے زمانے میں اجودھیا اسلامی تعلیم اور صوفی سلسلے کے بزرگوں کا ایک زبردست مرکز بن گیا تھا۔ اٹھارہویں صدی تک اجودھیا میں مسلمانوں کے غالب اثرات نمایاں رہے۔ تلسی داس کی رامائن کی مقبولیت کے بعد سے ہندوؤں میں اجودھیا کی مقبولیت بڑھی۔ ہندوؤں کے اثرات، ہانس بیکر کے مطابق اودھ کے نوابوں اور وزیروں کے دور حکومت میں نمایاں ہوئے جنہوں نے بڑی بے دردی کے ساتھ مختلف فرقوں کے ہندوؤں کے مندروں اور اکھاڑوں کو زمینوں کے عطیات دیئے۔

ابتدائی مسلمانوں نے اجودھیا میں ایک قناتی (بغیر چھت والی) مسجد بنائی۔ بعد میں چھت ڈالی گئی، مگر وہ شکستہ حالت میں تھی۔ اس کے بعد بابر کے جنرل میر باقی نے اس کے حکم کے بموجب مقامی شرقی طرز میں 1528 میں ایک مسجد تعمیر کروائی۔

اس تھیوری کی وجہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہاں ہندوؤں کے عقیدے کے باقیات کیوں نہیں ملے۔ فرش اور عمارت کے خانے میں چونے اور سرخی کا استعمال، سنگ تراشی کے چند ٹکڑے کی موجودگی (بنیادوں و دیواروں میں) اور سب سے بڑھ کر جانوروں کی ہڈیاں جن پر کاٹنے

کے نشانات ہیں اور محراب اور طاق کی موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے یہ ڈھانچہ مسجد کا تھا۔ کھدائی کے دوران پروفیسر سورج بھان نے یہ سب چیزیں دیکھیں ہیں مگر اس رپورٹ میں چھپایا گیا ہے۔ محکمہ جس جگہ کو عام آدمیوں کی جگہ بتاتا ہے وہ عام آدمیوں کے لئے مسجد ہی تھی۔

محکمۂ آثارِ قدیمہ اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے پچھم کی طرف واقع 60 فٹ کی دیوار کی موجودگی پر بہت زور دے رہا ہے۔ مغرب کی طرف خاصا نشیب ہے۔

ظاہر ہے کہ حفاظتی دیوار جو ابتدائی عہد میں بنائی گئی مگر بعد میں بنیاد کے طور پر کام آئی جس کے اوپر قناتی مسجد کی مغربی دیوار بنائی گئی اور بعد میں بابری مسجد تعمیر کی گئی۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سولہویں صدی سے پہلے اس عظیم ڈھانچے کے آس پاس کسی انسانی آبادی کا ثبوت نہیں ملتا۔ عام طور سے مسلم آبادیوں میں مسجد کے آس پاس کی جگہ خالی رکھی جاتی ہے تاکہ عام نمازیوں کے آنے جانے میں دقت نہ ہو۔

تعمیراتی لحاظ سے مندر کے وجود کو چیلنج کیا گیا ہے جو ڈھانچہ دریافت کیا گیا ہے اس کا طرزِ تعمیر اس اسٹائل کے مطابق نہیں ہے جو اس زمانے میں شمالی ہندوستان میں مندروں کی تعمیر میں رائج تھا۔ اس دور کا اب کوئی بڑا مندر نہیں ملتا جس میں مستطیل ہال کھمبوں پر ایستادہ ہو۔ اس کے برعکس اس کی ساخت بالکل مسجدوں جیسی ہے اور بابری مسجد کے پلان کے مطابق ہے۔ مندروں کا اندرونی حصہ عام طور سے بند اور تنگ ہوتا ہے مگر مسجدوں کا کشادہ اور چوڑا ہوتا ہے۔

## ہندوؤں کے لیے متبرک جگہ

محکمۂ آثارِ قدیمہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے پہلے ایک چھوٹی دوبارہ ساخت شدہ مدوّر متبرک جگہ (اندرونی قطر 5.5 فٹ) ڈھونڈ لی تھی جس کو شیو کی مقدس جگہ کی حیثیت سے اُچھالا گیا ہے۔ لیکن کوئی بھی مورتی شیو، وشنو یا رام کی نہیں ملی ہے۔

اس کی وجہ سے اس خیال کو مزید ٹھیس پہنچتی ہے کہ اجودھیا کا تعلق رام سے ہے۔ رپورٹ میں ایک پرنالہ کا بھی ذکر ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کھدائی کے دوران اسے بنایا گیا تاکہ ہندوؤں کے پوتر استھان کی حیثیت سے اس کی شناخت بتائی جائے۔ رپورٹ میں اس ڈھانچے کی لگی ہوئی تصویروں کے حوالے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

## مشہور اسکالروں کی تنقید

ممتاز و مشہور ماہرین تاریخ اور آثار رپورٹ شبور آر. ایس. شرما، عرفان حبیب، ڈی. این. جھا، سیتا رام رائے، آر. سی. ٹھاکران، سورج بھان، ایس. رتنا کر اور ڈی. منڈل نے اس رپورٹ کی بہت سی خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس رپورٹ میں جتنے سوالوں کے جواب نہیں دیے ہیں ان سے کہیں زیادہ سوالات کھڑے کر دیئے ہیں۔ بعض کمیاں برابر، باریک اور تکنیکی ہیں جو عام آدمی کے لیے نہیں ہیں مگر بعض ایسی چیزیں ہیں جو صریحاً غلط ہیں یا جنہیں قصداً چھپایا گیا، شامل کیا گیا ہے، جیسے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے اس کا ذکر کیا کہ اس جگہ پر جو سکّے اور لیری کوٹا کی چھوٹی مورتیاں ملی ہیں اور جو گپتا عہد سے تعلق رکھتی ہیں ان میں رام، سیتا، لکشمن، دشرتھ، ہنومان کی شکلیں نہیں ہیں۔

- جو بھی چیزیں دستیاب ہیں ان میں جیسے پتھر، لیری کوٹا کی چھوٹی مورتیاں، ظروف کے ٹکڑے اور دیگر چیزیں، اہمیت کے لحاظ سے درجہ وار اور زمانے کے لحاظ سے ان کا کٹیلاگ کیوں نہیں بنایا گیا؟
- گول متبرک جگہ کا اس امکان کے پیش نظر کوئی مطالعہ نہیں کیا گیا، کہ مسلمانوں کی متبرک جگہ نہیں ہو سکتی ہے۔
- کس بنیاد پر محکمہ یہ کہتا ہے کہ عظیم ڈھانچہ 11-12 ویں صدی کا ہے؟
- اس رپورٹ میں جانوروں کی ایسی ہڈیوں کو بالکل نہیں بتایا گیا ہے جن پر کاٹنے کے نشانات ہیں۔ مندر میں ایسی چیزیں نہیں مل سکتیں۔
- رپورٹ میں محراب اور طاق کا ذکر نہیں ہے جس کی تصاویر کی تصدیق پر پروفیسر سورج بھان نے کہا ہے۔
- محکمے نے ان قبروں کی کیٹلاگ کو کیوں اہمیت نہیں جو عظیم ڈھانچے کی ہم زمانہ ہیں؟
- رپورٹ میں پروفیسر عرفان حبیب کے الفاظ میں عہد کے متعلق فراڈ سے کام لیا گیا ہے اور چمکیلی اشیاء (ظروف) کو جو مسلم فن تعمیر کا امتیاز ہیں، اسلامی عہد سے قبل کا بتایا گیا ہے کہ کہا جا سکے کہ یہ ڈھانچہ ابتدائی ہندو عہد کا ہے۔ پہلے اس کا تعلق گیارہویں، بارہویں صدی سے پھر بارہویں سے سولہویں صدی سے بتایا گیا ہے۔
- کیوں محکمہ آخری فلور کو چونے اور سرخی سے بنا ہوا ہندو ڈھانچہ کہتا ہے؟ اس میں استعمال شدہ

سرخی اور چونے کی کاربن ڈیٹنگ جانچ کیوں نہیں کرائی گئی؟

- کس بنیاد پر محکمہ یہ کہتا ہے کہ چمکیلے ظروف اسلامی دور سے پہلے کے ہیں؟
- رام چبوترہ کے نیچے جو ذخیرہ اب ملا ہے محکمۂ آثارِ قدیمہ اس کا تعلق بابری مسجد یا کسی پہلے ڈھانچے سے کیوں نہیں بتاتا؟
- انسانی آبادی کی موجودگی یا عام موجودگی کے ثبوت کے لیے محکمے نے مٹی کا تجزیہ کیوں نہیں کرایا؟
- محکمہ نے کس طرح یہ فرض کرلیا کہ جو چند چیزیں ملی ہیں وہ اسی ڈھانچے کی ہیں جو اس جگہ پر موجود ہے، آس پاس کے کھنڈروں سے نہیں آئی ہیں، اتنے عظیم ڈھانچے کی موجودگی کے باوجود تھوڑے سے ہی سنگ تراشی کے نمونے ملے ہیں اس کی وضاحت کس طرح کی جارہی ہے۔

آثاریات کا مطالعہ تاریخ کے بغیر نامکمل یا مبہم رہ جاتا ہے۔ لہٰذا جب تک ان سوالوں کے شافی اور اطمینان بخش جوابات نہ مل جائیں اس وقت تک اس رپورٹ کو قبول کرنا یا اسے قابل اعتبار سمجھنا مشکل ہوگا۔

## رپورٹ کی قانونی حیثیت

مارچ رجولائی 2003 کے دوران محکمے نے خصوصی بنچ کو متعدد عارضی رپورٹیں پیش کی ہیں، کسی میں اس کا شائبہ تک نہیں ہے کہ بابری مسجد کے نیچے ایک زبردست ڈھانچہ موجود ہے۔ اچانک اپنی آخری رپورٹ میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کو اس کا سراغ مل گیا۔ محکمہ کو اس تضاد کی وضاحت کرنی تھی۔ یہ رپورٹ الہ آباد کے ہائی کورٹ کے خصوصی بنچ کو سونپی گئی ہے۔ اس عدالت میں تمام فریقین سے کہا ہے کہ ان کے اعتراضات کی روشنی میں رپورٹ لکھنے والوں کی شہادت ہوگی اور ان پر جرح کی جائے گی، دوسرے ماہرین بھی بلائے جاسکتے ہیں پھر اس کے بعد عدالت اس رپورٹ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرے گی۔ مان لیا جائے کہ عدالت اس رپورٹ کو کلی یا جزوی طور پر مان لے تو صرف ایک 'ماہر' کی رپورٹ قرار دی جائے گی۔ رپورٹ کوئی مفید نہیں ہے اور نہ کوئی واضح ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ محدود مسئلۂ ملکیت کے معاملے کے قانونی پہلو پر بالکل اثر انداز نہیں ہے۔

## کھدائی کی ضرورت

اہم سوال یہ ہے کہ ملکیت کے مقدمے میں کھدائی کی ضرورت اور اہمیت کیوں سمجھی گئی؟ اس مسئلہ پر نرسمہا راؤ کی حکومت نے 1993 میں سپریم کورٹ کی رائے جاننے کی خواہش کی تھی، سپریم کورٹ ماہرین کی رائے لے سکتی تھی، کھدائی کا حکم دے سکتی تھی تا کہ اس صدارتی ریفرنس کا جواب دے سکے، مگر سپریم کورٹ نے دانش مندی سے کام لے کر ایسا کچھ نہیں کیا اور ریفرنس واپس کر دیا۔ اسپیشل بنچ نے کسی طرح محکمۂ آثارِ قدیمہ سے کہا کہ وہ ایک غیر معروف اور نا تجربہ کار کمپنی 'ٹوجو وکاس انٹرنیشنل لمیٹیڈ' کی مدد سے متنازعہ جگہ کا گراؤنڈ اپنی ٹریٹنگ راڈار کے ذریعہ سروے کرے۔ یہ بات صیغۂ راز میں ہے۔

## محکمۂ آثارِ قدیمہ کا زعفرانی رنگ

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ حکومت ہند کا محکمہ ہے اور موجود حکومت نظریاتی لحاظ سے غیر جانبدار نہیں ہے اور 2002 اور 2003 میں سپریم کورٹ کے سامنے وہ موقف اختیار کر چکی ہے جو وی. ایچ. پی. کا ہے۔ اس محکمے کے انچارج وزیر آر. ایس. ایس. کے نظریات کے حامی ہیں اور یہ محکمہ حال میں ہی دھار (مدھیہ پردیش) کی کمال مولا مسجد کو جزوی مندر کی حیثیت دے چکا ہے۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ اس بات پر کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے کہ حکومت ہند اور آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت میں محفوظ شدہ تاریخی مسجدوں میں نماز پڑھنے کے سلسلے میں ایک معاہدہ ہو چکا ہے۔ یہ محکمہ محفوظ مسجدوں کی بالکل دیکھ بھال نہیں کرتا ہے۔ ایسی درجن بھر سے زائد مسجدیں خود دہلی میں ہیں۔

مختصراً یہ کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ مبہم اور غیر واضح ہے۔ بہت سی باتوں کو چھوڑ دیا گیا ہے اور تضادات سے بھرپور اور پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہے۔ تاریخی اغلاط کی بھرمار ہے اور ماہرانہ صلاحیت کی کمی صاف نظر آتی ہے۔ اس لیے ہرگز قابلِ اعتنا نہیں ہے۔



# بابری مسجد کے نیچے محکمۂ آثارِ قدیمہ کی تخریب کاری

از: پروفیسر عرفان حبیب (معروف مورخ)

ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ (اے.ایس.آئی) نے اپنی جو رپورٹ 22/اگست 2003 کو الہ آباد کی لکھنؤ بنچ (بابری مسجد/رام جنم بھومی) کے سپرد کی ہے جسے 25/اگست کو جاری کیا گیا ہے اس میں بعض اہم نکات کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے بلکہ طے شدہ نتائج بھی نکالے گئے ہیں۔ اس رپورٹ میں جو خامیاں ہیں ذیل میں ان کا خلاصہ کیا گیا ہے:

① مویشیوں کی ہڈیاں: اس کھدائی میں مویشیوں کی ہڈیوں کا پایا جانا اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ اسی مقام پر مویشیوں کے گوشت کو بطور غذا استعمال کیا جاتا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کسی مندر کا نام ونشان نہیں تھا۔ اس رپورٹ میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ مختلف ادوار سے تعلق رکھنے والے چند مویشیوں کی ہڈیاں انہیں ملی ہیں (رپورٹ کا صفحہ 270 ملاحظہ ہو) لیکن محکمۂ آثارِ قدیمہ کی اس سنجیدہ اور امتیازی رپورٹ میں نہ تو ان کی تعداد بتائی گئی ہے اور نہ ہی اُن جانوروں کی شناخت کا کوئی حوالہ دیا گیا ہے جن کی یہ ہڈیاں ہیں۔ واضح رہے کہ ان میں بیشتر ہڈیاں بھیڑوں اور بکریوں کی ہیں۔ مویشیوں کی ہڈیوں کے سلسلے میں اس رپورٹ میں ایک باب مختص کر دینا چاہئے تھا جبکہ اس سلسلے میں ایک دوسطروں کے علاوہ کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینے کا واضح مطلب یہی ہے کہ ہندوستانی محکمۂ آثار قدیمہ کو یہ خوف لاحق تھا کہ مویشیوں کے ڈھانچوں اور ہڈیوں کے منظر عام پر آنے سے اس متنازعہ مقام پر مندر ہونے کے دعوے کی بنیادیں ہی ختم ہو کر رہ جائیں گی۔

② چینی مٹی کے برتن: چینی مٹی کے برتنوں کا رواج مسلم سماج میں عام طور سے ہوتا ہے جبکہ مندروں میں ان کا استعمال کبھی نہیں کیا جاتا۔ ان برتنوں کے ٹکڑے کھدائی کے دوران جابجا ملے ہیں۔ فرش نمبر 4 کے نیچے ملنے والے ان برتنوں کے ٹکڑوں کو اس مندر کا ڈھانچہ بتایا گیا ہے جس کی تعمیر گیارہویں اور بارہویں صدی کے وسط میں ہوئی تھی۔ اس رپورٹ کے صفحہ نمبر 270 میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ ٹکڑے جس عہد کے اختتام کی نشاندہی کرتے ہیں وہ اس رپورٹ کے مطابق سراسر

فرضی ہیں۔ صفحہ 270 پر سلطنت وسطی کی مدت 12 سے 16 ویں صدی ہے جبکہ اسی رپورٹ کے صفحہ 40 پر بھی اسے سلطنت وسطی کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف کسی دوسری جگہ میں اس نوعیت کا ایسا کوئی تذکرہ نہیں ملتا جس سے واضح ہو کہ ایسے برتن ملے ہیں جس کا خلاصہ بحث میں کیا گیا ہے۔ عہدِ وسطیٰ اور سلطنت مغلیہ میں برتن کے حوالے یہ اشارہ دیتے ہیں کہ ان کے حجم اور سائز میں زیادہ فرق نہیں۔ گلنیرڈ برتن اس عہد کے مخصوص شناخت رہے ہیں۔ (صفحہ 108) قیاس کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شاید کسی مرحلے میں یہ مان لیا گیا ہوگا کہ گلنیرڈ برتن عہد وسطیٰ کی سلطنت (باب ششم) میں بھی پائے گئے تھے جسے بعد ازں کمال ہوشیاری سے آخری مرحلے تک پہنچا دیا گیا۔ بصورت دیگر گلنیرڈ برتنوں کی موجودگی متعلقہ عہد میں مندروں کی تعمیر کے دعووں کے خلاف ایک زبردست شہادت بن جاتی۔ یہ زبردست فریب کاری اس وجہ سے ممکن ہو سکی کہ کھدائی کے دوران گلنیرڈ برتنوں کے سینکڑوں ٹکڑوں میں سے 21 منتخب ٹکڑوں کی فہرست صفحہ 111-109 پر پیش کی گئی ہے۔ اس میں گلنیرڈ برتن کی کسی بھی اکائی کو اس کی کھدائی کے ساتھ وابستہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ متعلقہ مقام عہد کے تعین کی خاطر ان برتنوں کو جو اہمیت دی گئی ہے اسے دیکھتے ہوئے گلنیرڈ برتنوں کو کھدائی سے جوڑ کر دیکھا جانا ناگزیر ہے۔ اس کے نظر انداز کرنے اور پس پشت ڈال دینے سے ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ گلنیرڈ برتنوں کی شہادت مندر کی تعمیر کے دعوے کی سراسر مخالفت کرتی ہے اس لیے یہاں اس کی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی۔ یہاں تک کہ اپنی موجودہ شکل میں اس رپورٹ کے (صفحہ نمبر 108) باب ہفتم (عہد وسطیٰ 16-12 صدی میں) گلنیر ڈبرتنوں کے ملنے کی بات کو قبول کر کے صفحہ نمبر 41 میں خود ان کے دعوے کی ہی تردید ہو جاتی ہے کہ اس عہد میں ایک ''ستونوں پر قائم ڈھانچہ'' پچاس ستونوں کا ایک مندر تھا۔ واضح رہے کہ گلنیرڈ برتنوں کا استعمال کرنے والے مسلمانوں کا بھلا مندر سے کیا واسطہ پڑا ہے۔

## عہد کی ابواب بندی میں بدنظمی

ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ میں ناموں میں زبردست بدنظمی ہوئی ہے۔ اس رپورٹ کے تیسرے باب اسٹریٹی گراف اینڈ کرونولوجی کے حصہ ششم اور ہفتم میں جن ناموں کا حوالہ ہے ان کو دوسرے ابواب میں تبدیل کر دیا گیا ہے تا کہ حصہ ششم سے متعلق دعووں کے لئے غیر سہولت بخش

اشیاء کو آگے بڑھایا جا سکے اور اس طرح اس عہد کے آثار کو ہندو عہد کے آثار میں بدلا جا سکے۔ رپورٹ کے متعلقہ باب میں (صفحہ نمبر 41-30) باب پنجم، ششم اور ہفتم کا نام اس طور سے لیا گیا ہے: باب پنجم شمالی گپت راجپوت عہد ساتویں سے دسویں صدی، باب ششم عہد وسطیٰ کی سلطنت 11 دیں صدی سے بارہویں صدی، باب ہفتم عہد وسطیٰ 12 ویں صدی سے 16 ویں صدی۔ اس کے بعد ذرا ایک نظر نتائج کے خلاصہ پر بھی ڈالیئے۔ اس میں عہد کی ابواب بندی کا منظر نامہ یکسر تبدیل کر دیا گیا ہے۔ باب پنجم شمالی گپت راجپوتوں کا عہد، ساتویں سے دسویں صدی۔ باب ششم ابتدائی عہد وسطیٰ گیارہویں صدی سے بارہویں صدی۔ باب ہفتم، عہد وسطیٰ کی سلطنت 12 ویں سے 16 ویں صدی۔ عہد وسطیٰ کی سلطنت کو باب ششم سے ہفتم تک لے جانے کا اہم فائدہ یہ ہوا کہ باب ششم کے عہد کے گلنیرڈ برتنوں یا چونے اور گارے کی چنائی جیسی اسلامی عہد کی شناخت کرانے والی اشیاء کی موجودگی کو بآسانی نظرانداز کیا جا سکتا ہے اور نام بدلنے کی چھوٹی سی تدبیر کے ذریعہ اس قسم کی چیزوں کو باب ہفتم سے متعلقہ آثار کے خانے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس طرح ظاہر ہے کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ کو باب ششم میں ایک عظیم الشان مندر بتائے جانے کے دعوے سے متعلق آثار پر مسلمانوں کی موجودگی درج کرانے والے مشاہدین سے کسی قسم کا خطرہ ہرگز لاحق نہیں رہے گا۔

## کوری خام خیالی

بابری مسجد کی جگہ پر کھدائی کے دوران چار فرش پائے گئے جنہیں اوپر سے نیچے کی جانب سلسلہ وار ایک، دو، تین اور چار نمبر دیا گیا۔ اس میں فرش نمبر 4 سب سے نیچے ہونے کی وجہ سے سب سے قدیم کہلایا، فرش نمبر 3 اس بابری مسجد کی بنیاد کی دیواروں سے متعلق ہے جسے محکمہ کے آثارِ قدیمہ نے ''گرایا گیا'' اور ''متنازعہ ڈھانچہ'' کہا ہے۔ جس کی تعمیر 1528 میں ہوئی۔ فرش نمبر 4 سے متعلق رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ''یہ چونے کے ساتھ باریک مٹی اور اینٹ کے چورے کی ملاوٹ سے بنا ہوا فرش ہے''۔ متعلقہ بنیاد کی دیوار میں ایک محراب اور طاق بھی ملے ہیں جن کا تذکرہ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے اپنی رپورٹ میں سرے سے کیا ہی نہیں۔ اس فرش کو بہرطور مسلم تعمیر ہی ماننا ہوگا جسے محکمہ کے آثارِ قدیمہ نے مندر کا فرش قرار دیا ہے۔ جس کے اوپر ''یک ستونی عمارت'' کی تعمیر کی گئی تھی۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ عہد مغلیہ سے قبل کے کسی بھی مندر کی مثال پیش نہیں کر سکا جس میں چونے اور سرخ

مسالہ کے اس نوعیت کے فرش کی موجودگی ہو۔ واضح ہے کہ اس شرط کو پورا کئے بغیر مکمل طور سے مسلم طرزِ تعمیر کو ہندو طرز تعمیر کس طور قرار دیا جا سکتا ہے۔ بہر کیف جب ایسا کارنامہ انجام دے ہی دیا گیا ہے تو پھر اس نکتہ کی کیا ضرورت ہے کہ ''متنازعہ ڈھانچے کے نیچے ایک عظیم الشان عمارت تھی جو درحقیقت ایک مندر تھا''۔ یہ مندر 50 ستونوں کے سہارے قائم تھا اور چند فرضی تصاویر (تصویر نمبر 23، 23A اور 23B) کے توسط سے اس کی از سرِ نو تعمیر عمل میں آئی۔ یہ بات دیگر ہے کہ جب ہم تصویر 23 کا موازنہ (جس میں انہدام سے قبل کی بابری مسجد کو دکھایا گیا ہے) تصویر نمبر 23B سے کرتے ہیں (جس میں 50 فرضی ستونوں والے نو تعمیر شدہ مندروں کو دکھایا گیا ہے) تو اس میں جس نوعیت کے مندروں کا دعویٰ کیا گیا ہے وہ عظیم الشان کسی طور نہیں لگتا۔ ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کے مطابق یہ عظیم الشان عمارت 50 ستونوں میں سے 46 کے ساتھ وابستہ تھی۔ جسے 1206 تا 1526ء کے درمیان بنایا گیا تھا۔ یہ عہد لودھی سلطانوں کا عہد کہلاتا ہے۔ ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ نے اس مندر کو بحالت مجبوری مسلم عہد میں قبول کیا ہے کیونکہ کھدائی کے دوران مسلم طرز کی اشیاء کے ملنے سے جو ثبوت فراہم ہوتا ہے اس کے لئے ناگزیر تھا کہ اس سے قبل کے دور کا بھی قیاس کیا جائے۔ جہاں تک اس تعمیر سے قبل کا سوال ہے تو فرش نمبر 4 پر صرف چار بنیادی ستون پائے گئے ہیں۔ یہ امر باعث حیرت ہے کہ صرف اس بنیاد پر انہیں دسویں اور گیارہویں صدی کا تسلیم کر لیا گیا ہے اور مان لیا گیا ہے کہ ان کی طرز تعمیر یکساں ہی ہے۔ اس ڈھانچے کو بھی عظیم الشان ہونے کا اعزاز دیا گیا ہے۔ جس کی وسعت 50 میٹر پر محیط ہے۔ یہ بات بعید از عقل نہیں کہ چار بنیادی ستونوں والی کسی بھی عمارت کی چھت اس پر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش کی ہوتی تو ایسی عمارت برسوں قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

گیارہویں اور بارہویں صدی کے چار فرضی ستونوں کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ یہ اس سطح سے اینٹ کے بُرادے کے فرش کے ساتھ وابستہ ہیں۔ کیا گہڑوال کے عہد کی تعمیر میں سرخی کے استعمال کی کوئی دوسری مثال دی جا سکتی ہے؟ بالکل نہیں۔ یہاں آکر واضح ہو جاتا ہے کہ اس دور کو عہدِ وسطی کی سلطنت (صفحہ 40) کہنا کیوں ناگزیر ہو گیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سلطنت سے قبل کا عہد تھا۔ گہڑوال اور سلطنت کے عہد کو یکجا رکھ کر تعمیر میں سُرخی کے استعمال کی وضاحت کرنے کی یہاں بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ اگر بالفرض ایسا ہے تو یہ عظیم الشان تعمیر بھی 1206ء کے بعد ہوئی

ہوگی۔ ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کو شاید علم نہ ہو کہ سلطنت دہلی کا قیام کب عمل میں آیا اس لیے ماقبل کا فرضی عظیم الشان مندر بھی سلطانوں کے عہد میں تعمیر ہوا ہوگا۔ منہدم کی گئی مسجد سے قبل وہاں فرضی عظیم الشان مندر کا سارا دعویٰ ان ہی فرضی ستونوں کے سہارے قائم ہے۔

ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ جن کو بنیادی ستون قرار دے رہا ہے۔ حقیقتاً ایک یا ایک سے زائد کنکریٹ پتھر ہیں جو اینٹ کے ٹکڑوں پہ قائم ہیں۔ جنہیں یا تو گارے سے چنا گیا ہے یا پھر بغیر چنائی کے ایک کے اوپر ایک رکھ دیا گیا ہے۔ ان بنیادی ستونوں میں سے کئی میں تو ان کنکریٹ پتھروں کی سرے سے موجودگی ہی نہیں ہے جیسا کہ رپورٹ کے صفحہ نمبر 57-56 پر دی گئی توضیحات سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ایک بھی فرضی بنیادی ستون کسی ستون یا اس کے ٹکڑے سے وابستہ نہیں پایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی کنکریٹ پتھروں سے بھی کسی پر ایسے کسی نشان یا دباؤ کی علامت بنی ہوئی نہیں ملتی جس سے ان پر کسی ستون کے قائم ہونے کا علم ہو سکے۔ ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ میں کہیں بھی مندرج سوالوں کے جواب دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ① ان ستونوں کی بنیادوں میں اینٹ کے ٹکڑوں کا ہی استعمال کیوں کیا گیا؟ سالم اینٹوں کا کیوں نہیں۔ ② صرف گارے سے چنے ہوئے اینٹ کے ٹکڑے کس طرح ایسے ستونوں کا بار اُٹھا سکے ہوں گے جن پر چھت قائم ہو اور کیونکر اس بوجھ سے بنیادی ستون گرنے سے محفوظ رہے۔

حالانکہ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ بنیادی ستون ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور فرضی ڈرائنگ روم کو اس نوعیت کا دکھایا گی ہے (ملاحظہ ہو تصویر نمبر 23، 23A اور 23B) پھر بھی یہ رپورٹ نشر و اشاعت کے لیے اس کا توسیعی خاکہ پیش کرنے سے گریز کر رہی ہے جبکہ اس کے ہر بنیادی ستونوں کو دیگر بنیادوں کے مقابلے میں عظیم پیمانے پر پیش کیا گیا ہے۔ جس سے ان کے آپسی اشتراک کی بخوبی جانچ پڑتال کی جاسکتی ہے۔ اس نوعیت کی پیشکش اس لیے بھی ناگزیر تھی کہ ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ پر انگلی اُٹھائی گئی تھی کہ وہ کنکریٹ کے پتھروں سے وابستہ اینٹ کے ٹکڑوں کے ڈھیر کو نظر انداز کر رہا ہے جو محکمۂ آثارِ قدیمہ کے مطابق معقول اور مناسب مقامات پر نہیں تھے۔ ظاہری بات ہے کہ وہ اس فرضی خاکے میں کسی طور رنگ بھرنے سے قاصر تھے۔

بہر کیف ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کی جانب سے ہونے والی لاپروائی نظر انداز کرنا باعث حیرت ہے کیونکہ اس کا براہِ راست تعلق بنیادی ستونوں کے آثار سے ہے۔ اگر ہندوستانی محکمۂ آثارِ

قدیمہ کی پیش کردہ رپورٹ کے مطابق چلیں تو ان پچاس بنیادوں سے سات تو یقینی طور سے فرش نمبر 2 کے اوپر پائی گئی ہیں اور ایک اس کے برابر ہے۔ کم از کم چھ بنیادیں تو فرش نمبر 3 پر ٹکی ہوئی ہیں اور ایک جزوی طور سے فرش نمبر 3 اور فرش نمبر 4 پر۔ چونکہ یہ فرش کسی تنازعہ سے قطع نظر مسجد سے متعلق ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے سارے ستون جسے مندر کے ڈھانچے کو سہارا دینا تھا اس کی تعمیر کے اتنے سالوں بعد بنائے گئے ہوں گے۔ اسی پر بس نہیں یہ 9 ستون فرش نمبر 3 کو کاٹ کر نکلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سے اس خیال تک پہنچنا مشکل نہیں کہ جب مسجد کا فرش بنایا گیا تھا تو ان بنیادی ستونوں کو فرش کے درمیان میں یونہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ معاملہ بنیادی ستونوں کا نہیں ہے۔ یہ تو چنائی والے اینٹوں کے ڈھیر ہیں جو فرش نمبر 4 سے فرش نمبر 1 تک برابر بنتے رہے تھے۔

کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر اشوک دت نے جو ماہرین آثارِ قدیمہ میں سے ہیں اور ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے کھدائی کے دوران ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کے کاموں کی نگرانی کی ذمہ داری خود ہی قبول کی تھی۔ انہوں نے اینٹ کے ٹکڑوں کی وضاحت اور معقول توضیح پیش کی ہے۔ ڈاکٹر اشوک دت کے مطابق کسی زمانے میں فرش نمبر 4 پر سرخ چونے کا مسالہ ڈالنے سے قبل اس ٹیلے کو ہموار کیا گیا ہوگا۔ فرش نمبر 3 میں جا بجا گڈھے پڑ جانے کی وجہ سے جب فرش نمبر 2 کی ضرورت محسوس ہوئی تو از سر نو اس جگہ کو ہموار کرنے کے لیے اینٹ کے ٹکڑوں کا استعمال کیا گیا ہوگا۔ اس طرح جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ چند مقامات پر جو بنیادی ستون فرش نمبر 3 اور 4 کو کاٹتے نظر آتے ہیں۔ محض اینٹ کے ٹکڑوں کے ڈھیر نہیں ہیں جو فرش کے گڈھوں کو بھرنے کے لیے استعمال میں لائے گئے ہوں گے۔ چونکہ اس نوعیت کی مرمت کی ضرورت وقت گزرنے کے ساتھ لازماً پڑی ہوگی یہی وجہ ہے کہ اینٹ کے ٹکڑوں کے ڈھیر کثیر مقدار میں یہاں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر ہندوستانی محکمۂ آثار قدیمہ نے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ایسی بنیادوں اور بنیادی ستونوں کو دریافت کرنے کی ذمہ داری اپنے سر پر نہ لی ہوتی تو اس صورت میں ان کو ان فرشوں پر 50 کے بجائے 100 یا اس سے بھی زائد اینٹوں کے ڈھیر ملے ہوتے۔

### دائرہ بند غلط فہمیاں

ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ میں ''دائرہ بند مذہبی مقام'' (صفحہ 71-70) کی زبردست

مدح سرائی کی گئی ہے اور موجودہ ملبے کی فرضی تصویروں والی توضیحات میں اس کی جانب اشارہ کیا گیا ہے (ملاحظہ ہو تصویر نمبر 24 اور 24A) جس کا دائرہ بند شیو اور ویشنو مندروں (تصویر نمبر 18) کے ساتھ موازنہ کرنے میں عجلت برتی گئی اور ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کو اس کا خیال بالکل نہیں آیا کہ مسلم طرزِ تعمیر والی دائرہ نما دیواروں اور عمارتوں سے اس کا موازنہ کر لیتی۔ اس جانب توجہ نہ دینے کا مطلب ہی اس کی اہمیت کو دوچند کر دیتا ہے اس میں جو دیوار ثابت و سالم رہ گئی ہے۔ ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کی ڈرائنگ کے لحاظ سے صرف دائرے کا چوتھائی حصہ ہی بناتی ہے واضح رہے کہ مسلم طرزِ تعمیرات کی دیواروں کی اس نوعیت کی ساخت کافی معروف رہی ہے۔ اس کے علاوہ مسلم تعمیر والی گنبدوں سے آراستہ دائرہ بند عمارتیں بھی ہیں۔ بہرکیف اگر ہم ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کی اس دریافت کے عجیب وغریب یک رُخی جائزہ کو فراموش بھی کر دیں تب بھی پہلے فرضی ''مذہبی مقام'' کے حجم کو لیا جا سکتا ہے حالانکہ ہندوستانی محکمہ آثارِ قدیمہ کی طرح دائرے کو پورا کرنے کا کوئی سبب نہیں ہے۔ اس نقشہ کے پیمانے کو دیکھتے ہوئے (رپورٹ میں تصویر نمبر 17) دائرہ بند مذہبی مقام کا اندرونی حصہ صرف 160 سینٹی میٹر یعنی ساڑھے پانچ فٹ ہوگا۔ اتنے چھوٹے سے مذہبی مقام کی مدح سرائی کی وجہ کوئی تو ہوگی۔ اس کے برخلاف خود ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ نے قبول کیا ہے کہ اس تعمیر میں ایسا کچھ نہیں ملا جو اسے ایک مندر یا مذہبی مقام کہنے کا جواز فراہم کرتا ہو۔

## مندر سے وابستہ چند متفرق اشیاء

اس کھدائی کے دوران کسی بھی قسم کی مورتی برآمد نہیں ہوئی۔ اس میں جو بھی اشیاء برآمد ہوئی ہیں وہ متفرق نوعیت کی ہیں جیسے سیاہ کسولی کے پتھر جو بابری مسجد کے ستونوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس ستون کو کارسیوکوں نے اپنا نشانہ بنایا تھا (اگرچہ انہیں مندر کے باقیات سے محبت کا دعویٰ ہے) اور یہ 1992 میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملبے میں دب گئے تھے۔ اس میں پتھر کی چند اور اشیاء بھی برآمد ہوئی ہیں (جیسے ایک سجاوٹ کا پتھر اور دیوار میں استعمال کی جانے والی تحریر شدہ تختی) ایک پتھر جس پر پتیوں کے نشانات وغیرہ بنے ہیں نیز نصف دائرہ نما سوراخ والے دروازوں کے قبضے، کنول کے نقاشی والے پتھر وغیرہ (صفحہ 271) جن کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔ یہ کسی دیگر ملبے سے بآسانی برآمد ہو سکتے ہیں جنہیں دوبارہ استعمال کے لیے یہاں لایا گیا ہو۔ ہندوستانی محکمۂ آثارِ

قدیمہ کا ان اشیاء کی فہرست بنانا یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ اشیاء متعلقہ مقام پر بنے کسی عظیم الشان مندر کی ہرگز نہیں ہو سکتیں بلکہ انہیں پہلے سے ہی کسی کھنڈر سے یونہی اُٹھا کر لایا گیا ہے تاکہ نئی تعمیر میں ان کا دوبارہ استعمال کیا جا سکے۔

ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ میں تقریباً سبھی چیزوں میں آثارِ قدیمہ کی جزئیات کی کمی لازمی طور سے نظر آتی ہے۔ کاربن ڈیٹنگ کے یک ورقی رپورٹ کے حوالے میں نہ تو متعلقہ اشیاء اور اس کے پائے جانے کی تفصیل نیز تجربہ گاہ کا ردِّ عمل پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ رپورٹ سرے سے بے بنیاد ثابت ہو جاتی ہے جس کا غلط استعمال کبھی بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی برتن کے ٹکڑوں کے لئے کسی زمانے کا تعین نہیں کیا گیا۔ اسی طرح جانوروں اور انسانوں کی ہڈیوں کے سلسلے میں کسی عہد کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ اور عہد بندی میں یہ خیال قطعاً نہیں رکھا گیا ہے کہ کھلے برتن کے زمانے کو پس پشت ڈال کر نتائج کا خلاصہ کرتے ہوئے (صفحہ نمبر 268) میں اسے 1000 قبل مسیح تک پہنچا دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے پس پشت یہی اشتیاق کام کر رہا ہے کہ اجودھیا کے اس معاملے کو پیچھے دھکیل دیا جائے بھلے ہی اس کی وجہ سے دعوے فضول اور بے بنیاد کیوں نہ لگیں۔

ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کی فکر کرنے والے حضرات کو اس پر غور کرنا ہوگا کہ جس رپورٹ کی ہم نے جانچ پڑتال کی ہے اس قسم کی رپورٹوں کے بعد کیا ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کا ذرہ برابر اعتماد قائم رہ سکے گا۔ واضح رہے کہ اس ادارے کا ماضی نہایت قابل فخر رہا ہے۔ بابری مسجد کے انہدام نے ہماری قوم کے چہرے پر بدنما داغ لگا دیا تھا اب ہندوستانی محکمۂ آثارِ قدیمہ کا اعتماد بھی جاتا رہا۔ اس اعتماد کو بحال کرنا یقیناً آسان نہیں ہوگا۔ جانے کب یہ کیسریا رنگ میں رنگنے کی تباہ کن کارروائی ختم ہوگی۔ (خبردار جدید دہلی، اکتوبر 2003)



# محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ صرف رائے ہے ثبوت نہیں

از: وصی احمد نعمانی
(ایڈووکیٹ، سپریم کورٹ آف انڈیا)

بابری مسجد قضیہ سے متعلق محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ نے غیر ضروری طور پر ایک مباحثہ چھیڑ دیا ہے۔ رپورٹ بذاتِ خود بے شمار تضاد کے گھیرے میں ہے۔ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی جانب داری نے بہ ظاہر رپورٹ کو ہی ناقابلِ یقین بنا دیا ہے۔ ویسے بھی کسی ماہر کی کوئی بھی رپورٹ عدالت میں مکمل ثبوت کا درجہ حاصل ہی نہیں کر سکتی ہے، جب تک کہ ماہر اور ان کے کاغذات، سرٹیفکیٹ یا رائے کو جارح اور ظالم جرح کے سخت ترین مراحل سے نہ گزار دیا جائے۔ 574 صفحات پر مشتمل رپورٹ جو الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ کے سامنے پیش کر دی گئی ہے، اس پر اعتراضات یا جواب داخل کرنے کے لئے قانونی طور پر فریقین کو مہلت دی گئی ہے۔

رپورٹ میں جو بات کہی گئی ہے اس کا ثابت کرنا محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کے لیے ایک دشوار گزار کام ہے اور جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ فی الحال اس رپورٹ کی وہی حیثیت ہے جو عدالت میں موجود یا پیش کردہ دیگر کاغذات اور دستاویزات کی ہے، جس کو ثابت کرنا باقی ہے یا جس سے متعلق ابھی جرح نہیں ہو سکی ہے اور جب تک اس رپورٹ پر جرح نہیں ہو جاتی ہے یہ صرف ایک کاغذ کا ٹکڑا ہے اور بس۔ متنازعہ رپورٹ کی چند باتیں جو پوری رپورٹ کو مشکوک، غیر ضروری، تضاد سے بھری ہوئی، سیاسی بدنگاہی پر مبنی، بدنیتی اور بے ایمانی کا نتیجہ ثابت کرتی ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

❶ بابری مسجد کے نیچے کسی شمالی ہند کے بڑے مندر سے ملتا جلتا ڈھانچہ تھا۔

❷ 50 ستونوں پر مشتمل کسی ہال کے باقیات ملے ہیں۔ منقش اینٹیں، پتھر وغیرہ بھی دستیاب ہوئے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا دونوں دعوے خود دوسرے ماہر آثارِ قدیمہ کی رائے سے رد ہو جاتے ہیں۔ جناب سیتا رام رائے سابق ڈائریکٹر آثارِ قدیمہ، بہار نے کہا ہے کہ مذکورہ بالا دعویٰ بے بنیاد اور من گھڑت ہے، جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور یہ کہنا کہ کسی مندر کے باقیات ملے ہیں یہ ساری باتیں کھدائی میں ملے ثبوت کے برعکس ہیں۔

50 میٹر کی گہرائی میں جس ڈھانچہ کی موجودگی کا دعویٰ کیا جارہا ہے وہ بے معنیٰ ہے، کیونکہ موقع پر تو 50 میٹر گہری کھدائی ہوئی ہی نہیں ہے، تو پھر ڈھانچہ انہیں اتنی گہرائی میں کیسے مل گیا۔

جناب سیتارام، رائے الہ آباد ہائی کورٹ کی جانب سے کھدائی کے کام کی نگرانی کے لیے مقرر کیے گئے تھے اور انہوں نے کھدائی کے کام کی نگرانی کی ہے۔ ان کے سامنے تو کوئی شے ایسی نہیں نکلی یا نکالی گئی یا دستیاب ہوئی، جو یہ ثابت کرے کہ 50 فٹ کی گہرائی میں اور بابری مسجد کے نیچے شمالی ہند کے کسی بڑے مندر کے طرز کا کوئی ڈھانچہ تھا، اس لیے تمام رپورٹ جھوٹی ہے، سیاسی داؤ پیچ اور حکومت کے اختیارات کا بالکل بے جا استعمال ہے۔ بابری مسجد انہدام سے متعلق اکسانے والی اڈوانی کی تقریر جس طرح ٹیپ سے غائب ہوئی اسی طرح انہیں ڈھانچہ کا ثبوت مل گیا۔

چلئے ہم اخباری بیان، اعتراضات اور من گھڑت باتوں کو جوں کا توں مان کر چلتے ہیں اور اس کا تجزیہ صرف اور صرف قانونی نقطہ نگاہ سے کرتے ہیں۔

محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ جج صاحبان کے کیا فرائض ہیں؟ ماہر کی رپورٹ کی پرکھ کیسے ہوگی؟ کیا یہ صرف ایک اور کاغذ کی حیثیت سے عدالت میں موجود بہت سے کاغذات کی بھیڑ میں کھو کر رہ جائے گا؟ ان تمام باتوں کا محاسبہ اور تجزیہ کرتے ہیں۔

سپریم کورٹ اور مختلف ہائی کورٹ کے فیصلوں اور دفعہ 45 قانون شہادت کی روشنی میں اور دفعہ Evidenc Act 3 کو ملا کر پڑھنے سے جو نچوڑ نکلتا ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

کسی ماہر یا ایکسپرٹ کی رائے بذاتِ خود قانونی طور پر ثبوت ہرگز نہیں ہے۔ وہ صرف ایک مشورہ ہے، یا ایک سائنسی اور تکنیکی خیال ہے۔ اس طرح کی رائے یا Opinion بہت سے ثبوتوں کے لیے پیش کردہ دستاویزات میں سے صرف ایک دستاویز ہے۔ اسے مکمل پروف یا حتمی ثبوت کا درجہ حاصل کرنے کے لیے بہت سے عدالتی اور قانونی مراحل سے گزر کر خود کو (رائے) ثابت کرنا ہوگا کہ یہ قابلِ اعتماد، آزادانہ اعتبار کیے جانے کے لائق ہے۔ اسی طرح ماہرِ فن کو بھی یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اپنے مضمون کا ایکسپرٹ ہے جس کی باضابطہ اس نے تعلیم حاصل کی ہے اور اس طرح کی رپورٹ دینے کا انہیں تجربہ اور ملکہ حاصل ہے۔ ماہر کو یہ بھی ثابت کرنا ہوگا کہ اس نے ماضی میں جو بھی رپورٹ دیے ہیں وہ غیر مشکوک اور ایماندارانہ، بلا کسی جانب داری کے تھیں اور اسی طرح

موجودہ رپورٹ جو عدالت میں زیر غور ہے وہ بھی اصولی اور قانونی طور پر بے لوث اور درست و سچی رپورٹ ہے۔ یہ سب انہیں صرف اس بات کے لئے اور اس ثبوت کے لئے کرنا ہوگا کہ عدالت ان کی ان باتوں سے یہ باور کر سکے کہ رپورٹ کو صرف بہت سے ثبوتوں کی طرح ایک ثبوت مان کر پرکھا جائے کہ ماہر کا دعویٰ اور یا اس کا Opinion کتنا آزاد اور درست ہے۔ ان مراحل سے گزر کر بھی ان کو قابل اطمینان کلی طور پر نہیں مان لیا جائے گا، جب تک کہ ماہر کے رپورٹ کی دیگر ٹھوس ثبوتوں سے چول میں چول نہ مل جائے۔ اگر ماہر کی رپورٹ عدالت میں موجود دیگر ثبوتوں سے (Corroborate) میل نہیں کھاتی ہے تو اس طرح کی رپورٹ کی حیثیت صرف ایک کاغذ کے ٹکڑے کی ہے اور یہ سب کچھ ثابت کرنے کے لئے ماہر کو عدالت میں بہ حیثیت گواہ پیش ہو کر ان تمام کاغذات کو ثابت کرنا ہوگا۔ ان کی نہایت جارح اور ظالم مخالف وکیل کے ذریعہ کڑی سے کڑی جرح کی جائے گی۔ ان کو ثابت کرنا ہوگا کہ جو رپورٹ اس نے پیش کی ہے۔ وہ سائنسی اور تکنیکی اصول وضوابط پر مبنی ہے اور جو نتیجہ ماہر نے اخذ کیا ہے وہ بذات خود ایک مکمل ضابطہ پر مبنی ہے۔ ان ضابطوں کو بھی عدالت کے سامنے درست اور آزاد ثابت کرنا ہوگا، اس لیے صرف رپورٹ یا سرٹیفکیٹ یا اس پر مبنی کوئی دستاویز بالکل بے معنیٰ ہے۔ جب تک کہ عدالت اس پر جرح کے بعد یقین نہ کر لے کہ یہ ثبوت قابل یقین واعتبار ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

1966 (2) Cr.L.J. 466 L.J. 466

عدالت زیریں کا فرض ہے کہ وہ ماہر کی رائے (Opinion) کو جانچے پرکھے۔ اس کا تجزیہ اور محاسبہ کرے۔ عدالت اس طرح کی ''رائے'' کی اہمیت کو بھی کسوٹی پر کسے گی اور وہ کسوٹی یہ ہے کہ رائے دینے والا کس کردار کا مالک ہے؟ اس کا تجربہ کیسا ہے، اس کی فنی مہارت کیسی ہے؟ دیگر مقدموں میں ان کے ذریعے دیے گئے رپورٹوں کی قانونی حیثیت کیا رہی ہے؟ کسی طرح ان کی رپورٹ جانب داری اور بے ایمانی پر تو مبنی نہیں تھی؟ اگر ان کسوٹیوں پر ماہر کی رائے یا ماہر بذات خود پورا اُترتا ہے تو رپورٹ میں دم سمجھا جائے گا۔ وہ بھی صرف اس حد تک کہ رپورٹ کو دوسرے ثبوتوں میں شامل کر کے پڑھا جائے اور تال میل دیکھا جائے۔ قانونی زبان میں Corroboration دیکھا جائے گا۔ بابری مسجد قضیہ کے آثار قدیمہ کی رپورٹ بالکل اسی طرح ہے جیسے:

① ڈاکٹر کی رپورٹ پوسٹ مارٹم میں۔ ② نشانی انگوٹھے کے ایکسپرٹ کی رپورٹ۔

③ آتشی اسلحہ میں بیلسٹک ایکسپرٹ کی رپورٹ۔ ④ ہینڈ رائٹنگ کی رپورٹ۔
⑤ سیریالوجسٹ (Seriologist) کی رپورٹ وغیرہ وغیرہ۔

ان ہی تمام رپورٹوں کی طرح یہ رپورٹ بھی صرف ایک رائے ہے، اصل مقدمہ کا موضوع نہیں۔ اصل مقدمہ کے Facts نہیں۔ جب تک Facts یا مقدمہ کے اصل مواد سے رپورٹ کی تال میل ثابت نہیں ہو جاتی ہے۔ رپورٹ صرف رائے ہے، قانوناً ثبوت نہیں ہے، اس لیے اس سے مقدمہ پر صرف اتنا اثر ہوگا کہ فیصلہ تک پہنچنے کے لیے ایک اور دستاویز کو ثابت کیا جانا ہوگا۔ جو کسی فریق کے دباؤ یا اثر میں نہیں دیا گیا ہے، جو حقیقت اور سچائی پر مبنی ہے۔ تب عدالت اپنی رائے قائم کرے گی۔ (دیکھئے: A. 1936 P.C. 154)

مگر عدالت آنکھ بند کر کے ماہر کی رائے قبول نہیں کرے گی، بلکہ ایکسپرٹ کو ذمہ داری دے گی کہ وہ عدالت کے سامنے وہ اصول اور پیمانہ پیش کرے یا فارمولہ اور نظریہ فراہم کرے جس کی بنیاد پر خود اس کی رائے کو عدالت میں ٹیسٹ کی جائے۔ اس کی Accuracy یعنی رپورٹ کی ٹھیک ٹھاک جانچ ہو سکے۔ انہیں پیمانہ اور اصول پر اس کے ذریعہ اخذ کیے گئے نتیجہ کو جانچا جائے گا، جیسے اس مقدمہ میں ماہر کی رائے پر مبنی جو نتیجہ ہے وہ یہ ہے کہ ''بابری مسجد کے نیچے 50 فٹ کی گہرائی میں شمالی ہند کے کسی بڑے مندر سے ملتا جلتا ڈھانچہ کے باقیات ملے ہیں۔''

اس نتیجہ کے لیے ماہر نے کون سا سائنسی اور تکنیکی پیمانہ طے کیا تھا؟ کس فارمولے سے اس نے شمالی ہند کے مندر سے مشابہت دیکھی؟ 50 فٹ کی کھدائی ہوئی یا نہیں؟ کن باقیات سے مندر کی موجودگی کا ثبوت ملتا ہے، دیگر باقیات جیسے ہڈیوں کی موجودگی کیا ثابت کرتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی جارح اور ظالم وکیل سے جرح میں پالا پڑ گیا تو اس کی ساری جانب داری آشکارا ہو جائے گی اور خود جناب ماہر کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ و فرضی ثبوت یکجا کرنے کی سزا تک ہوسکتی ہے۔

ایکسپرٹ یا ماہر چاہے جس قدر بھی کوشش کر لے مگر جس نے اس کی خدمات حاصل کی ہے اور ان کو بلایا ہے۔ لاشعوری طور پر رپورٹ دیتے وقت اور رپورٹ دینے کے لیے من مانا مواد کھوجنے کے لیے ماہر کا جھکاؤ بلانے والے کی طرف ہی ہوگا۔ اس کی وجہ سے وہ اپنی رپورٹ کو عدالت میں سچ ہی ثابت کرنا چاہے گا۔ نتیجہ کے طور پر فریق ثانی کے خلاف ان کو اپنی رائے بنانی ہی ہوگی اور رائے بھی یکطرفہ ہوسکتی ہے۔ (دیکھئے: 1934 Cr. L.J. 735)

ایسی ہی حالت میں فریق کے ذریعہ طلب کردہ ماہر کی رپورٹ نہایت کمزور ثابت ہوگی۔

(دیکھیے: 1945 P.C. 174)

لیکن عدالت کسی بھی حالت میں اپنے Will یا نتیجہ کو ایکسپرٹ کی رائے یا Opinion کے سامنے سرینڈر یا خود سپردگی کا شکار نہیں ہونے دے گی۔

اگر عدالت نتیجہ اخذ کرنے کے لیے طے کئے گئے فارمولے، اصول ونظریے اور پیمانہ سے قائل اور متفق ہے تو بھی اپنی خودارادی اور آزادی کو سرینڈر نہیں ہونے دے گی، کیونکہ فارمولہ، پیمانہ درست ہونے کے باوجود جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے وہ پیمانہ اور فارمولہ کے برعکس ہوسکتا ہے، اس لیے جج کو یا عدالت کو اس بات کا اختیار ہرگز نہیں ہے کہ ثبوت اور شہادت کی غیر موجودگی میں جج خود کو گواہ بنالے اور اس ایکسپرٹ کی ''رائے'' میں جو ''خلا'' تھا اس کو عدالت بذات خود پُر کردے۔ ایسا کرنا عدالت کے وقار کو مجروح کرے گا۔

(دیکھیے: خود الہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ 1955 N.U.C. (All) 386-D.B.)

عدالت کو اس بات کی بھرپور واقفیت ہے کہ جو ماہر بے ایمانی پر مبنی رائے (Dishonest Opinion) دیتا ہے وہ بذات خود اس بات سے آگاہ ہوتا ہے کہ وہ جارح (Ruthless) جرح کرنے والے وکیل کے سامنے بے آبرو اور بے نقاب ہو جائے گا۔ دوسری طرف کوئی بھی دوربیں، دوراندیش اور عقابی نگاہ رکھنے والی عدالت بغیر سختی اور باریک بینی سے جانچے پرکھے بنا ماہر کی رائے کو ہرگز نہیں مانے گی۔ عدالت کے ذریعہ کسوٹی پر رپورٹ کو کسنے کے بہت سے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ عدالت یہ جانے کہ فلاں ماہر کے ذریعہ اگر کسی دوسرے مقدمہ میں رپورٹ دی گئی ہے تو وہ 'مشکوک' تو نہیں ثابت ہوگئی یا ماہر دباؤ پر مبنی رپورٹ دینے کی عادت کا شکار تو نہیں ہے۔ یعنی خود ماہر کا ''کردار'' داؤں پر لگا ہوتا ہے۔ جب اس کی ''رائے'' کو عدالت میں پرکھا جاتا ہے، مگر یہ سب کچھ جرح کرنے والے وکیل کی اپنی صلاحیت پر منحصر ہے کہ اس سے سچ اگلوا ڈالے اور اس کی رپورٹ کو جانب دارانہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

(دیکھیے: 1967 Cr. L.J. 134 A.I.R., 1967 All 64)

سپریم کورٹ نے بذات خود ایک فیصلہ میں کہا ہے کہ چونکہ ماہر کی رائے (Opinion) صرف ایک رائے ہے اس لیے اپنی اس ہیئت کی وجہ سے نہایت کمزور اور لاغر ہے اور یہ کہ ایسی رائے ہرگز

فیصلہ کے لیے حتمی بنیاد نہیں بن سکتی ہے۔ اگر چہ کوئی مکمل قانونی ضابطہ نہیں ہے، جس سے یہ بات بالکل قطعی طور پر مان لی جائے کہ جب تک اہم اور ناقابل تنسیخ ثبوت نہ مل جائے، ماہر کی رائے کو مکمل نہیں مانا جائے گا، لیکن نامکمل سائنسی طریقہ اور رائے قائم کرنے کے لیے استعمال ہونے والے غیر پختہ تکنیک کی وجہ سے نہایت محتاط طریقہ اپنانا چاہئے۔ نہایت باریک بینی اور بے لوث فکر سے اس کو پرکھا جانا چاہیے اور پھر دوسرے شواہد اور ثبوت سے تال میل (Carroboration) کرنا چاہئے، پھر جب رائے ٹھوس لگے اور ٹھوس لگنے کے اصول وضوابط درست لگیں تب جا کر ایسی رائے پر اعتماد کرنے کی وجہ ہونی چاہئے اور پھر تب ایسی رپورٹ کو قابل عمل مانا جانا چاہئے۔

(دیکھئے: 1977 (2) S.C.C. 210, 2002 (9) J.T. 347)

اسی طرح سپریم کورٹ نے اپنے دوسرے فیصلہ میں کہا ہے کہ ایکسپرٹ اصل مواد (Facts) کا گواہ نہیں ہوتا ہے، اس لیے اس کی رائے صرف ایک مشورہ ہے۔ ایکسپرٹ جو گواہ بھی ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی ''رائے'' کی صداقت کو درست اور سچ ثابت کرنے کے لیے سائنسی فارمولے پر مبنی اصول دے گا، جس کے ذریعہ عدالت اپنی آزاد رائے بنا سکے۔ کسی خاص نتیجے پر پہنچ سکے۔ اگر فارمولے پر مبنی ''رائے'' قائل کرنے کے لائق ہے اور کسوٹی پر کھرا اُترتی ہے تو وہ رائے دوسرے اہم ثبوت کے ساتھ مل کر بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہو جاتی ہے۔ اس طرح گواہ کی وقعت (Credibility) اس کی حتمی رائے کے لیے دی گئی وجوہ اور اصول پر منحصر ہوتی ہے اور اس پر بھی مبنی ہوتی ہے کہ اس نے کیا ڈاٹا اور کیا مواد فراہم کیا ہے۔ ایکسپرٹ کی رائے اس طرح خود بخود ثبوت میں نہیں بدل جاتی ہے بلکہ اس کی سخت جرح ہوتی ہے، پرکھا جاتا ہے۔ عدالت کی عقابی نگاہ کا آمنا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ (دیکھئے: 1999 Cr. L.J. 429)

اس طرح اگر چہ ماہر نے اپنی رپورٹ دے دی ہے، لیکن دیگر ثبوت جو عدالت میں موجود ہیں اور اطمینان بخش ہیں، تو ان ثبوتوں کو ماہر کی من گھڑت (Hypothetical) رائے کی وجہ سے خارج نہیں کیا جائے گا، بلکہ عدالت میں موجود دیگر ثبوت ہی اطمینان بخش سمجھے جائیں گے۔

(دیکھئے: 2001 (7) S.C.C. 315)

عدالت نے اپنے ایک اور اہم فیصلہ میں کہا ہے کہ ماہر کی رائے عوام الناس کے فیصلے کو کمزور نہیں کرے گی۔ یہ لوگ روز مرہ کے حالات و واقعات کو دیکھتے پرکھتے اور پھر اپنا فیصلہ سناتے ہیں۔

دیکھئے: 1956 Cr., L.J. 41 (D.B.) یعنی یہ کہ عام انسان جانتا ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر کے لیے کسی بھی دیگر عمارت کا انہدام نہیں کیا گیا تھا۔ عوام کو یہ بھی اندیشہ ہے کہ اڈوانی کے بابری مسجد سے متعلق بیان کو سی۔بی۔آئی۔ نے دباؤ کی وجہ سے نکال دیا۔ عوام کو یہ بھی شک ہے کہ ماہر آثارِ قدیمہ نے حکومت کے دباؤ میں جانب داری پر مبنی رپورٹ دی ہے کہ کوئی مندر کا پرانا ڈھانچہ بابری مسجد کے نیچے 50 فٹ کی گہرائی میں باقیات کی بنیاد پر موجود رہا ہوگا، لیکن جو عوام کا فیصلہ ہے کہ یہ سب کچھ دیدہ دلیری پر مبنی ہے اور بے ایمانی جیسی لگتی ہے، اگر عوام کا یہی فیصلہ آخری فیصلہ ہے تو رپورٹ صرف ایک رائے ہے، ثبوت نہیں۔ بہر حال اس کو سچ ثابت کرنے کے لیے جوئے شیر لانا ہوگا۔ عوام کے فیصلہ کو ہی آخری فیصلہ ماننا ہوتا۔ کیونکہ عدالت کو فیصلہ سنانے کے لئے ان بنیادوں کو ملحوظ خاطر رکھنا ہوگا۔ (راشٹریہ سہارا، اُردو)



## اے.ایس.آئی.کی رپورٹ ——— کتنی معتبر؟

از: انور علی ایڈووکیٹ

بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں محکمۂ آثار قدیمہ کی رپورٹ کی اہمیت، معنویت کیا ہے؟ کیا یہ رپورٹ ملکیت کے حقوق طے کرنے کے لیے ضروری، مؤثر اور برمحل ہے؟ آخر مسلمانوں کے قابل وکلاء نے ہائی کورٹ کے کھدائی کرنے کے حکم 23 March, 2003 کو اپیل کر کے عدالت میں کیوں چیلنج نہیں کیا؟ ان سوالات کے اطمینان بخش جوابات کے لیے مقدمہ ملکیت کا پس منظر، منظر اور ضمنی تناظر دیکھنا اور ان کا تجزیہ کرنا ضروری ہے۔

بابری مسجد/رام جنم بھومی کا تنازعہ 1856 سے انگریزوں کی سوغات ہے۔ اس درمیان پرتشدد ٹکراؤ اور مختلف مقدمات بھی ہوئے جن کی نوعیت مقامی رہی۔ مسجد میں نماز پابندی سے اقامت و اذان کے ساتھ پانچوں وقت ادا کی جاتی رہی۔

- 23دسمبر 1949ء مسلمانوں نے آخری بار عشاء کی نماز باجماعت ادا کی، پھر 24/دسمبر کو فجر کے وقت مورتیاں پرکٹ (ظاہر) ہوجانے کا شور ہوا۔ 24-23/دسمبر کی درمیانی شب میں مسجد کی محراب امامت میں مورتیاں ایستادہ کردی گئیں۔
- نقض امن کی روک تھام کے لیے مجسٹریٹ نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ 145 کے تحت مسجد کو قرق کر کے مقفل کر دیا، ریسیور مقرر کر دیا۔ ایک سائیڈ گیٹ سے شردھالوؤں کو آرتی پوجا ارچنا کی اجازت دے دی گئی، مسلمانوں کو مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا۔
- یکم فروری/1986ء فوجداری کی اس کارروائی میں ضلع سیشن جج پانڈے نے مسجد کو کھول دیا، اس کے بعد تباہی، بربادی، خوں ریزی کی ایک دردناک، خوفناک اور اذیت ناک داستان مسلسل ہے۔

یہ تو تھی عدالتی سرسری کارروائی کی ایک چھوٹی دھارا۔ دیوانی کارروائی شروع ہوتی ہے 1961 میں۔

- 24-23/دسمبر 1949ء سے مسلمانوں کا مسجد میں داخلہ مکمل طور پر ممنوع ہوا۔ قبضہ غاصبانہ سے ملکیت کے حقوق پختہ کی میعاد 23/دسمبر 1961ء کو پوری ہو رہی تھی۔ ہوش مند، نیشنلسٹ مسلم

قیادت (مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا عبدالرؤف، مولانا شاہد فاخری، پروفیسر ہمایوں کبیر) نے بارہ سال کی میعاد کے اندر ہی، 1961ء میں مولوی نفیس احمد کاظمی سہارنپوری ایڈووکیٹ مرحوم، مولوی بشیر احمد ایڈووکیٹ مرحوم الہ آباد کے ذریعہ ٹائیٹل سوٹ فیض آباد کی عدالت میں دائر کیا، جواب ہائی کورٹ کی اسپیشل بنچ میں زیر تجویز ہے۔ اسی مقدمہ کی کارروائی میں 23/مارچ 2003ء کو حکم ہوا کہ آرڈر 26، رول 10-9 الف کے تحت بابری مسجد متنازعہ اراضی میں کھدائی کر کے محکمے آثار قدیمہ تحقیقات کر کے رپورٹ دے کہ وہاں 1528ء میں تعمیر مسجد سے پہلے کے کسی مندر کے آثار ہیں یا نہیں؟

بابری مسجد ٹائیٹل سوٹ میں مرکزی تنقیح جس پر مقدمہ کی ہار جیت کا انحصار ہے، یہ ہے ''کیا وقف خداوند تعالیٰ موسومہ وقف بابری مسجد متنازع جائیداد (اراضی تحتی مسجد) کا مالک ہے؟'' اصل تنازع ہی یہ ہے اور اسی تنازع کا فیصلہ عدالت کو صادر کرنا ہے۔ ملکیت کے ایشو پر مسلمانوں کا موقف مضبوط ہے۔ ① مسجد کی عمارت اور اس کی اراضی تحتی اور مسجد سے متعلق ملحق 22 پلاٹ قبرستان (گنج شہیداں) وقف بالا استعمال (Wakf by User) ہے، جس کی ملکیت خداوند تعالیٰ کی ہے۔ یہ 1528ء سے 23/دسمبر 1949ء تک لگاتار وقف میں مسلمانوں کے زیر استعمال اور قبضہ میں رہی۔ 24-23/دسمبر 1949ء کو طاقت کے ذریعہ خلاف قانون، بلا کسی استحقاق یا حق کے ان کو بے دخل کیا گیا۔ وقف بورڈ لکھنؤ میں یہ جائیداد، پبلک وقف کے طور پر وقف ایکٹ 1936ء کے سروے اوقاف گزٹ نوٹیفکیشن سے نوٹیفائی کی گئی اور وقف لسٹ 19/نومبر 1944ء من جانب سنی قف بورڈ لکھنؤ زیر دستخط رحمٰن بخش قادری P.C.S. اطلاع عام کے لیے شائع بھی کی گئی۔ یہ نوٹیفکیشن وقف کی ملکیت کا قطعی اور حتمی ثبوت ہے۔ (قانون شہادت دفعہ 83 اور یو. پی. وقف ایکٹ 1936 اور 1960، دفعہ (-6(9))

لیکن عدالت عالیہ کے فیصلہ میں (مورخہ 23/اگست 1991ء اے.آئی.آر 1991 الہ آباد صفحہ 89) (بابری مسجد مقدمہ) قانون کی تشریح یہ کر دی گئی۔

''(وقف جائیداد کے) دفعہ 6(4) کے تحت نوٹیفکیشن کا اثر یہ ہے کہ جائیداد اور ادارہ کا کیرکٹر مسلمانوں کے لیے قطعی حتمی وقف ہو جاتا ہے۔ کوئی مسلمان اس کو چیلنج نہیں کر سکتا، لیکن یہ نوٹیفکیشن دوسرے فرقہ کے افراد پر نافذ نہیں ہوتا۔''

مسلمانوں کے ذی علم وکلاء نے اس تجویز اور آبزرویشن کو اپیل میں چیلنج نہیں کیا اور اس طرح وقف بابری مسجد کے ملکیتی حقوق کے ایک اہم ثبوت کو ضائع کر دیا۔ یہاں اس تاریخی حقیقت کو تحریر کرنا مناسب ہوگا کہ مسجد شہید گنج لاہور کا مقدمہ مسلمان Limitation کے ایشو پر تو ہارے تھے ہی، لیکن سکھوں کے حق میں مسجد کے خلاف گوردوارہ پر بندھک ایکٹ کے تحت مسجد کا اندراج بطور گوردوارہ 1935 میں نوٹی فائی ہوا تھا اور لاہور ہائی کورٹ فل بنچ اوز پریوو کونسل نے (1936 اور 1960) یہ تجویز دی تھی کہ ''مسجد کا بطور گرودوارہ گزٹ میں نوٹی فائی کیا جانا سبھی پر (مسلمانوں پر بھی) قابل پابندی ہے۔'' اس مثال پر وقف نوٹیفیکیشن قطعیت کا حامل تھا۔

آثار قدیمہ کھدائی رپورٹ کی معنویت، اثریت اور برمحل پر آنے سے پہلے مسجد شہید گنج لاہور کے واقعات کا ذکر ضروری ہے۔ تسلیم شدہ حقائق یہ تھے کہ مدنی مسجد شہید گنج کی تعمیر 1722 میں ہوئی تھی، 1972 تک مسلمان مسجد میں نماز اقامت واذان سے ادا کرتے رہے، جولائی 1772ء میں مسجد پر سکھ حکومت کا قبضہ ہوا، سکھوں نے کہا کہ یہ بھائی تارو سنگھ کا شہیدی استھان ہے اور سکھوں کے لئے مقدس ہے۔ مسجد میں ادائیگی نماز بند ہوئی اور برابر بند رہی۔ 8/جولائی 1935 کی شب میں اکالیوں نے مسجد کو شہید کر دیا۔ گردوارہ ایکٹ کا نفاذ ہوا۔ پھر 1935 میں مسجد کا گرودوارہ لسٹ میں اندراج اور نوٹیفیکیشن ہوا۔ انجمن اسلامیہ کا اعتراض رد کر دیا گیا اور مسلمان 1938 میں مقدمہ ہارے۔ عدالت نے تجویز کیا۔

''مسجد کو دوامی تقدس حاصل نہیں ہے۔ یہ صرف حقیقت جائیداد ہے اور غاصبانہ قبضہ اس پر ہوسکتا ہے۔''

قانون کا ایک معمولی طالب علم بھی بخوبی جانتا ہے کہ ملکیت کے مقدمہ میں استقرار ملکیت اور دخل واپسی کی دادرسی کے لیے محض اور محض ملکیت کا دستاویزی اور زبانی شہادت سے ثبوت دیا جاتا ہے۔ بابری مسجد کے ذی علم اور لائق وفائق وکلاء نے دوسری ہمالیائی غلطی یہ کی کہ انہوں نے ایک لایعنی، بے محل اور غیر ضروری تنقیح یہ فریم کرائی کہ ''کیا مسجد کی تعمیر سے قبل اس جگہ کوئی مندر تھا، جس کو مسمار کر کے مسجد تعمیر کرائی گئی''۔ اور پھر اسی تنقیح پر 23/مارچ 2003 کے حکم سے آثار قدیمہ کی کھدائی شروع کی گئی۔ کھدائی کے لیے کوئی ایکسپرٹ مسلمانوں کی طرف سے موجود نہیں رہا، حالاں کہ درخواست کر کے ایک آثارِ قدیمہ کا ایکسپرٹ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ مسلمانوں کے وکلاء کی دوسری

ہمالیائی غلطی یہ رہی کہ انہوں نے عدالت میں، عدالت کے باہر میڈیا میں (سستی شہرت کے لیے) نیشنل انٹیگریشن کونسل کے مختلف اجلاس میں یہ بیان ریکارڈ کرایا: ''اگر آثارِ قدیمہ کی شہادت سے یا تواریخی شواہد سے یہ ثابت ہو جائے کہ بابری مسجد کی تعمیر سے قبل وہاں سائٹ پر مندر تھا، اس کو مسمار کر کے مسجد بنائی گئی تو مسلمان دعویٰ سے دست بردار ہو جائیں گے......''۔

ہمارے یہ ذی علم وکلاء اچھی طرح جانتے ہیں کہ قدیم تہذیبوں کے شہروں میں مصر میں، یونان میں، میسوپوٹامیہ (عراق میں)، چین میں اور ہندوستان کے قدیم شہروں میں، دلی میں، بنارس، اجین، اجودھیا، متھرا میں کسی بھی جگہ سے زمین کھود لیجیے، قدیم تہذیب کے آثار ملیں گے۔ یہی نہیں، تحصیل کے درجہ کا وکیل بھی ترکیبیں جانتا ہے کہ کمیشن کی کارروائی میں کس طرح قبضہ ثابت کرنے کے لیے مختلف چیزیں، مقدمہ کا کوئی اثر دار فریق متنازعہ جائیداد میں پلانٹ کر دیتا ہے۔ وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور ان کی آئیڈیالوجی کے افراد سے کیا آپ دیانت اور اخلاص پر مبنی عمل کی توقع رکھیں گے اور اغراض مقدمہ کے لیے وہ اخلاقی اقدار کی پابندی کر کے Fair Legal Game کے اصولوں پر چلیں گے؟

سیدھی سادی دلیل مسجد شہید گنج نظائر (A.I.R. 1936 Law, 1940 P.C.) پر مبنی ہمارے وکلاء کو یہ پیش کرنی تھی، تنقیح کے فریم کرتے وقت بھی اور کھدائی کا حکم 23/مارچ 2003 کے وقت بھی کہ ''یور لارڈ شپ! دلیل کے طور پر مان لیجیے کہ 1528 تعمیر مسجد سے قبل سائٹ پر مندر کی عمارت تھی، اس کو مسمار کر کے مسجد بنائی گئی۔ اس مفروضہ پر بھی مسلماً 1528 سے 24-23/دسمبر 1949ء تک لگاتار، کھلم کھلا، علی الاعلان، بلا کسی روک ٹوک اور مزاحمت کے مسلمانوں کا قبضہ رہا ہے۔ مسلمان پانچ وقت اقامت و اذان کے ساتھ نماز ادا کرتے رہے۔ کل جائیداد مع گنج شہیداں، اراضی، مقاصد وقف میں مسلماً استعمال ہوتی رہی ہے۔ 24/دسمبر 1949ء کو وحشی طاقت کے بل پر ان کو بے دخل کیا گیا۔ میعاد کے دوران دعویٰ ٹائٹل پر مبنی دائر کیا گیا۔ مندر کا کوئی Sacred Character قانون میں نہیں ہے۔ وہ صرف پراپرٹی کی تعریف میں قانوناً آتا ہے اور وہ دھارمک سمپتی (جائیداد) نہ رہ کر مسلمانوں کی ملکیت، لگاتار Adverse Possession سے ہو گئی ہے۔ آثارِ قدیمہ کی تنقیح بے معنی، اور غیر ضروری ہے اور ملکیت طے کرنے کے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آثارِ قدیمہ کمیشن کی رپورٹ کی کوئی قانونی اہمیت نہیں ہے، ملکیت طے کرنے کے لیے''۔

مسلمانوں کے وکیلوں نے تیسری ہمالیائی غلطی یہ کی کہ مسجد سے ملحق تین اطراف میں جو قبرستان گنج شہیداں کے 22 پلاٹ تھے، ان سے وقف خداوند تعالیٰ کی طرف سے تحریری دست برداری عدالت میں داخل کر کے ملکیت کے حقوق سرینڈر کر دیے۔ اب صورت حال یہ ہے: ① مسجد کی اراضی کے تینوں اطراف میں سرکاری ایکوائر شدہ اراضی ہے اور یا ہندو سنستھاؤں کی جائیدادیں۔ اگر مسلمان وقف کے مقدمہ میں مسجد کی اراضی سے متعلق کامیاب بھی ہو جاتے ہیں تو آمد و رفت کا حق کہاں سے ملے گا۔ حق آسائش آمد و رفت ضرور یہ کا مقدمہ سو سال اور لڑیے اور ہندوستانی مسلمانوں کو ٹروما میں مبتلا رکھیے۔ ② ہمارے ان لیڈروں اور ذی علم پیشہ وروں کے یہ بیانات کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مسجد کی جگہ تعمیر سے پہلے مندر تھا تو وہ اپنے اوقافی حقوق ملکیت سے دست بردار ہو جائیں گے، یہ بیان پوری مسلم قوم پر قابل پابندی ہے۔ متوفی محمد ہاشم انصاری اور وقف بورڈ، مدعیان پر قابل پابندی ہے۔ اب مقدمہ میں ناکامی اور نامرادی کے اندیشے ہیں۔

اب آثار قدیمہ کی رپورٹ مندر کے باقیات اور آثار کے (غلط یا صحیح) حقائق کے ساتھ ریکارڈ پر ہے۔ ظفریاب جیلانی یا قاسم رسول الیاس صاحب اس پر تنقیدی بیانات میڈیا کو جاری کریں، چڑیاں کھیت چگ گئیں ہیں، اب پچھتانے سے کیا ہو؟ اس وقت ملت کے سامنے ایک بڑی مصیبت Dilemma ہے۔ مسلمانوں کی علیحدگی پسند تنظیموں نے، جو خود فرقہ وارانہ ایجنڈا مسلمانوں کے لیے پیش کرتی ہیں، خود سیکولر نہیں ہیں، لیکن آئین پسندی، جمہوریت اور سیکولرازم کی دہائی دیتی ہیں، ان تنظیموں میں کوئی جمہوری اقدار کا پاس نہیں ہے۔ ان کے لیڈر انتہائی غیر جمہوری مزاج رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے جمہوری سیکولر اداروں اور اقدار کا پورا فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ مسلمانوں کو کوچہ بند (Blind Street) پر پہنچا دیا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ یہ ایک ملین ڈالر کا سوال ہے۔ (i) اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کے سیکولر مزاج رہنما اور سیکولر سماجی تنظیمیں سامنے آئیں اور ایک کنونشن جنوبی ہند کے کسی مقام پر منعقد کیا جائے۔ (دلی لکھنؤ میں اس لیے نہیں کہ ان تنظیموں کے سرپھرے شیدائی مباہلہ بول طریقے اختیار کر کے کنونشن کو تتر بتر کر دیں گے)، (ii) بابری مسجد ایکشن کمیٹیوں کو، جن میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی بابری مسجد کمیٹی بھی ہے، سے بابری مسجد مقدمات لے لیے جائیں۔ (iii) مجوزہ کنونشن میں مسلم وکلاء اور سابق جج صاحبان کا ایک بورڈ بنایا جائے جو مقدمات کی مانیٹرنگ کرے۔ یہ مسلم جج صاحبان اور وکلاء کا بورڈ ہندوستان گیر پیمانہ سے منتخب کیا

جائے۔(iv) جناب ظفریاب جیلانی، عبدالمنان صاحب اور ان کے ہمراہی وکلاء سے مقدمہ کا بریف فوراً لے لیا جائے۔ پیروی کے لیے وکلاء کا ایک پینل مقرر کر کے کارروائی کی جائے۔ جنوبی ہند کے وکیلوں کو بھی اعتماد میں لیا جائے۔ عدالت میں پیروی کے لیے اچھے وکلاء کا (غیر مسلم وکلاء سے بھی) تقرر کیا جائے۔ اس طرح بہترین قانونی دماغوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔

اگر وکلاء کا پینل یہ مشورہ دیتا ہے کہ ہمارے وکلاء کے بیانات سے اور وقف کے 22 پلاٹوں کے سرینڈر کرنے سے، آثار قدیمہ کی رپورٹ ہمارے اوپر قابل پابندی ہے اور اس کے Binding Effect سے بچا نہیں جا سکتا تو ایک دوسرا کنونشن منعقد کر کے جس میں سیکولر ہندو رہنماؤں کو بھی شامل کیا جائے۔ کوئی پروقار حل نکالا جائے جو صلح کلی اور سد بھاؤنا پر منتج ہو۔ یہ وقت ہے کہ حقیقت پسندی سے کام لیا جائے اور ملت اسلامیہ ہند کی اقتصادی، معاشی اور تعلیمی ترقی کے ایشو پر پوری توجہ دی جائے۔



## محکمہ آثارِ قدیمہ کی کھدائی رپورٹ ۔۔۔ بے بنیاد اور گمراہ کن

از: ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس
(مدیر ماہنامہ ''افکار ملی'') ترجمان آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

کسی جمہوری ملک میں اگر فسطائی ذہنیت رکھنے والے افراد کو اقتدار پر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے تو وہ کس طرح جمہوری اور سرکاری اداروں کی مٹی پلید کرتے ہیں، اگر کسی کو اس کی کوئی مثال دیکھنا ہو تو اسے محکمہ آثارِ قدیمہ کی 572 صفحات پر مشتمل وہ رپورٹ دیکھنی چاہئے جو اس نے الہ آباد ہائی کورٹ کے حکم پر کھدائی مکمل کر کے عدالت میں داخل کی ہے۔ یہ رپورٹ جھوٹ کا پلندہ ہے، حکمراں پارٹی کے سیاسی مفاد کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ رپورٹ نہ صرف سرسری ہے بلکہ تضاد بیانیوں کا مجموعہ ہے۔ کورٹ میں دورانِ کھدائی پر مامور ٹیم کی جانب سے جمع کی جانے والی اپنی ہی عبوری رپورٹوں کی تکذیب کرتی ہے۔

الہ آباد ہائی کورٹ میں بابری مسجد کا زیر سماعت مقدمہ دراصل حقیقت کا مقدمہ ہے یعنی اس میں کورٹ کو یہ طے کرنا ہے کہ جس دن تنازعہ پیدا ہوا (22/دسمبر 1949ء) اس دن یہ جگہ کس کی ملکیت تھی۔ کورٹ کو اس سوال کا نہ تو جواب تلاش کرنا ہے اور نہ ہی اس مقدمہ سے اس بات کا کوئی تعلق ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر سے قبل وہاں کون سی عمارت تھی اور یہ کہ آیا اس کو توڑ کر بابری مسجد بنائی گئی تھی اور نہ ہی موجودہ مقدمہ کی یہ ضرورت ہے کہ یہ جانا جائے کہ بابری مسجد سے قبل (یہ عرصہ چند سالوں سے کئی صدیوں قبل کا بھی ہو سکتا ہے) وہاں کوئی اور عمارت یا مندر تھا یا نہیں۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک لایعنی کام کس لیے کرایا گیا۔ لاکھوں روپے اور مقدمہ کا وقت کیوں ضائع کیا گیا۔ کورٹ کے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ ابتدا میں جو 25 ایشوز مقدمہ میں طے ہوئے تھے اس میں فریق مخالف کی خواہش پر ایک ایشو یہ بھی طے کیا گیا تھا کہ آیا بابری مسجد سے قبل وہاں کوئی مندر تھا یا نہیں۔ لہٰذا کورٹ کو یہ اختیار ہے کہ وہ اس سوال کے جواب کو جاننے کی کوشش کرے چاہے اس کا مقدمہ سے براہِ راست تعلق ہو یا نہ ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کھدائی کی مخالفت نہ صرف مسلمانوں کی جانب سے کی گئی تھی بلکہ نرموہی اکھاڑہ اور دوسرے ہندو فریق بھی اس کے حق میں نہیں تھے۔ مزید براں جو لوگ رام جنم بھومی کے دعوے دار ہیں اصلاً یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے

دعوے کے حق میں ثبوت فراہم کریں۔ بہرحال کورٹ کو قانونی طور پر یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ کسی ایشو کا جواب مدعی کے مطالبہ کے بغیر بھی خود جاننے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کی جانب سے کھدائی کی مخالفت کی دو وجوہات بیان کی گئی تھیں ایک یہ اس کا مقدمہ کے قانونی پہلو سے کوئی تعلق نہیں ہے، دوسرے یہ کہ اس سے ایک غلط نظیر قائم ہوگی اور آئندہ جب بھی کسی مسجد یا عبادت گاہ کے تعلق سے کوئی تنازعہ پیدا ہوگا تو الہ آباد ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کو بطور نظیر پیش کیا جائے گا۔ لیکن کورٹ نے یہ دلیلیں مسترد کر دیں۔ پہلے تو جو انڈیا کمپنی سے سروے کرایا گیا اور اس کے بعد مارچ سے اگست تک محکمہ آثارِ قدیمہ کی جانب سے بابری مسجد کی پوری زمین کی مورتیوں کے آس پاس دس دس فٹ جگہ چھوڑ کر کھدائی کرائی گئی۔

25/اگست کو آثارِ قدیمہ کی جانب سے کھدائی کے نتائج پر مبنی 572 صفحات کی ایک رپورٹ جمع کی گئی جس میں حیرت انگیز طور پر یہ اشارہ دیا گیا کہ بابری مسجد کے نیچے اٹھارویں صدی عیسوی کی ہال نما عمارت کے آثار ملے ہیں اور اس میں جو اشیاء برآمد ہوئی ہیں وہ اس زمانے میں شمالی ہند میں بننے والے مندروں سے مشابہت رکھتی ہیں۔

رپورٹ کے نتائج نہ صرف یہ کہ بابری مسجد کے نیچے سے برآمد ہونے والی اشیاء سے میل نہیں کھاتے بلکہ تاریخی حقائق کے بھی خلاف ہیں۔ بابری مسجد کے نیچے جو فرش یا تعمیری باقیات ملے ہیں اس میں جو گارا استعمال کیا گیا وہ چونا اور سرخی ہے۔ اینٹوں اور پتھروں کو جوڑنے کے لئے جس کا استعمال مسلم دورِ حکومت سے ہی ہندوستان میں شروع ہوا ہے۔ آثارِ قدیمہ اس پہلو کو بالکل ہی گول کر گیا ہے۔ یہ بات یہاں واضح رہنی چاہئے کہ 10/جون کو ملک کے دس ممتاز ماہرین آثارِ قدیمہ اور ماہرین تاریخ نے کورٹ کی اجازت سے کھدائی کی اس جگہ کا معائنہ کیا تھا۔ ان میں سے بعض نے بعد ازاں اپنی پریس کانفرنس میں یہ بتایا تھا کہ بابری مسجد کے نیچے جو فرش اور تعمیری باقیات ملے ہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بابری مسجد کے نیچے یا تو پہلے کوئی قناتی مسجد یا عید گاہ تھی۔ جس پر دوبارہ یہ مسجد تعمیر کی گئی ہے۔ کھدائی کرنے والے ماہرین نے بابری مسجد کی پشت پر جس 50 میٹر لمبی دیوار کا ذکر کیا ہے وہ دراصل مسجد کی مغربی دیوار ہے۔ چونکہ بابری مسجد بلندی پر تھی اور اس کی پشت پر ڈھلان ہے اس لیے مسجد کو محفوظ رکھنے کے لیے بہت لمبی، گہری اور مضبوط دیوار بنائی گئی تھی۔ اس دیوار میں جو مصالحہ استعمال ہوا وہ اور دیوار کا طرزِ تعمیر مسلم دورِ حکومت کی یاد دلاتا ہے۔ محکمہ آثارِ

قدیمہ کے ماہرین دیوار کا تعلق غلط ڈھنگ اور بے بنیاد طور پر دورِ قدیم کے مندر سے جوڑ رہے ہیں۔ اسی طرح جن 50 مقامات کو قدیم بلند بالا عمارت کے ستونوں کی بنیاد کہا ہے اسے ایک جاہل بھی بآسانی مسترد کر سکتا ہے۔ پہلے تو یہ بنیادیں فرش کو کاٹ کر خواہ مخواہ بنائی گئی ہیں، جس پر دورانِ کھدائی بھی مسلم فریق نے اعتراض کیا تھا ان کا یہ اعتراض کورٹ کے ریکارڈ پر موجود ہے اور جب مقدمہ کھدائی کے نتائج پر گفتگو ہوگی اسے بھی سامنے لایا جائے گا۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ملک کے بعض ممتاز ماہرین آثارِ قدیمہ کا کہنا ہے کہ اگر کوئی عالیشان اور بلند بالا قوی ہیکل عمارت تھی تو جن چیزوں کو ستونوں کی بنیاد کہا جا رہا ہے وہ اس عمارت کا بوجھ ہرگز بھی نہیں سنبھال سکتے تھے۔ پھر ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ نام نہاد ستونوں کی یہ بنیادیں تین مختلف سطحوں سے برآمد ہوئی ہیں یا کرائی گئی ہیں۔ کسی عمارت کے ستونوں کو الگ الگ سطحوں پر کیسے تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ رام جنم بھومی کے مدعیان برابر یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ بابری مسجد ایک 85 کسوٹی کھمبوں والے مندر کو توڑ کر بنائی گئی ہے جس میں سے 14 کھمبے تو بابری مسجد میں استعمال ہوئے اور باقی 71 کھمبے مسجد کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ لیکن اس پوری کھدائی میں ان میں کا ایک بھی ستون برآمد نہیں ہوا، پتہ نہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اس کا کیا جواب ہے مندر حامیوں کے پاس؟

ایک خاص بات یہ ہے کہ دورانِ کھدائی تقریباً ہر سطح پر جانوروں کی ہڈیاں کٹی ہوئی اور ٹوٹی ہوئی حالت میں پائی گئیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بکری، بھیڑ اور گائے وغیرہ کی ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر رپورٹ میں اس سے کوئی نتیجہ نہیں اخذ کیا گیا ہے۔ ہڈیوں کی موجودگی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس مقام پر جو لوگ آباد تھے وہ گوشت خور تھے۔ اگر وہاں کوئی مندر یا ہندو عبادت گاہ تھی تو وہاں اتنے بڑے پیمانے پر ہڈیوں کی موجودگی کی کیا توجیہ کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی جو قبریں بابری مسجد کے شمال میں ملی تھیں ان سے بھی کوئی نتیجہ نہیں اخذ کیا گیا۔

کھدائی کے دوران جو کانچ اور مٹی کے خوشنما، رنگین اور نقش و نگار والے برتن اور سکے ملے ہیں وہ بجا طور پر مسلم دورِ حکومت اور بابری مسجد کی تعمیر سے پہلے اس مقام پر مسلم آبادی کی موجودگی کو ثابت کرتے ہیں۔ رپورٹ میں اس پہلو کو پوری طرح نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کھدائی کرتے وقت نہ صرف یہ کہ آثارِ قدیمہ کے بین الاقوامی ضوابط کو نظر انداز کیا گیا بلکہ غیر مسلم مزدوروں کو کوئی چیز مسلم عہد کو ثابت کرنے والی ملتی تو وہ اسے پھینک دیتے تھے۔ مسلم فریق کی جانب سے عدالت میں

شکایت سے یہ سلسلہ رکا۔ کھدائی کے دوران ہونے والی بے ضابطگیوں کا نوٹس لیتے ہوئے ٹیم کے لیڈر مسٹر منی کو ہائی کورٹ نے ان کے عہدہ سے ہٹا دیا تھا۔ تاہم وہ اسی ٹیم کا حصہ بنے رہے اور ان کا عمل دخل پوری طرح جاری رہا۔ کھدائی کے نتائج کو لے کر ٹیم کے لیڈر مبینہ طور پر ہر ہفتہ دہلی کا دورہ کر کے اپنے آقاؤں سے ہدایت حاصل کیا کرتے تھے۔ رپورٹ جس تاریخ کو کورٹ میں داخل ہونی تھی اس کے دو دن بعد داخل کی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ مبینہ طور پر اس کے نوک پلک دہلی میں ''درست'' کیے گئے۔

آثارِ قدیمہ کے طے شدہ معیار اور ضابطہ کے مطابق بھراؤ کی زمین سے ملنی والی اشیاء کو کسی زمانے کی تعین کرنے کے لیے بطور ثبوت نہیں استعمال کیا جاتا۔ اس لیے کہ بھراؤ کے لیے عام طور پر ملبہ کہیں اور سے لایا جاتا ہے۔ لیکن بھراؤ کی زمین سے ملنے والی ایسی اشیاء جن کا کوئی تعلق کسی ہندو دور سے ثابت ہوتا یا مندروں میں وہ استعمال ہوتی ہوں ان کو اس رپورٹ میں ثبوت مانا گیا اور اس بنیاد پر زمین کے مختلف ستونوں کو مختلف تاریخی ادوار سے منسوب کیا گیا۔

یہ رپورٹ تضادات کا مجموعہ بھی ہے۔ اس رپورٹ پر ممتاز ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور ماہرین تاریخ کی ناراضگی بالکل بجا ہے۔ کھدائی میں ملنے والی اشیا اور دیگر معلوماتِ اور ان پر کھدائی کرنے والی ٹیم کے تاثرات میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ محکمہ آثارِ قدیمہ نے تاریخ کے ساتھ جو کھلواڑ کیا ہے اس کو آسانی سے معاف نہیں کیا جا سکے گا۔ یہ رپورٹ شرافت، دیانت، عدل و انصاف کے تقاضوں کے خلاف اور تاریخی حقائق کی جانچ پڑتال کے بین الاقوامی معیار سے پوری طرح متصادم ہے۔ ظاہر بات ہے کہ عدالت میں جب اس پر بحث ہوگی تو اس کے یہ تمام پہلو پوری طرح بے نقاب ہو کر سامنے آ جائیں گے۔ اس کا اندازہ ان لوگوں کو بھی ہے جن کے ''اشارے'' پر رپورٹ کے ساتھ کھلواڑ کیا گیا ہے ظاہر ہے سر دست ان کا منشا رپورٹ سے آنے والے انتخاب میں فائدہ اُٹھانا ہے۔ تاہم جس طرح اس رپورٹ پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا کوئی فائدہ بی۔ جے۔ پی۔ آنے والے انتخابات میں اُٹھا پائے گی۔ لیکن اپنے جھولے کو پوری طرح خالی پانے والی بی۔ جے۔ پی۔ ایک بار پھر جھوٹ کے سہارے ہی عوام کو گمراہ کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ اس رپورٹ سے زیر سماعت مقدمے کے قانونی پہلو پر

کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سنگھ پریوار اور مندر حامی اس رپورٹ کے آنے کے بعد خوشی کے جو شادیانے بجا رہے ہیں انہیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جھوٹ پر تعمیر کی گئی یہ عمارت بہت جلد زمیں بوس ہو جائے گی۔ مسلمانوں کو اور سیکولر عناصر کو صبر اور استقامت کے ساتھ اپنے موقف پر جما رہنا چاہئے اور سنگھ پریوار کی گیدڑ بھبکیوں سے ہراساں نہیں ہونا چاہئے۔



# محکمہ آثارِ قدیمہ کی زعفرانی رنگت

از: محمد سراج الدین شریفی

ہندوستانی محکمہ آثارِ قدیمہ۔ Archeological Survey of India (A.S.I.) کو عام طور پر خود مختار، غیر جانبدار اور مذہبی تعصبات وحکومت کی ریشہ دوانیوں سے پاک صاف سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ ادارہ کانگریسی دورِ حکومت سے ہی مذہبی تعصبات اور حکومت کی ریشہ دوانیوں کا شکار رہا ہے، البتہ اس نے اپنا کھلا کھیل بابری مسجد کے سلسلے میں اب کھیلا ہے۔ اس معاملے میں اس نے عدالت کو رپورٹ دی ہے کہ بابری مسجد ڈھانچے کے نیچے مندر کی بنیاد ہے، جس سے اس کی زعفرانیت ہی کا پتہ چلتا ہے اور اس سازشانہ و جانبدارانہ فرضی رپورٹ سے اس کی خود مختاری، غیر جانبداری اور حکومت کی ریشہ دوانیوں سے پاک وصاف ہونے کا بھرم کھل جاتا ہے۔ اپنے اس اقدام سے اس نے سنگھ پریوار کو بالخصوص اور ہندوؤں کو بالعموم شرانگیزی پر اُبھارا ہے، انہیں ایک بہت طاقتور ہتھیار مہیا کر دیا ہے جس سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ اب A.S.I. بھی پورے طور پر زعفرانی رنگ میں رنگ چکا ہے۔ حالانکہ اس ادارہ پر یہ رنگ بہت پہلے ہی سے چڑھا ہوا ہے البتہ سنگھ پریوار کی واجپئی حکومت میں اس کا رنگ اور گہرا ہو گیا ہے نیز بھاجپا کو ایک نیا انتخابی موضوع بھی مل گیا ہے۔

واضح رہے کہ واجپئی حکومت اس سے پہلے NCERT اور ICHR جیسے تعلیمی وتاریخی اداروں کا بھی بھگوا کرن کر چکی ہے اور اس طرح وہ نہایت تیزی وہوشیاری کے ساتھ سنگھ کے ایجنڈے پر عمل کرتی چلی آ رہی ہے۔ ان سنگین معاملات میں اس کی حلیفی نام نہاد سیکولر جماعتوں کا کردار بھی واضح ہو گیا ہے اور ان کے جھوٹے سیکولرزم کا بھرم کھل گیا ہے۔ واضح رہے کہ NCERT ملک کے سرکاری تعلیمی اداروں کے لئے نصاب تعلیم وضع کرتا ہے، جب کہ ICHR ملک کی تاریخ مرتب کرتا ہے اور اسی کی تاریخی تحقیقات کی روشنی میں ملک کے سرکاری تعلیمی اداروں یعنی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ دونوں نہایت اہم ادارے مرکزی حکومت کے تحت کام کرتے ہیں۔ واجپئی حکومت نے ان کے اعلیٰ عہدوں پر سنگھیوں کو بٹھا کر تعلیم وتاریخ کے معاملات میں بھی ریشہ دوانیوں سے کام لیتے ہوئے اپنے ایجنڈے کو بہت آگے لے جانے کی کامیاب کوشش کی ہے

اور اسی طرح مرکزی سراغ رساں ادارہ C.B.I. کے معاملے میں بھی موجودہ بھاجپائی حکومت شرارت سے کام لے رہی ہے وہ اس طرح کہ یہ ادارہ پہلے وزارتِ عظمیٰ کے تحت کام کر رہا تھا مگر جب سے واجپئی آئے تب سے انہوں نے اسے وزارتِ داخلہ کے تحت کر دیا ہے، کیونکہ نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ اڈوانی بھی سنگھ پریوار ہی کے آدمی ہیں، چونکہ واجپئی نے اپنے چہرے پر سیکولر اور غیر جانبدار نیز اعتدال پسندی کا مکھوٹا لگا رکھا ہے اور وہ بہت پرفریب سیاست کرتے ہیں اس لئے ان کے سامنے کچھ حدود کی پابندیاں بھی ہیں لہٰذا اس ذمہ داری کو انہوں نے اڈوانی کے حوالے کر دیا ہے اور اڈوانی کھل کر سنگھ کے ایجنڈے کی وکالت کرتے ہیں کیونکہ ان کے چہرے پر کوئی مکھوٹا نہیں ہے اس لئے ان کے سامنے کسی حد کی پابندی بھی نہیں ہے۔ اس سے پہلے واجپئی اڈوانی کو نائب وزیر اعظم بنا کر بھی ایک زبردست کھیل کھیل چکے ہیں۔

ملک کے مشہور مؤرخ اور دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے سابق پروفیسر جناب کے. ایم. شریمالی (K.M. Shrimali) نے محکمہ آثارِ قدیمہ (A.S.I.) پر تین سال پہلے دو مضمون لکھے تھے جس میں انہوں نے اس ادارے کی زعفرانیت کو سامنے رکھا تھا Safronisation of Indian History ''ہندوستانی آثارِ قدیمہ کا بھگوا کرن'' (ہندوستان ٹائمز 04/06/2003) Rediscovery of India ''ہندوستان کی دوبارہ دریافت'' (ہندوستان ٹائمز 04/07/2003) اپنی تحریر میں پروفیسر صاحب اس ادارہ کے طریقۂ کار اور اس کے کردار پر سوالات اُٹھا کر اس کی غیر جانبداری وخود مختاری نیز اس کی مذہبی تعصبات وحکومت کی ریشہ دوانیوں کے پاک وصاف ہونے کا بھرم کھول دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> Why does Fatehpur Sikri hog the lime light when the Khajuraho diggings go unnoticed? Much has been written in these columns about recent discoveries in December 1999, at Fatehpur Sikri. The role of the Archaeological Survey of India (A.S.I.) has particularly come under scrutiny and for justifiable persons. Its reticence at the time of Karsewak type Archaelogy at Ayodhya and also during and after the demolition of the 450 years old Babri Masjid is too recent to forget.

**ترجمہ:** ''فتح پور سیکری کو کیوں شہرت دی جاتی ہے جبکہ کھجوراہو کی کھدائی کو نظر انداز کیا جاتا ہے؟ فتح پور سیکری کی حالیہ دریافتوں، دسمبر 1999 پر اس کالم کے تحت بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اس سلسلے میں محکمہ

آثارِ قدیمہ کے کردار پر بالخصوص احتسابی انداز میں سوال اُٹھایا گیا ہے جو اپنی جگہ مناسب اور درست ہے۔ بابری مسجد کے انتظام و انصرام کے سلسلے میں اس ادارہ نے جو کارسیوکوں جیسا طریقۂ کار اپنایا ہے اور اپنی کارروائیوں کے تعلق سے جو رازداری برتی ہے نیز اس 450 سالہ پرانی مسجد کی شہادت کے وقت اور اس کے بعد بھی جو رویہ اپنایا ہے اسے اتنا جلد بھلایا نہیں جا سکتا ہے''۔

یعنی ہندوستانی محکمہ آثارِ قدیمہ اور سنگھ پریوار والے فتح پور سیکری کی دریافتوں کو خوب مشہور کرتے ہیں حالانکہ اس ادارے نے اپنی تمام کارروائیاں جانبدارانہ، راز دارانہ، غیر ذمہ دارانہ اور مشکوکانہ انداز میں کی ہیں مگر کھجوراہو کی کھدائیوں کی دریافتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جہاں جین مذہب کے دیوتاؤں کی مورتیاں ملی ہیں اور یہ ثابت ہو گیا ہے کہ موجودہ ہندو مندر جین مذہب کی عبادت گاہوں کو مسمار کر کے بنائی گئی ہے۔ فتح پور سیکری کی حالیہ دریافتوں پر میڈیا میں بالخصوص سنگھی میڈیا میں خوب لکھا گیا ہے اور آج بھی چرچہ کیا جا رہا ہے، جبکہ اس معاملے میں A.S.I. کا کردار سازشانہ طرزِ کار رہا ہے جس کا احتساب ہونا چاہئے۔ اس ادارے کے کردار و کارکردگی پر جو سوالات اُٹھائے گئے ہیں وہ اپنی جگہ مناسب اور درست ہیں بابری مسجد کے انتظام و انصرام کے وقت اور وہاں کی کھدائیوں کے وقت بھی نیز اس کی شہادت کے وقت اور اس کے بعد کے وقتوں میں بھی اس ادارے کا کردار غلط اور غیر ذمہ دارانہ ہی نہیں بلکہ کارسیوکوں جیسا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی بعض کارروائیاں رازداری کے ساتھ ہوئی ہیں۔ واضح رہے کہ پچھلے قریب تین سالوں میں A.S.I. نے اجودھیا میں کئی بار کھدائی کا کام کیا ہے۔ سابقہ تمام کھدائیاں ملکی وسائل کے سہارے کی گئی تھیں اور ان کھدائیوں کی رپورٹوں میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی مگر اس بار کی کھدائی میں ایک غیر ملکی کمپنی کی مدد لی گئی ہے، کچھ دنوں پہلے اپنے خاص قسم کے آلات سے جانچ کے بعد یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ اس ڈھانچہ کے نیچے کسی دوسری عمارت کی بنیاد ہے اور اسی شوشہ کی بنیاد پر نئی کھدائی کی گئی ہے A.S.I. نے اس کھدائی کے بعد عدالت کو جو رپورٹ دی ہے وہ فرضی ہی نہیں بلکہ مذکورہ غیر ملکی کمپنی A.S.I. اور بھاجپا حکومت کی مشترکہ سازشوں کا نتیجہ ہے۔ اور اس رپورٹ نے مسلمانوں کے دعویٰ کو بہت کمزور کر دیا ہے اور یہ سب کچھ سرکاری اداروں پر ہمارے غیر فراستانہ اعتبار و انحصار کی وجہ سے ہوا ہے غیر ملکیوں کی فتنہ پروری اور اسلام دشمنی تو جگ ظاہر ہی ہے۔☐

(ملت کا ترجمان، جام نور، سہسرام اکتوبر 2003)

اے ایس آئی کی رپورٹ پر ردعمل

## رپورٹ سیاسی دباؤ میں تیار کی گئی ہے

از: سید شہاب الدین
(سابق ممبر پارلیمنٹ)

محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ عدالت کے حکم کے باوجود یہ رپورٹ سیاسی دباؤ میں تیار کی گئی ہے۔ یہ محض الزام نہیں بلکہ اس کے پیچھے حقائق اور دلائل دونوں ہیں۔ کورٹ میں محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی جو عبوری رپورٹیں پیش کی تھیں ان میں اور اس حتمی رپورٹ میں کوئی تال میل نہیں ہے۔

ابھی تک جو بھی حقائق سامنے آئے ہیں ان سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ متنازع مقام پر کوئی مندر موجود تھا، کیونکہ مسجد کی بنیاد اور کھدائی میں پائے جانے والے ستون کے بیچ 50 فٹ کی دوری ہے۔ اسی طرح کئی حقائق ایسے ہیں جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ رپورٹ پر بحث کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی تنازع بڑھے، ہمیں عدالت کے فیصلے کو قبول کرنا چاہئے اور فیصلے کو عمل میں لانے کی ضمانت دینی چاہئے۔ جہاں تک کھدائی سے متعلق عدالت کے حکم کا سوال ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس حکم سے مسئلے کی پیچیدگی میں اضافہ ہوا ہے، پھر بھی حکم دیا گیا ہے تو اسے قبول کرنا ہی ہوگا۔ سردست کسی فیصلے پر پہنچنا ممکن نہیں۔ ہمیں عدالتی فیصلے کا انتظار کرنا چاہئے۔ ☐ ☐

## ہنگامہ آرائی سے ماحول مزید خراب ہوگا: ایک نقطۂ نظر

از: مولانا وحید الدین خاں

اجودھیا معاملے میں محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹ آنے کے بعد شک وشبہے اور الزام تراشیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ جن لیڈروں کو آثار قدیمہ کے طریقۂ کار کی جانکاری تک نہیں ہے وہ بھی محض سیاسی مفادات کی حصولی کے لیے تبصرے کر رہے ہیں اور مختلف نوعیت کے شک وشبہات ظاہر کر رہے ہیں۔ ان میں مسلم لیڈر بھی پیچھے نہیں ہیں۔ دراصل کئی

چھوٹے موٹے لیڈر اپنی سیاسی دکان چمکانے کے لیے سماجی ہم آہنگی کو بگاڑنے کا کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عدالت بھی اپنا فیصلہ سنانے سے پہلے کچھ ایسی تیاری کرتی ہے کہ جس سے کشیدگی میں اضافہ نہ ہو۔ چوں کہ معاملہ عدالت میں زیرِ غور ہے اور محکمہ آثارِ قدیمہ نے عدالت کے حکم کے تحت کھدائی کی ہے، لہٰذا اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہئے۔ مندر مسجد کے تنازعات کے سلسلے میں ہمیں 1951 میں بنائے گئے ایکٹ کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ اس ایکٹ میں دو باتیں واضح کی گئیں تھیں۔ ایک تو یہ 1947ء تک جن مسجدوں کا وجود تھا، حکومت ان کے تحفظ کی گارنٹی لے اور دوسرا یہ کہ اجودھیا مسئلہ کا حل عدالت کے ذریعہ ہو۔ جب یہ باتیں پہلے سے ہی طے ہیں تو ہنگامہ آرائی سے کیا فائدہ! یہ بات دونوں فرقوں کو سمجھنی چاہئے۔ ہنگامہ آرائی سے مسئلے کا حل تو ممکن نہیں، البتہ ماحول مزید خراب ہوگا۔ لہٰذا عدالتی فیصلے کا انتظار اور اس کو قبول کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ □ □

## بابری مسجد کی تعمیر کا مسئلہ مقامی و ملکی نہیں بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے

بھارت کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کے حکم پر مسجد کو مقفل کر کے مسلمانوں کا داخل ہونا اور نماز پڑھنا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ فروری 1986ء میں تالا توڑ دیا گیا اور مسجد کو عملاً مندر بنا لیا گیا۔ باقاعدہ سنگ بنیاد رکھنے کی رسم نومبر 1989ء میں ادا کی گئی اور بالآخر 6؍دسمبر 1992ء کو ہندوؤں کے ایک بڑے اجتماع نے مسجد کو منہدم کر دیا۔ مسلمان اپنا کیس عدالت میں لے گئے۔ عدالت نے مارچ 2003 میں محکمہ آثارِ قدیمہ کو یہ جگہ کھودنے کا حکم دیا۔ اب گزشتہ 24 اگست کو ہائی کورٹ لکھنؤ نے محکمہ آثارِ قدیمہ کی طرف سے 574 صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ کی سمری (Summary) جاری کی ہے جس میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ محکمے کو بابری مسجد کی بنیادوں کی کھدائی کے دوران دسویں صدی کے ایک ''رام مندر'' کے ثبوت ملے ہیں۔ اس مندر کے 50 ستونوں اور اس کی دیواروں اور اینٹوں پر کنول کے پھول کی مصوری کے آثار بھی ملے ہیں۔ ''رام اور مسز رام'' کا ایک مسخ شدہ جڑواں بت بھی ملا ہے۔ اس رپورٹ میں یہ استدلال پیش کیا گیا ہے کہ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ مغل حکمرانوں نے ہندوستان پر قبضے کے بعد رام مندر کو منہدم کر کے بابری مسجد تعمیر کرائی تھی۔

آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے اس رپورٹ کو مبہم ''من گھڑت'' بے بنیاد اور جھوٹی رپورٹ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اصل رپورٹ میں تبدیلی حکومت کے دباؤ پر کی گئی ہے۔ عدالت

نے فریقین کو چھ ہفتے کا وقت دیا ہے تا کہ وہ تفصیلی غور وخوض کے بعد رپورٹ پر اپنا اپنا موقف پیش کر سکیں۔ عدالت کا فیصلہ خواہ کچھ بھی ہو، ایک بات طے ہے کہ یہ معاملہ رکنے والا نہیں اور آئندہ ادوار میں ہندو مسلم منافرت کی نئی آگ کو ہوا دینے کا سبب بنے گا، جبکہ واجپئی اور ان کی بھارتیہ جنتا پارٹی (بی۔جے۔پی) اس رپورٹ کو آئندہ سال عام انتخابات کے موقع پر اپنے انتخابی منشور کا حصہ بنائیں گے۔ لیکن انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہندوستان میں بسنے والے 18 کروڑ مسلمان اپنے مذہبی و تاریخی آثار کو آسانی سے ہندو سیاست گردی کی نذر نہ ہونے دیں گے، اور یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ مسلمانوں کا مذہبی، تاریخی و تہذیبی ورثہ دنیا کے خواہ کسی بھی حصے میں ہو، پوری دنیائے اسلام کی میراث ہے۔ اس اعتبار سے بابری مسجد کے انہدام اور دوبارہ اُسی جگہ پر مسجد کی تعمیر کا مسئلہ مقامی و ملکی نہیں، بلکہ بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ □ □

(ہفت روزہ ندائے خلافت، لاہور 10 ستمبر 2003)

---

## مندر ہونے کا کوئی ثبوت نہیں

از: ڈاکٹر آر۔بی۔ ٹھاکرن (آرکیالوجسٹ)

محکمہ آثارِ قدیمہ کو کھدائی کے دوران دسویں صدی کی ایسی کوئی چیز نہیں ملی ہے جس سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ وہاں اُس دور کا کوئی مندر تھا۔ محکمے کے لوگ مندر کے ثبوت کے طور پر جس دیوار کو پیش کر رہے ہیں وہ مسجد کا ہی ایک حصہ ہے۔ دیوار کا پلاسٹر اور فرش کا پلاسٹر ایک جیسا ہے۔ اے۔ ایس۔آئی نے یہ نہیں بتایا ہے کہ فرش اور دیوار ایک ہی زمانے کے ہیں یا الگ الگ زمانے کے ہیں۔ ستون کی بناوٹ بھی الگ الگ سطح پر پائی گئی اور وہ الگ الگ دور کے ہیں۔ وہ مسجد کے بعد کے ہیں پہلے کے نہیں۔ یہی نہیں تین ٹھوس فرش بھی ملے ہیں، یہ بھی بالکل الگ الگ ہیں۔ ایک کے اوپر دوسرا اور دوسرے کے اوپر تیسرا بنایا گیا ہے۔ یہ بھی الگ الگ دور کے ہیں۔ ستونوں میں استعمال کی گئی اشیاء اور تکنیک عہد وسطیٰ کی ہے۔ لکھوٹی اینٹوں کے ٹکڑوں اور کچے پتھروں سے ستون تیار کیے گئے ہیں۔ ان ستونوں میں کسی بھی مضبوط اور بھاری بھر کم تعمیر کا بوجھ برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے، مندر جیسی بڑی تعمیر کا تو ہرگز نہیں۔ یہ الگ الگ موقعوں پر مختلف مقاصد کے تحت تعمیر کی گئی عارضی چیزیں ہیں۔ یہ عارضی ستون مسجد کے آگے مسافر خانہ یا دوسرے استعمال کے لیے

ضرورت پڑنے پر بنائے گئے ہوں گے۔ چونکہ وشو ہندو پریشد اور اس کی ساتھی تنظیموں کا خیال ہے کہ وہاں ستونوں والا مندر تھا، اسی خیال کو پختہ کرنے کے لیے اے ایس آئی ستونوں کی بناوٹ پر خاص زور دے رہی ہے۔

اے ایس آئی نے کھدائی کے کام میں جدید ترین تکنیک کا استعمال نہیں کیا ہے۔ کھدائی میں ملی ہڈیوں اور دوسری چیزوں کو اے ایس آئی درج نہیں کر رہی تھی۔ عدالت کے کہنے کے بعد جہاں تہاں من مانے انداز سے انہوں نے ریکارڈ کرنا شروع کیا۔ رپورٹ پیش کرنے سے پہلے جو چیزیں ملی تھیں، ان پر اچھی طرح غور ہونا چاہیے تھا۔ پائی گئی مختلف سطحوں میں فرق کو اجاگر نہیں کیا گیا ہے۔ چمک دار برتنوں کی موجودگی درج نہیں کی گئی ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اے ایس آئی نے نہ تو تکنیک کا استعمال کیا، نہ ہی رپورٹ کے سلسلے میں غور و خوض کیا۔ سروے کا کام ٹھیک سے نہیں ہوا۔ جب سروے کی ٹیم ہی اس میں فریق ہو تو سروے کی جانبداری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اے ایس آئی نے مخصوص سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے من گھڑت دعویٰ پیش کیا ہے، اس کے دلائل کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں ہے۔ □ □

# ایک غلط نظیر قائم ہوئی

از: پروفیسر ڈی این جھا (مؤرخ)

محکمہ آثار قدیمہ کے پاس زعفرانی دل ہے، دماغ تو خیر ہے ہی نہیں، اے ایس آئی کو وہاں مندر ہی تلاش کرنا تھا اس نے وہی کیا جو بھارتیہ جنتا پارٹی نے چاہا۔ اس کے لیے اس نے اپنی رپورٹ تیار کرنے میں کئی بے ضابطگیاں بھی کیں۔ ایسی کھدائی کی کوئی تاریخی اہمیت نہیں، جس کے نتائج پہلے سے معلوم ہوں۔ محکمہ آثارِ قدیمہ نے ثبوتوں کی بنیاد پر نتائج اخذ نہیں کیے، بلکہ نتائج کے مطابق ثبوتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ یہ ایک طرح کا آرکیالوجیکل فراڈ ہے۔ اے ایس آئی نے تین عبوری رپورٹیں پیش کیں۔ ان تینوں رپورٹوں میں کہیں بھی یہ اشارہ نہیں تھا کہ مندر کے باقیات ملے ہیں۔ اچانک چوتھی اور آخری رپورٹ میں مندر کے باقیات کہاں سے مل گئے؟ اے ایس آئی کی رپورٹ کی معتبریت مشکوک ہے۔ رپورٹ میں ستونوں کی بات کہی گئی ہے۔ دراصل اینٹ کے کچھ ٹکڑوں کو جوڑ کر انہیں ستونوں کی بنیاد بتایا جا رہا ہے۔

کھدائی کے کام میں 'سائٹ نوٹ بک' بنانے کا اہم کام تو ہوا ہی نہیں ہے۔ ہوا بھی ہے تو بہت سی چیزوں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق وہاں 50 ستونوں کی بنیادیں ملی ہیں۔ ان میں سے صرف 4 ستونوں کو بنیاد مان کر رپورٹ میں مندر کے باقیات کا نام دے دیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ صرف 4 ستونوں کی بنیاد پر مندر کے وجود کو کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مئی / 2003 میں یہ شکایت کی گئی تھی کہ بابری مسجد کے فرش کے ٹکڑوں کو ستون کی بنیاد کے طور پر اکٹھا کر کے فوٹو کھینچا جا رہا ہے۔

اے.ایس.آئی کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کے لیے یہی کافی ہے۔ جس 'توجو وکاس انٹرنیشنل' کو بنیاد مان کر عدالت نے کھدائی کا حکم دیا تھا اس کی معتبریت بھی مشکوک ہے۔ اے.ایس.آئی. بھی سرکاری ادارہ ہے، اس میں اتنی جرأت کہاں ہے کہ وہ یہ کہہ دے کہ وہاں مندر نہیں تھا۔ بنیادی طور پر اجودھیا کا مسئلہ ملکیت کے تنازع کا ہے۔ زمین کے جھگڑے کے لیے زمین کو کھودنا ضروری نہیں ہے۔ اس سے ایک غلط نظیر قائم ہوئی ہے۔ ☐ ☐

## پہلے یقین تھا اب ثبوت بھی مل گیا

از: ایم. وینکیا نائیڈو (صدر بی.جے.پی.)

ہندو فرقہ اپنے جذبات اور عقیدے کی وجہ سے اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کا پہلے سے ہی خواہاں تھا، لیکن اب محکمہ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ آنے سے یہ تاریخی ثبوت مل گیا ہے کہ وہاں بھگوان رام کا مندر موجود تھا۔ اس رپورٹ کی روشنی میں تمام تنظیموں کو مل بیٹھ کر مندر تعمیر کی راہ ہموار کرنی چاہیے۔ اگر عام رائے نہیں بنتی ہے تو مندر کی تعمیر کے لئے سارے راستے کھلے ہوئے ہیں۔

اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر صرف ہندوؤں کے عقیدے کا ہی موضوع نہیں ہے، بلکہ یہ ملک کے وقار کا سوال بن گیا ہے۔ بھگوان رام کسی مذہب یا فرقے کے نہیں، بلکہ سبھی کے ہیں۔ بیرونِ ملکوں میں بھی ان کی پوجا ہوتی ہے۔ کئی شہر ان سے منسوب ہیں۔

محکمہ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ کو قبول کر کے مسلم فرقے کو اجودھیا میں مندر کی تعمیر میں اپنا تعاون دینا چاہیے۔ رپورٹ سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ میر باقی نے فتح کی خوشی میں مندر کی جگہ ایک ڈھانچہ کھڑا کیا تھا۔ یہاں کوئی نماز بھی ادا نہیں کی جاتی تھی۔ پہلے یقین تھا، اب ثبوت سامنے آ گیا ہے۔

مسلم تنظیموں کو مندر تعمیر کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے۔ اگر سیاسی اسباب کی بنا پر رکاوٹ ڈالی جاتی ہے تو یہ ملک کے ساتھ ناانصافی ہوگی اور کروڑوں رام بھکتوں کے جذبات کی توہین ہوگی۔ بی۔جے۔پی۔ چاہتی ہے کہ مندر کی تعمیر عام رائے اور خوشگوار طریقے سے ہو۔ یہی خواہش ملک کے تمام لوگوں کی ہے۔ ہم تمام فرقوں کو مل جل کر رہنا ہے۔ ایک ساتھ ترقی کرنی ہے۔

آخر کب تک ایک ہی مسئلے پر لڑتے رہیں گے۔ میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ ووٹ بینک کی سیاست کرنے والوں کے بہکاوے میں نہ آئیں اور نئے سرے سے بات چیت کے ذریعے مندر تعمیر کی راہ تلاش کریں۔ سیاسی جماعتوں کو اس سے دور رہنا چاہئے، کیونکہ ان کی دخل اندازی کی وجہ سے ہی مندر کی تعمیر میں تاخیر ہو رہی ہے۔ اگر ثبوت ملنے کے بعد بھی خوشگوار ماحول میں مندر کی تعمیر نہ ہوئی تو پھر سے آندولن شروع ہوگا، جسے کوئی روک نہ سکے گا۔ □ □



# محکمہ آثارِ قدیمہ سے چند سوال

از: شمس طارق خان
(لکچرر شعبہ تاریخ چانکیہ آئی.اے.ایس اکیڈمی نئی دہلی)

اجودھیا میں بابری مسجد کی کھدائی اور اے.ایس.آئی. (A.S.I.) کی رپورٹ نے کئی سوال ایسے کھڑے کر دیئے ہیں جو نہ صرف عام انسان کو پریشان کر رہے ہیں بلکہ خود مورخ اور ماہرین آثارِ قدیمہ بھی محوِ حیران ہیں۔

سب سے پہلے تو مورخ اور ماہر آثارِ قدیمہ اس بات پر حیران ہیں کہ آخر ایک لاء سوٹ میں (ملکیت سے متعلق) بابری مسجد کے مقام کی کھدائی کی کیا ضرورت تھی اور کیا مستقبل میں ایسے کسی تنازع کا حل کھدائی کے بعد نکلے گا۔ کیا اس سے دعووں اور کاونٹر دعوؤں کا ایک نیا سلسلہ نہیں شروع ہو جائے گا۔ ہندوستان میں ایسے بے شمار مذہبی مقامات ہیں جس کی نوعیت پہلے کچھ اور تھی۔ بدھ اور جین مذہبی مقامات کی جگہ مندروں نے اور کئی مندروں کی جگہ مسجدوں نے لی ہے۔ لیکن یہ سب قدیم ہندوستان اور عہدِ وسطٰی کی بات ہے۔ کیا قدیم اور عہدِ وسطٰی کی غلطیوں کی آج اصلاح ممکن ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا بودھی درخت جسے ایک شیو بھکت نے ساتویں صدی میں کاٹ ڈالا تھا پھر سے وہی پیڑ لگایا جا سکتا ہے۔ جس کے نیچے بدھ کو گیان (نروان) حاصل ہوا تھا۔ کیا بدھ اور جین کے ہزاروں وہار، چیتیہ (Chaitya) وغیرہ کو پھر سے بنایا جا سکتا ہے جسے شیو اور وشنو کے بھکتوں نے توڑا تھا۔ اگر نہیں تو پھر عدالت کو اس قسم کے فیصلے کی کیا ضرورت پیش آئی جس سے تنازع کو ایک نئی شکل ملتی ہے۔ اگر ان کھدائیوں سے یہ ثابت بھی ہو جاتا ہے کہ وہاں پر ایک مندر تھا تو کیا اس بنا پر وہاں مندر بنانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس سے اصل مقدمے کی نوعیت پر حرف نہیں آئے گا یا بالفاظ دیگر مقدمے کی راہ سے ہم بھٹک نہیں جائیں گے؟

لیکن ان سب کمیوں کے باوجود جب عدالت نے کھدائی کا حکم جاری کیا تو لوگوں نے یہ سوچتے ہوئے اسے قبول کرنے کی حامی بھر لی کہ اگر اس سے تنازع کا حل ہو سکتا ہے تو کیوں نہیں اسے بھی آزما کر دیکھ لیا جائے۔ لیکن عدالت کے اس فیصلے سے اے.ایس.آئی. کو اپنی پروفیشنلزم کو ثابت کرنے کا ایک سنہری موقع ملا تھا۔ لیکن کھدائی کے بعد جس طرح اس نے غیر منصفانہ جانب

داری سے کام لیا اس سے اس کی 100 سالہ سنہری تاریخ داغدار ہوگئی۔ تاہم کچھ لوگ ابتداء ہی سے شورش میں مبتلا تھے اور شک کا اظہار کرنے لگے تھے کیونکہ مرکزی حکومت کا یہ شعبہ ایچ.آر.ڈی. منسٹری کے تحت آتا ہے۔ جس کے وزیر باتدبیر ہندتو کے علمبردار مرلی منوہر جوشی ہیں۔ لیکن چند راؤ جواے.ایس.آئی سے واقف تھے، انہیں کچھ امید ضرور تھی۔ لیکن ان کی امیدوں پر اُس وقت پانی پھر گیا جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اے.ایس.آئی نے کھدائی کچھ اس طرح شروع کی جو یا تو احمقانہ لگتی ہے یا شر انگیز۔

آرکیولوجیکل اسٹڈی میں یہ پڑھایا جاتا ہے کہ کسی ایسے مقام کی کھدائی نہیں کی جاسکتی جہاں زمین کے اوپر کوئی تاریخی عمارت یا اس کے آثار موجود ہوں، خواہ ان کے نیچے اس سے اہم تاریخی عمارت ہونے کا امکان ہی کیوں نہ ہو۔ اس لحاظ سے اجودھیا میں بابری مسجد کی حالیہ کھدائی سے بیش قیمتی ثبوت مٹ گئے۔ اتنا ہی نہیں کھدائی کے وقت دریافت مختلف اشیاء مثلاً برتن کے آثار کو عہد بہ عہد ریکارڈ نہیں کیا گیا۔ بلکہ تین چار الگ الگ عہد کے برتن ملا دیئے گئے۔ اس طرح 11 ویں صدی سے 19 ویں صدی کے برتن میں کون سا 11 ویں صدی کا ہے، کون سا 15 ویں اور 16 ویں صدی کا ہے اور کون 18 ویں صدی یا 19 ویں صدی کا اب ٹھیک اُس کی شناخت بھی مشکل ہے۔ ساتھ ہی کھدائی کے دوران ایک ایسے پتھر ملنے کی بات بھی کہی گئی ہے جو کسی مندر کے ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے واضح رہے کہ یہ وہی پتھر ہے جسے معروف مورخ عرفان حبیب نے مسجد کا ہی ایک حصہ بتایا تھا۔

دراصل اے.ایس.آئی. نے جان بوجھ کر مختلف عہد کے ثبوتوں کو گڈمڈ کر دیا ہے اور اس کی تعبیر (Interpetation) اس طرح کی ہے کہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکے کہ وہاں مسجد نہیں بلکہ ایک مندر تھا۔ حالانکہ پتھر پر جن علامات (Symbols) کے ملنے کی بات کی گئی ہے ان کا تعلق کسی بھی مذہب یا علاقائی کلچر سے ہوسکتا ہے۔ اس طرح اے.ایس.آئی. کی اپنی رپورٹ میں ایسا کچھ نہیں ہے جس سے وہاں پر کسی مندر کے ہونے کا ثبوت ملتا ہو۔ یہ تو صرف ان رپورٹ کی تعبیر (Interpretation) میں ایسا خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ کسی 11 ویں صدی کے مندر کا ہوسکتا ہے۔ یہ بھی واضح ہو کہ تاریخ میں بالخصوص آرکیولوجیکل اسٹڈیز کی بناء پر مختلف Interpretation کی گنجائش رہتی ہے۔

ہمارے ملک میں ہندتو کا احیاء چاہنے والوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ تاریخ سے زیادہ اپنی نام نہاد سنسکرتی کو ترجیح دیتے ہیں جس کے نتیجے میں تاریخ پس پشت ڈال دی جاتی ہے۔ ہندتو کے

علمبرداروں نے نصابی کتابوں میں بھی تاریخی حقائق کو مسخ کیا ہے جس سے بین المذاہب منافرت شدت اختیار کرتی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر NCERT کے گیارہویں کلاس کی تاریخ کی کتاب کا نیا ایڈیشن ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف مقام پر تقریباً 34 صفحات میں عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں مسلمان بادشاہوں پر مندر توڑنے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ اسی طرح قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سناتن دھرم کے نقطۂ نظر سے آریوں کی تہذیب کو قدیم بتایا گیا ہے جبکہ تاریخ ہڑپا تہذیب کو قدیم مانتی ہے۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قدیم ہندوستان آریوں کی تہذیب ہے۔ ہندوستان کی موجودہ آبادی دراصل آریہ ہے لیکن مسلمان اور عیسائی اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ وہ حملہ آور ہیں۔ اگر NCERT کی اس کتاب کے تاریخی بیان کو درست مان لیا جائے تو یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ آریہ مورتی پوجا نہیں کرتے تھے اور ان کی تہذیب میں گوشت کھانے کو اہم مقام حاصل تھا۔ اس کے برعکس آج کے ہندو مورتی پوجا کرتے ہیں اور گوشت نہیں کھاتے۔ اسی مسخ شدہ تاریخ کے مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ ہندتو کی علمبردار حکومت کا رشتہ اسرائیل سے مضبوط تر ہوتا جارہا ہے کیونکہ عالمی سطح پر مسلمانوں اور عیسائیوں کے مشترکہ دشمن یہودی ہی خیال کئے جاتے ہیں۔ اس طرح نصابی کتابوں میں یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اس ملک میں جتنے بھی مسلمان بادشاہ آئے وہ سبھی ایک جیسے تھے۔ انہوں نے یہاں اسلامی حکومت قائم کی اور ہندوؤں پر ظلم وستم روا رکھا۔ اس بات کو ایک عرصے سے Stereotype انداز میں اتنے شدومد کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے ملک کا عام ہندو سماج بھی اس خیال کا حامی بنتا جارہا ہے۔

اس صورت حال میں ہمارے ملک کی عدالت عالیہ یا دیگر شعبوں سے وابستہ افراد بھی ایسے فیصلے میں جس کا تعلق بالخصوص مسلمانوں سے ہوتا ہے، عام طور پر تعصب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا بابری مسجد کے مسئلے میں تاریخی طور پر حق ملکیت واضح ہونے پر بھی ہندتو کا علمبردار طبقہ ہٹ دھرمی پر تلا ہوا ہے اور مسئلہ خطرناک صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ لہٰذا بابری مسجد کھدائی کے سلسلے میں محکمہ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ کی بنا پر بابری مسجد کو عدالت میں مندر ثابت کرنا ٹیڑھی کھیر ہوگی۔ کیونکہ اصل مسئلہ عدالت میں اس کی ملکیت کا ہے۔ نہ کہ اس کا کہ وہاں مسجد تھی یا مندر۔ البتہ اس رپورٹ سے اتنا ضرور ثابت ہوگیا ہے کہ ہندوستان کے مختلف سیکولر خیال کئے جانے والے ادارے بھی تاریخ کو مسخ کر کے کس قدر فرقہ پرست اور اپنی بنیادی آئینی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوتے جارہے ہیں۔ □ □

# بابری مسجد کی کھدائی: عینی شاہد کی زبانی

## ماہنامہ ''ہدایت'' کے مدیر کے نام ایک خط

مخلصی و محبی مولانا محمد فضل الرحیم صاحب مجددی زیدت معالیکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بندہ بفضلہٖ تعالیٰ بعافیت ہے، خدا کرے آں جناب مع جملہ احباب بعافیت ہوں!

بعدہٗ: عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ آں جناب کی خدمت میں کوئی عریضہ ارسال کروں لیکن ادھر کئی ماہ سے مدرسہ کی مشغولیات کے علاوہ ''بابری مسجد، اجودھیا'' کھدائی کی نگرانی کی بھی مشغولیت بڑھ گئی تھی۔، روزانہ وہاں جاکر نگرانی کرنی پڑتی تھی اس وجہ سے کوئی عریضہ ارسال نہ کرسکا تھا۔ مؤرخہ ۷راگست سے کھدائی بند ہوگئی ہے، اب اس کی رپورٹ کی تیاری ہو رہی ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے مسجد کے نیچے مندر ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا بلکہ مسجد کے نیچے بھی ایک اور مسجد کی دیوار اور فرش ملی ہے، مسجد کے دائیں اور بائیں کئی قبریں بھی ملی ہیں۔ سرکاری ٹیم کے علاوہ ہم لوگوں نے اپنے طور سے ملک کے مختلف حصوں سے اس کام کے ماہر (آرکیالوجسٹ) جمع کیے تھے، وہ بھی ان کاموں کی نگرانی اور رپورٹنگ کا کام بڑے پیمانے پر کر رہے تھے تاکہ اگر سرکاری عملہ کوئی غلط رپورٹ پیش کرے تو بروقت ہم اپنے ماہرین کے توسط سے اسے چیلنج کرسکیں۔ ماہرین نے بڑی قربانیاں بھی دیں، لوگوں نے اپنی ملازمتوں سے چھٹیاں لے کر کئی کئی ماہ خرچ کیے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے احباب کا خصوصی تعاون رہا، کئی غیر مسلم ماہرین نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔

اس کے علاوہ ہر ہفتہ ہائی کورٹ کے وکلاء حضرات کی ایک ٹیم ظفریاب جیلانی ایڈووکیٹ کی سربراہی میں آتی رہی جو ہفتہ بھر کے کاموں کا انتہائی باریکی سے جائزہ لیتی تھی، غرضیکہ بڑی اہمیت کا حامل یہ کام بڑی جانفشانی سے پانچ ماہ میں مکمل ہوا۔

جہاں ایک طرف خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی خدمت کے لیے قبول فرمایا وہاں اس بات کا افسوس بھی ہے کہ میری نگاہوں کے سامنے اور میری موجودگی میں اللہ کے گھر کی ایک ایک

اینٹ اور اس کے فرش کا ایک ایک ٹکڑا کھود ڈالا اور مسجد کے تمام نشانات کو زمین کی گہرائیوں تک مٹا ڈالا۔ گویا جو کام کارسیوک نہ کر سکے تھے اُسے ہماری سرکار نے ہماری موجودگی میں اور ہماری نگاہوں کے سامنے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اس سارے منظر کو ہم نے اپنے سینے پر بے بسی کا پتھر رکھ کر خون کے آنسو روتے ہوئے دیکھتے رہے اور کچھ نہ کر سکے۔ اللہ ہمیں معاف فرمائیں۔

آں جناب سے درخواست ہے کہ دعاء فرماتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری بداعمالیوں کو معاف فرما کر اپنے مقدس گھر کو دوبارہ عطا فرمادیں اور اسے آباد کرنے کی توفیق سے ہمیں سرفراز فرمائے۔

فقط والسلام۔ خادم: حسب اللہ بادشاہ

مدرسہ احمدیہ حنفیہ، مغل پورہ، فیض آباد، یو. پی۔

(بشکریہ: ماہنامہ ہدایت، جے پور، شمارہ ستمبر 2003)



# اجودھیا رپورٹ پر ماہرین آثارِ قدیمہ کی رائے

محکمہ آثارِ قدیمہ حکومت بہار کے سابق ڈائریکٹر جناب سیتا رام رائے نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ اجودھیا کے متنازعہ مقام پر کسی قدیم ہندو مندر کی موجودگی کا کوئی ثبوت ابھی تک نہیں ملا ہے۔ اس سلسلے میں محکمہ آثارِ قدیمہ حکومت ہند نے الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ کو جو رپورٹ پیش کی ہے وہ مبہم بھی ہے اور تضادات سے بھی پُر ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ سیاسی دباؤ کے تحت یہ رپورٹ مرتب کی گئی ہے۔ لکھنؤ بنچ نے رام جنم بھومی بابری مسجد تنازعہ کے سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے جناب سیتا رام رائے کو بھی طلب کیا تھا۔ اجودھیا میں کھدائی کے دوران وہ بھی موجود تھے اور ان کا قیام تقریباً 15 دنوں تک رہا۔

انہوں نے مرکزی محکمہ آثارِ قدیمہ پر الزام لگایا کہ اس نے کھدائی کے دوران صحن کو کچھ اس طرح سے تراشا ہے کہ ستون کی شکل بن گئی ہے اور اسی بناء پر اب ▪▪ دعوی کر رہا ہے کہ اب یہ ستون کسی مندر کے ہیں۔ محکمہ کی رپورٹ جو گذشتہ سوموار کو جاری کی گئی ہے اس کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ رپورٹ لکھی ہے ان کے دلوں میں بھگوا ٹولی کے لئے نرم گوشے موجود ہیں۔

جناب سیتارا رام رائے کے علاوہ ایک دوسرے مشہور ماہر آثارِ قدیمہ پروفیسر سورج بھان، الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ آثارِ قدیمہ کے سابق صدر پروفیسر ڈی. منڈل، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کی سابق صدر پروفیسر شیریں رتنا کرنے بھی جناب سیتارام رائے کے اس نقطۂ نظر سے کامل اتفاق کیا ہے۔ جناب رائے کی طرح پروفیسر سورج منڈل بھی بہار کے ہی رہنے والے ہیں۔ جناب رائے نے اس بات پر زور دے کر کہا ہے کہ 1528ء میں بابری مسجد کی تعمیر سے قبل اس جگہ پر کوئی عمارت سرے سے موجود نہیں تھی لہٰذا کسی عمارت کے انہدام کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان چاروں ماہرین آثارِ قدیمہ نے یہ بھی کہا ہے کہ مرکزی محکمہ نے اجودھیا میں کھدائی کا جو طریقہ اپنایا تھا وہ بھی غلط تھا، ہمیں اس بات کا پورا یقین ہے کہ اجودھیا کے مذکورہ مقام پر کبھی کوئی مندر نہیں تھا۔ انہوں نے بتایا کہ 13 ویں صدی عیسوی اور اس کے بعد سے لے کر مسلمانوں کے دور حکومت تک اس پورے علاقے میں مسلمانوں کے تعلق سے بے شمار آثار اور باقیات آج بھی موجود ہیں۔

اس علاقے میں ٹوٹی ہوئی اینٹیں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس پورے علاقے میں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی آبادی موجود تھی۔ (ٹائمس آف انڈیا، پٹنہ 2003)

ترجمانی: سید عبدالرافع



# محکمہ آثارِ قدیمہ نے اپنی 140 سالہ ساکھ مٹی میں ملا دی

از: سید عرفان احمد

محکمہ آثارِ قدیمہ نے بابری مسجد کے قریب کھدائی کے سلسلے میں جو رپورٹ عدالت میں داخل کی ہے وہ توڑ مروڑ کر پیش کی گئی ہے اور بد نیتی پر مبنی ہے۔ یہ اعتراض آج یہاں ہائی کورٹ میں سنی سنٹرل وقف بورڈ اور حاجی محبوب نے اپنے الگ الگ بیان میں کہا ہے جبکہ نرموہی اکھاڑے نے اے.ایس.آئی. کی رپورٹ کو 99.9 فیصد درست قرار دیا ہے۔ ان اعتراضات پر غور کرنے کے لیے خصوصی سہ رکنی بنچ کا آئندہ 10/اکتوبر کو اجلاس ہوگا۔ فریقین کو اعتراض داخل کرنے کے لیے ابھی کل 9/اکتوبر تک کا وقت ہے جس میں جمعیۃ علماء ہند اور دیگر مسلم فریقوں کے ساتھ فریق مخالف کی جانب سے بھی 9/اکتوبر کو اعتراض داخل کیے جائیں گے۔ سنی سنٹرل وقف بورڈ کی جانب سے ظفریاب جیلانی نے 42 صفحات پر مشتمل اعتراض میں کہا کہ اگرچہ ابھی تک محکمہ آثارِ قدیمہ 1889 سے 1965 تک اپنی مختلف رپورٹوں اور پبلیکیشن میں اس مقام کو بابری مسجد کہتا آ رہا ہے لیکن عدالت میں داخل کردہ موجودہ رپورٹ میں اس مقام کو متنازعہ عمارت کہا بابری مسجد نہیں جس سے اس مقام کو مندر ثابت کرنا ناممکن ہوگا۔ اس اعتراض میں کہا گیا ہے کہ اے.ایس.آئی کا دعویٰ ہے کہ متنازعہ مقام پر دسویں صدی سے آبادی ملتی ہے جو غلط ہے۔ کیوں کہ ماہرین اس بات پر متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ اس مقام پر چھٹی صدی سے لے 12 ویں صدی تک آبادی کے آثار ہی نہیں ملتے ہیں اور اس کے بعد 13 ویں صدی میں یہاں پر ایسے لوگوں کی آبادی شروع ہوئی جو لوگ چمکیلے برتن کا استعمال کرتے تھے اور گوشت کھا کر ہڈیاں پھینک دیتے تھے۔ اس طرح اے.ایس.آئی. کا رپورٹ میں یہ کہنا کہ وہاں 11 ویں صدی کا مندر تھا جو بے بنیاد ہے اور اے.ایس.آئی کا یہ کہنا کہ وہاں 50 ستونوں کی بنیاد ملی ہے گمراہ کن اور بے بنیاد ہے۔ اس سلسلے میں اے.ایس.آئی. کی رپورٹ میں بھی ستونوں کی دوریوں اور ستونوں کی سطح کی نشاندہی کی ہے۔ اس رپورٹ کے ہی مطابق یہ ستون ایک ہی وقت میں تعمیر نہیں ہوئے بلکہ مختلف وقتوں میں تعمیر کیے گئے اور ان ستونوں کی بنیاد پر بڑی عمارت کی تعمیر ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس طرح ان ستونوں پر پھر کس طرح مندر تعمیر ہوسکتا ہے۔

سنی وقف بورڈ نے ان تمام اعتراضات کے بعد عدالت سے مزید اعتراض داخل کرنے کے

لیے وقت مانگا ہے۔ جیلانی کا کہنا ہے کہ اے.ایس.آئی. کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اے.ایس.آئی. نے بی.جے.پی. کی مرکزی حکومت کے دباؤ میں یہ رپورٹ لکھی۔ انہوں نے اپنے اعتراض میں کہا کہ جب بابری مسجد کے باہر صحن میں رام چبوترے کو رپورٹ میں برابر رام چبوترا لکھا گیا تو اے.ایس.آئی. کی اس بات پر بھی سخت اعتراض کیا گیا کہ ایک غیر معتبر کتاب ''کیونا ایسٹ'' کے حوالے سے یہ لکھا گیا کہ رام چبوترا کے نیچے 5x5 کا قدیم چبوترا تھا جب کہ یہ کتاب جس سیاح کے حوالے سے لکھی گئی اس کی اصل کتاب تو لیٹن زبان میں تھی اور اس کا ترجمہ فرانسیسی میں ہوا تھا ان دونوں کتابوں کو دیکھے بغیر اس چبوترے کو قدیم ہونے کی بات لکھ دی۔

وقف بورڈ نے اے.ایس.آئی. کی رپورٹ میں ایک پتھر کو دیوی دیوتا کا جوڑا بتانے کی بات کو بے بنیاد کہتے ہوئے کہا کہ مبینہ پتھر میں جسم کے اوپر کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا ہے پھر کس طرح اے.ایس.آئی. نے اس کو دیوی دیوتا کا جوڑا قرار دیا۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ محکمہ آثارِ قدیمہ نے غلط بیانی کا سہارا لے کر اس مقام کو مندر ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ جیلانی نے اپنے اعتراض میں اس بات پر زور دیا کہ آثارِ قدیمہ سے متعلق ایک اہم ثبوت ہڈیوں کا دستیاب ہونا تھا جس کو جان بوجھ کر اے.ایس.آئی. نے نظر انداز کیا۔ انہوں نے کہا کہ متنازعہ مقام سے ہڈیوں سے متعلق پائے جانے کے بارے میں پوری طرح نظر انداز کیا، رپورٹ میں جس مقام سے جانوروں کی ہڈیاں ملیں گی ویڈیو اور دوسرے دستاویزی ثبوت کو دیکھ کر ہی ایڈیشنل کمشنر اعتراض کر پائے کیوں کہ ابھی ان ویڈیو اور دستاویزی ثبوت کا مکمل معائنہ نہیں ہو سکا ہے۔ سنی وقف بورڈ نے عدالت سے استدعا کی کہ آثارِ قدیمہ کی اس رپوزٹ کو مسترد کر دیا جائے۔ اس مقدمہ کے مدعی حاجی محبوب کے وکیل سید عرفان احمد نے سنی وقف بورڈ کے اعتراض کو اپناتے ہوئے مزید کہا کہ محکمہ آثارِ قدیمہ نے اس رپورٹ کے ذریعہ اپنی 140 برس کی ساکھ کو مٹی میں ملا دیا ہے کیونکہ یہ پوری رپورٹ سنگھ پریوار کی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، 10/اکتوبر 2003)



# اے.ایس.آئی. رپورٹ کی روشنی میں اجودھیا تنازعہ

از: سید عبدالرافع

اجودھیا میں متنازعہ مقام پر محکمہ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں کی گئی کھدائی پر مبنی رپورٹ نے مسئلہ تو ایک بھی حل نہیں کیا البتہ اس کی وجہ سے متعدد نئے سوالات ضرور کھڑے ہو گئے ہیں۔ اور یہ سوالات ایسے ہیں جن پر قانونی، علمی، تاریخی حلقوں کے علاوہ ماہرین آثارِ قدیمہ کے حلقے میں بھی مدتوں بحث چلے گی۔ بابری مسجد کے نیچے 12 ویں صدی کے کسی مندر کے وجود کے علمبردار، محکمہ کی رپورٹ سے بہت خوش، مطمئن، شاداں اور فرحاں نظر آتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ وہ جو دعویٰ اب تک کرتے آرہے تھے وہ بالآخر صحیح نکلا۔ لیکن اس دعوے کی نفی کرنے والوں میں بھی ملک کے بعض ممتاز اور معتبر مورخ اور ماہرین آثارِ قدیمہ کے علاوہ برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کے شعبہ آثارِ قدیمہ کے استاد پروفیسر دلیپ کمار چکرورتی بھی ہیں۔ ان ماہرین نے محکمہ کی رپورٹ کی معنویت، غیر جانبداری اور معقولیت پر سوال کھڑے کر دیئے ہیں۔ اس رپورٹ میں جو 500 سے زائد صفحات پر مشتمل ہے یہ کہا گیا ہے کہ کھدائی کے دوران جو باقیات برآمد ہوئی ہیں وہ شمالی ہند کے مندروں کی امتیازی خصوصیات کی حامل ہیں اور اس دعوے کو زیادہ سے زیادہ مدلل کرنے کے لیے ان باقیات کا تعلق 12 ویں صدی کے ہندو مندروں سے جوڑ دیا گیا ہے، اور اس سلسلے میں سارناتھ کے مندروں کی مثال دی گئی ہے۔ اس مندر کا نام دھرم چک راجی ناتھ ہے۔ جسے قنوج کے راجا گوبند چندر کی بودھ رانی کمارا دیوی نے 12 ویں صدی میں وہاں تعمیر کرایا تھا۔ یہ بات محکمہ آثارِ قدیمہ کی اس رپورٹ میں درج ہے جو 1921ء میں مرتب کی گئی تھی لیکن اس میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ دھرم چکراجینا ویہار کوئی ہندو مندر نہیں تھا بلکہ اس کے باقیات کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عمارت ایک بودھ خانقاہ تھی (انجلی مودی، ہندو 27/اگست 2003) ویسے بھی ویہار کا لفظ بودھوں کے یہاں ہی استعمال ہوتا ہے۔ اور چھٹی صدی قبل مسیح اس کی حیثیت ایک آشرم یا سرائے کی ہوتی تھی لیکن محکمہ آثارِ قدیمہ حکومت ہند کے پہلے ہندوستانی ڈائرکٹر جنرل دیارام ساہنی نے اس رپورٹ پر نظر ثانی کرتے ہوئے 1930ء میں اسے بدل دیا اور ویہار کی جگہ ہندو مندر لکھ دیا۔ یہ ان کی تعبیر تھی اُس مرتب کی نہیں جس نے 1921ء میں وہ رپورٹ لکھی تھی۔ بہرکیف محکمہ آثارِ قدیمہ نے گزشتہ ماہ جو رپورٹ الہ

آباد ہائی کورٹ کو پیش کی ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں باوجود اس کے کہ اس میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ کھدائی کے نتیجے میں جو باقیات برآمد ہوئی ہیں وہ ان مندروں سے مشابہ ہیں جو شمالی ہند کے مندروں میں آج بھی دیکھی جاتی ہیں تو اس سے کہیں زیادہ اہم انکشاف ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ کھدائی جس جگہ کی گئی ہے اس کی تاریخ 1300 قبل مسیح کی معلوم ہوتی ہے اگر یہ بات ثابت کی جا سکی تو اس علاقے کی قدیم تاریخ کو سمجھنے میں اس سے بہت مدد ملے گی۔

دوسری طرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر عرفان حبیب کا کہنا ہے کہ اجودھیا میں متنازعہ مقام پر کسی مندر کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی رپورٹ میں الٹ پھیر کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ کھدائی کے دوران جانوروں کی جو ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں وہ اس بات کا فیصلہ کن ثبوت ہیں کہ اس مقام پر پہلے کوئی مندر موجود نہیں تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ رپورٹ میں جانوروں کی ہڈیوں کا پہلے تو کوئی ذکر نہیں کیا گیا حالانکہ آثار قدیمہ سے متعلق ضابطوں اور روایات کا تقاضا یہ تھا کہ برآمد ہونے والی ایک ایک چیز ریکارڈ میں لائی جاتی اور اسے محفوظ بھی رکھا جاتا۔ جب ہائی کورٹ کو اس جانب متوجہ کیا گیا تو اس کی ہدایت خاص پر ایک جگہ ان ہڈیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پروفیسر حبیب نے یہ بھی کہا ہے کہ محکمہ کی رپورٹ میں وقت کے تعلق سے بھی جعل سازی کی گئی ہے۔ رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ کھدائی سے جو چیزیں برآمد ہوئیں ہیں وہ 12 ویں صدی سے تعلق رکھتی ہیں مگر اس کے لئے اس نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے بقول پروفیسر عرفان حبیب بابری مسجد پہلے سیاسی توڑ پھوڑ کا شکار ہوئی اب دوسری بار وہ محکمہ آثار قدیمہ کی توڑ پھوڑ کا شکار ہوئی ہے۔

دوسری طرف پروفیسر سورج بھان کا بھی ایک بیان آیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ محکمہ آثار قدیمہ 9 ویں صدی عیسوی اور 12 ویں صدی عیسوی کی درمیانی مدت میں کسی عظیم الشان مندر کے وجود کو ثابت کرنے میں قطعی ناکام رہا ہے بلکہ اس کے برعکس اس نے جو باقیات برآمد کی ہیں ان کو دیکھنے سے یہی معلوم پڑتا ہے کہ وہ کسی قدیم مسجد کا ہی حصہ ہیں۔ رپورٹ میں جن بڑے بڑے ہال کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی بابری مسجد کی عمارت کا ہی حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ مزید برآں بڑے ستونوں کی جو بنیاد ملی ہیں وہ بھی کسی مندر کا حصہ نہیں لگتیں کیوں کہ ان سب کا تعلق مختلف ادوار سے ہے۔ دو چار منقش پتھر ضرور ملے ہیں جن کے بارے میں رپورٹ میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ 11 ویں صدی یا

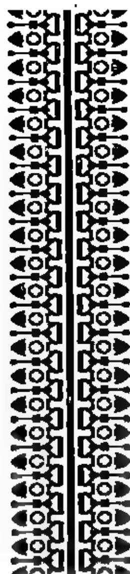
12 ویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کے بارے میں کلکتہ یونیورسٹی کے ایک ماہر اشوک دت کا کہنا ہے کہ وہ 19 ویں صدی یا 20 ویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذکورہ رپورٹ کا تجزیہ کرنے کے بعد پروفیسر سورج بھان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ رپورٹ ناقص اور غیر اطمینان بخش ہے اور ایسا لگتا ہے کہ ایک خاص اور مطلوبہ مقصد کے تحت اسے لکھا گیا ہے۔ رپورٹ میں جو تضادات ہیں وہ اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ پروفیسر نین جوت لاہری کو پروفیسر بھان کے اس نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں ہے گرچہ وہ محکمہ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ کو درست قرار دیتی ہیں مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ اس رپورٹ کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ 6 دسمبر 1992ء کو اجودھیا میں جو کچھ بھی ہوا وہ ہندوستان جیسے سیکولر ملک کے لئے درست تھا۔

اجودھیا کھدائی کے سلسلے میں پروفیسر دلیپ کمار چکرورتی اپنے ایک مضمون (ہندوستان ٹائمز پٹنہ 29 اگست 2003) میں لکھتے ہیں کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں آثارِ قدیمہ کی دریافت کے تعلق سے جو کھدائیاں ہوئی ہیں ان کی صرف 15% رپورٹ ہی شائع ہوئی ہے لیکن یہ پہلا موقع ہے کہ پانچ ماہ تک عدالتی نگرانی میں کی گئی اجودھیا کھدائی کی رپورٹ اب انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ اس طرح سے ایک اہم اور قدیم شہر کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بہت کچھ معلوم ہو سکے گا۔ بہر کیف اہم بات یہ ہے کہ برآمد ہونے والے آثارِ قدیمہ کی نوعیت کیا ہے اور ماہرین نے کس طرح کے نتائج اخذ کئے ہیں اجودھیا سے متعلق برہمنی ادبی روایات فی الحقیقت دیومالائی کہانیاں ہی ہیں جن کو آثارِ قدیمہ کے ذریعہ ثابت کرنا قطعی ناممکن ہے البتہ بودھ روایات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بودھ نے اس علاقے میں اپنا کچھ وقت ضرور گزارا تھا اور آثارِ قدیمہ سے بھی یہ بات ثابت ہے اس کے علاوہ یہ علاقہ جین، تیرتھنکروں کی آماجگاہ بھی رہ چکا ہے۔

غرض یہ کہ کھدائی کے بعد بھگوا ٹولی کے لئے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ متنازعہ مقام پر پہلے کوئی مندر تھا البتہ اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ جیسا پروفیسر چکرورتی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے لے کر 9 ویں صدی تک اجودھیا میں کھنڈرات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ البتہ 12 ویں صدی عیسوی میں قطب الدین ایبک نے اس پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور اسے اودھ کا مرکزی مقام بنایا۔ پھر اکبر کے دورِ حکومت میں یہاں ایک ٹکسال بنایا گیا۔ 18 ویں صدی میں یہ شہر نوابان اودھ کے قبضے میں آیا۔ 1856ء میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس

کے ساتھ ہی شروع ہوا 'اجودھیا کا تنازعہ' اور جب ملک آزاد ہوا تو سنگھ پریوار نے اس پر سیاست شروع کردی مقصد تھا اقتدار پر قبضہ کرنا۔ (ہفت وار جریدہ 'نقیب'، پھلواری شریف پٹنہ، 8/ستمبر 2003)








# رائے بریلی عدالت کا فیصلہ اور اس کے مضمرات







فاضل عدالت نے مواد اور ثبوت و دستاویز کو Misread کیا ھے۔ سپریم کورٹ کی نظیر کو غیر قانونی طور پر بنیاد بنایا ھے۔ یہ نظیر کسی طور پر موجودہ مقدمہ پر لاگو نہیں کی جا سکتی ھے۔ نظیر میں مذکورہ حالات و واقعات رائے بریلی کی عدالت میں زیر سماعت مقدمہ سے بالکل متضاد ہیں۔ اس لئے مسٹر اڈوانی کو بری کیا جانا صریحاً غیر قانونی، غیر دستوری عمل ھے اور فاضل جج کا فیصلہ ساقط کئے جانے کے لائق ھے۔

وصی احمد نعمانی

ایڈووکیٹ، سپریم کورٹ آف انڈیا۔

# میں خوش ہوں

حرف بہ حرف

ایل. کے. اڈوانی (نائب وزیراعظم)

① ''یقیناً اس فیصلے سے مجھے بے حد راحت پہنچی ہے۔ میری یہ خوشی اور یہ راحت دوبالا ہو جاتی اگر میرے دوسرے ساتھی بھی بری ہو گئے ہو گئے ہوتے، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ میرے پاس یہ سمجھنے کے لیے کہ آخر ایسا کیوں کر ہوا کوئی بنیاد نہیں ہے۔ میں اس کا تجزیہ نہیں کر سکتا کہ میرے باقی ساتھی کیوں بری نہ ہو سکے، تاہم میرے لیے یہ دکھ اور افسوس کی بات ہے۔ پہلے یہ ایک سازش کا معاملہ تھا، جس میں A یا B ملزم کے درمیان تمیز ہو سکتی تھی، مگر اب الزامات اشتعال انگیز تقریروں اور انہدام پر اکسانے کے ہیں۔ فیصلہ آنے کے بعد میں نے جوشی جی سے کہا تھا کہ وہ استعفیٰ واپس لے لیں۔ بہرحال اب وکلاء اس فیصلہ کا مطالعہ کر کے ہمیں بتائیں گے کہ آئندہ کے لیے کیا لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ اپوزیشن نے مجھے اجودھیا تحریک پر بدنام کرنے کی منظم کوشش کی۔ انہوں نے تحریک کو فرقہ وارانہ تحریک قرار دیا۔ اجودھیا تحریک کو عوامی حمایت اس لیے حاصل ہوئی کہ ہم ملک کے عوام کو یہ پیغام پہنچانے میں کامیاب رہے کہ ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے اور ہمارا آئین مذہب وعقائد سے قطع نظر سب کو یکساں درجہ دیتا ہے۔ لیکن ووٹ بنک کی گندی سیاست کی خاطر سیکولرازم کی غلط شبیہ پیش کی جا رہی ہے۔ لوگوں نے رام مندر تحریک میں اس لیے حصہ لیا کہ انہوں نے محسوس کیا کہ رام مندر اسی مقام پر بننا چاہئے جو رام کی جائے پیدائش تصوّر کی جاتی ہے''۔□ □

② ''بابری مسجد مسماری کے مقدمہ میں میرے خلاف الزامات طے کرنے سے متعلق رائے بریلی کی عدالت کے فیصلہ کو میں چیلنج کروں گا۔ یہ ایک جھوٹا مقدمہ ہے۔ میرے اور دیگر 6 لوگوں کے خلاف 10 ر اکتوبر کو الزامات طے کیے جائیں گے لہٰذا اس سے قبل ہی میں الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں جاؤں گا۔ اس معاملہ میں وشو ہندو پریشد کے لیڈر وشنو ہری ڈالمیا سے میری بات ہوئی ہے، لیکن ہم کوئی مشترکہ اپیل دائر نہیں کریں گے۔ رائے بریلی کی عدالت نے جب میرے خلاف الزامات طے کرنے کا فیصلہ کیا تو میں نے فوراً وزیراعظم کو اپنا استعفیٰ

بھیج دیا۔ سیاست میں اخلاقیات پر بھی زور دینے کی بے حد ضرورت ہے۔''

مرلی منوہر جوشی (مرکزی وزیر ترقی انسانی وسائل)

③ ''ہم اجودھیا کے مسئلہ پر تشدد نہیں چاہتے، عدالت کے فیصلہ کا مندر کی تحریک پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ ہمارا یقین ہے کہ مندر ہر حال میں تعمیر ہوگا، چاہے اس کے لیے کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ حکومت اس مسئلہ پر سنجیدہ نہیں ہے۔ واجپئی حکومت چاہتی تو ایک قانون بنا کر مندر تعمیر کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں دور کر سکتی تھی مگر اب 17 ر اکتوبر کو ہم 5 لاکھ کارسیوکوں کو جمع کر کے 6 ر دسمبر دوہرائیں گے۔'' اشوک سنگھل (کارگزار صدر وی. ایچ. پی.)

④ ''میں رام مندر کی تعمیر کے لیے کوئی بھی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ رام مندر کی تعمیر ہمارے لیے موت اور زندگی کا سوال ہے، اس کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ عدالت مجھے کوئی بھی سزا دے میں بھگتنے کو تیار ہوں''۔ اوما بھارتی (بی۔ جے۔ پی۔)

⑤ ''مجھے اس فیصلہ کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر وہ مجھے پھانسی پر بھی چڑھا دیں تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا کہ مجھے بھگوان رام کی سیوا کا موقع ملا۔ بی۔ جے۔ پی۔ رام جنم بھومی تحریک کی بیساکھیوں پر مرکز میں برسر اقتدار ہے۔ اسے اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کے لیے قانون پاس کرنا چاہئے۔ سرکار کی یہ دلیل بے کار ہے کہ اس کے پاس خاطر خواہ اکثریت نہیں ہے۔''

اچاریہ گری راج کشور (وشو ہندو پریشد)

⑥ ''مجھے یقین ہے کہ رائے بریلی کی عدالت کا 19 ر ستمبر 2003 کا فیصلہ ہائی کورٹ سے رد ہو جائے گا جس میں بابری مسجد کی شہادت کے سلسلے میں میرے ساتھ ساتھ 6 دیگر لوگوں کے خلاف الزامات طے کرنے کی اجازت دی گئی ہے، تاہم مرکزی حکومت کو پہلے ہی مقدمہ واپس لے لینا چاہئے تھا، کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ ایک سیاسی واقعہ تھا۔ دراصل مرکزی حکومت میں ہمت و حوصلہ کا زبردست فقدان ہے۔ ہمارے خلاف یہ صرف سیاست کی کارفرمائی کے نتیجے میں کیا گیا ہے۔ کانگریسی دور حکومت میں سنجے گاندھی اور فرنانڈیز کے خلاف ایسے مقدمات واپس لیے گئے ہیں۔ اس نظیر کو سامنے رکھ کر بی۔ جے۔ پی۔ کی زیر قیادت سرکار کو بھی ایسا کرنا چاہئے تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔'' وشنو ہری ڈالمیا (وشو ہندو پریشد)

⑦ ''بابری مسجد انہدام کیس میں میرے خلاف الزامات طے کرنے سے متعلق رائے بریلی عدالت کے فیصلہ کا میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس فیصلے سے رام مندر کی تعمیر میں میرا تعاون ثابت ہوتا ہے جو میرے لیے باعث فخر ہے۔ رام مندر اجودھیا میں ہی تعمیر ہونا چاہیے اور اس کے لیے ہم ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ مندر رام جنم بھومی پر ہی تعمیر کی جائے گی۔ اگر رام مندر اجودھیا میں نہیں بن سکتا جہاں بھگوان رام پیدا ہوئے تھے تو کیا یہ مندر مکہ یا مدینہ میں بنایا جائے گا۔ ہمارے وکلاء عدالت میں رام مندر کی تعمیر کے لیے قانونی لڑائی لڑیں گے اور بی۔جے۔پی۔ ورکر مندر تعمیر کے حق میں ماحول پیدا کرنے کے لیے کام کریں گے۔''

ونئے کٹیار (صدر بی۔جے۔پی۔یو۔پی۔ یونٹ)



اداریہ: راشٹریہ سہارا

# بابری مسجد انہدام اور خصوصی عدالت کا فیصلہ

بابری مسجد انہدام معاملہ کی سماعت کے لیے تشکیل شدہ رائے بریلی کی خصوصی عدالت کے ذریعہ نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی کو الزامات سے بری کر دیئے جانے اور باقی 7 ملزمان کے خلاف الزامات طے کئے جانے کے فیصلے نے سی. بی. آئی. جیسے خفیہ ایجنسی کے اعتبار پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ ظاہر ہے عدالت فائل پر موجود ابتدائی شہادتوں یا ثبوتوں سے بندھی ہوئی ہے اور ابھی تک عدالت کے فیصلے کی تفصیلات بھی سامنے نہیں آئی ہیں۔ لیکن جس طرح سے اس معاملہ کے 8 ملزمان میں سے ایک اور اہم ترین ملزم لال کرشن اڈوانی کو شک کی بنیاد پر عدالت نے الزامات سے بری کیا ہے اس سے کم از کم یہ بات تو واضح ہو ہی جاتی ہے کہ سی. بی. آئی. نے اس معاملہ میں کچھ ایسی خامیوں اور کوتاہیوں کو راہ دے دی جو مسٹر اڈوانی کے الزامات سے بری ہونے کا سبب بن گئیں۔

دراصل مسجد انہدام سے متعلق قانونی کارروائیاں روزِ اوّل سے ہی تنازعات کی شکار رہی ہیں۔ 6/دسمبر 1992 کو مسجد انہدام کے بعد اس معاملہ میں دو الگ الگ ایف. آئی. آر. درج کرائی گئی تھیں۔ ان میں ایک ایف. آئی. آر. میں عام کارسیوکوں کو ملزم بنایا گیا تھا جبکہ دوسری ایف. آئی. آر میں لال کرشن اوڈانی، مرلی منوہر جوشی سمیت وی. ایچ. پی. کے کئی لیڈر بھی شامل تھے۔ آخر الذکر ایف. آئی. آر. کی بنیاد پر ہی 27/فروری 1993 کو سی. بی. آئی. نے اڈوانی سمیت دیگر ملزمان کے خلاف للت پور کی خصوصی عدالت میں چارج شیٹ داخل کی۔ 8/جولائی 1993 کو یہ معاملہ رائے بریلی میں خصوصی عدالت تشکیل دے کر وہاں منتقل کر دیا گیا اور اگلے ہی ماہ یعنی 25/اگست 1993 کو آگے کی جانچ کے لئے یہ معاملہ سی. بی. آئی. کو سونپ دیا گیا لیکن بعد میں جب لکھنؤ میں بھی خصوصی سی. بی. آئی. عدالت کی تشکیل ہوئی تو سی. بی. آئی. نے دونوں ایف. آئی. آر. کے 49 ملزمان کے خلاف ایک مشترکہ چاج شیٹ داخل کی۔ لیکن بعد میں 29/نومبر 2002 کو دیئے گئے سپریم کورٹ کے ایک حکم کے بعد مذکورہ 8 ملزمان کے خلاف معاملہ پھر رائے بریلی میں سی. بی. آئی. کی خصوصی عدالت میں بھیج دیا گیا۔ اسی سال 3/ستمبر 2003 کو مذکورہ عدالت نے اڈوانی سمیت 8 ملزمان کے خلاف الزامات طے کرانے کے فیصلے کو محفوظ کر لیا تھا۔ جسے 19/ستمبر 2003 کو سناتے ہوئے عدالت

نے نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی کو ان الزامات سے بری کر دیا جبکہ باقی 7 ملزمان کے خلاف الزامات طے کرنے کے لئے 10 / اکتوبر کی تاریخ مقرر کی۔

130 صفحات پر مشتمل اپنے فیصلے میں خصوصی عدالت نے مسٹر اڈوانی کو تعزیرات ہند کی دفعہ 147, 149, 153A, 153B اور 505 کے تحت لگائے الزامات سے بری کر دیا۔ اڈوانی کو بری کرنے کا فیصلہ شک کا فائدہ دیتے ہوئے کیا گیا ہے اور اس میں عدالت نے یونین بینک آف انڈیا بنام پرفل کمار وغیرہ 1979 اور بہار اسٹیٹ بنام رمیش سنگھ 1927 و چند دیگر مقدمات کو بنیاد بنایا ہے۔

بہر حال خصوصی عدالت کے مذکورہ فیصلہ نے کئی اہم سوال کھڑے کر دیئے ہیں اور ایک مرتبہ پھر اس ایشو پر مرکز و اتر پردیش کی سیاست کے بازار میں گرمی آنے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

اوّل تو اس فیصلے نے سی.بی.آئی. کی کارکردگی و غیر جانبداری کو مشکوک بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے جب تقریباً یکساں حالات میں 8 افراد کے خلاف فرد جرم داخل کی جائے اور معاملے کے اہم ترین مانے جانے والے ملزم کو الزامات سے بری کر دیا جائے تو سی.بی.آئی. کی طرف سے اس سلسلہ میں کی گئی کوششیں شک کے دائرے میں آجاتی ہیں خصوصاً اس لیے بھی کہ اڈوانی ملک کے نائب وزیر اعظم ہیں اور سی.بی.آئی. ان کے ماتحت ہے۔ ان حالات میں سی.بی.آئی. یا اڈوانی اپنی صفائی میں کچھ بھی کہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ راست نہ سہی لیکن بالواسطہ سی.بی.آئی. پر پڑنے والے نفسیاتی یا ذہنی دباؤ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

عدالت کے اس فیصلہ نے بھاجپا کے داخلی اختلافات کو بھی واضح کر دیا ہے۔ فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے عدالت کا فیصلہ آنے سے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ اگر عدالت کا فیصلہ ان کے خلاف آتا ہے تو وہ اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیں گے۔ سیاسی مبصرین جوشی کے اس فیصلے کو اڈوانی پر دباؤ ڈالنے والا بتا رہے تھے اور اب فیصلہ آنے کے بعد وزیر اعظم اور بھاجپا صدر وینکیا نائیڈو کے دباؤ کے باوجود جوشی کا استعفیٰ واپس نہ لینا اس بات کا ثبوت ہے کہ بھاجپا میں اعلیٰ سطح پر داخلی چپقلش جاری ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک طرف اڈوانی خود کو بری کر دیئے جانے پر خوش ہیں تو دوسری طرف ونئے کٹیار اور اوما بھارتی جیسے پارٹی لیڈروں کے چہرے اس فیصلہ سے کھلے ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے ان لیڈروں کو لگتا ہے کہ ان کو عدالت کے ذریعہ اس معاملہ میں بری نہ کیے جانے کا انہیں سیاسی فائدہ پہنچے گا اور وہ ایک مرتبہ پھر رام مندر تحریک میں

خود کو ایک ''ہیرو'' کی طرح پیش کر کے بھاجپا کے لیے ووٹ حاصل کریں گے اور اس طرح پارٹی میں بھی اپنا قد اونچا کر سکیں گے۔ بھاجپا ایک تو بار بار یہ کہتی رہی کہ وہ رام مندر کو اپنا انتخابی ایشو نہیں بنائے گی اور دوسری طرف عدالت کا فیصلہ آنے کے بعد ونئے کٹیار جیسے لیڈر جس ردعمل کا اظہار کر رہے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ پارٹی پھر عوام کے جذبات کا استحصال کر کے اپنا سیاسی الو سیدھا کرنے کا خواب دیکھ رہی ہے۔

خصوصی عدالت کا فیصلہ مرکز اور ریاست کے سیاسی درجۂ حرارت کو بڑھانے والا ہے۔ کانگریس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں پارلیمنٹ اور اس کے باہر احتجاج کرے گی۔ دیگر اپوزیشن پارٹیاں بھی بھاجپا سرکار اور سی. بی. آئی. کے خلاف اپنی حکمت عملی تیار کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ ان حالات میں خود سی. بی. آئی. پر اس بات کے لیے بھی دباؤ بڑھ رہا ہے کہ وہ اڈوانی کو بری کیے جانے کے فیصلہ کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کرے۔ اگر سی. بی. آئی. اس معاملہ میں اپیل سے گریز کرتی ہے تو اس کی ساکھ مزید خراب ہو سکتی ہے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ خصوصی عدالت کا مذکورہ فیصلہ کئی اعتبار سے دور رس اثرات کا حامل ثابت ہو سکتا ہے اور اس نے سی. بی. آئی. جیسی معتبر ایجنسی کی ساکھ کو لال کرشن اڈوانی کو بری کیے جانے کے سبب داؤ پر لگا دیا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، 22 ستمبر 2003)



بی. جے. پی. کا نقطۂ نظر

# 'دیگر ملزمان بھی بے قصور ہیں'

از: بلبیر پنج (رکن راجیہ سبھا، بی. جے. پی.)

اجودھیا کا مسئلہ کبھی بھی بی. جے. پی. کی سیاست کا حصہ نہیں رہا، جبکہ رائے بریلی کی عدالت کا فیصلہ اجودھیا کے مسئلے سے جڑا ہے، لہٰذا بی. جے. پی. کی سیاست پر اس کا کوئی اثر پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ رائے بریلی کی عدالت میں محض الزامات طے کرنے کا عمل پورا ہوا ہے۔ اس عمل میں عدالت محض مدعی کے پیش کردہ ثبوت اور دلائل کو دیکھتی ہے، جبکہ دوسرے فریق کے دلائل اور ثبوت اس موقع پر نہیں دیکھے جاتے۔ نائب وزیر اعظم اڈوانی کے معاملے میں تو عدالت نے مان لیا کہ ان کے خلاف بادی النظر میں کوئی معاملہ نہیں بنتا۔ ان کے علاوہ جن 7 لیڈروں پر الزامات طے کیے جانے کا سوال ہے تو مجھے یقین ہے کہ جب مقدمے کی کارروائی چلے گی اور مذکورہ 7 لیڈروں کے دفاع میں ثبوت پیش کیے جائیں گے تو وہ بھی بری ہو جائیں گے۔ میں یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ بی. جے. پی. مندر کی تعمیر کے سوال پر پوری طرح متحد ہے اور اندرونِ پارٹی کوئی اختلاف نہ کبھی تھا، نہ ہے اور نہ ہوگا۔ ہماری پارٹی نے اجودھیا کے سوال کو ہمیشہ عقیدہ کا سوال مانا ہے اور یہ تنازع یا تو بات چیت کے ذریعے سلجھ سکتا ہے یا پھر عدالت کے فیصلے سے۔

اجودھیا کا تنازع بہت پرانا ہے۔ 1989ء میں بی. جے. پی. نے پالن پور اجلاس میں اس موضوع پر پہلی مرتبہ عوامی موقف اختیار کیا تھا۔ بعد میں اس مسئلے پر تحریک نے شدت اختیار کی اور جب قانونی کارروائی سے کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو آخر کار کارسیوکوں کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا اور انہوں نے متنازع ڈھانچے کو منہدم کر دیا۔ مرکز میں اس وقت کی نرسمہا راؤ حکومت نے انتقامی سیاست کھیلی، آر. ایس. ایس. پر پابندی لگا دی گئی۔ بی. جے. پی. کے سینئر لیڈروں پر جھوٹے مقدمے دائر کیے گئے سی. بی. آئی. کا ناجائز استعمال کیا گیا اور بے بنیاد الزامات لگائے گئے۔ رائے بریلی میں زیرِ غور معاملہ بھی اسی سیاست کا حصہ تھا۔ بی. جے. پی. اگر چاہتی تو ان بھی مقدمات کی کارروائی کو اسی طرح روک سکتی تھی جس طرح اندرا گاندھی نے 1980ء میں اپنے خلاف جاری معاملات رکوا دیے تھے۔ 1975ء میں وہ جس طرح الہ آباد ہائی کورٹ کے خلاف کھڑی ہوئی تھیں اسی طرح ہمارے لیڈر بھی

کھڑے ہو سکتے تھے۔ بی.جے.پی. چاہتی تو ان لیڈروں کے خلاف مقدمات چلانے کی حکومت اجازت نہ دیتی، لیکن پارٹی نے پوری ایمانداری سے کام لیا اور جمہوری روایت پر قائم رہتے ہوئے بے بنیاد الزامات اور مقدمات کا سامنا کیا۔ اس لیے یہ الزام عاید کرنا انتہائی قابل اعتراض ہے کہ بی.جے.پی. نے قانونی کارروائی کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش کی اور سی.بی.آئی. پر ثبوت وشواہد سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے لیے دباؤ ڈالا۔ جو لوگ اس طرح کے الزامات عاید کر رہے ہیں انہیں اپنے موقف پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ سی.بی.آئی. نے 1996ء میں ہی اپنا کام پورا کر لیا تھا۔ ثبوت جمع کرنے کا کام موجودہ حکومت کے آنے سے پہلے ہی پورا ہو چکا تھا، البتہ اس پر بحث ہوتی رہی، لیکن اس سے چھیڑ چھاڑ کی نہ تو گنجائش تھی اور نہ بی.جے.پی جیسی با اصول پارٹی ایسا کر سکتی تھی۔

کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بی.جے.پی. اس فیصلے کو اپنے حق میں کیش کرانے کی کوشش کرے گی، یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ اجودھیا کے مسئلے کو بی.جے.پی. نے نہیں، دوسری پارٹیوں نے زندہ رکھا ہے۔ اگر دوسری پارٹیاں چاہتیں تو مندر کی تعمیر ہونے دیتیں اور مسئلے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جاتا۔ بی.جے.پی. آج بھی اجودھیا کو سیاسی موضوع نہیں مانتی، لیکن اگر اپوزیشن جماعتیں اس کو موضوع بناتی ہیں تو بی.جے.پی. کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ بھی اس کو زیر بحث لائے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اڈوانی مندر کی تحریک کے قائد تھے، مگر الزامات ان کے بجائے دوسروں پر طے ہو گئے۔ پارٹی یہ تسلیم کرتی ہے کہ اڈوانی یا پارٹی کے دوسرے لیڈر قصوروار نہیں۔ تحریک کے دوران کچھ ناپسندیدہ واقعات ہو جاتے ہیں، مثلاً آزادی کے وقت عدم تعاون کی تحریک چلی، اس میں بھی بعض اوقات تشدد ہوا، لیکن کیا اس کے لیے گاندھی جی پر مقدمہ چلنا چاہیے تھا؟ ایسے واقعات کے لیے تحریک کے قائدین کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔



# اڈوانی کو بری کرنا غیر قانونی عمل

از: وصی احمد نعمانی
(ایڈووکیٹ سپریم کورٹ آف انڈیا)

رائے بریلی کی سی. بی. آئی. کی خصوصی عدالت نے جناب ایل. کے. اڈوانی کو بری کر کے زبردست قانونی غلطی کی ہے۔ عدالت نے سپریم کورٹ کی نظیر کی بھی صریحاً غلط تشریح کی ہے۔ سی. بی. آئی. کی عدالت میں جاری کارروائی کے مواد اور حالات و واقعات سپریم کورٹ کی نظیر سے بالکل مختلف ہیں۔ جس کی وجہ سے نظیر کا اطلاق اس مقدمہ میں بالکل نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اس فیصلہ میں دو اہم باتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ سی. بی. آئی. کی بددیانتی، جانب داری، عدالت کے کاغذات میں ہیرا پھیری کی وجہ سے اس طرح کے اہم مقدموں میں پیروی کی خامی کی بدترین مثال ہے۔ دوئم یہ ہے کہ فاضل عدالت نے سپریم کورٹ کی نظیر 1979 Cr. L.J. 154 کی تشریح میں فاش غلطی کی ہے بلکہ غیر ضروری طور پر فیصلہ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ جو مواد اور ثبوت و دستاویز باقی سات ملزمان کے خلاف تھے وہی مواد مسٹر اڈوانی کے خلاف چارج فریم کرنے کے لئے کافی تھے۔ بلکہ ان کے خلاف سنگین ثبوت موجود ہیں۔ لیکن سی. بی. آئی. نے براہ بدنیتی اور مرکزی سرکار کے وفادار ملازم کی حیثیت سے خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس نے ثبوت و دستاویز میں جی بھر کر پھیر بدل کیا ہے۔ بابری مسجد انہدام کے موقع پر اڈوانی کی جذباتی تقریر کا حصہ ٹیپ سے غائب کر کے سی. بی. آئی. نے اپنے طور پر بڑا کارنامہ انجام دیا ہے لیکن ابھی تو صرف چارج فریم کرنے کا مرحلہ تھا۔ اس مرحلہ میں سی. بی. آئی. چاہے اپنی پیٹھ ٹھوکے مگر جب چارج کے بعد گواہی ہوگی اور جرح کے درمیان ہر حالت میں مسٹر اڈوانی کا نام آئے گا تو اس حالت میں دفعہ 319 ضابطہ فوجداری کے تحت نئے سرے سے ان تمام ساتوں ملزمان کے ساتھ اڈوانی پر بھی مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔

تمام قانونی نگاہ رکھنے والے دانشوروں، مفکروں اور یہاں تک کہ عام لوگوں کو تعجب ہے کہ کس طرح سات پھنسے اور آٹھواں چھٹ گیا۔ جبکہ انہدام کی کارروائی سے پہلے کی طرف نظر اُٹھائیں تو پتہ چلے گا کہ جناب اڈوانی سازشی عمل میں دیگر ملزمان کے مقابلے زیادہ سرگرداں نظر آتے ہیں۔ میں یہاں ثبوت کے طور پر انہدام کے پہلے کی تقریروں کو پیش کروں گا۔ ان لیڈروں نے انہدام

کے سلسلے میں جو تقریریں کی تھیں ان تقریروں کو سپریم کورٹ کے تاریخی فیصلہ میں ریکارڈ کے طور پر محفوظ کر دیا گیا ہے۔ اڈوانی نے رتھ یاترا کے دوران اپنی تقریروں میں لگاتار یہ کہا کہ ''کارسیوک اجودھیا میں جمع ہوں اور یو۔ پی۔ کی کلیان سنگھ کی سرکار رہے یا نہ رہے اس کی پرواہ نہ کریں۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ اجودھیا میں کارسیوا صرف ''کیرتن اور بھجن'' تک محدود نہیں رہے گا بلکہ جسمانی طاقت کا بھی استعمال کیا جائے گا''۔

"He also kept saying that Karseva in Ayodhya would not remain restricted to "Bhajan or Kirtan" but would involve physical labour." J.T. 1994(2) S.C. 215

مرلی منوہر جوشی نے کہا کہ ''یو۔ پی۔ کی بی۔ جے۔ پی۔ کی حکومت کارسیوکوں کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں کرے گی۔ کارسیوا کی نوعیت اجودھیا میں سادھو سنت طے کریں گے، چونکہ یہ مذہبی معاملہ ہے اس لیے دھرم آچاریہ طے کریں گے۔ سپریم کورٹ کو مداخلت کا اختیار نہیں ہے۔''

یہی نہیں بلکہ جوشی نے پہلی دسمبر 1992ء کو متھرا میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''کارسیوکوں، اجودھیا میں یکجا ہو کر نام نہاد بابری مسجد کو گرا دو۔'' وشنو ہری ڈالمیا نے 9/نومبر 1992ء کو دہلی میں کہا کہ ''بابری مسجد ایسے ہی منہدم کر دی جائے گی جیسے کہ بابر نے اس کی تعمیر کی تھی''۔ دیکھئے کتاب ''چشم دید گواہ'' صفحہ 114-112۔

ان نیتاؤں کی تقریر سے متاثر ہو کر بھیڑ یکجا ہوئی اور تقریروں کا سلسلہ انہدام کے قبل تک جاری رہا۔ آخر کار مسجد گرا دی گئی۔ اگر ان تمام تقریروں اور مقصد، نیت، سازش کا جائزہ لیں تو سب کے سب سازش کار ثابت ہوتے ہیں صرف ایک نہیں یا فقط چند نہیں، اس لیے دفعہ 147-145, 148 تعزیراتِ ہند کے تحت غیر قانونی مجمع بنا کر دنگا فساد کرنے، خطرناک ہتھیار کے ساتھ، ایک مقصد کے تحت، نیت کر کے جرم کرنے کا معاملہ ثابت ہوتا ہے۔ اس غیر قانونی مجمع کا ہر فرد برابر کا مجرم ہے۔ چنانچہ مسٹر اڈوانی کسی بھی طرح بری کئے جانے کے حق دار نہیں ہیں۔ وہ سب کی طرح ہی ملزم ہیں اور برابر کی سزا کے مستحق ہیں۔ سب کے ساتھ ان کے خلاف دفعہ 153A, 153B 505 تعزیراتِ ہند کے تحت جرم بنتے ہیں۔

بریلی کی خصوصی عدالت نے سپریم کورٹ کے جس قانونی فلسفہ اور نظریہ کو بنیاد بنایا ہے وہ قانونی نکتہ غلط نہیں ہے، کیونکہ دفعہ 227 ضابطہ فوجداری کے تحت جب عدالت چارج طے کرے گی تو اسے اختیار ہے کہ وہ بادی النظر میں یہ دیکھے کہ مقدمہ بنتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح اگر دو خیال بنتے

ہیں اور جج مطمئن ہے ثبوت کی بنیاد پر Suspicion تو ہے مگر بہت مضبوط Suspicion نہیں ہے تو عدالت ملزم کو بری کر سکتی ہے۔ ان اصولوں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مقدمہ میں مضبوط Suspicion سات ملزمان کے خلاف پایا جاتا ہے مگر جو ان سب کا لیڈر ہے اور مذکورہ بالا دفعات کے جرم میں پیش پیش ہے ان کے خلاف عدالت کو کن بنیاد پر Strong Suspicion نظر نہیں آیا۔ ایک ہی مقدمہ میں گواہ ثبوت سب کے خلاف ایک سا ہے بلکہ ایک ہی ہے۔ اس کے باوجود آٹھواں دودھ کا دھلا عدالت کی نگاہ میں کیسے ثابت ہوا۔ یہ زبردست ناانصافی ہوئی ہے۔ یہ Miscarriage of Justice ہے۔ فاضل عدالت نے نظیر کو پڑھنے میں زبردست قانونی غلطی کی ہے۔

یونین آف انڈیا بنام پرفل کمار سال میں سپریم کورٹ کے فاضل جج جسٹس سید مرتضیٰ فضل علی اور جسٹس ڈی۔اے۔ڈیسائی نے اپنے فیصلہ کے پیراگراف (2)10 میں کہا ہے کہ ''جب عدالت میں پیش مواد، دستاویز، ملزم کے خلاف زبردست شبہ پیدا کرتے ہیں اور اس کی صفائی میں کچھ نہیں ہے تو عدالت ملزمان کے خلاف چارج طے کرنے، ٹرائل شروع کرنے کے لئے حکم دینے میں حق بجانب ہوگی۔''

"10(2) Where the materials placed before the court disclose grave suspicion against the accused which has not been properly explained, the court will be fully justified in framing a charge and proceeding with trial."

بریلی کی فاضل عدالت نے اس اہم نکتہ کو بالکل بے سود مان کر غیر قانونی عمل کا ارتکاب کیا ہے۔ عدالت نے سپریم کورٹ کی مذکورہ بالا نظیر کی روح کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے جس کے پیراگراف 23 میں فاضل ججوں نے کہا ہے کہ یونین آف انڈیا بنام پرفل کمار کے مقدمہ میں ایک بات اہم یہ ہے کہ کوئی قانونی ثبوت اور دستاویز ایسی نہیں ہے کہ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ مدعا علیہ نمبر 1,2 جرم کرنے کے لئے کسی وقت بھی ایک رائے تھے''۔

"23 Lastly, there does not appar to be any legal evidence to show any meeting of mind betwen respondents nos. 1 and 2 at any time."

جبکہ یہ بات بالکل ثابت ہے کہ بابری مسجد انہدام کے سلسلہ میں تمام ملزمان اپنی پوری ٹولی کے ساتھ بہت پہلے سے اور حادثہ کے وقت ایک رائے تھے، ایک خیال تھے، ان سب کی نیت ایک تھی،

سب کے سب ایک سازش کے تحت جرم کرنے کی تیاری کر چکے تھے اور اسی سازش کے تحت سب نے مل کر غیر قانونی عمل کیا، مسٹر اڈوانی پیش پیش تھے، مکھیا تھے اور ان کی رہنمائی میں تمام غیر قانونی عمل ہوا۔ اس لئے وہ برابر کے ملزم ہیں۔ ان کے خلاف ایک سا جرم بنتا ہے۔

فاضل عدالت نے مواد اور ثبوت و دستاویز کو Misread کیا ہے۔ سپریم کورٹ کی نظیر کو غیر قانونی طور پر بنیاد بنایا ہے۔ یہ نظیر کسی طور پر موجودہ مقدمہ پر لاگو نہیں کی جا سکتی ہے۔ نظیر میں مذکورہ حالات و واقعات رائے بریلی کی عدالت میں زیر سماعت مقدمہ سے بالکل متضاد ہیں۔ اس لئے مسٹر اڈوانی کو بری کیا جانا صریحاً غیر قانونی، غیر دستوری عمل ہے اور فاضل جج کا فیصلہ ساقط کئے جانے کے لائق ہے۔



# بابری مسجد مقدمہ کی کھلتی ۔ کستی گرہیں

از: محفوظ الرحمٰن
(معروف صحافی اور سابق مدیر ''دعوت'' سہ روزہ، نئی دہلی)

رائے بریلی کی خصوصی عدالت نے گزشتہ 19 ستمبر کو مرکزی وزیر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی، سابق مرکزی وزیر اوما بھارتی، اتر پردیش بی. جے. پی. کے صدر ونے کٹیار، وشو ہندو پریشد کی سب سے اہم شخصیت اشوک سنگھل وغیرہ کے خلاف فرد جرم عائد کرنے کا فیصلہ سنا کر بلاشبہ ایک ایسا کارنامہ انجام دیا ہے، جس کی بازگشت آنے والے دنوں میں پوری قوت سے بار بار سنائی دیتی رہے گی۔ فاضل عدالت کے اس فیصلے کا روشن پہلو یہ ہے کہ اس نے ان لوگوں کی گردنوں میں انڈین پینل کوڈ کی متعدد دفعات کا قلادہ ڈال دیا ہے، جو قانونی داؤ پیچ کا سہارا لے کر اب تک اس سے بچتے رہے ہیں یا جو عملاً اپنے آپ کو قانون سے بالاتر سمجھنے کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ رائے بریلی کی خصوصی عدالت کے فاضل جج مسٹر وی. کے. سنگھ کے اس فیصلے کا ایک نسبتاً تاریک پہلو بھی ہے. انہوں نے نائب وزیر اعظم مسٹر لال کرشن اڈوانی کو شک کا فائدہ دیتے ہوئے صاف بری کر دیا ہے، جو بابری مسجد کے انہدام کی فضا تیار کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ 6 دسمبر 1992 کو بابری مسجد کی شہادت کا جو روح فرسا واقعہ پیش آیا اسے اگر کسی سازش کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے تو اس میں سب سے اہم کردار اڈوانی جی کا ہی رہا ہے، اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہوگا۔ بابری مسجد انہدام کا واقعہ کوئی اچانک رونما ہونے والا واقعہ نہیں تھا۔ مسجد کے انہدام کا سلسلۂ عمل فی الواقع مسٹر لال کرشن اڈوانی کی رتھ یاترا کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا۔ 6 دسمبر 1992 کو جو کچھ ہوا، وہ اس کا نقطۂ عروج تھا۔ اس پس منظر میں مسٹر لال کرشن اڈوانی کا نام مجرموں کی فہرست سے خارج کر دینے کی بات آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ یہ اس فیصلے کا وہ حصہ ہے جو لوگوں کے گلے سے نیچے نہیں اُتر رہا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے اس فیصلے کی خرابی یا اس کے نقص کا نام دے سکتے ہیں، لیکن اس خرابی یا اس نقص کا ایک اچھا پہلو جو اُبھر کر سامنے آ رہا ہے وہ یہ ہے کہ مسٹر اڈوانی کی ذات ایک بار پھر پورے ملک میں موضوع بحث بن گئی ہے۔ ان کے اس جرم بے پناہ کے بخیے گمان غالب یہی ہے کہ عوامی سطح کے ساتھ ساتھ مجاز عدالتوں میں بھی اُدھیڑے جائیں گے اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ

ہے کہ سنگھ پریوار میں بھی ان پر انگلیاں اُٹھانے والوں کی تعداد کچھ بڑھتی ہی دکھائی دے رہی ہے۔

اب بریلی کی خصوصی عدالت نے جس مقدمہ نمبر 198/92 میں اپنا فیصلہ سنایا ہے وہ فی الواقع بابری مسجد کے انہدام کے بعد لکھنؤ کی خصوصی سی. بی.آئی. عدالت میں مقدمہ نمبر 197/92 کے ساتھ ہی زیر سماعت تھا، لیکن بعد میں الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ کے ایک فیصلے کے بعد عملاً معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ اس وقت عدالت عالیہ نے اپنے فیصلے میں تکنیکی بنیادوں پر لکھنؤ کی خصوصی عدالت کی تشکیل سے متعلق نوٹیفکیشن کو اگرچہ ناقص ٹھہرایا تھا، تاہم اس میں یہ بتا بھی کہی گئی تھی کہ ریاستی حکومت اگر چاہے تو وہ ایک نیا نوٹیفکیشن جاری کر کے اس خامی کو دور کر سکتی ہے، لیکن ریاستی حکومت نے اس سلسلے میں کوئی نیا نوٹیفکیشن جاری نہیں کیا۔ راج ناتھ سنگھ تو ظاہر ہے ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے، لیکن ان کے بعد مایاوتی نے بھی غالباً بی. جے. پی. کے دباؤ کے تحت کوئی نیا نوٹیفکیشن جاری کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی، لیکن ان کے لیے اس پورے معاملے کو بیک قلم رد کر دینا بھی ممکن نہیں تھا، چنانچہ انہوں نے 30/مئی 2002 کو سپریم کورٹ میں ایک حلف نامہ داخل کر کے یہ کہا کہ اس مقدمے کی سماعت رائے بریلی کی خصوصی عدالت میں شروع ہو سکتی ہے۔ اس طرح یہ نیم مردہ مقدمہ ایک بار پھر زندہ ہو گیا۔ مقدمہ کی از سر نو سماعت کے شروع ہونے کے بعد سی. بی.آئی. نے آٹھوں ملزمان، لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی، ونے کٹیار، اشوک سنگھل، وشنو ہری ڈالمیا، آچاریہ گری راج کشور اور سادھوی رتھمبرا کے خلاف 21/مئی 2003 کو ایک ضمنی فرد جرم داخل کی، جس میں 6/دسمبر 1992ء کو آٹھوں ملزمان کو بابری مسجد کے انہدام کے دوران ڈائس پر موجود دکھایا گیا تھا، بعد ازاں 5 اور 18/جولائی کو بھی سی. بی. آئی. نے عدالت کو پوری قوت کے ساتھ یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ آٹھوں ملزمان 6/دسمبر کو پورے 7 گھنٹے تک ڈائس پر موجود رہے اور ان کی موجودگی میں ہی مسجد کے تینوں گنبد ایک ایک کر کے گرا دیے گئے۔ علاوہ ازیں سی. بی. آئی. کے وکیل نے عدالت کو یہ یقین بھی دلانے کی کوشش کی کہ مسجد پر حملے کے دوران ڈائس پر موجود لوگوں میں کئی لوگ انتہائی اشتعال انگیز نعرے لگا رہے تھے، لیکن کسی نے بھی کسی کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

اس ضمنی چارج شیٹ میں سی. بی. آئی. نے نہ جانے کن مصلحتوں کی بناء پر لکھنؤ کی خصوصی عدالت میں پہلی جو چارج شیٹ داخل کی گئی تھی اس میں ترمیم کر کے اس کی دھار کو عملاً کند کر دیا تھا۔ لکھنؤ کی خصوصی عدالت میں جو چارج شیٹ داخل کی گئی تھی اس میں بشمول اڈوانی آٹھوں ملزمین پر

دیگر دفعات کے ساتھ ساتھ دفعہ 120B (مجرمانہ سازش) اور 295، 295A (کسی عبادت گاہ کے تقدس کو پامال کرنا، اسے نقصان پہنچانا اور کسی فرقہ کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا) جیسی دفعات بھی عائد کی گئی تھیں۔ لیکن رائے بریلی کی عدالت میں پیش کی جانے والی ضمنی چارج شیٹ سے ان دفعات کو خارج کر دیا گیا تھا۔ یہ مسئلہ اپوزیشن نے پارلیمنٹ میں بھی اُٹھایا تھا اور اس کے خلاف غالباً قانونی چارہ جوئی کا عمل بھی شروع ہو چکا ہے یا ہونے جا رہا ہے۔ اب رائے بریلی کی عدالت نے 19 ستمبر کو جو فیصلہ سنایا ہے اس میں لال کرشن اڈوانی کے سوا باقی ساتوں ملزمین کے خلاف دفعہ 147 (بلوہ فساد)، 149 (ارتکاب جرم)، 153A اور 153B (فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی) اور 505 (بدگمانی پیدا کرنا) جیسی دفعات لگائی گئی ہیں۔ ان ملزمین سے کہا گیا ہے کہ وہ 10 اکتوبر کو عدالت میں پیش ہوکر اپنے خلاف فرد جرم کی سماعت کریں اور اپنی صفائی پیش کریں، یہ لوگ رائے بریلی عدالت میں پیش ہوکر اپنے خلاف فردِ جرم کی سماعت کریں اور اپنی صفائی پیش کریں، یہ لوگ رائے بریلی عدالت میں پیش ہوکر باضابطہ طور پر مقدمہ لڑیں گے یا اس فیصلے کے خلاف مجاز عدالت سے رجوع کریں گے، ابھی اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہہ سکنا مشکل ہے۔ گمان غالب یہی ہے کہ یہ لوگ کسی مجاز عدالت سے کسی نہ کسی شکل میں رجوع کرنے کا فیصلہ ہی کریں گے۔ سنگھ پریوار کے کچھ لیڈروں نے اس کی جانب بہت ہی واضح انداز میں اشارہ بھی کر دیا ہے۔

رائے بریلی کی خصوصی عدالت نے لال کرشن اڈوانی کو تمام الزامات سے بری کر کے اس مقدمہ کی پیچیدگی میں خاصا اضافہ کر دیا ہے۔ فاضل جج نے انہیں شک کا فائدہ دے کر ایک نیا سوال کھڑا کر دیا ہے جس کی بازگشت آگے چل کر عدالتوں میں بھی سنائی دے گی اور پارلیمنٹ میں بھی اس کی گونج پوری قوت کے ساتھ سنی جائے گی اور اگر وزیر اعظم، فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کا استعفیٰ نامنظور کر دیتے ہیں یا وہ خود وزیر اعظم سے اس مسئلے پر بات چیت کے بعد اپنا فیصلہ واپس لے لیتے ہیں تو گمان غالب یہی ہے کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں ہنگامہ آرائی اور شور و شغب کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جائے گا جو مشکل ہی سے رکے گا۔

جہاں تک نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی کو بے داغ بری کرنے کا سوال ہے، وہ بھی گمان غالب یہی ہے کہ کچھ نئے اور انتہائی معنی خیز سوالوں کو بھی جنم دینے کا سبب بنے گا۔ فاضل جج مسٹر بی. کے. سنگھ نے اس سلسلے میں سپریم کورٹ کے جس مقدمہ یونین آف انڈیا بنام پرفل کما سامل

(1979) کا حوالہ دیا ہے، اس کے بارے میں قانون کے کچھ جانکاروں کا کہنا ہے کہ ایک دوسرے سے متصادم گواہوں کی بنا پر ملزمین کو بری کرنے کی بات مقدمے کی سماعت کے بعد دیے جانے والے فیصلے کے تعلق سے کہی گئی ہے نہ کہ اس کا اطلاق فرد جرم عائد کرنے کے مرحلہ پر ہوتا۔ ان حلقوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے سے یہ بات بھی اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ اگر ارتکاب جرم سے متعلق دو طرح کی باتیں یعنی موافقانہ اور مخالفانہ دونوں طرح کی چیزیں سامنے آئیں تو معاملہ فرد جرم عائد کرنے کا ہی بنتا ہے۔ خصوصیٔ عدالت کے فاضل جج کے طویل فیصلے کے صفحہ 124 پر اجودھیا میں اڈوانی کی سیکورٹی کی انچارج اس وقت کی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس انجو گپتا کے بیان کے کچھ حصے دیے گئے ہیں، جس میں کہا گیا ہے کہ اڈوانی نے ایک موقع پر ان سے پوچھا تھا کہ بابری مسجد کے گنبد پر کیا کچھ ہو رہا ہے؟ بعد ازاں انہوں نے انجو گپتا سے یہ بھی جاننا چاہا کہ بابری مسجد کے اندر کا کیا حال ہے؟ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ فاضل جج نے انجو گپتا کے اس بیان کو اس بات کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے کہ اڈوانی کو اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ کارسیوک مسجد کے اندر یا اس کے گنبد پر کیا کچھ کر رہے ہیں۔ یہ گویا اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ اڈوانی کے کنٹرول سے باہر تھا۔ حالات جس رخ پر مڑ گئے تھے اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ فاضل جج نے انجو گپتا اور ہو سکتا ہے کہ کچھ دیگر پولس افسروں یا دیگر لوگوں کے بیانات کو بنیاد بنا کر ان لوگوں کے بیانات کو کلی طور پر نظر انداز کیوں کر دیا جو پورے واقعے میں کسی نہ کسی زدپ میں اڈوانی کا ہاتھ دیکھ رہے تھے یا انہوں نے حالات و واقعات کی پوری روش کو اڈوانی کی رتھ یاترا اور اس کے مابعد اثرات کو کسی بھی درجہ میں لائق توجہ کیوں نہیں سمجھا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے سوال لوگوں کے ذہنوں میں اُٹھ رہے ہیں یا اُٹھ سکتے ہیں، انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کے استعفیٰ کا تعلق ہے اس کے حوالے سے غالباً یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ انہوں نے ایسا کچھ ضمیر کی آواز پر یا عوامی زندگی میں اخلاقی اصولوں اور اخلاقی قدروں کو وہ حیثیت دینے کے لیے کیا ہے جن کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ لکھنؤ کی خصوصی سی. بی. آئی. عدالت میں ان کے اور اُن کے ساتھ دیگر سات مجرمین کے خلاف فرد جرم 1997 میں ہی داخل ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود 1998 میں انہوں نے وزارت کا قلمدان سنبھالا اور 19 ستمبر 2003 تک وہ فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر کے منصب پر فائز رہے۔ اس پوری مدت میں نہ تو ان کے زندہ ضمیر نے انہوں کوئی کچوکا لگایا،

نہ انہیں اخلاقی قدروں اور اخلاقی اصولوں کا شمہ برابر بھی کوئی خیال آیا، چنانچہ اب انہوں نے جو استعفیٰ دیا ہے ظاہر ہے کہ اس کا سبب وہ نہیں ہو سکتا جو وہ بتا رہے ہیں۔ اگر وہ اپنے استعفیٰ کے معاملے میں واقعتاً مخلص ہوتے تو اپنے شہر الہ آباد کے ہی ایک وزیر باتدبیر کے نقش قدم کی پیروی کرتے۔ ہماری مراد آنجہانی لال بہادر شاستری سے ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی کابینہ میں وہ ریلوے کے وزیر تھے۔ ایک بار جب ایک بھیانک ریل حادثہ پیش آیا اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ بحیثیت وزیر اس کی ذمہ داری سب سے پہلے انہیں ہی قبول کرنی چاہیے تو انہوں نے اپنا استعفیٰ وزیر اعظم کے بجائے صدر جمہوریہ کو بھیج دیا اور خود الہ آباد چلے گئے۔ پنڈت جی کو جب ان کے استعفیٰ کی خبر ملی تو وہ اپنے گھر الہ آباد پہنچ چکے تھے، انہوں نے اس سلسلے میں وزیر اعظم تک سے کوئی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور پنڈت جی کو بادل ناخواستہ ان کا استعفیٰ منظور کرنا پڑا۔ حالات و واقعات کی روش پر اور رائے بریلی کی خصوصی عدالت کے فیصلہ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ بابری مسجد کے مقدمہ کی کھلتی گرہیں اس معاملے کو سلجھانے کے بجائے کچھ اور زیادہ طول دے سکتی ہیں اور یہ بلاشبہ اس ملک اور ہندوستانی سماج کے مفاد میں نہیں ہے۔



# آئین کی برتری اور عوامی خواہشات

از: مولانا اسرار الحق قاسمی
(صدر ملی تعلیمی فاؤنڈیشن، نئی دہلی)

کم وبیش 11 سال کے بعد بابری مسجد انہدام کا قضیہ محض یہاں تک پہنچا کہ 49 نامزد ملزمین میں جو سب سے اہم ملزم تھا اس پر فرد جرم تک عاید نہ ہوسکی اور ایک خصوصی مگر ذیلی عدالت نے سات دیگر ملزمین پر فرد جرم عاید کرنے کا حکم دیا۔ عدلیہ کے بھر پور احترام کے ساتھ یہ کہنا مجبوری ہے کہ شاید تمام قانونی ورزش محض اس امر کے لئے ہورہی تھیں کہ رام مندر تحریک کو ''خونی تحریک'' کی شکل دینے والے لیڈ کو کسی طرح بری کرالیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یقینی طور پر سی. آئی. بی. تک کو استعمال کرلیا گیا، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ سیاسی قیادتیں اور برسراقتدار جماعتیں ایسا کرتی رہی ہیں لیکن ایک ایسے معاملہ میں سی. بی. آئی. تک کو استعمال کرلیا گیا، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ سیاسی قیادتیں اور برسرِ اقتدار جماعتیں ایسا کرتی ہیں لیکن ایسے معاملے میں سی. بی. آئی. کو استعمال کرنے کی یہ پہلی مثال ہے۔ جس کی حقیقت سے ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا واقف ہے۔

نائب وزیر اعظم کے کردار سے کون واقف نہیں، انہوں نے سومناتھ سے اجودھیا کے لئے رتھ یاترا کیوں شروع کی، جبکہ ایک ذیلی عدالت نے تالہ بھی کھلوا دیا تھا اور پوجا بھی ہورہی تھی؟ بار بار یہ بیان کیوں دیا کہ غلامی کے کلنک کو مٹانا ہی پڑے گا؟ پھر 5 دسمبر 1992 کو وہ اجودھیا میں کیا کر رہے تھے، اگر کارسیوکوں کے ''صبر کا باندھ'' ٹوٹنے کا خطرہ تھا تو ان کو ملک کے گوشہ گوشہ سے وہاں لاکر جمع ہی کیوں کیا تھا؟ مذکورہ تاریخ میں ونے کٹیار کی رہائش گاہ پر انہوں نے جو میٹنگ کی تھی وہ کس مقصد کے لئے تھی؟ 6 دسمبر 1992ء کو بھی وہ خود مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی، سادھوی رتمبھرا اور اشوک سنگھل کے ساتھ اس اسٹیج پر موجود تھے جو کارسیوکوں کی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرنے کے لئے بنایا گیا تھا مگر جہاں سے ان کو زہریلی تقریریں کرکے مشتعل کیا جارہا تھا۔ سی. بی. آئی. نے کہا تھا کہ اس کے پاس آڈیو اور ویڈیو ٹیپ موجود ہیں جن میں ایل. کے. اڈوانی سمیت دیگر ملزموں کی تقریریں

ریکارڈ ہیں، آج وہ ٹیپ کہاں ہیں؟ کیا سی. بی. آئی. اتنی غافل اور بے خبر ہوگئی ہے کہ اس کے قبضہ کی انتہائی حساس چیزیں چور اچکے آسانی سے اُڑا لے جائیں؟

قانون یہ ہے کہ سازش کو ثابت کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ سازش کنندہ موقع واردات پر بہ نفس نفیس موجود بھی ہو۔ گاندھی قتل کیس میں عدالت یہ رولنگ دے چکی ہے۔ ایل. کے. اڈوانی کے بارے میں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی پوری تحریک ''غلامی کا کلنک'' مٹانے پر ہی مرکوز رکھی۔ ہر چند کہ وہ 5 اور 6 دسمبر 1992 کو اجودھیا میں عین موقع واردات پر بہ نفس نفیس موجود تھے مگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ تقریریں نہیں کر رہے تھے بلکہ کارسیوکوں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے تو اس سے قبل 8 سال تک انہوں نے کھلے طور پر جو تحریک اور سازش تیار کی وہ کس لئے تھی؟ اور کیوں سی. بی. آئی. نے اس کو موثر طور پر عدالت میں پیش نہیں کیا؟ پھر جن بنیادوں پر جوشی، اوما بھارتی اور سنگھل پر فرد جرم عائد کرنے کا جو فیصلہ ہوا ہے اڈوانی بھی تو انہیں بنیادوں پر ملزم تھے، وہ کیسے بری ہو گئے؟

بہر حال اب جو سب سے اہم مسئلہ ہے اور جس پر تمام انصاف پرور حلقوں کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں یہ ہے کہ وزیر اعظم ان حالات میں کیا قدم اُٹھاتے ہیں۔ مرلی منوہر جوشی نے استعفیٰ دے کر بظاہر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انہوں نے اخلاقیات کا پاس رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ استعفیٰ خالص اندرونی سیاسی چشمک کا مرہونِ منت ہے۔ اگر اخلاقیات کا اتنا ہی پاس ہوتا اور بی. جے. پی. کو اقدار پر مبنی سیاست اتنی ہی عزیز ہوتی تو مرلی منوہر جوشی ہی نہیں اڈوانی بھی بہت عرصہ پہلے استعفیٰ دے دیتے، بلکہ وزیر اعظم ان کو کابینہ میں شامل ہی نہ کرتے اس کے لئے بہت ہی بے وزن سی دلیل دی گئی کہ ''جنتا'' نے چن کر بھیجا ہے، جن آدیش کا پالن کرتے ہوئے انہیں حکومت میں شامل کیا گیا ہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ وزیر اعظم نے متعدد مواقع پر بحث کے دوران ایوان میں اس بات پر بھی زور دیا تھا کہ ایک ''لکشمن ریکھا'' ہونی چاہئے، ہم ان کے اس خیال کی قدر کرتے ہیں۔ لکشمن نے سیتا کے آگے ایک خطِ کشید کر کے یا ایک لائن کھینچ کر کہا تھا کہ اس لائن کو پار مت کرنا اور سیتا نے ایسا ہی کیا تھا۔ کیا وزیر اعظم اسی ''لکشمن ریکھا'' کی بات کرتے ہیں؟ اور کیا کبھی انہوں نے اپنے ساتھیوں اور اپنے ہم خیال یا ہم نوا حلقوں کے آگے بھی کوئی لکشمن ریکھا کھینچی ہے اور اس پر

عمل کرنے کو کہا ہے؟ لکشمن ریکھا تو بہت دور، آئین نے جو قانونی حدود متعین کی ہیں اور ایک سماجی واجتماعی زندگی جینے اور دوسروں کو جینے کا حق دینے کے جو سنہرے اصول متعین کئے ہیں کیا ان پر عمل کیا گیا؟

21/ستمبر 2001ء کو سپریم کورٹ نے ایک اہم معاملہ میں رولنگ دی تھی۔ ''اکثریتی پارٹی کے ذریعہ ظاہر کی گئی خواہشات اسی وقت برتر ہوں گی جب وہ آئین سے مطابقت رکھیں۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمہوریت کسی بے ہنگم اور ہر طرح کی قیود اور ضابطوں سے آزاد نظام کا نام نہیں ہے بلکہ ایسے نظام کا نام ہے جو ایک طے شدہ آئین کا پابند ہے ایسا آئین جس کی بنیاد سیکولر اقدار پر رکھی گئی ہو۔ سیکولرزم کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ خود جینے کے لئے دوسروں کے جینے کا حق چھین لیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ذاتی اور مذہبی معاملات میں ہر فرد کو اس کے عقائد، اس کے تصورات اور خیالات کے مطابق عمل کرنے کی پوری آزادی ہو جبکہ سماجی اور سیاسی معاملات میں طے شدہ حدود کے اندر رہتے ہوئے سب کو یکساں حقوق حاصل ہوں اور کسی کو کسی پر برتری نہ ہو لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا تقاضہ یہ بھی ہے کہ اگر مختلف وجوہ سے مختلف حالات میں مختلف طریقہ ہائے کار سے کسی معاملہ میں اکثریتی رائے ایسی آئے جو خود سیکولرزم، جمہوریت اور آئین کے بنیادی تقاضوں کے خلاف ہو تو اس کو برتری حاصل نہیں ہوگی اور نہ صرف یہ کہ اس رائے کا احترام واجب نہیں ہوگا بلکہ اس کو مسترد کیا جانا لازمی ہوگا۔ ایسا ملک کی سلامتی کے لئے اور اس کے تحفظ و یکجہتی کو یقینی بنانے کے لئے کرنا ضروری ہوگا۔ ایسے میں عوامی خواہشات پر ملکی سلامتی و یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فوقیت حاصل ہوگی۔

بی. جے. پی. نے ہمیشہ اس کا الٹا کیا ہے، اس نے تو نام نہاد ''اکثریتی عوامی خواہشات'' کو ملک کی سلامتی پر ترجیح دی ہے، اس نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی قیمت پر سیاسی عروج حاصل کیا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے آئین کو ہی بدلنے کی کوشش میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ بابری مسجد کے معاملہ میں ماخوذ'' کھلے ملزمین'' کو حکومت میں شامل کرکے وزیراعظم نے آئین کی روح کے خلاف کام کیا اور اس ریکھا سے آگے نکل گئے جو لکشمن نے کھینچی تھی اور جس کا ذکر خود وزیراعظم نے بارہا کیا ہے۔ ماضی میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ وزراء نے واقعات کی اخلاقی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ اس عمل سے اخلاقیات کو ہی مضبوطی نہیں ملتی بلکہ واقعات کی

درست نشاندہی اور اُن کے ذمہ داروں کو دُرست شناخت میں بھی مدد ملتی ہے اور تفتیشی ایجنسیوں کو کھلے ماحول میں اور کسی قسم کے دباؤ سے آزاد ہوکر اپنا کام انجام دینے کا موقع ملتا ہے۔ بی۔جے۔پی۔ نے اپنا اعتماد خود کھویا ہے، اس کے پاس دکھانے کے لئے ایسا کوئی عمل نہیں جس کی بنیاد پر وہ یہ کہہ سکے کہ اس نے جو کچھ کیا ہے وہ آئین کی بالادستی کے لئے کیا ہے۔ اس کے برخلاف اس نے اپنے عمل سے آئین کی دھجیاں اُڑائی ہیں۔ ملک کی ہزاروں سالہ جمہوری اقدار و روایات کو مجروح کیا ہے اور سیاسی فائدہ کی خاطر دو طبقات کے درمیان نفرت کی آہنی دیوار کھڑی کی ہے، ایسے میں مرلی منوہر جوشی کے استعفیٰ کی کوئی اہمیت نہیں ہے، وزیر اعظم اسے قبول کریں یا مسترد، انصاف تو پہلے ہی زخمی ہو چکا ہے۔ (راشٹریہ سہارا، 21/اکتوبر 2003)

## اڈوانی کو "معاف" کرنے سے CBI کی معتبریت پر سوالیہ نشان؟

از: ابن قاسم

کسی بھی تحریک کے روح رواں کے لیے یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ واقعاتی شواہد تحریک میں اس کی شمولیت سے انکار کر دیں لیکن یہ پہلا موقع ہے جب کسی تحریک کے رہنما نے اپنا نام "سورماؤں" کی فہرست سے خارج کر دیے جانے پر راحت کی سانس لی ہے۔ بابری مسجد کی شہادت رام مندر تحریک کا نتیجہ تھی جس کے روح رواں لال کرشن اڈوانی تھے۔ اڈوانی نے اس تحریک میں جان پھونکنے کے لئے سوم ناتھ سے اجودھیا تک رتھ یاترا نکالی جس کے نتیجہ میں نہ صرف فرقہ وارانہ فسادات ہوئے بلکہ ملک بھر میں کشیدگی بھی پیدا ہوئی۔ اس رتھ یاترا کو لالو پرساد یادو نے مکمل نہیں ہونے دیا اور سمستی پور میں اڈوانی جی گرفتار کر لئے گئے جس کے نتیجہ میں وی. پی. سنگھ کو اپنی حکومت گنوانی پڑی۔ یہ تحریک یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک دن ایسا بھی آیا جب 6ر دسمبر 1992 کو بی۔ جے۔ پی۔ کے لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی اور وشو ہندو پریشد کے دوسرے اہم لیڈروں کی موجودگی میں بابری مسجد شہید کر دی گئی۔ اب اس سلسلہ میں رائے بریلی کی عدالت میں دائر ایک مقدمہ میں عدالت نے نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی کو بابری مسجد کی شہادت کی سازش رچنے کے الزام سے بری کر دیا جب کہ وزیر انسانی وسائل مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی، اشوک سنگھل، وشنو ہری ڈالمیا، آچاریہ گری راج کشور، ونے وکٹیار اور سادھوی رتمبرا کے خلاف تعزیرات ہند کی دفعہ 147, 149, 153A, 153B اور 505 کے تحت الزامات طے کرنے کے لیے 10ر اکتوبر کو عدالت میں موجود رہنے کے لیے کہا ہے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں سی. بی. آئی. کے الزامات کو پہلی نظر میں درست قرار دیا ہے۔ اب اگر سی. بی. آئی. ان لوگوں کے خلاف اپنے الزامات کا کامیابی سے دفاع کر پاتی ہے تو ان ملزموں کو تین سے پانچ سال تک سزا سنائی جا سکتی ہے۔ ان دفعات کے تحت مذہبی اشتعال پھیلانے، فساد کرانے، اجتماعی مقصد سے کوئی جرم کرنے اور مذہبی مقام پر فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کے الزامات آتے ہیں۔

عدالت کے اس فیصلہ میں جو سب سے اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر عدالت نے اڈوانی کو کس طرح بری کر دیا۔ رام مندر تحریک سے جس شخص کو ذرا سی بھی واقفیت ہے وہ اچھی طرح

جانتا ہے کہ اڈوانی اس تحریک کے اہم کردار تھے۔ بابری مسجد کی شہادت کو محض 6 دسمبر 1992 کو پیش آنے واقعات تک محدود کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ بابری مسجد کی شہادت ایک دن کی اشتعال انگیزی کا نتیجہ نہیں تھی۔ اگر نائب وزیر اعظم ایل.کے.اڈوانی اپنے بچاؤ میں یہ کہتے ہیں کہ ''جہاں تک مجھے علم ہے 6 دسمبر 1992 کو میں نے، مرلی منوہر جوشی نے یا کسی اور نے کوئی تقریر نہیں کی'' تو ان کا یہ بیان عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے جیسا ہے۔ اگر سی. بی.آئی.اڈوانی اور دوسرے ملزموں کے خلاف شواہد پیش کرتے وقت صرف 6 دسمبر کے واقعات کو مدنظر رکھتی ہے تو یہ ان ملزموں کو راحت دینے کی ایک کوشش ہی کہی جائے گی۔ واقعات کا تجزیہ کیا جائے تو اڈوانی کو یہ راحت رائے بریلی کی عدالت نے نہیں بلکہ سی. بی.آئی. نے دی ہے۔ سی. بی.آئی. نے دانستہ طور پر ایسے شواہد پیش کیئے جو اڈوانی کے حق میں جاتے تھے۔ سی. بی.آئی. وزارت داخلہ کے ماتحت ہے جس کے سربراہ نائب وزیر اعظم ایل.کے.اڈوانی ہیں۔ اس حقیقت کا علم ہوتے ہوئے اگر کسی کو رائے بریلی کے فیصلہ پر حیرت ہے تو اسے معصومیت پر ہی محمول کیا جائے گا۔ جب سی. بی.آئی. نے 1997 میں لکھنؤ کی عدالت میں دائر چارج شیٹ سے دفعہ 120B ہٹا کر 31 مئی 2003 کو رائے بریلی کی عدالت میں ضمنی چارج شیٹ داخل کی تھی اسی وقت یہ واضح ہو گیا تھا کہ سی. بی.آئی. کسی خاص مقصد سے ایسا کر رہی ہے۔ ایوان میں ایسا کرنے پر شدید ہنگامہ بھی ہوا کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ دفعہ 120B کے ہٹنے سے پورا معاملہ کمزور پڑ جائے گا۔ سابق وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ کے وکیل نے کہا تھا کہ سی. بی.آئی. نے جان بوجھ کر یہ دفعہ ہٹائی ہے۔ اب جبکہ اڈوانی کو عدالت نے بری کر دیا ہے اس سے اپوزیشن کا سی. بی.آئی. کا بے جا استعمال کرنے کا الزام درست معلوم ہوتا ہے۔ اپوزیشین کا الزام ہے کہ سی. بی. آئی. نے اصل چارج شیٹ سے چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ 9 ستمبر 1997 کو سی. بی.آئی. نے لکھنؤ کی ایک عدالت میں اڈوانی سمیت بی.جے.پی. اور وشو ہندو پریشد کے 49 لیڈروں کے خلاف چارج شیٹ داخل کی تھی جس پر مجسٹریٹ نے کہا تھا کہ اڈوانی اور دیگر لیڈروں نے متنازعہ ڈھانچہ گرانے کی سازش رچی ہے بعد میں ہائی کورٹ نے تکنیکی بنیاد پر اس حکم کو خارج کر دیا اور ریاستی سرکار سے نیا نوٹیفیکیشن جاری کرنے کے لیے کہا بعد میں مایاوتی سرکار نے نیا نوٹیفیکیشن جاری کرتے ہوئے رائے بریلی کورٹ سے نئے سرے سے پورے معاملہ کی جانچ کرنے کے لیے کہا۔ مایاوتی نے ایسا کیوں کہا یہ بھی ایک موضوع بحث ہے۔

اس فیصلہ پر جہاں پوری دنیا کو حیرت ہوئی ہے وہیں خود اڈوانی بھی حیرت زدہ ہیں وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں کہ انہیں عدالت کے فیصلے پر خوش ہونا چاہئے یا افسوس کرنا چاہئے۔ اس بات کے بھرپور شواہد موجود ہیں کہ اڈوانی اور جوشی دوسرے لیڈروں کے ساتھ اجودھیا میں اس اسٹیج پر موجود تھے جو بابری مسجد کی شہادت کی قیادت کر رہا تھا۔ اس اسٹیج سے ''ایک دھکا اور دو بابری مسجد توڑ دو'' کا نعرہ لگایا جا رہا تھا۔ نائب وزیر اعظم ایل. کے. اڈوانی کے چہرے پر بھی وہی جوش تھا جو بی. جے. پی. اور وشو ہندو پریشد کے دوسرے لیڈروں کے چہرے پر تھا۔ اس موقع کی تصویر آج بھی اس حقیقت کی گواہ ہے۔ اخباروں میں شائع تصویر میں اڈوانی کے چہرے پر کوئی ندامت نظر نہیں آتی۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں انہوں نے 6/دسمبر کو اپنی زندگی کا افسوسناک دن قرار دیا۔ لیکن بی. جے. پی. کے لیڈران مختلف مواقع پر مختلف بیانات دینے کے ماہر ہیں بابری مسجد کی شہادت کے بعد اڈوانی نے پارٹی کے ترجمان 'بی. جے. پی. ٹوڈے' کے اداریہ میں مسجد کی شہادت کو غلط نہیں ٹھہرایا بلکہ اس کے انہدام کے طریقہ کو غلط بتایا۔ اس مضمون میں انہوں نے بابری مسجد کے وجود کو ہندوؤں کے لئے شرمناک ٹھہرایا تھا۔ اس کے علاوہ لبراہن کمیشن کے سامنے اڈوانی جی کی بہو نے جو بیان دیا ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ سی. بی. آئی. نے 9/ستمبر 1997 کو جو چارج شیٹ لکھنؤ کی عدالت میں داخل کی تھی اگر اسی کے مشمولات کو دیکھا جائے تو اڈوانی کی بابری مسجد کی شہادت میں شمولیت واضح ہو جاتی ہے عدالت کے اس فیصلہ نے اڈوانی کو جہاں راحت دی ہے وہیں سی. بی. آئی. کے کردار کو مشکوک بنا دیا ہے۔

(بشکریہ قومی آواز، 30/ستمبر 2003)



# عدالتی فیصلے نے بی. جے. پی. کے غبارے کی ہوا نکال دی

از: عتیق مظفر پوری (معروف صحافی)

رائے بریلی کی خصوصی عدالت کا فیصلہ آنے سے ایک روز قبل یعنی 18 ستمبر کو مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی نے جب یہ اعلان کیا تھا کہ اگر عدالت کا فیصلہ ان کے خلاف آیا تو وہ وزارت سے مستعفی ہو جائیں گے، بھارتیہ جنتا پارٹی (بی. جے. پی.) کے اندر کھلبلی مچ گئی تھی، کیونکہ ایک تو سنگھ پریوار کے لیڈروں میں اس طرح کے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا فقدان پایا جاتا ہے۔ اڈوانی بھی وزارت سے مستعفی ہونے پر مجبور کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ہونی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایل. کے. اڈوانی بری کر دیے گئے، جبکہ ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی، سابق مرکزی وزیر اوما بھارتی، اشوک سنگھل، وشو ہندو پریشد کے صدر وشنو ہری ڈالمیا، نائب صدر گری راج کشور، اتر پردیش بی. جے. پی. کے صدر ونے کٹیار اور سادھوی رتھمبرا کے خلاف مقدمے چلانے کا حکم دے دیا گیا، جو کچھ لوگوں کے لیے قطعی غیر متوقع تھا یا کم سے کم لال کرشن اڈوانی کے بری کیے جانے کی اُمید نہیں تھی۔ مثال کے طور پر وشو ہندو پریشد کے نائب صدر گری راج کشور نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ جب اڈوانی سمیت سبھی لیڈر 6/دسمبر 1992 کو جائے واردات پر موجود تھے اور سب کے اوپر یکساں الزامات عاید کیے گئے تھے تو تنہا اڈوانی کو کس بات پر رہا کر دیا گیا۔ ان کا واضح اشارہ اڈوانی کے وزارت داخلہ کے عہدے کی طرف تھا۔ اسی طرح ہندتوا کی شعلہ بیان مقرر سادھوی رتھمبرا نے بھی اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں یہ کہا کہ رام مندر کی تحریک تو وشو ہندو پریشد کے ذہن کی پیداوار تھی، لیکن رتھ یاترا کے بعد وزیر داخلہ اس میں شامل ہو گئے تھے۔ کچھ لوگ اسے سنگھ پریوار کے اندر کشمکش سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اندرونی کشمکش ہو بھی، لیکن دراصل سنگھ پریوار کے بیشتر لیڈروں کو یہ امید تھی کہ اڈوانی جی کے وزیر داخلہ ہونے کے طفیل سبھی لوگ بابری مسجد کے انہدام کی سازش کے الزام سے بری کر دیے جائیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی بھی عدالت کا فیصلہ آنے سے پہلے ہی استعفیٰ دینے جیسی اخلاقی جرأت کا مظاہرہ نہ کر پاتے، جس نے پورے سنگھ پریوار کو خاصی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے، وہ بھی ایسے نازک موقع پر جبکہ محض

ڈیڑھ دو ماہ بعد ملک کی پانچ ریاستیں دہلی، راجستھان، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ اور میزورم میں اسمبلی انتخابات ہونے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے دن سے ہی ڈاکٹر جوشی کو اپنا استعفیٰ واپس لینے کے لیے منانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس سلسلے میں سنگھ پریوار کے متعدد لیڈروں کے علاوہ وزیر دفاع جارج فرنانڈیز بھی مرلی منوہر جوشی سے مل چکے ہیں اور یہ سمجھا جارہا ہے کہ اگر جوشی اپنا استعفیٰ واپس لینے پر راضی نہ ہوئے تو وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی جو پہلے ہی ضبط سے کام لینے کی تلقین کر چکے ہیں، ان کا استعفیٰ منظور نہیں کریں گے، اس لیے کہ بھلے ہی وشو ہندو پریشد اسمبلی انتخابات کے پیش نظر اجودھیا تنازع کو گرم کرنے کے لیے 'مارچ پر مارچ کرنے کا اعلان کرے اور بی جے پی صدر وینکیا نائیڈو عدالت کے فیصلے کے باوجود 'ہار نہ ماننے' کی ڈینگیں ہانکیں، واقعہ یہ ہے کہ رائے بریلی کی خصوصی عدالت کے فیصلے نے سنگھ پریوار خاص طور سے بھارتیہ جنتا پارٹی کے غبارے کی ہوا نکال دی ہے۔ ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کے استعفیٰ دے دینے کی وجہ سے بی جے پی کارکن رائے دہندگان کا سامنا کرنے کا قطعی حوصلہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ ان کو ڈر لگ رہا ہے کہ اگر ملک کے عوام نے اُن سے یہ پوچھ لیا کہ جو کام ملک کی عدالت اور ملک کے قانون کی نظر میں مجرمانہ ہو وہ آپ کے لیے، ہمارے لیے اور اس ملک کے ہندوؤں کے لیے باعثِ ''گورو'' (افتخار) کیسے ہوسکتا ہے؟ تو وہ کیا جواب دیں گے۔ کیا آپ ایسے شخص (اوما بھارتی) کو ہماری ریاست مدھیہ پردیش کا وزیر اعلیٰ ☆ کے طور پر چننے اور ووٹ دینے کو کہتے ہیں جس کے خلاف عدالت نے ایک مذہبی عبادت گاہ کے انہدام کی سازش کا مقدمہ چلانے کا حکم دیا ہے؟ کیا بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کے لیڈر ملک کے قانون اور اس کی عدالتوں سے اوپر ہیں یا سپریم کورٹ کی پھٹکار کے باوجود اب تک گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کو ''گدی'' چھوڑنے کے لیے کیوں نہیں کہا گیا؟ بھارتیہ جنتا پارٹی اور اس کے لیڈروں کو عوام کے ان سوالوں کا جواب دینا پڑے گا۔ صرف اخبار اور ٹیلی ویژن والوں کے سامنے یہ کہنے سے بات نہیں بنے گی کہ عدالت کا فیصلہ ان کے حق میں ہو یا ان کے خلاف، بہردوصورت اس کا فائدہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو ہی ہوگا اور اس کے ووٹ بینک مزید پکے ہوں گے۔ کیا صرف اس لیے کہ اب تو عدالت نے بھی ایک طرح سے ان کے ملزم ہونے کی سند دے دی ہے؟ جو لوگ ان کی فکر سے اتفاق کرتے ہیں، وہ مزید مضبوطی کے ساتھ ان سے جڑیں گے؟ بھارتیہ جنتا پارٹی کو یہ خوش فہمی چھوڑ دینی چاہیے۔ وہ دن ہوا ہوئے جب پسینہ گلاب تھا۔ ہر بار

اجودھیا معاملہ کے گرمانے سے بی. جے. پی. کو فائدہ ہوگا، یہ ضروری نہیں ہے۔ اس بار اجودھیا معاملے میں جو گرمی آئی ہے وہ گرمی اس کا دامن جلا بھی سکتی ہے۔ کیوں کہ اس گرمی میں عدالت کے فیصلے کی تپش بھی شامل ہے اور اس ملک کا عام آدمی بی. جے. پی. صدر ونکیا نائیڈو کی طرح عدالت کے فیصلے کو ''سیاسی فیصلہ'' سے تعبیر کر کے عدالت کی توہین نہیں کرتا، عدالت اور اس کا احترام کرتا ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ بابری مسجد کے انہدام کے بعد اس وقت کی مرکزی حکومت نے بی. جے. پی. کے زیر اقتدار جن ریاستی حکومتوں کو برطرف کر کے صدر راج نافذ کر دیا تھا، ان ریاستوں میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو اپنے بوتے پر دوبارہ اقتدار میں آنا نصیب نہیں ہوا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ سپریم کورٹ نے مرکز کے ذریعہ صدر راج نافذ کرنے کے اقدام کو درست قرار دیا تھا۔ اس کے باوجود اگر سنگھ پریوار کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عدالت کے ہر فیصلے کا سیاسی فائدہ بہر حال بی. جے. پی. کو ہوگا تو شاید وہ بے وقوفوں کی جنت میں رہتے ہیں یا انہوں نے اس ملک کے لوگوں کو بے وقوف سمجھ رکھا ہے، جو ملک کی عدالتوں کے فیصلے کو نظر انداز کر کے بھارتیہ جنتا پارٹی کے جھانسے میں آ جائیں گے۔ ہرگز نہیں۔ اس ملک کے عوام کی اکثریت امن پسند، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی علم بردار اور سیکولر سوچ کی حامل ہے۔

پھر بات آ کر صرف اجودھیا اور بابری مسجد کے انہدام تک محدود ہوتی تو ہو سکتا ہے کہ نام نہاد 'آستھا' کی دہائی دے کر کچھ لوگوں کو رام کر لیا جاتا اور سنگھ پریوار کے لوگ انہیں مندر کی تعمیر کے لیے بی. جے. پی. کے ہاتھ مضبوط کرنے کی اپیل کرتے، جس سے رائے بریلی کی خصوصی عدالت کے فیصلے کے بعد سیاست پر مبنی ہونے کا اعتراف کر لیا گیا ہے، مگر یہاں تو آوا کا آوا ہی ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ملک کی عدالت عالیہ کے ذریعہ حکومت گجرات کو پھٹکار لگائی گئی، جس کی شہ پر گودھرا سانحہ کے بعد کرائے گئے تجربے کو سنگھ پریوار ملک کی دیگر ریاستوں میں بھی دہرانا چاہتا ہے، پھر رائے بریلی کی خصوصی عدالت کا زیر تبصرہ فیصلہ صادر ہوا۔ ان سب کو لے کر بھارتیہ جنتا پارٹی پر تھوتھو ہو ہی رہی ہے تھی کہ 25 ستمبر کو سپریم کورٹ کا ہی ایک اور انتباہ آ گیا، جس میں حکومت گجرات سے کہا گیا ہے کہ اگر فساد کے دوران اجتماعی آبرو ریزی کی شکار ہونے والی خاتون بلقیس یعقوب رسول کو ریاستی پولس نے ڈرانے دھمکانے کا رویہ برقرار رکھا تو اس کے سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ اب تو صرف دیکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی بیرونی ممالک کا دورہ

کر کے واپس آنے کے بعد عدالت کے اس فیصلے کا احترام کرتے ہوئے سنگھ پریوار اور بی جے. پی. لیڈروں کو ''رام دھرم'' نبھانے کی ہدایت کرتے ہیں یا ٹھیک اسی طرح ملک کو آنکھ دکھاتے ہوئے ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی ☆ کے استعفیٰ کو نامنظور کر دیتے ہیں، جس طرح انہوں نے پارلیمنٹ میں اپوزیشن کو آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا تھا کہ ''جارج فرنانڈیز کو میں نے بلایا ہے وہ واپس نہیں آنا چاہتے تھے''۔ (راشٹریہ سہارا 28/ اکتوبر، 2003)



☆ واضح ہو کہ حالیہ اسمبلی انتخاب میں فتح یاب ہو کر اوما بھارتی مدھیہ پردیش کی وزیر اعلیٰ بنائی جا چکی ہیں۔ (مرتب)

☆ مرلی منوہر جوشی کا استعفا بھی نامنظور ہو گیا اور موصوف اپنے عہدے پر تاحال بحال ہیں اور گجرات سانحہ کے اصل مجرم بھی اپنے اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ (مرتب)

## بابری مسجد انہدام کے مجرم

از: احسن مفتاحی (معروف صحافی)

بیسٹ بیکری مقدمہ کے سفاک مجرمین جس طرح عدالت سے بری ہوئے، اسی طرح بابری مسجد انہدام کے مقدمے سے رائے بریلی کی عدالت نے انہدام کے سب سے بڑے مجرم اور موذی لال کرشن اڈوانی کو بری کر دیا کیونکہ سی. بی آئی. اُنہی کی ماتحتی میں کام کرتی ہے۔ تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ سی. بی آئی. افسران اپنے باس کے خلاف عدالت میں ایسی رپورٹ داخل کرتے کہ عدالت انہیں مجرم ٹھہراتی۔ لال کرشن اڈوانی بابری مسجد کے شروع سے ملزم ہیں۔ ان کو وزیر داخلہ بنائے جانے کا کوئی اخلاقی جواز ہی نہیں تھا۔ اپوزیشن کی تمام پارٹیوں نے ان کو وزیر داخلہ بنائے جانے پر اعتراض کیا تھا مگر ڈھونگی اور پاکھنڈی اٹل بہاری واجپئی نے کسی کی بات نہیں سنی۔ ملحوظ خاطر رہے کہ بابری مسجد منہدم ہوئی تھی تو اس وقت لال کرشن اڈوانی اپوزیشن کے لیڈر تھے۔ انہوں نے انہدام کے فوراً بعد اپوزیشن لیڈر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اپوزیشن لیڈر بننے کا جواز انہوں نے گنوا دیا تھا تو وزیر داخلہ بننے کا ان کے پاس کیا جواز ہے؟

لال کرشن اڈوانی اور مرلی منوہر جوشی مختلف سمتوں سے اجودھیا کی طرف ہجوم بے ہنگام کے ساتھ اشتعال انگیز تقریریں کرتے ہوئے بڑھ رہے تھے تو کہتے جاتے تھے کہ ہم اجودھیا کیرتن گانے کے لئے نہیں جا رہے ہیں بلکہ ''کچھ اور'' کرنے جا رہے ہیں۔ یعنی انہوں نے علی الاعلان بابری مسجد منہدم کرنے کا ناپاک ارادہ ظاہر کیا تھا اور تسلسل کے ساتھ کیا تھا۔ مسلمانوں کو تشویش ہوئی اور انہوں نے اس وقت کے وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے درخواست کی کہ بابری مسجد کے تحفظ کے لئے کچھ کرو تو وہ موذی خاموش رہا۔ اس وقت کے یو. پی. کے وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ نے سپریم کورٹ میں حلف نامہ داخل کیا تھا کہ بابری مسجد کا بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔ ملزموں پر مقدمہ چلانے کے لیے حکومت اُتر پردیش نے جو نوٹیفیکیشن جاری کیا تھا، اس پر عدالت نے عدم اطمینان کا اظہار کر کے حکم دیا تھا کہ اس کے اندر جو جھول ہے، اُسے دور کر کے از سرِ نو نوٹیفیکیشن جاری کیا جائے مگر راج ناتھ سنگھ اور مایاوتی نے ایسا نہیں کیا۔ راج ناتھ سنگھ نے اس لیے ایسا نہیں کیا کہ اس میں ان کی پارٹی کے کچھ لوگ ملوث تھے اور مایاوتی نے اس لیے نہیں کیا کہ بی جے. پی. سے انہوں نے اتحاد کر رکھا تھا۔

ملائم سنگھ یادو بھی خاموش ہیں۔ وہ اڈوانی کو بری کئے جانے کے خلاف اپیل دائر کرنے کے بھی روادار نہیں ہیں کیونکہ وہ بی جے. پی. کی خاموش حمایت سے برسراقتدار آئے ہیں اور ان کو صرف اپنا اقتدار عزیز ہے۔ وہ وزارتِ داخلہ علیا کے لیے کسی حد تک بھی جاسکتے ہیں۔ 13/دنوں کی حکومت کے بعد اٹل بہاری واجپئی مستعفی ہوئے تھے تو صرف ملائم سنگھ کی وجہ سے متبادل حکومت نہ بن سکی تھی۔ اس طرح ملائم سنگھ یادو نے اپنی نادانی کی وجہ سے بی جے. پی. کی دانستہ یا نادانستہ مدد کی۔ عبوری انتخابات ہوئے تو بی جے. پی. کو پہلے سے زیادہ نشستیں ملیں اور واجپئی نے 24/پارٹیوں کے اشتراک سے مخلوط حکومت بنالی۔

ہم شروع سے کہتے آئے ہیں کہ ملائم سنگھ یادو سیکولرزم کے نادان دوست ہیں اور نادان دوست، دانا دشمن سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ملائم سنگھ یادو کے مشیر اَمر سنگھ ہیں جن کو اپنے پیسے کا بہت گھمنڈ ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ پیسے سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ اتر پردیش میں ممبرانِ اسمبلی کو بھیڑ بکریوں کی طرح جس طرح خریدا گیا، اس میں امر سنگھ کی دولت کا ہاتھ ہے۔ امر سنگھ چاہتے ہیں کہ وہ ملائم سنگھ کو استعمال کر کے پورے ملک کو یرغمال بنالیں تاکہ یہ وسیع وعریض ملک ان کی زرخیز منڈی بن جائے۔

بابری مسجد انہدام مقدمے سے لال کرشن اڈوانی کے باعزت بری ہونے پر سب سے زیادہ غم وغصہ کا اظہار مغربی بنگال کے بڑے میاں جیوتی باسو نے کیا ہے جیوتی باسو نے کہا کہ ساری دنیا جانتی ہے کہ فساد کی جڑ لال کرشن اڈوانی ہیں، اُنہوں نے ہی رتھ یاترا نکالی تھی اور اس یاترا کے دوران پورے ملک میں خون کی ندی بہی تھی۔ مغربی بنگال کے ضلع پرولیا کے چاکدا میں بھی اڈوانی کی رتھ یاترا آئی تھی اور وہاں کے مسلمانوں کو خون میں نہلا گئی تھی۔ اُس وقت جیوتی باسو مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے۔ بڑے میاں لال کرشن اڈوانی کا نام سنتے ہیں اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ ''سے تو کریمنل'' (وہ تو جرائم پیشہ ہے)۔ جیوتی باسو بہت پرانے کمیونسٹ ہیں۔ ان کو فرقہ پرستی سے سخت نفرت ہے۔ وزیر اعظم کی حیثیت سے نرسمہا راؤ مغربی بنگال کے دورے پر آئے تو پروٹوکول کی مجبوری سے وزیر اعلیٰ جیوتی باسوان کا خیر مقدم کرنے کے لیے دمدم ہوائی اڈے گئے۔ ان سے ہاتھ ملایا مگر موذی نرسمہا راؤ نے جیوتی باسو سے معانقہ کرنا چاہا تو بڑے میاں تیزی سے پیچھے ہٹ گئے اور نرسمہا راؤ سے اپنی شدید نفرت کا اظہار کردیا۔ اس منظر کو ہزاروں لوگوں نے دیکھا

اور محسوس کیا تھا۔ جیوتی باسو نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ بابری مسجد انہدام سازش کا سرغنہ لال کرشن اڈوانی ہے اور سرغنہ ہی عدالت سے بری ہو گیا۔ ہم جیوتی باسو کی اس 100 رفیصد صداقت کی تائید کرتے ہیں مگر اس میں اتنا اضافہ اور ترمیم کرتے ہیں کہ بابری مسجد انہدام کا اصل مجرم موذی نرسمہا راؤ ہے، اسی نے سب کچھ کیا اور کرایا۔ دن کو 1 بجے چندر شیکھر نے بنارس سے نرسمہا راؤ کو ٹیلی فون کیا تھا کہ بابری مسجد کا ایک گنبد گر گیا ہے، باقی دو گنبد تو بچا لیں مگر نرسمہا راؤ ٹس سے مس نہیں ہوا اور اپنے ساتھ کانگریس کو بھی لے ڈوبا۔

عدالتیں، فیصلہ تفتیشی ایجنسیوں کی داخل کردہ رپورٹوں کی بنیاد پر کرتی ہیں، اس لیے موجودہ ہندوستان میں عدالتیں انصاف کرنے سے قاصر ہیں۔ ہماری تجویز ہے کہ جسٹس کرشنا ایر کی قیادت میں غیر سرکاری عدالت تشکیل کی جائے اور عوامی ایجنسیاں تفتیش کریں۔ وہ اپنی رپورٹوں میں نرسمہا راؤ، شرد پوار اور ایس. بی. چوہان کو بھی ملزم گردانیں۔ شرد پوار نے ہی 18رنومبر 1992 کو مسلم دشمن فرقہ پرستوں کی میٹنگ میں وزیر دفاع کی حیثیت سے نرسمہا راؤ کی سرپرستی میں بابری مسجد کے انہدام کا ناپاک منصوبہ بنایا تھا۔ اڈوانی، جوشی، اُوما بھارتی وغیرہ تو دوسرے درجے کے مجرم ہیں، اصل اور اوّل مجرم نرسمہا راؤ، شرد پوار اور ایس. بی. چوہان ہیں۔ غیر سرکاری عدالت ان مجرموں کو پھانسی کی سزا دے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس سزا کو بروئے کار لانا ممکن نہ ہوگا مگر دنیا تو جان جائے گی کہ ہندوستان پر مجرموں کی حکومت تھی اور ہے۔ (ہفت روزہ نئی صدی، کولکاتہ، شمارہ 2راکتوبر 2003)



چند آراء

# انصاف کے تقاضوں کا خون

- تکنیکی بنیادوں پر رائے بریلی عدالت نے بابری مسجد کے مقدمہ میں بلا شبہ نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ لال کرشن اڈوانی کو کلین چٹ دے دی ہے، لیکن کوئی بھی انصاف پسند سماج بابری مسجد کے انہدام کے الزام سے اڈوانی کو بری نہیں کر سکتا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ 6/دسمبر 1992 کے سیاہ دن اجودھیا میں جمع مشتعل ہجوم کی لیڈر شپ کا فریضہ اڈوانی ہی انجام دے رہے تھے۔ ان کے اس فعل کی قانونی حیثیت کچھ بھی رہی ہو اور فاضل عدالت کے سامنے کسی بھی قانونی مجبوری کے تحت وہ اس سنگین الزام سے بری کر دیے گئے ہوں، لیکن سماجی حقیقت اور ایماندارانہ سچائی یہ ہے کہ بابری مسجد کو منہدم کرنے والے باقی ملزمان کی طرح اس شرمناک فعل میں وہ برابر کے شریک ہیں۔ تاریخ ان کو کبھی معاف نہیں کرے گی اور اقتدار کی خاطر سماج کو مذہبی بنیادوں پر تقسیم کرنے اور سماج کو بانٹنے کا الزام ان کے دامن پر لگا رہے گا۔ ڈاکٹر سریندر نشچل (ہیڈ آف دی سوشیولوجی ڈپارٹمنٹ، جین ڈگری کالج)

- رائے بریلی کی عدالت سے لعل کرشن اڈوانی بری ہو گئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنے ضمیر کی عدالت سے بھی بری ہو جائیں گے یا ہندوستان کی انصاف پسند عوام ان کو معاف کر دے گی۔ اگر یہ مان لیں کہ خاص 6/دسمبر کے دن بابری مسجد کے انہدام میں وہ شریک نہیں تھے لیکن کیا اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ اس سانحہ کے جو محرکات رہے ہیں ان کے ''مہارتھی'' وہ نہیں تھے جس کا منطقی اور لازمی نتیجہ بابری مسجد کے انہدام کے سانحہ کی شکل میں سامنے آیا۔ 6/دسمبر کو بابری مسجد کو ہی نہیں ڈھایا گیا، مشترکہ کلچر اور سماجی وراثت کو بھی تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی گئی تھی۔ اپنے آپ میں یہ خود ایک سنگین جرم ہے اور کوئی بھی انصاف پسند ہندوستانی اس کے لیے اڈوانی کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

پروفیسر مہندر جوشی (صدر پرگتی شیل وچار منچ)

- رائے بریلی کی خصوصی عدالت نے بی۔ جے۔ پی۔ کے سات لیڈروں کے خلاف فردِ جرم عائد کرنے کے احکامات صادر کر دیے۔ نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی کے خلاف بادی النظر

میں کوئی جرم نہیں بنتا، اس لیے ان کو بری کر دیا۔ مہذب سماج کا بنیادی اصول ہے کہ خواہ کوئی شخص مرتبہ اور منصب کے لحاظ سے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، قانون سے بڑا کوئی نہیں۔ قانون کی نظر میں وہ دوسرے شہریوں کے برابر ہے۔ اس اصول کی روشنی میں اگر ہم 6/دسمبر کے واقعات پر نظر ڈالیں، اجودھیا کی سا کن تصاویر الیکٹرونک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کی اگر دستاویزی حیثیت سامنے رکھیں تو کیا ڈپٹی پرائم منسٹر شری اڈوانی کو تشدد کے واقعات سے بری الذمہ قرار دینا ممکن ہے؟ خود شری اڈوانی کو بھی اس پر حیرت ہوئی ہوگی کہ جس گراؤنڈ پر ان کو بری کیا گیا ہے، باقی سات ملزمان کو کیوں نہیں؟ سب جانتے ہیں کہ اڈوانی 6/دسمبر 1992 کو اجودھیا کے غیر قانونی اجتماع (Unlawfull Assembly) میں شامل تھے اور اسٹیج پر اس کا ایک حصہ تھے۔

انور علی ایڈووکیٹ (ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف مسلم لاء)

- عدالت کے فیصلہ پر رائے زنی تو ممکن نہیں، لیکن فیصلہ کے نتائج اور اثرات پر نظر ڈالیں تو عدالت کے ذریعہ بابری مسجد کی شہادت کے الزام سے نائب وزیر اعظم کو بری قرار دیا جانا عام آدمی کی نگاہ میں انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ کسی بھی راہ چلتے عام شہری سے پوچھ لیجئے اس کا ایک ہی جواب ملے گا کہ نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی کو بچانے کے لئے سرکاری ایجنسیوں نے حقائق کو توڑ موڑ کر عدالت کے سامنے پیش کیا اور واقعات وشواہد کو چھپا کر عدالت کو اندھیرے میں رکھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عدالت نے مسٹر اڈوانی کو بری کر دیا حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اڈوانی کی رتھ یاترا اور ان کے جلسوں میں کی گئی اشتعال انگیز تقاریر اور "قسم رام کی کھاتے ہیں مندر وہیں بنائیں گے" جیسے جذبات بھڑکانے والے نعروں سے ملک کی جو فضا بنی تھی بابری مسجد کی شہادت اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ اتنا ہی نہیں اجودھیا کے مشتعل ہجوم میں 6/دسمبر 1992 کو اڈوانی بذات خود شریک تھے۔ ان کی موجودگی میں ہی قانون و انصاف اور امن و آشتی کی دھجیاں اُڑائی گئی تھی اور مذہبی رواداری کو تشدد اور پاگل پن کے ہاتھوں دفن کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود اگر اڈوانی بے قصور ثابت کئے جا سکتے ہیں تو عام آدمی یہی کہے گا کہ اڈوانی کے بری کئے جانے سے انصاف کے تقاضوں کا خون ہوا ہے۔

عارف عثمانی علیگ (جنرل سکریٹری ایم اے۔ یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن)

- اڈوانی جی کو عدالت سے بری قرار دیئے جانے سے سی. بی. آئی. پر سرکاری دباؤ کا اثر صاف

دکھائی دیتا ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ ایک سازش کے تحت عدالت کے سامنے حقائق پیش نہیں کئے گئے اور اڈوانی کی لابی نے مرلی منوہر جوشی کو حاشیہ پر رکھنے کے لئے یہ ڈرامہ رچا۔ جوشی، اڈوانی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ بی۔ جے۔ پی۔ کی درونِ خانہ سیاست پر نظر رکھنے والا ہر شخص اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے۔ عدالت چاہے جو فیصلہ سنائے حقیقت یہ ہے کہ اس مقدمہ کے باقی 7 ملزمان کی طرح اڈوانی بھی بابری مسجد کے انہدام میں یکساں طور پر شریک ہیں وہ اس داغ کو نہیں دھو سکتے۔

راؤ محبوب علی خاں (سکریٹری سہارنپور روڈ کارونگ مینوفیکچرس ایسوسی ایشن)

○ ملک کی اکثریت سے اگر یہ پوچھا جائے کہ بابری مسجد کے انہدام میں اڈوانی شریک تھے تو جواب ملے گا۔ ہاں! بھاجپا اور اس کی ہمشیر جماعتوں کے کارکنان اور ذمہ داران بھی اس بات کے منکر نہیں ہیں کہ مسٹر اڈوانی ''بابری ڈھانچہ'' کو گرانے کا گورو حاصل کرنے والوں میں شامل نہیں ہیں۔ قانون کی پیچیدگیاں اور تقاضے چاہے کچھ بھی رہے ہوں اور عدالت سے اڈوانی کو بے گناہی کا سرٹیفیکٹ بھی مل گیا ہو لیکن حقائق کو بدلا نہیں جا سکتا۔ بابری مسجد کی شہادت کی تاریخ جب بھی رقم کی جائے گی اڈوانی ملزموں کی فہرست میں شامل رہیں گے۔ اڈوانی جی کے بری کئے جانے سے ایک مرتبہ پھر ثابت ہو گیا کہ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر صاحب اقتدار لوگ خود کو بے قصور اور بے گناہ ثابت کر سکتے ہیں اور قانون کے لمبے ہاتھ ان کے گریبان تک نہیں پہنچنے دیئے جا سکتے۔ جب تک قانون کی آنکھ پر پٹی بندھی رہے گی، حکمرانِ وقت اور بااثر طبقے قانون کو اسی طرح دھوکہ دے کر بری ہوتے رہیں گے اور یہ سوال اپنی جگہ قائم رہے گا کہ ہر چیز اقتدار وقت کے ہاتھوں کا آخر کھلونا کیوں ہے؟

پروفیسر جلال عمر (مشیر خاص ''سہوگ'' سماجی تنظیم)

○ بھاجپا نے اقتدار کا فائدہ اُٹھا کر سی۔ بی۔ آئی۔ کو استعمال کیا ہے اور ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں۔ اگر اڈوانی کو عدالت کے ذریعہ بابری مسجد کے معاملہ میں بری کرانے کی کوشش نہ کی جاتی تو نائب وزیر اعظم سے وزیر اعظم تک کا سفر اڈوانی کے لئے مشکل ہو جاتا۔ اٹل بہاری واجپئی کے بعد بھاجپا کے پاس دو چہرے ہیں ایک اڈوانی کا دوسرا مرلی منوہر جوشی کا۔ جوشی مخالف لابی نہیں چاہتی کہ اڈوانی کے ہوتے کل وہ وزیر اعظم کی دعویداری پیش کرنے کے

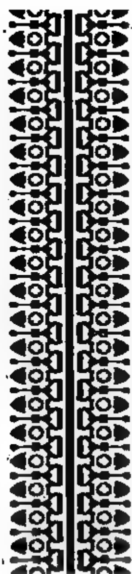
قابل رہیں اسی لئے اڈوانی کو بچانے کے لئے سی۔ بی۔آئی۔ نے کیس کو کمزور کیا ہے اور اڈوانی بری کر دیئے گئے ہیں لیکن اوپر کی عدالت سے وہ بے قصور ثابت نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اڈوانی کو سماج معاف کر سکتا ہے۔
جمشید علی (کپڑا تاجر)

- گناہ برابر گناہ ہے تو سزا بھی برابر ہونی چاہئے۔ اڈوانی جی کو بے قصور ثابت کرانے کے لئے سرکار یا بھاجپا نے جو بھی ہتھکنڈے اپنائے اور عدالت کو جس طرح گمراہ کیا اس سے قانون اور انصاف کی روح یقیناً مجروح ہوتی ہے۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اڈوانی پر بھی باقی سات ملزمان کی طرح مقدمہ چلنا چاہئے ورنہ لوگ یہی کہیں گے کہ انصاف کی نظر میں سب یکساں نہیں ہیں۔
طالب رسول (جنرل مرچنٹ)

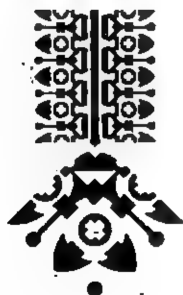
- اڈوانی جی کی رہائی پر جو سوالات اُٹھائے جا رہے ہیں ان کو کسی بھی طرح غلط نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ جہاں تک قانون کا سوال ہے اس پر تو کوئی ماہر قانون ہی کچھ کہہ سکتا ہے لیکن ایک عام آدمی کی نگاہ میں عدالت کا فیصلہ گلے نہیں اُتر رہا ہے۔ 6 دسمبر کے سانحہ پر جو کچھ نشر ہوا نہ اس کو ''چھپایا'' جا سکتا ہے اور جو کچھ لکھا گیا نہ اس کو مٹایا جا سکتا ہے۔ وہ ایک دستاویزی ہے جس میں بابری مسجد کو ڈھانے والوں کی فہرست میں اڈوانی کا نام بھی شامل رہے گا چاہے وہ کسی بھی عدالت سے بری کیوں نہ کر دیئے جائیں۔
تسنیم احمد (اردو ٹیچر)

پیشکش: شاہد زبیری

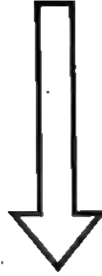






# بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں نرموہی اکھاڑے کے گواہوں کی دلچسپ داستان



رام کے بارے میں ہم نے اپنے اجداد سے سُنا ہے پڑھا نہیں ہے۔ میرے پاس جو کچھ رام کے بارے میں ہے وہ سب سُنا ہوا ہے۔

— مہنت بھاسکر داس
زموہی اکھاڑہ

## بابری مسجد ملکیت مقدمہ

# نرموہی اکھاڑے کے گواہوں کی داستان

مہنت بھاسکر کا بیان ①:-

لکھنؤ 4 ستمبر (سہارا خبر) بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں آج نرموہی اکھاڑے کے گواہ نے اپنی ایک نئی کہانی میں کہا کہ اجودھیا میں بابری مسجد میں 23-22 دسمبر 1949 کی رات میں کوئی نیا واقعہ ہی نہیں ہوا۔ اس رات ہم تین لوگ ہمیشہ کی طرح تین گنبدوں والی عمارت میں سو رہے تھے اور مسجد کے اندر چار بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ خصوصی کمشنر اور ایڈیشنل ضلع وسیشن جج نریندر پرساد کے سامنے ظفریاب جیلانی کے یہ پوچھے جانے جانے پر کہ 23-22 دسمبر کی رات میں پرم ہنس رام چندر داس کی قیادت میں کچھ شر پسندوں نے سیڑھی لگا کر زبردستی مسجد میں مورتیاں رکھ دی تھیں، اس واقعہ کی رپورٹ اجودھیا تھانے کے سب انسپکٹر رام دیو دوبے نے درج کرائی تھی، اس رپورٹ میں دوبے نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہندوؤں کی اس حرکت سے مسجد ناپاک ہو گئی ہے، اس سوال کا جواب دیتے ہوئے گواہ مہنت بھاسکر داس نے کہا کہ یہ رپورٹ تو مسلمانوں کے دباؤ میں درج کر دی گئی تھی۔ اس گواہ نے اس سے بھی انکار کیا کہ واقعہ کے دن پرم ہنس وہاں موجود تھے یا اس واقعہ کے سلسلے میں ان پر کوئی مقدمہ چلا تھا اور نہ ہی پکڑے گئے۔ اگر کوئی اس طرح کی بات کرتا ہے تو غلط کرتا ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل معاملے کے دوسرے گواہوں نے دو طرح کے بیان درج کرائے۔ کچھ گواہوں نے کہا تھا کہ 23-22 دسمبر 1949 کی رات میں بابری مسجد کے درمیانی گنبد کے نیچے رام للا پرکٹ ہوئے تھے جبکہ کچھ گواہوں نے کہا تھا کہ پرم ہنس وغیرہ نے درمیانی گنبد کے نیچے مورتیاں منبر پر رکھ دی تھیں۔ مہنت بھاسکر داس نے مزید کہا کہ واقعہ کی رات رپورٹ میں درج لوگوں کے ساتھ ساڑھے گیارہ بجے مسجد کے اندر حسب معمول میں سویا تھا۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ 23 دسمبر 1949 کو حسب معمول بھکتوں کی بھیڑ تھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس گواہ نے یہ اعتراف کیا کہ دفعہ 144 کو توڑنے کے الزام میں کچھ لوگوں کو دفعہ 188 ضابطہ فوجداری کے تحت ایک ماہ کی سزا ہوئی تھی۔ گواہ نے کہا کہ دفعہ 145 والے مقدمہ میں ان کے گرو اور پیروی کرتے تھے۔ ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ اجودھیا میں سمترا بھون راجہ وکرمادتیہ

نے نہیں بنوایا تھا۔ اس گواہ نے تین گنبدوں والی عمارت کے فرش مصلیٰ کی تصویر کو دیکھ کر اعتراف کیا کہ یہ فرش وہاں بنا تھا۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ بابری مسجد کے مبینہ مندر میں 1934 سے قبل پجاری مقرر کر دیا گیا تھا۔ گواہ نے جیلانی کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ جب بحق سرکار مسجد 1950 میں قرق کر لی گئی تھی اور وہاں ریسیور مقرر ہو گیا تھا تو ریسیور کے حکم سے میں مسجد کے اندر مندر کا پجاری ہو گیا تھا۔ 1959 تک اس جگہ کا پجاری تھا۔ جمعیت علماء ہند اور دیگر مسلم فریقوں کے وکلاء دوران سماعت موجود تھے۔ ☐ ☐

## ② 1949 سے قبل اجودھیا میں بابری مسجد اور مندر کا کوئی تنازع نہیں تھا

لکھنو، 9 ستمبر (سہارا خبر) بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں نرموہی اکھاڑے کے مہنت بھاسکر داس نے کہا کہ 1949 سے قبل اجودھیا میں بابری مسجد اور مندر کا کوئی تنازعہ ہی نہیں تھا۔ یہ تنازعہ دسمبر 1949 کے بعد شروع ہوا ہے۔ خصوصی کمشنر اور ایڈیشنل جج ضلع و سیشن جج نریندر پرساد کے سامنے نرموہی اکھاڑے کے پہلے گواہ مہنت بھاسکر داس نے ظفریاب جیلانی کی جرح کے جواب میں کہا کہ 1528 میں بابر کے ذریعے وکرمادتیہ کے اس مندر کو توڑے جانے کی بات ہم نے بزرگوں سے سنی ہے کسی جگہ پڑھا نہیں ہے۔ اس گواہ نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ بابر کے عہد میں بھی اس مسجد میں نماز نہیں ہوئی اور مسجد میں نماز پڑھنے کے سلسلے میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان 76 بار فساد ہوا۔ آخری بار 1934 میں فساد ہوا تھا۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ اجودھیا میں اس وقت وکرمادتیہ کے ذریعہ بنائی گئی کوئی عمارت موجود نہیں ہے۔

جیلانی کے ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ رام کے بارے میں ہم نے اپنے اجداد سے سنا ہے، پڑھا نہیں ہے۔ میرے پاس جو کچھ رام کے بارے میں ہے وہ سب سنا ہوا ہے۔ مہنت نے کہا کہ بالمیکی رامائن کے اشلوک کے معنی جاننے کی ہم نے کوشش نہیں کی۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ پوری اجودھیا ہی رام جنم بھومی اور ان کا محل ہے۔ اس کے علاوہ اجودھیا میں کچھ نہیں ہے۔ اس گواہ نے کہا کہ آنند رامائن کے مطابق اجودھیا کی باؤنڈری میں اجودھیا کے جنوب میں گورکھپور، مغرب میں لکھنؤ، شمال میں نیپال اور مشرق میں الہ آباد تھا۔ یہ سرحد رام کے عہد میں تھی انہوں نے یہ بھی بیان دیا کہ اجودھیا میں رام کے محل کی چہار دیواری سونے کی بنی ہوئی تھی اور

اس کے اندر محل میں جو ستون تھے ان میں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے تھے لیکن جب رام سورگ گئے ان کے ساتھ اجودھیا کے تمام باشندے چلے گئے تو یہ محل مٹی کے ٹیلے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اپنا بیان قلم بند کراتے ہوئے گواہ نے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ رام ساڑھے نو لاکھ برس قبل تھے تو کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پونے دو کروڑ برس قبل رام کا عہد تھا۔ گواہ سے جب پوچھا گیا کہ ان میں سے کون سی بات درست ہے تو گواہ نے کہا کہ میرے خیال سے دونوں باتیں درست ہیں۔ اس گواہ نے آج ایک اور نئی بات قلم بند کرائی کہ رام کے اوتار وشنو تھے جب کہ اس سے قبل گواہوں نے کہا تھا کہ وشنو نے رام اور کرشن کی شکل میں اوتار لیا تھا۔

گواہ یہ نہیں بتا سکا کہ اس 'کل یگ' کو کس 'منو' نے بنایا تھا اور ایک منو کا عہد کتنا ہوتا ہے۔ لیکن گواہ نے سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر کہا کہ موجودہ اجودھیا ہی راجہ وکرمادتیہ نے بسائی تھی۔ دورانِ سماعت جمعیۃ علماء ہند کے پیروکار اور وکیل موجود تھے۔ □ □

## ③ موجودہ اجودھیا رام چندر جی کے عہد کی ہے ہی نہیں

لکھنؤ، 11 ستمبر (سہارا خبر) بابری مسجد ملکیت مقدمے میں آج نرموہی اکھاڑے کے مدعی مدعی مہنت بھاسکر داس نے اپنا بیان قلمبند کراتے ہوئے کہا کہ رام چندر جی کے عہد کی اب اجودھیا نہیں ہے اور موجودہ سیتا رسوئی میں اب ان کے عہد کی اشیاء یعنی چولہا، بیلن چکلا بھی رام چندر جی کے زمانے کا نہیں ہے۔ خصوصی کمشنر نیز ایڈیشنل ضلع وسیشن جج نریندر پرساد کے سامنے ظفریاب جیلانی کی جرح کے جواب میں نرموہی اکھاڑے کے اس پہلے گواہ نے کہا کہ سیتا رسوئی میں موجود اشیاء کئی سو برس قدیم ہو سکتی ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے بابری مسجد کے شمال والی دیوار کی البم میں تصویر دیکھ کر کہا کہ وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ دیوار بابری مسجد کی ہے یا نہیں۔ اس گواہ نے اپنے کل اور آج کے بیان کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا کہ بابری مسجد کے دروازے کے بارے میں جو بیان دیا تھا وہ غلط تھا۔ جیلانی کے یہ پوچھنے پر کہ آپ کا خاص بیان، جو حلف نامہ کے ذریعہ عدالت میں داخل کیا ہے، اس حلف نامہ کے 24 ویں پیراگراف میں آپ نے ان البم کی جن تصاویر کی ذکر کیا ہے، وہ ان البم میں نہیں ہیں۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے گواہ نے کہا کہ حلف نامہ میں غلط لکھ دیا ہے۔ پھر کہا کہ حلف نامہ میں یادداشت کی بنیاد پر ہی ان تصاویر کا ذکر کر دیا تھا۔

انہوں نے مزید کہا کہ ان تصاویر کا البم ہم نے سرسری طور پر بہت دن قبل دیکھا تھا۔ مہنت نے ایک اور سوال کے جواب میں یہ اعتراف کر لیا کہ 1986 سے قبل یعنی بابری مسجد کا تالا کھولنے سے قبل تک مسجد کے اندر کوئی بھی سنگھاسن نہیں تھا اور تصویر دیکھ کر کہا کہ یہ سنگھاسن تالا کھولنے کے بعد رکھ دیا گیا ہوگا۔ اس گواہ نے اپنا بیان قلمبند کراتے ہوئے کہا کہ رام چبوترے پر رام کے چرن چنہ (پاؤں کے نشانات) کی تعداد آٹھ تھی اور یہ نشانات کئی برس قدیم ہیں۔ ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ سیتا رسوئی کا چولہا تو مسالے کا تھا اور بیلن چکلا وغیرہ سنگ مرمر کا تھا۔ گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ جس وقت مسجد کی قرقی یعنی دسمبر 1949 کو ہوئی تھی اس وقت مسجد میں رام اور لکشمن کی دو مورتیاں تھیں۔ جب جیلانی نے قرقی کی فائل کی فرد عدالت میں دکھائی تو اس میں رام کی دو مورتیوں کا ذکر تھا۔ اس پر گواہ نے کہا کہ فرد میں غلط لکھا ہے۔ پھر کسی سوال کے بعد گواہ نے کہا کہ رام لکشمن کی مورتی کے ساتھ بھگوان سالک رام کی 6 چھوٹی مورتیاں بھی تھیں بابری مسجد کے منبر (سیڑھی) پر رکھی تھی۔ جمعیت علماء ہند اور دیگر مسلم فریقوں کے وکلاء کے علاوہ پیروکار دورانِ عدالت سماعت عدالت میں موجود تھے۔ ☐ ☐

## ④ بابری مسجد کے باہر بنا چبوترہ دوبار بحق سرکار قرق ہو چکا ہے

لکھنؤ، 19 ستمبر (سہارا خبر) بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں نرموہی اکھاڑے کے مدعی مہنت بھاسکر داس کے بیان سے آج یہ انکشاف ہوا کہ بابری مسجد کے باہری حصے پر بنے رام چبوترے کے قبضے کو لے کر نرموہی اکھاڑے کے مہنتوں کے جھگڑے میں یہ چبوترہ دوبارہ بحق سرکار کا قرق ہو چکا ہے۔

خصوصی کمشنر نریندر پرساد کے سامنے اس گواہ سے ظفریاب جیلانی کی جرح ختم ہوگئی اور اس گواہ سے مشتاق احمد صدیقی کی جرح شروع ہوگئی۔ کل 19 ستمبر کو جمعیۃ علماء ہند اور دیگر مسلم فریقوں کی جرح اس گواہ سے ہوگی۔ نرموہی اکھاڑے کے اس گواہ نے مشتاق احمد صدیقی کے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ سب سے پہلے 1957 میں مہنت پریم داس اور مہنت گولکی رام کے درمیان جھگڑے میں رام چبوترا بحق سرکار قرق ہوا تھا۔ تقریباً دو برس بعد عدالت کے حکم سے قرقی ختم ہوگئی تھی۔ دوبارہ 1982 میں پھر چبوترہ دھرم داس اور سیارا گھو کے درمیان جھگڑے کو لے کر 145 کا

مقدمہ چلا اور چبوترہ قرق ہو گیا۔ مقدمہ آج بھی زیر سماعت ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ نرموہی اکھاڑے کی جائیداد میں اب بھی 9 گاؤں موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ 600 برس قبل نرموہی اکھاڑے کا وجود جے پور میں عمل میں آیا تھا۔ ظفریاب جیلانی کے سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ یہ تلسی داس کے عہد سے 200 برس قبل ہی نرموہی اکھاڑا وجود میں آ گیا تھا۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ بابری مسجد کے اندر جو رام کی مورتی ہے وہ چل مورتی ہے جو کہیں بھی ہٹائی جا سکتی ہے اور کہیں بھی رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن اچل مورتی ایک ہی مقام پر رہتی ہے۔ گواہ نے اس بات کو غلط بتایا کہ بابری مسجد کے صدر دروازے پر مچھلی کا نقشہ بنا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ شیر کا نقشہ بنا ہوا تھا اور خود ہی پھر کہا کہ شیر کے نیچے مچھلی کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ آج جمعیۃ علماء ہند اور دیگر مسلم فریقوں کے وکلاء دوران سماعت بیٹھے تھے۔ □ □

## ⑤ بابری مسجد میں رام للا نے ایک ہی وقت میں تین شکلوں میں اوتار لیا

لکھنؤ، 21 ستمبر (سہارا خبر) بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں نرموہی اکھاڑے کے دعوے کے مدعی مہنت بھاسکر داس نے آج اپنے بیان میں پھر ایک نئی کہانی قلم بند کرائی کہ بابری مسجد کے اندر ساڑھے 9 لاکھ برس پہلے بھگوان رام نے پہلے تو چتر بھج (چار باہوں) والے دیوتا کی شکل میں اوتار لیا اس پر کوشلیا ماتا نے بھگوان سے کہا کہ اس شکل میں اچھے نہیں لگتے۔ چنانچہ بھگوان وشنو رام لال (بچے) کی شکل میں آ کر کوشلیا کی گود میں لیٹ گئے تھے۔ گواہ نے مزید کہا کہ وہ کوشلیا کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔ اس طرح بھگوان ایک ہی دن میں تین طریقے سے اسی مقام پر اوترت ہوئے۔

خصوصی کمشنر نریندر پرساد کے سامنے نرموہی اکھاڑے کے اس گواہ نے مشتاق احمد صدیقی کی جرح کے جواب میں کہا کہ 1992 تک بابری مسجد کے باہر رام چبوترے پر رام للا لکڑی کے مندر میں تھے اس لکڑی کے مندر پر ٹین شیڈ پڑا ہوا تھا۔ ایک سوال کے جواب میں آج پھر گواہ نے اپنے سابقہ بیان کو غلط بتاتے ہوئے کہا کہ رام چبوترا 1951 میں نہیں قرق ہوا تھا بلکہ 1966 میں ہوا تھا۔ صدیقی کے یہ پوچھنے پر کہ 1966 میں پوری مسجد کا کیمپس کیا متنازعہ تھا؟ تو گواہ نے کہا کہ 1966 میں مسجد کا پورا کیمپس متنازعہ نہیں تھا، صرف رام چبوترا ہی متنازعہ تھا اور 1982 میں دوسری بار بھی رام چبوترا صرف بحق سرکار قرق ہوا تھا۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ بابری مسجد کے

شمال میں جو جنم استھان مندر ہے اس کے نام فیض آباد گونڈہ میں جائیداد ہے۔ گواہ نے یہ اعتراف کیا کہ 1966 میں جب رام چبوترے کی لڑائی دو مہنتوں کے درمیان ہوئی تھی اس مقدمے میں رام چبوترے کو رام جنم بھومی کہا جاتا تھا۔ گواہ نے اپنے بیان میں مزید کہا کہ 1991 میں جب کلیان سنگھ حکومت نے بابری مسجد سے منسلک تمام 2.77 ایکڑ زمین کو تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے خلاف نرموہی اکھاڑے نے ہائی کورٹ میں رٹ کی تھی۔ مشتاق احمد صدیقی کے ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ بابری مسجد کے صدر دروازے کے ستونوں پر کچھ لوگ کہتے ہیں، ہنومان کی شبیہہ کی نقاشی تھی۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ اجودھیا میں سب سے قدیم مندر ناگیشور ہے اس مندر میں رام کے بیٹے کش نے شیو بھگوان کی مورتی رکھی تھی، لیکن گواہ یہ نہیں بتا سکا کہ یہ مندر کب بنا تھا۔ اس گواہ نے اپنے سابقہ بیان کو غلط کہتے ہوئے کہا کہ نرموہی اکھاڑے کی یو۔ پی. میں 3 بیٹھک ہیں 4 نہیں ہیں۔ کل جو 4 کہا ہے وہ غلط ہے۔ صدیقی کے ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ 1946 سے 29/دسمبر 1949 تک بابری مسجد کے اندر کوئی نئی تعمیر نہیں ہوئی۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ بابری مسجد کے شمال میں جو رام جنم استھان مندر ہے وہ رام جنم مندر کو توڑ کر بابری مسجد کی تعمیر ہونے کے بعد بنایا گیا تھا۔ آج دوران سماعت جمعیۃ علماء ہند اور دیگر مسلم فریقوں کے وکلاء عدالت میں موجود تھے۔ آئندہ 22/ستمبر کو اس معاملہ کی سماعت کرنے والی خصوصی سہ رکنی بنچ کا اجلاس ہوگا۔ □ □ □

## ⑥ بابر یا میر باقی نے اجودھیا میں کسی مسجد کی تعمیر نہیں کرائی تھی

بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں نرموہی اکھاڑے کے دعوے کے دوسرے گواہ پنڈت راجہ رام پانڈے نے آج اپنا بیان شروع کرتے ہوئے کہا کہ 1528 میں مغل بادشاہ بابر یا اس کے کمانڈر میر باقی نے اجودھیا میں کوئی مسجد ہی نہیں بنوائی اور اجودھیا میں بابری مسجد نام کی کوئی مسجد نہیں ہے۔

جسٹس سید رفعت عالم، جسٹس کھیم کرن اور جسٹس بھنور سنگھ کی خصوصی بنچ کے سامنے آج اس گواہ سے ویریشور دویدی، اجے پانڈے، رچنا اگنی ہوتری، کے علاوہ مسلمانوں کے سینئر وکیل عبدالمنان نے اس گواہ سے جرح مکمل کر لی۔ اب اس گواہ سے ظفریاب جیلانی کی جرح شروع ہو گئی ہے۔ کل جمعیۃ علماء ہند اور دیگر مسلم فریقوں کے وکلاء کی جرح بھی اس گواہ سے ہوگی۔

عبدالمنان کے ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ وہ گزشتہ 73 برس سے اجودھیا میں رہ رہا ہے اس لیے اجودھیا کی تمام تاریخ کے بارے میں واقفیت رکھتا ہے۔ اس گواہ نے اپنے بیان میں مزید کہا کہ اس نے آج تک کسی سے بھی اجودھیا میں بابری مسجد کے بارے میں نہیں سنا ہے۔ اس گواہ کو جب 23/دسمبر 1949 کو اجودھیا تھانہ کے انسپکٹر رام دیو دوبے کی رپورٹ دکھائی گئی جس میں لکھا تھا کہ رات میں چند ہندو شر پسندوں نے مسجد میں گھس کر مورتیاں رکھ دیں جس سے مسجد ناپاک ہوگئی۔ اس رپورٹ کو گواہ نے یہ اعتراف کیا کہ اس میں لکھا ہے کہ مسجد کے اندر زبردست مورت رکھ دی گئی۔ گواہ نے حالانکہ اس بات سے انکار کیا کہ 23-22 دسمبر 1949 کی رات میں مسجد میں زبردستی مورتیاں رکھ دی گئیں تھیں۔ اس نے کہا کہ وہ 1930 سے اجودھیا میں ان مورتیوں کے درشن کرتا چلا آرہا ہے لیکن گواہ یہ نہیں بتا سکا کہ یہ مورتیاں کب سے مسجد کے اندر رکھی ہیں۔ اس گواہ نے اپنے خصوصی بیان میں کہا کہ بابری مسجد کو 1934 میں ہندو مسلم فساد میں کوئی نقصان نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ہندوؤں نے اس عمارت کو نقصان پہنچایا تھا اور اس فساد میں مسلمانوں کو جانی نقصان اُٹھانا پڑا تھا اس خوف سے مسلمان اِدھر نہیں آتے تھے۔

اس بیان میں گواہ نے کہا کہ 23/دسمبر 1949 کی رات میں زبردستی مسلمانوں کی بھیڑ مسجد کے سامنے آگئی تھی جس سے مسلمانوں کے دباؤ میں اس عمارت کو 29/دسمبر 1949 کو بحق سرکار قرق کر لیا گیا تھا۔ اپنے بیان میں گواہ نے کہا کہ 1949 میں کوتوالی اجودھیا میں ایک مسلمان دیوان تھا اور اس کوتوالی کے پاس ظہور احمد کی دکان تھی جو اس مقدمہ میں فریق ہے۔ ظہور احمد بہت مقدمہ باز ہیں۔ ☐ ☐

## ⑦ 1949 کے بعد رام چبوترے کے مغرب میں بھجن کیرتن ہوتا تھا

لکھنؤ، 30/ستمبر (سہارا خبر) بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں نرموہی اکھاڑے کے دعوے کے گواہ راجہ رام پانڈے نے اعتراف کیا کہ 29/دسمبر 1949 یعنی مسجد کے بحق سرکار قرق ہونے کے بعد مسجد کے باہر رام چبوترے کے مغرب میں بھجن کیرتن ہوتا تھا۔

یہ بیان آج یہاں انہوں نے خصوصی کمشنر اور ایڈیشنل ضلع وسیشن جج کی عدالت میں ظفریاب جیلانی کے ایک سوال کے جواب میں قلم بند کرایا۔ اس گواہ نے کہا کہ مسجد میں جو سفید پتھر لگے تھے

وہ 1930 سے دیکھتا آرہا ہے۔ گواہ نے کہا کہ چبوترہ کا رقبہ 8x10 تھا جو 1992 تک قائم تھا۔ ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ متنازعہ عمارت کا مطلب ہے کہ تین گنبد والی عمارت اور اس کے جنوبی دیوار میں لگے جنگلے۔ جیلانی کے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ اجودھیا کے محلّہ سورگ دوار میں ایک قدیمی مسجد اورنگ زیب نے بنوائی تھی اس نے مزید بتایا کہ بابری مسجد کے مغرب میں 200 گز کی دوری پر صرف دو مسلم چیکوے رہتے تھے۔ اور اسی راستے کے آگے چوراہے پر مغرب کی جانب حاجی سید اخلاق حسین رہتے تھے ان کے احاطہ میں ایک مسجد تھی اور چوراہے پر ایک مسجد ہے۔ گواہ نے کہا کہ حاجی پھیکو جو معزز شخص تھے جن کا انتقال ہو گیا ان کے دو لڑکے حاجی عبدالاحد اور حاجی محبوب، حاجی ہاشم انصاری اور ظہور کو اچھی طرح جانتا ہوں ان سے اچھی ملاقات ہے۔

آج ہائی کورٹ میں اس معاملے کی دو عدالتوں میں کارروائی جاری تھی۔ عدالت نمبر 19 میں گواہ سے بیان پر جرح ہو رہی تھی تو عدالت نمبر 17 میں اجودھیا میں کی گئی کھدائی کی ویڈیو کیسٹ کی نمائش وی.سی.آر. کے ذریعہ ٹی.وی. پر ہو رہی تھی۔ گواہ نے اچانک لنچ کے بعد کمشنر سے گذارش کی کہ اسے تیز بخار ہو گیا ہے اس لیے اب وہ مزید بیان قلم بند نہیں کرا سکتا۔ اس پر کمشنر نریندر پرساد نے مزید بیان کے لیے 30 ستمبر تک کے لیے عدالت ملتوی کر دی۔ ☐ ☐ ☐

## ⑧ 1949 کے بعد ہم نے پہلی مرتبہ بابری مسجد کا نام سنا

لکھنؤ، 1 راکتوبر (سہارا خبر) 1949 کے بعد ہم نے پہلی بار بابری مسجد کا نام نہیں سنا ہے اس سے قبل بابری مسجد کا نام نہیں سنا تھا۔ اور یہ مسجد اجودھیا میں کہاں پر ہے مجھے نہیں معلوم۔ لیکن یہ معلوم ہے تھا کہ بابری مسجد کا کوئی مقدمہ چل رہا ہے۔ یہ بیان آج نرموہی اکھاڑے کے دعوے کے مقدمے کے دوسرے گواہ راجہ رام پانڈے نے خصوصی کمشنر کے سامنے بابری مسجد ملکیت مقدمے میں دیا۔

خصوصی کمشنر اور ایڈیشنل ضلع وسیشن جج نریندر پرساد کے سامنے ظفریاب جیلانی کی جرح میں کہا کہ گواہی میں آنے سے قبل یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ مقدمہ بابری مسجد کا چل رہا ہے۔ انہوں نے پھر مزید کہا کہ 22 ستمبر کو جب اس مقدمے میں عبدالمنان نے ہم سے جرح شروع کی تھی تب معلوم ہوا جس کو ہم لوگ جنم مندر کہتے ہیں اس کو مسلمان بابری مسجد کہتے ہیں۔ جیلانی کے ایک سوال کے

جواب میں گواہ نے بتایا کہ 1934 سے ہندی اخبار پڑھ رہا ہوں لیکن گواہ نے اس سے انکار کیا کہ 1986 میں شیلانیاس اور 1949 میں بابری مسجد کی قرقی کی بابت ہندی اخبار میں لفظ بابری مسجد کا نام نہیں پڑھا۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ اجودھیا کے محلّہ بیگم پورہ میں اب مسلم آبادی میں توسیع ہوگئی ہے۔ لیکن 1949 میں وہاں آبادی بہت کم تھی۔ انہوں نے مزید کہا کہ محلہ میران پورا میں اس وقت کوئی آبادی نہیں ہے لیکن گواہ یہ نہیں بتا سکا کہ 23/دسمبر 1949 کو دو ڈھائی سو مسلمان بابری مسجد کے باہر شور کر رہے تھے وہ کون سے مسلمان تھے جب کہ گواہ نے ہر محلے کے مسلمانوں کا نام جاننے کا دعویٰ کیا تھا۔ گواہ نے بتایا کہ بابری مسجد کے مغرب کی دیوار سے پونے دو سو گز دور امیر چیکوے کا مکان بنا ہے۔

گواہ کو جب اس کا 28/ستمبر کا بیان دکھایا گیا اور کہا کہ آپ نے بیان دیا ہے کہ جہاں وہ رہتے ہیں اُنول مندر سے دیکھا تھا کہ 23/دسمبر 1949 کو دو ڈھائی سو مسلمان مسجد کے باہر تھے اور مسجد کے اندر 300 ہندو تھے۔ لیکن آج بیان دیا ہے کہ اس مندر سے صرف ہم کو مسلمان دکھائی دے رہے تھے تو گواہ نے کہا کہ پہلے کا بیان غلط لکھ لیا گیا تھا۔ جمیعت علماء ہند اور دیگر مسلم فریقوں کے وکلاء موجود تھے جب کہ عدالت نمبر 17 میں آج بھی اجودھیا کی کھدائی کی ویڈیو نمائش بھی ہوئی۔ □

## ⑨ وی.ایچ.پی. کے کہنے پر ہی اجودھیا میں کارسویک جمع ہوئے تھے

لکھنؤ، 2/اکتوبر (سہارا خبر) 6/دسمبر 1992 کو جب بابری مسجد گرا دی گئی تو ہم کو سخت افسوس ہوا تھا کیوں کہ بھگوان چھت کی جگہ اب ٹاٹ میں ہیں۔ یہ بیان بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں نرموہی اکھاڑے کے دعویٰ کے دوسرے گواہ راجہ رام پانڈے نے درج کرایا۔

خصوصی کمشنر اور ایڈیشنل ضلع وسیشن جج نریندر پرساد کے سامنے ظفریاب جیلانی کی جرح کے جواب میں گواہ نے کہا کہ بابری مسجد کو وشو ہندو پریشد کے لوگوں نے گرایا تھا اور وشو ہندو پریشد کے کہنے سے ہی اجودھیا میں کارسیوک جمع ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ڈھانچہ گرانے والوں نے یہ بہت کیا تھا، گواہ نے کہا کہ اس واقعہ کے بعد اجودھیا میں مسلمان مارے گئے گھر جلائے گئے تھے اس وجہ سے بہت سے مسلمان وہاں سے کہیں اور چلے گئے تھے ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ 6/دسمبر 1992 کے بعد سے اب تک بہت سے ہندی اخبار پڑھے لیکن میری جانکاری میں نہیں ہے

کہ ان خبروں میں بابری مسجد کا ذکر آیا ہو۔ جیلانی کے ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ اس نے نہیں سنا کہ وہ ڈھانچہ بابر کا بنایا ہوا تھا، ہم تو اس عمارت کو مندر ہی سمجھتے تھے۔

جیلانی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے راجہ رام پانڈے نے کہا کہ مجھے یاد نہیں ہے کہ تالا لگنے کے بعد وہاں کسی مسلمان نے نماز پڑھنے کی کوشش کی ہو۔ گواہ نے یہ بھی کہا کہ اسے یاد نہیں کہ محمد ہاشم انصاری اور دوسرے مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی کوشش میں سزا ہوئی ہو۔ گواہ نے اس کا اعتراف کیا کہ تالا کھلنے کے ایک ماہ بعد مسلمانوں نے یومِ سیاہ منایا تھا۔ جیلانی کے ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ 23/دسمبر 1949 سے بابری مسجد کے اندر تالا لگا دیا گیا تھا اور یہ تالا پولس نے لگایا تھا۔ اس تالے کو کھولنے کے لیے 1983 سے وشو ہندو پریشد نے تحریک شروع کر دی تھی اس سلسلے میں لکھنؤ سے اجودھیا تک ایک یاترا نکالی گئی تھی جہاں سرجو ندی پر حلف لیا گیا کہ بابری مسجد کی جگہ ہی مندر بنائیں گے۔ گواہ نے کہا کہ نرموہی اکھاڑے کے مہنت بھاسکر داس کے کہنے پر گواہی دینے آیا ہوں۔ جیلانی کے ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ ہم نے نہیں سنا کہ کانگریس کے بزرگ لیڈر پنڈت کملا پتی ترپاٹھی نے اعلان کیا تھا کہ اگر بابری مسجد کے پاس شلانیاس ہوا تو پہلا پھاوڑا ان کے سر پر چلے گا۔ آج دوران سماعت جمعیت علماء ہند اور دیگر مسلم فرقوں کے وکلاء موجود تھے اب اگلی گواہی 8/اکتوبر کو ہوگی۔

## ⑩ ''شنکر بھگوان'' ہنومان کی شکل میں رام کی خدمت کرنے آئے تھے

لکھنؤ، 15/اکتوبر (سہارا خبر) بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں نرموہی اکھاڑے کے دعویٰ کے گواہ راجہ رام پانڈے نے اپنا بیان قلم بند کراتے ہوئے کہا کہ بھگوان شنکر ہنومان کی شکل میں رام کی خدمت کرنے آئے تھے۔ بھگوان شنکر کو برہما نے اس کام کے لیے بھیجا تھا۔ خصوصی کمشنر اور ایڈیشنل ضلع وسیشن جج نریند پرساد کے سامنے ظفریاب جیلانی کی جرح کے جواب میں گواہ نے کہا کہ 1934 کے اجودھیا فساد میں مسجد کی دیوار کو نقصان پہنچا تھا اس کی مرمت 1949 تک نہیں کرائی گئی تھی۔ گواہ نے اس بات کو غلط بتایا کہ اس فساد میں بابری مسجد کے گنبد اور فرش کو بھی نقصان پہنچا تھا اور اس مسجد کی مرمت کے لیے انگریز حکومت نے ہندوؤں سے ہرجانہ لے کر مسجد کی مرمت کرائی تھی۔ جیلانی کے ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ ہنومان جی کی شکل اور مورتی کے بارے

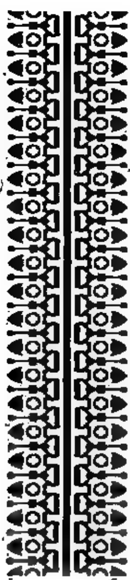
میں رام چرت مانس میں ذکر آیا ہے۔ رام چرت مانس میں ہنومان کو پہاڑ کی طرح بتایا گیا ہے۔ گواہ نے مزید بتایا کہ رام چرت مانس میں ہنومان کو بندر بھی بتایا ہے اور وہ اپنے کو مچھر کے برابر بھی کر لیتے تھے جب وہ سیتا جی کی تلاش میں لنکا گئے تھے تو مچھر کی ہی شکل میں گئے تھے۔ ایک اور سوال کے جواب گواہ نے کہا کہ بابری مسجد کے جنوبی دروازے کے ستون پر ہنومان کی شبیہہ بنی ہے وہ پہاڑ والی نہیں ہے بلکہ چھوٹی ہے۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ برہما جی نے دیوتاؤں سے کہا تھا کہ بندروں کی شکل میں جا کر بھگوان کی خدمت کرو۔ دورانِ سماعت آج جمعیۃ علماء ہند اور دیگر مسلم فریقوں کے وکیل عدالت میں موجود تھے۔ □ □

## ⑪ میں نے نہیں پڑھا کہ بابر نے مندر توڑ کر مسجد بنوائی تھی

### نرموھی اکھاڑے کے تیسرے گواہ ستیہ نرائن ترپاٹھی کا بیان

لکھنؤ، ۹ر نومبر (سہارا خبر)۔ بابری مسجد ملکیت مقدمہ میں نرموہی اکھاڑے کے دعوے کے تیسرے گواہ ستیہ نرائن ترپاٹھی نے اپنا بیان قلم بند کراتے ہوئے کہا کہ اس نے کسی بھی کتاب میں یہ نہیں پڑھا کہ بابر نے اجودھیا میں مندر توڑ کر مسجد بنوائی تھی۔ اس گواہ نے یہ بھی اعتراف کیا کہ مغل بادشاہ بابر اجودھیا بھی کبھی نہیں آیا تھا۔ کیوں کہ کسی بھی کتاب میں اس کا ذکر نہیں آیا ہے کہ بابر اجودھیا آیا تھا۔

جسٹس سید رفعت عالم، جسٹس کھیم کرن، جسٹس بھنور کے سامنے ظفریاب جیلانی کے ایک سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ بابری مسجد کے اندر جو 12 ستون لگے تھے اس میں کسی دیوی دیوتا کی نشست بنی تھی یا نہیں میں یہ نہیں بتا سکتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ وہ سرسوتی ششو مندر میں پرنسپل کے عہدہ پر ہیں۔ گواہ نے اس سے انکار کیا کہ یہ ششو مندر آر. ایس. ایس. کے زیر نگرانی چلتے ہیں۔ گواہ نے کہا کہ اس اسکول کے نصاب میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ اجودھیا میں رام مندر کو منہدم کر کے بابر نے وہاں بابری مسجد بنوائی تھی۔ گواہ نے یہ بھی اعتراف کیا کہ اس کے مطالعہ کے مطابق مغل بادشاہ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کوئی بھی اجودھیا نہیں آیا اور نہ ہی اس سلطنت کی جانب سے اجودھیا پر کبھی حملہ ہوا۔ گواہ نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا کہ بابری مسجد کے اندر کب مورتیاں رکھی

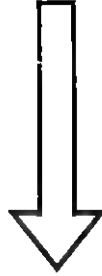









# وشو ہندو پریشد (V.H.P.) کے عزائم



وی. ایچ. پی. ایک پلان کے تحت کام کر رہی ہے،
اس کے لیڈر من مانے طریقے سے،اشتعال انگیز تقریروں
کے ذریعہ فساد کراکے حکومتِ ہند کو بلیک میل کر
رہے ہیں لیکن ہماری سرکار عالمی دہشت گردی سے
لڑائی کی بات کر رہی ہے جبکہ سرکار کو ایسے مشتبہ
افراد کے خلاف فوراً کارروائی کرنی چاہئے. یہ لوگ
ملک میں دہشت گردی کو بڑھاوا دے کر ملک کو
تباہ کرنے پر آمادہ ہیں. وی. ایچ. پی. نے گجرات کے
فارمولے کو شمالی ہند میں دھرانے کی کوشش کی ہے.
گجرات کے بعد اتر پردیش ان کے نشانہ پر ہے...

وی. پی. سنگھ
(سابق وزیر اعظم)

# فرقہ وارانہ تعصب کو ہوا دینے کی سازش

از: سریندر موہن (سابق ممبر پارلیمنٹ)

گجرات میں عام اسمبلی انتخابات میں جیت اور ہماچل پردیش میں ہار سے بی. جے. پی. نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کے پاس الیکشن میں کامیابی کا صرف وہی پرانا آزمودہ نسخہ ہے کہ فرقہ وارانہ تعصب کو ہوا دی جائے، اب جبکہ یکم دسمبر کو دہلی، راجستھان، مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ میں اسمبلیوں کے عام انتخاب ہوں گے، تو اُس نے وی. ایچ. پی. کے ذریعہ اس نسخہ پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ چونکہ یہ انتخابات پہلے سے متوقع تھے، اس لیے وی. ایچ. پی. نے ایک ماہ پہلے ہی 17 راکتوبر کی تاریخ طے کر دی تھی کہ رام بھگت بڑی تعداد میں اجودھیا میں جمع ہوں گے اور بھگوان رام کی آرتی اور پوجا کریں گے۔ اس وقت ان کو یہ خیال بھی رہا ہوگا کہ ایک ایسی حکومت اتر پردیش میں ہے، جس میں بی. جے. پی. کی حصہ داری ہے اور تب تو ارادے بہت بلند تھے، لیکن اس حکومت کے جانے کے بعد جب سماج وادی پارٹی کے رہنما ملائم سنگھ یادو کی حکومت بنی تو وہ اس واہمہ کی شکار ہوگئی کہ وہ بی. جے. پی. کی مرکزی حکومت اور گورنر وشنو کانت شاستری کے ممنوں ہوں گے، جنہوں نے اس حکومت کو بننے کا موقع دیا، حالانکہ اس کے سوا چارہ نہ تھا، کیونکہ راجیہ سبھا کسی دوسرے اقدام کو منظور نہ کرتی۔ بی. جے. پی. عام انتخابات بھی نہیں چاہتی تھی، جو کہ بی. ایس. پی. کی مراد تھی۔

بہر حال وی. ایچ. پی. نے جو ماحول میں زہر آلودگی پیدا کی ہے، اُس کا اندازہ اس بات سے لگ جاتا ہے کہ اُس کے بین الاقوامی جنرل سکریٹری پروین توگڑیا نے یہ اعلان کر دیا کہ اگر رام بھگتوں کو اجودھیا پہنچنے کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالی گئیں تو پورا ملک جل کر خاک ہو جائے گا۔ اُنہوں نے یہ بھی دھمکی دی کہ بڑے پیمانہ پر تشدد کے واقعات رونما ہوں گے۔ ان دھمکیوں سے وہ نئی حکومت کو مرعوب کرنا چاہتے تھے اور عوام میں نفرت کا ایک جنون بھی پیدا کرنا چاہتے تھے، لیکن انہوں نے ملائم سنگھ یادو کی اس تصویر کو فراموش کر دیا جو اُنہوں نے 1990 میں پیش کی تھی۔ اُن کی غلط فہمی تو صوبائی حکومت کے سخت اقدامات نے دور کر دی اور اب آچاریہ گری راج کشور، جو کہ وی. ایچ. پی. کے نائب صدر ہیں، کی گرفتاری سے وی. ایچ. پی. کے حوصلے کچھ پست ہوئے ہیں، لکھنؤ میں اس ریلی کا حشر بھی اُس کے عزائم پر گہری چوٹ ہے۔ بنارس، کانپور اور آگرہ وغیرہ کے بعد اجودھیا میں بڑی تعداد میں گرفتاریاں بھی یہ

ظاہر کرتی ہیں کہ حکومت قانون اور امن کی پوری حفاظت پر کاربند رہی۔ صوبائی حکومت کی سختی سے گھبرا کر وی.ایچ. پی. نے سنگھ کے سب سے اونچے رہنما جناب سدرشن صاحب سے مداخلت کی درخواست کی اور دوسری طرف وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کے خلاف بھی مہم شروع کر دی۔ شری سدرشن نے مرکزی حکومت اور خاص کر بی. جے. پی. کی مرکزی لیڈر شپ پر زور ڈالا، اس کے نتیجے کے طور پر پہلے تو وزیر اعظم نے ملائم سنگھ یادو کو یقین دلایا کہ اجودھیا میں وی.ایچ. پی. سب کچھ امن و قانون کو ملحوظ خاطر کر کے ہی کرے گی، البتہ جو وی.ایچ. پی. ایسی ہی یقین دہانیوں کے باوجود 6 ر دسمبر 1992 کو کارگزاری دکھا چکی ہے، اس کے بعد اس بات کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی ہے کہ اس پر اعتبار کیا جائے۔ اب ڈپٹی پرائم منسٹر صاحب جناب لال کرشن اڈوانی نے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو سے فون پر بات چیت کی اور یہ مشورہ دیا کہ وہ ٹکراؤ کو ٹالیں۔ سوال یہ ہے کہ ٹکراؤ پیدا کون کر رہا ہے؟ عدالت کے فیصلہ کی خلاف ورزی کون کر رہا ہے؟ قانون کو اپنے ہاتھوں میں کون لے رہا ہے؟ نفرت کی آگ اور تشدد کے امکانات کو کون بڑھا رہا ہے؟

مرکزی حکومت کے 2 دیگر وزراء ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی اور شری راج ناتھ سنگھ یقین دہانی کرانے والے بیانات دے چکے ہیں۔ وہ وی.ایچ. پی. سے بھی کہہ سکتے تھے کہ اجودھیا میں بھیڑ اکٹھی نہ کرے اور ملک میں اشتعال انگیزی سے باز آئے۔ وہ اپنے آئینی فرائض سے کوتاہی کیوں کر رہے ہیں؟ رام کی پوجا گھر گھر میں ہوتی ہے، جیسے شیو، ہنومان، کرشن کی ہوتی ہے۔ لیکن وی.ایچ. پی. اور سنگھ گروہ کو تو طاقت حاصل کرنے کا ہر طریقہ اپنانا ہے، وہ آئینی ہو یا غیر آئینی اور اس سے چاہے کتنی آگ پیدا ہو۔ عوام کی خوش حالی اور بہبودی سے اس گروہ کو کوئی سروکار نہیں ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پانچ برس میں عوام اس سے بیزار ہو گئے ہیں۔ انتخابات میں ناکامی کے امکان سے خوف زدہ اس گروہ کی کوشش ہے کہ وہ نفرت میں اضافہ کر کے تشدد کی بنا پر اقتدار پر قبضہ کرے۔ ہر ذی ہوش انسان اور ہر ایک وطن پرست ہندوستانی کو محتاط ہونا چاہئے کہ ملک کی بربادی کی اس سازش کو کامیاب نہ ہونے دیں۔ گزشتہ سال وہ 15 ر مارچ کو یہی تماشا اسی اجودھیا میں کر رہے تھے اور اس بار 17 ر اکتوبر کو کیا۔ نہ جانے کب تک یہ عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنا اُلو سیدھا کرنے میں لگے رہیں گے۔ □ □

ردِ عمل

# حصول اقتدار کے لئے خطرناک کھیل

وی. پی. سنگھ (سابق وزیر اعظم)

ملک کے حالات بہت نازک ہیں۔ سنگھ پریوار اقتدار کے حصول کے لئے خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔ عدلیہ و آئین کی بالادستی اور قانونی اداروں کا وجود خطرے میں ہے۔ ان حالات میں عوام میں بیداری کی سخت ضرورت ہے۔ مرکزی حکومت کو پارٹی کے مفاد سے اوپر اُٹھ کر فیصلہ لینا چاہئے۔ وزیر اعظم کو پہل کر کے حالات کو نارمل بنانے کے لئے اقدام کرنے چاہئیں۔ جب جب انتخابی دور شروع ہوتا ہے تب تب وشو ہندو پریشد جیسی فاشست طاقتیں مندر کا سوال اُٹھا کر ملک میں نفرت کا ماحول پیدا کر دیتی ہیں۔ ان ہی طاقتوں نے گجرات میں بھی یہی کیا جس کے خوفناک نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ وی. ایچ. پی. ایک پلان کے تحت کام کر رہی ہے، اس کے لیڈر من مانے طریقے سے اشتعال انگیز تقریروں کے ذریعہ فساد کرا کے حکومت ہند کو بلیک میل کر رہے ہیں لیکن ہماری سرکار عالمی دہشت گردی سے لڑائی کی بات کر رہی ہے جبکہ سرکار کو ایسے مشتبہ افراد کے خلاف فوراً کارروائی کرنی چاہئے۔ یہ لوگ ملک میں دہشت گردی کو بڑھاوا دے کر ملک کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں۔ وی. ایچ. پی. نے گجرات کے فارمولہ کو شمالی ہند میں دہرانے کی کوشش کی ہے۔ گجرات کے بعد اتر پردیش ان کے نشانہ پر ہے۔ لیکن یہ لوگ وہاں کامیاب نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ جنوبی ہندوستان کو بھی اپنا نشانہ بنا رہے ہیں لیکن وہاں بھی انہیں کامیابی نہیں ملے گی۔ اپنے منصوبے ناکام ہوتے دیکھ کر اب یہ لوگ سماج میں نفرت پھیلا کر فساد کرانے پر آمادہ ہیں تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں۔ گجرات کا زہر اجودھیا میں پھیلا کر یہ لوگ دہشت و خوف کے ذریعہ فساد کرا کے اپنے ہاتھوں میں اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں جمہوریت سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ان حالات میں جمہوریت میں یقین رکھنے والی پارٹیوں اور عوام کو متحد ہو کر ان نازک حالات کا مقابلہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ ملک کو آزادی ملنے کے بعد بابائے قوم مہاتما گاندھی نے ہندو مسلم سکھ عیسائی میں آپسی بھائی چارہ پیدا کر کے بھارت کی تعمیر کی۔ جس اتحاد کے ذریعہ ہمیں آزادی ملی تھی ہمیں اسے اسی طرح برقرار رکھنا چاہئے۔ وی. ایچ. پی. اور بی. جے. پی. ایک ہی سکہ کے دو پہلو ہیں یہ اپنے مشن کو انجام دینے میں مشغول ہیں۔ یہ لوگ الگ الگ خطوں میں مختلف طرح کی

کارروائیوں کے ذریعہ اپنی مہم کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے دفعہ 370، یکساں سول کوڈ اور مندر مسجد مسئلہ کو گزشتہ اسمبلی و پارلیمنٹ الیکشن میں بھنانے کی کوشش کی لیکن یہ لوگ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہیں ہو سکے اب ان کا آخری ہتھیار ملک کے کسی بھی حصہ میں دنگا کرا کے اپنے منصوبوں میں کامیاب ہونا ہے۔ ☐ ☐

ردعمل

# وی.ایچ.پی.لیڈروں پر پوٹا کیوں نہیں؟

سید شہاب الدین (سابق ممبر پارلیمنٹ)

اجودھیا میں نام نہاد رام بھگتوں کے عزائم کو اجودھیا کے عوام اور حکومت اتر پردیش نے جن جن تدبیر سے ناکام بنایا ہے اس کے لیے عوام اور حکومت دونوں قابل مبارکباد ہیں۔ وی.ایچ.پی.کی سنکلپ ریلی کا ڈرامہ پرامن طور پر اختتام پذیر ہوگیا اور یہ اس لیے ممکن ہوسکا کہ ایک طرف حکومت یو.پی.نے فیصلہ کن اقدامات کیے اور دوسرے عوام نے وی.ایچ.پی.کا ساتھ نہیں دیا۔ 15/اکتوبر سے 17/اکتوبر تک جو واقعات ظہور میں آئے ان سے پتہ چل گیا کہ وی.ایچ.پی.کا اجودھیا، اجودھیا سے باہر اور ملک کے دوسرے حصوں میں کوئی اثر نہیں ہے اور یہ کہ اجودھیا کے عوام کے ساتھ ساتھ سنتوں اور مہنتوں نے بھی خود کو اس سے الگ کرلیا۔

وی.ایچ.پی.کے مایوس اور مشتعل رضاکار اجودھیا میں تھوڑی تعداد میں آباد مسلم شہریوں کو انتہا پسندی کا نشانہ بناسکتے تھے مگر حکومت یو.پی.نے کم سے کم طاقت استعمال کرتے ہوئے سیکورٹی کا ایسا نظم کیا کہ کوئی ناپسند واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اس کے لیے ملائم سنگھ خاص طور پر قابل مبارکباد ہیں۔ یہ بات فہم سے بالاتر ہے کہ وی.ایچ.پی.نے تحویل شدہ اراضی کو مندر کی تعمیر کے لیے اپنے حوالہ کیے جانے کا مطالبہ لے کر اجودھیا میں ہی کیوں پروگرام رکھا، جبکہ یہ اراضی مرکزی حکومت کی تحویل میں ہے اور ریاستی حکومت سے اس کا کوئی لینا دینا نہیں ہے اور اس کو منتقل کرنے کے لیے قانون سازی پارلیمنٹ کے دائرہ اختیار میں ہے۔ ریاستی حکومت وی.ایچ.پی.کے مطالبات کو پورا نہیں کرسکتی لہٰذا وی.ایچ.پی.کو اپنا احتجاج اجودھیا کے ماحول کو نہ چھیڑتے ہوئے دہلی میں منظم کرنا چاہئے تھا۔ لیکن وی.ایچ.پی.کا مقصد سیاسی تھا جس کے تحت اجودھیا میں تشدد بھڑکانا اور ہندو جذبات کو بھڑکا کر آئندہ اسمبلی الیکشن میں بی.جے.پی.کے لئے ہندو ووٹ حاصل کرنا تھا۔ ایسے میں مرکز اور تمام متعدد ریاستی حکومتوں کو چاہئے کہ وہ وی.ایچ.پی.کی اشتعال انگیزی خاص طور پر پروین توگڑیا کے زہریلے بیانات کی پاداش میں وی.ایچ.پی.لیڈروں پر پابندی عائد کرے اور ان پر پوٹا لگادیں کیونکہ ان کا مقصد مسلمانوں کو خوف زدہ کرنا ہے۔

☐ ☐

ردعمل

# سنگھ پریوار کو مرکز کی حمایت حاصل

جنیشور مشر (سینئر نائب صدر سماجوادی پارٹی)

نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانے نے اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کو اجودھیا میں وشو ہندو پریشد کے کارکنان کو اجودھیا میں داخل ہونے کی اجازت دینے کا مشورہ دیا ہے۔ اس مشورہ کے لئے ان کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ چلایا جانا چاہئے۔ سپریم کورٹ نے متنازعہ مقام پر صورتحال کو جوں کا توں برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے۔ عدالت کے اس حکم کے پیش نظر ملائم سنگھ یادو جی نے اجودھیا جانے والے وشو ہندو پریشد کے مشتعل کارکنان پر سختی کا رویہ اختیار کیا۔ الہ آباد ہائی کورٹ نے بھی ریاستی حکومت کو حکم دیا ہے کہ اجودھیا میں غیر قانونی اجتماع نہ ہونے دیا جائے۔ ایک طرف تو عدالتیں اجودھیا میں وشو ہندو پریشد کے کارکنان کے اجتماع کو روکنے کا حکم دے رہی ہیں اور دوسری طرف ملک کے نائب وزیر اعظم نے ریاستی وزیر اعلیٰ کو مشورہ دیا کہ وہ اجودھیا جانے والے وی.ایچ. پی. کے کارکنان کو نہ روکیں۔ لال کرشن اڈوانی ملک کے وزیر داخلہ ہیں اور عدالتی احکامات پر عمل درآمد کرانا ریاستی حکومت کے ساتھ ساتھ مرکزی حکومت کی بھی ذمہ داری ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے ملائم سنگھ یادو کو یہ مشورہ دے کر عدالت کی توہین کی ہے۔ ان کے خلاف توہین عدالت کی کارروائی کی جانی چاہئے۔ اتر پردیش میں سماجوادی پارٹی کی حکومت ہے جس کی پیدائش عوامی تحریکات کے نتیجے میں ہی ہوئی ہے۔ ملائم سنگھ یادو، رام منوہر لوہیا اور چودھری چرن سنگھ کے پیروکار ہیں۔ ہم عوامی جذبات کا احترام کرتے ہیں لیکن آئین اور عدلیہ کی توہین کرنے والوں سے نمٹنا بھی جانتے ہیں۔ حکومت کو عوام کے تئیں اور لچیلا رویہ اختیار کرنا چاہئے لیکن ہماری اس سوچ کا ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی گئی تو حکومت ایسے عناصر کو ایسا سبق سکھائے گی کہ آئندہ لوگ کبھی آئین اور عدلیہ کے ساتھ کھلواڑ کی بات سوچ بھی نہیں سکیں گے۔

□ □

نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی نے ملائم سنگھ یادو کو اجودھیا جانے والے وشو ہندو پریشد کارکنان کو نہ روکنے کا جو مشورہ دے کر نامناسب کام کیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سنگھ پریوار کو مرکزی حکومت کی خاموش حمایت حاصل ہے۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے بھی پہلے یہ کہا تھا کہ وشو ہندو پریشد پر بھروسہ کیا جانا چاہئے کیونکہ اس نے اپنا 17 را کتوبر کا پروگرام پرامن طور پر کرنے کا یقین دلایا

ہے۔ واجپئی کے یہ کہنے کے بعد ہی اڈوانی نے ملائم سنگھ یادو کو یہ مشورہ دیا ہے۔ اجودھیا کے لئے ریل گاڑیاں بند نہ کرنے کا فیصلہ بھی مرکزی حکومت نے سنگھ کے دباؤ میں ہی کیا۔ اس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ سنگھ پریوار کو مرکز کی کس طرح حمایت مل رہی ہے۔ بی۔ جے۔ پی۔ اور وشو ہندو پریشد نے 1992 میں بھی یہ یقین دلایا تھا کہ سب کچھ پر امن طور پر ہوگا لیکن دنیا نے دیکھا کہ 6 ردسمبر کو کیا ہوا۔ دراصل سنگھ پریوار اجودھیا میں پوجا کے نام پر شر پسندی اور مندر تعمیر کے نام پر فرقہ وارانہ تشدد کی سیاست میں مصروف ہے لیکن اب اسے اجودھیا مسئلہ پر جنون پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ملے گی۔ لوگوں کو معلوم ہو چکا ہے کہ بی۔ جے۔ پی۔ کے لئے مندر صرف انتخابی ایشو ہے اس لئے اب وہ جھانسے میں نہیں آئیں گے۔ پانچ ریاستوں میں آئندہ اسمبلی انتخابات اور لوک سبھا انتخابات کے پیش نظر ایک بار پھر فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سیاست میں مذہبی یا جذباتی معاملات کو ایشو بنانے کی جگہ عوام سے جڑے سوالات جیسے غریبی، بھکمری، بے روزگاری، ناخواندگی وغیرہ کو ایشو بنانا چاہئے۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ سماج اور ملک مخالف زعفرانی طاقتوں کے خلاف سڑکوں پر اُتریں اور عوامی مسائل کو لے کر تحریک چلائیں۔

کمیونسٹ پارٹیاں

(بشکریہ: راشٹریہ سہارا، اُردو)



# وی۔ایچ۔پی۔ کی خطرناک کوشش ناکام لیکن...؟

از: چتورانن مشرا (سابق مرکزی وزیر)

اجودھیا میں 17 ستمبر کا واقعہ اور کانپور مغل سرائے، الہ آباد وغیرہ شہروں میں کارسیوکوں کا جیل توڑنا واضح کرتا ہے کہ وشو ہندو پریشد کورٹ کے احکامات کو نہیں مانے گی اور اپنی من مانی پر آمادہ رہے گی۔ سپریم کورٹ کے حکم کے خلاف وہ متنازعہ مقام پر ہنگامہ آرائی کر رہے تھے پولس پر پتھر پھینک رہے تھے، یہ سب نے ٹی۔وی۔ پر دیکھا۔ سنگھل صاحب گرفتار ہونے کے خلاف نہ صرف خود احتجاج کر رہے تھے بلکہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ یہ جگہ ان کی ہے وہاں وہ جلسہ کریں گے۔ سپریم کورٹ کا حکم ان کے لئے کوئی معنیٰ نہیں رکھتا۔ پھر وزیر اعظم کے یہ کہنے کا کیا تک ہے کہ رام جنم بھومی کا معاملہ عدالت کے ذریعہ ہی حل ہوگا۔

جس طرح اشوک سنگھل اور کارسیوکوں نے عدالتی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پولس پر پتھراؤ کیا اور گولی چلوانے کی کوشش کی اس سے یہ واضح ہے کہ ان کا ارادہ کیا کرنے کا تھا۔ اتنا سب کچھ ہونے پر بھی وزیر اعظم اور نائب وزیر اعظم ان ہی کارسیوکوں پر اعتماد کرنے کے لئے عوامی اپیل کر رہے تھے۔ ملائم سنگھ یادو بھی نرم ہو گئے اور انہوں نے چھوٹے چھوٹے جتھوں میں رام للا کا درشن کرنے کے انتظام کرنے کا حکم بھی دے دیا۔ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ وشو ہندو پریشد کی اس قطعی ناجائز حرکت کو یہ کہہ کر حمایت دے رہے تھے کہ کارسیوکوں کو درشن کرنے دیا جائے۔ درشن کے بہانے وہ ہنگامہ مچانا چاہتے تھے۔ اس پر وزیر داخلہ پردہ ڈال رہے تھے۔ غیر قانونی تحریک کو وزیر داخلہ نے مذہبی شکل دینے کی پوری پوری کوشش کی۔

کارسیوکوں نے گجرات کے آدی واسیوں کو اور دوسری جگہوں سے بھی آدیواسیوں کو بڑی تعداد میں لانا یہ واضح کرتا ہے کہ ان کا ارادہ ٹکراؤ کا تھا۔ کارسیوکوں کو معلوم تھا کہ مرکزی حکومت ان کے ساتھ ہے اس لئے وہ کھل کر ہنگامہ مچا رہے تھے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی اور سنگھ پریوار بہت ہی گہری سازش سے کام لے رہے ہیں اور آئین ہند کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ یہ بات کوئی پوشیدہ نہیں جگ ظاہر ہو چکی ہے۔ گجرات میں فسادات کروا کر

اشتعال پیدا کرنے کے بعد بھی انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کی کوشش کی گئی اور جب الیکشن کمیشن نے دھاندلی کو روکنا چاہا تو چیف الیکشن کمیشن پر لگاتار الزامات عائد کئے گئے۔ فسادات کے مقدموں میں پولس کی مدد سے گواہوں کو ڈرا دھمکا کر نظام عدلیہ کا کیسا مذاق اُڑایا گیا یہ بیسٹ بکری کیس سے ظاہر ہو چکا ہے اور جب حقوق انسانی کمیشن نے مداخلت کی تو اس پر بھی قابل اعتراض لفظوں میں حملہ کیا گیا تب پھر سپریم کورٹ کو مداخلت کرنا پڑی۔

بابری مسجد مقدمہ میں لال کرشن اڈوانی اور دیگر لیڈروں پر سازش کا کیس تھا جو آئین کے خلاف تھا۔ کیس کی فائل سے اڈوانی جی سے متعلق انڈین پولس سروس کی ایک افسر مسز انجو گپتا کی رپورٹ غائب کردی گئی کیونکہ اس میں مسجد توڑنے کے لئے اڈوانی جی کی اشتعال انگیز تقریر کا ذکر تھا۔ اڈوانی جی کارسیوکوں کو باہر آنے کو کہہ رہے تھے کیونکہ مسجد توڑی جارہی تھی۔ ٹی وی پر سبھی نے یہ منظر دیکھا۔ اجودھیا سے متعلق سٹیزن کمیشن جس میں سپریم کورٹ کے کئی سابق جج صاحبان تھے ان کے سامنے بیانات میں یہ سب باتیں آئی ہیں پھر بھی وزیر داخلہ اپنے عہدے کا فائدہ اُٹھا کر چارج شیٹ سے باہر رہے۔

میں نے ان تمام باتوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ اس وقت مرکزی سرکار بہت ہی جھوٹے اور فریبی لوگوں کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ اس حکومت کے وزراء اور لیڈر کب کیا کہیں گے اور کب کیا کریں گے اس کا ٹھکانا نہیں ہے۔ موجودہ سرکار ملک کے لئے زبردست خطرہ ہے۔ خود اشوک سنگھل اجودھیا کے گھروں میں ایک ہفتہ سے خاموش رہ کر ہنگامہ آرائی کرانے کے لئے چھپے بیٹھے رہے اور جب پولس نے پکڑ لیا تو ہاتھا پائی کرتے ہوئے آئین میں درج حقوق کی بات کرنے لگے۔

اس خطرناک صورتحال پر تمام محبان وطن کو سنجیدگی سے سوچنا چاہئے اور اس کا تدارک آئندہ انتخابات میں کرنا چاہئے۔ این ڈی اے کی سیکولر پارٹیوں کو اب بھی اس پر کوئی قدم اُٹھانا چاہئے۔ شہریوں کو پریشانی ہوگی اس بہانہ پر اجودھیا میں ریل جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ریلوے کا محکمہ ایک سیکولر لیڈر کے ہاتھ میں ہے انہیں یہ سوچنا چاہئے تھا کہ یہ شہریوں کی پریشانی کا معاملہ ہے۔ یا سپریم کورٹ کے حکم کی خلاف ورزی کا؟ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ملک کدھر جارہا ہے۔ □ □

# ہندتو کی تحریک ابھی ختم نہیں ہوئی

از: انور علی ایڈووکیٹ

چناؤ کی آمد ہے، بی. جے. پی. نے ہندو ووٹ سمیٹنے کے لئے اپنی حکمت عملی پر عمل درآمد کرتے ہوئے موؤمنٹ شروع کر دی ہے۔ 17 را کتوبر کا اجودھیا مارچ اسی حکمت عملی کا ایک جامع اور سوچا سمجھا حصہ تھا۔ رام نام پر ہندوؤں کے جذبات کے تاروں پر سیاسی مضراب کا عمل جاری ہے۔ سنگھ پریوار کے ایک اہم عنصر ''وشو ہندو پریشد'' نے واضح طور پر ہنسا کا طریقہ اپنا کر فرقہ وارانہ فساد برپا کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ دو بڑی عالمی جنگوں (1939 & 1919) کے درمیانی زمانہ کے جرمنی اور اٹلی میں اقلیتوں کو ہنسا کا نشانہ سیاسی مقاصد کے لئے بنایا گیا تھا اس کے بعد شاید ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں فاشزم کے طریقے اپنا کر، تشدد کے عقیدہ پر عمل پیرا تنظیمیں اقلیتی فرقہ کے خلاف متشدد کارروائیاں کرنے کی دھمکی دے رہی ہیں۔ مرکزی سرکار کا رویہ اس تشدد پسند تنظیم کی حوصلہ افزائی کا رہا ہے۔ ہوم منسٹر صاحب نے وشو ہندو پریشد کی وکالت کرتے ہوئے یو. پی. کے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کو یقین دہانی کرائی کہ ''یہ تو رام بھگت ہیں، اجودھیا میں صرف پوجا ارچنا کریں گے اور امن پسند ہیں، امن وامان اور شانتی کا ماحول رکھیں گے''۔ بہرحال 17 را کتوبر کو اجودھیا میں شر پسندی کے باوجود قانون کی حکمرانی نظر آئی، دسمبر 1992 میں جنگل راج اور تشدد کی حکمرانی تھی۔ عدالت عالیہ ہائی کورٹ کے حکم کا پورا احترام ہے اس کو منوایا جا رہا ہے۔ دسمبر 1992 کی طرح عدالتی احکامات اور حکومتی وعدوں کو پاؤں تلے روندا نہیں گیا۔ راقم کی عاجزانہ رائے میں مسئلہ کا پہلو صاف ہے۔ اس ملک میں آئین کی حکمرانی ہے یا دھارمک جذبات کا ننگا ناچ؟ قانون کی حکمرانی (Rule of Law) کی بالادستی ہے یا متشدد تنظیموں کا راج؟ ایڈمنسٹریشن کی نظر میں سب شہری یکساں ہیں اور سب کے ساتھ مساوی سلوک یا کسی خاص طبقہ کی امتیازی پوزیشن؟ 92-1991 کے برعکس 2003 میں یو. پی. سرکار کا رویہ، آئین کی حکمرانی، قانون کی حکمرانی اور ایڈمنسٹریشن کا رویہ عملی طور پر سب کے لئے اور پردیش کی جنتا کے لئے اطمینان بخش ہے۔

لیکن 17 را کتوبر اجودھیا مارچ کے ناکام ہونے سے بات یہ نہیں کہ ''ہندوتو'' کی موؤمنٹ ختم ہو گئی ہے اس کو ایک وسیع تر تاریخی تناظر میں دیکھنا ضروری ہوگا۔ ''ہندوتو'' کی آئیڈیالوجی کی بنیاد ''کلچرل ہندو نیشلزم'' ہے جس کی شروعات ہندو مہا سبھا کی تحریک سے ہوئی، سبھا کا بنیادی عقیدہ ''بھارت ماتا

پوجیہ بھومی ہے'' ہے۔ ہندو مہا سبھا کہتی ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کا ملک ہے اور اس میں ''غیر ملکی عناصر'' مسلمان اور عیسائی کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن سبھا اپنی ہندوتو آئیڈیالوجی میں تشدد پر مبنی جارحانہ رویہ نہیں رکھتی تھی۔ بقول فرینک موریس یہ Meek and Mild رویہ رکھتی تھی۔ 1950 میں ڈاکٹر شیاما پرشاد مکھرجی نے مرکزی کابینہ سے استعفیٰ دیا اور جن سنگھ کی بنیاد رکھ دی جس میں آر.ایس. ایس. نے بلا پس وپیش تعاون دیا اور جن سنگھ ملک میں آر.ایس.ایس. کا پولیٹکل ونگ بن کر کام کرنے لگی، کیونکہ گاندھی جی کے قتل سے آر.ایس.ایس. خاموشی سے کلچرل تنظیم بن گئی تھی۔ جن سنگھ نے آر.ایس.ایس. کے اس پولیٹکل تھیوری کو عملی جامہ پہنانے کا عمل شروع کر دیا کہ ''ہندوستانی اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے مسئلہ کا حل ممکن ہے اور یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل ہو سکتا ہے بشرطیکہ'' ان کے ذہنی سانچہ میں بنیادی تبدیلی لائی جائے اور ان کو ثقافتی، سماجی اور سیاسی ہندو بنا لیا جائے۔ باقی معاملات میں ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ اقلیتیں اپنے مذہب اور عقیدہ کے مطابق عبادت کریں۔'' (شیاما پرشاد مکھرجی 1950 جن سنگھ تاسیسی اجلاس میں تقریر) جن سنگھ نے ''جارحانہ ہندتو'' کے اس سیاسی فلسفہ کو اپنایا کہ ''ہندوستانی قومیت وطن کے جغرافیائی حدود میں محبوس نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد ویدک کلچر ہے اور یہی شہریت کی بنیاد ہے''۔ (بلراج مدھوک) بلراج مدھوک نے 1949 میں ''انڈیانائزیشن آف انڈین مسلمز'' کا نعرہ دیا اور کہا '' ہر وہ شخص جو ہندوستان میں پیدا ہوا ہو وہ ہندوستانی نہیں، بلکہ ہندوستانی وہ ہے جو خود کو قطعی طور پر ہندوستانی کلچر کے سپرد کر دیتا ہے جو اپنی تخلیق اور ہیئت میں قطعی طور پر ویدک اور ہندو کلچر ہے اور ایسا ہندوستانی جو خود کو ویدک کلچر میں سمو نے، وہ ہندو ہے۔'' جن سنگھ کی انڈیانائزیشن کی تحریک نے بلراج مدھوک کی قیادت میں 71-1969 میں کافی زور پکڑا جس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کا شدھی کرن تھا یعنی مسلمان کے ذہن، کلچر، سیاسی سماجی نظریات، خیالات افکار اور جذبات کی شدھی کر کے اس کو ویدک اور پرانے کلچر میں ضم کر دیا جائے۔ جن سنگھ کی بنیاد آر.ایس.ایس. کے فلاسفر ڈاکٹر ہیڈ گوار اور گورو گول والکر کے نظریات تھے، جو حقیقت میں ہٹلر کی مین کیمف سے ماخوذ تھے۔ گورو جی نے 22 رفروری 1970 کو کہا تھا: ''نجات کی ایک ہی کرن ہے اور وہ ہے محض نیشنلزم جو ہندوستان میں ہندو نیشنلزم ہے۔'' موصوف کے الفاظ یہ تھے۔ جب جرمنی میں یہودی اقلیت کو نازیوں سے اور ان سے پہلے جنکرز نے کا نشانہ بنایا اور جرمنی آرین نسل کی خاصیت کو برقرار رکھنے کی نیت سے، نسلی صفائی سے یہودی مسئلہ کو حل کرنے کی تحریک چلائی تو گول والکر جی نے اپریل 1934 میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

''آزادی حاصل کرنے کے بعد ہندوستانی اقلیتوں کا مسئلہ بھی اسی طرح حل کیا جائے گا۔ موجودہ دور میں سنگھ پریوار کی سبھی تنظیموں کی بنیادی سائیکلوجی کو سمجھنے کے لئے سنگھ کی آئیڈیالوجیکل کتابیں We and Our Nationhood Defined اور A Bunch of Thought کا مطالعہ ضروری ہے جو بنیادی طور پر جرمن چانسلر اڈولف ہٹلر کی مین کیفپ پر مبنی ہے۔

ہٹلر کا بنیادی پولیٹیکل فلسفہ تھا کہ 'جرمنی نسل، خالص آرین نسل ہے، اس کو جرمن کی قومیت (شہریت) کا حق ہے اور یہ نسل دنیا پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ باقی جرمنی کی آبادی، یہودی یا غیر آریائی عیسائی کو جرمنی کی قومیت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ جرمن نیشنلزم کے دائرے سے باہر ہیں، جرمن زبان، قومیت کی نشانی ہے۔ ہٹلر کا کہنا تھا کہ فرانس، جرمن قوم کا دائمی اور قاتل دشمن ہے۔ ہٹلر کے مطابق یہودی دشمنی، نازی پروگرام کا بنیادی نکتہ ہے۔ یہودیوں کو دوسرے درجہ کے شہری کا درجہ ہی دیا جاسکتا ہے۔ یہود دشمنی، جرمن اخلاقیات کا بیرومیٹر ہے۔ قومی ذلت کا بدلہ دشمن سے لینا قومی فرض ہے۔ وہ شہری جو قومی ذلت کا بدلہ لینے کے لئے مستعد رہتا ہے اور اس راہ میں قدم بڑھاتا ہے وہ شہری وطن پرست (Super Patriot) ہے۔ آرین نسل کی بالادستی کے لئے اور آرین قوم کی خاصیت قائم رکھنے کے لئے پرائیویٹ آرمی کی تربیت ضروری ہے جو قومی اخلاقیات کی حفاظت کرے۔ تعلیم سے بچوں کے ذہنوں میں قوم پرستی کوٹ کوٹ کر بھرنی چاہئے تاریخی کتابوں میں ہٹلر کے مطابق ''تعلیم کو کلچرل نظریات کا پابند بنایا جانا چاہئے، اور ان سب مقاصد کے حصول کے لئے پروپیگنڈا مشینری کو اس طرح استعمال کرنا چاہئے کہ یہ مقاصد انسانی ذہن میں ارفع اور اعلیٰ ہو جائیں۔''

اب اس فلسفہ کو موجودہ ہندتو کی آئیڈیالوجی پر دیکھئے۔ ہندوتو طاقتیں اور سنگھ پریوار ہٹلر کے طور پر کام کر رہا ہے۔ تعلیم کا بھگوا کرن، نوجوانوں کے ذہن میں مسلم دشمنی کے خیالات پیدا کرنا، پروپیگنڈہ، پرائیویٹ سینا شاکھا کی ٹریننگ، ماضی کے مفروضہ فاتحوں کے مظالم اور ہندوؤں کی مظلومیت اور قومی بےعزتی کا پروپیگنڈہ۔ یہ سب ایک ہندو راشٹر کے مقاصد کے لئے ہیں جس میں الیکشن کا مقصد ''لیڈر'' کا چناؤ ہوگا اور ایک مخصوص طبقہ کی بالادستی...... اس پر سبھی سیکولر ذہن کے دانشوروں اور رہنماؤں کو توجہ دینا ہندوستان کے قومی مفاد میں ہوگا۔ □ □ □

# سنگھ پریوار کی خواہش خاکستر

از: آر. کے. آنند (ممبر پارلیمنٹ، راجیہ سبھا)

سنکلپ ریلی اپنے انجام کو پہنچی اور اپنے پیچھے کم از کم دو سوالات چھوڑ گئی۔ پہلا سوال یہ ہے کہ رام مندر کی تعمیر کے لیے کتنی مرتبہ "سنکلپ" یا عہد وحلف لینے کی ضرورت پڑے گی؟ کیا اس کے لیے ایک بار عہد وحلف لینا کافی نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اس ملک کے وہ ہندو جو وی. ایچ. پی.، بجرنگ دل اور دوسری شر پسند جماعتوں سے جڑے ہوئے ہیں ہندوستان کے آئین وقانون سے بالاتر ہیں؟ ان دو سوالات پر ہی ساری بحث کا دارومدار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بی. جے. پی.، وی. ایچ. پی. یا بجرنگ دل نے نہ تو ہندو عقائد اور روایتوں کے مطابق مندر کی تعمیر کے لیے کوئی سنکلپ لیا اور نہ ہی اس کا ایسا کوئی ارادہ ہے۔ یہی نہیں اسے اس طرح کا کوئی سنکلپ لینے کا اختیار بھی حاصل نہیں ہے۔ بے گناہوں کی لاشوں اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے ملبہ سے گزر کر کسی مندر کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتا۔ اس بار بھی اسے نہ تو سنکلپ لینا تھا اور نہ ہی اس کی کوئی ضرورت تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یو. پی. میں بظاہر اس کی دوست حکومت نہیں ہے جو اسے جھوٹ موٹ کا ہی سہی سنکلپ لینے دے۔ وی. ایچ. پی. نے اجودھیا کے معاملہ میں سپریم کورٹ کے کسی حکم کو آج تک نہیں مانا ہے مگر اسے یہ معلوم تھا کہ یو. پی. حکومت اس کو عدلیہ کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے اور متنازع یا اس سے ملحق غیر متنازع جگہ پر کوئی ریلی کرنے نہیں دے گی مگر اس کے باوجود ساری کوششیں کی گئیں۔ قانون کی نظر میں ایسی کوئی کوشش کرنا بھی عدلیہ کے احکامات کی خلاف ورزی اور کھلی توہین ہے۔ حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس طرح کی کوششوں کو بھی معرض وجود میں نہ آنے دے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ سیاسی مصلحتیں اور حکمرانوں کے دل میں چھپا ہوا چور ان کے ہاتھوں کو باندھ دیتا ہے۔

یہاں ماضی کے اوراق سے کچھ واقعات کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ 5/دسمبر 1950 کو رام چندر پرم ہنس رام چندر داس نے رام جنم بھومی کے درشن کے لیے عرضی داخل کر کے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ 16/دسمبر 1961 کو ہاشم انصاری نے سنی وقف بورڈ کی جانب سے مسجد سے مورتی ہٹانے کے لیے عدالت میں عرضی داخل کی اور تب سے قانونی جنگ جاری ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ رام چندر داس

اور انصاری دونوں بہت گہرے دوست تھے اور رام چندر داس کے آخری ایام تک دونوں کے درمیان یہ دوستی اسی طرح قائم رہی۔ وشو ہندو پریشد نے رام چندر داس کو اپنا مہرہ بنا کر اپنی مقبولیت میں اضافہ کے لیے استعمال کیا۔ خاص طور سے مارچ 2002 میں پرم ہنس رام چندر داس نے وشو ہندو پریشد کے بینر تلے شیلا دان پروگرام کا اعلان کر کے اس تحریک سے زیادہ وشو ہندو پریشد کو تقویت پہنچانے کا کام کیا لیکن عدالت کے سخت رویہ کے باعث شیلا دان کا پروگرام رسمی ہو کر رہ گیا اور یوں وشو ہندو پریشد کی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچا۔ اس پروگرام کے نتیجہ میں ہونے والے گودھرا سانحہ اور پھر گجرات فسادات نے وشو ہندو پریشد کو بالکل ہی حاشیے پر لا کھڑا کیا۔ گجرات الیکشن میں بی۔ جے۔ پی۔ کی کامیابی اور پھر پورے ملک میں گجرات کارڈ کھیلنے کے وشو ہندو پریشد کے اعلان نے عوام کو اس تنظیم سے بدظن کر دیا۔ وشو ہندو پریشد کی 17/ اکتوبر 2003 کی سنکلپ سبھا کی ناکامی میں اس صورت حال کا بھی بڑا دخل ہے۔

6/ دسمبر 1992 کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد وشو ہندو پریشد اس مقام پر رام مندر کی تعمیر کے لیے کوشاں ہے جہاں سپریم کورٹ نے متنازعہ مقام پر موجودہ حالت کو برقرار رکھنے کا حکم دے رکھا ہے۔ جنوری 2003 میں وشو ہندو پریشد نے عدالت کے فیصلہ کا انتظار کرنے کے بجائے اس مقام پر 15/ مارچ 2002 سے مندر تعمیر کرنے کا اعلان کیا۔ 13/ مارچ کو سپریم کورٹ نے ایک اہم فیصلہ سناتے ہوئے 67 ایکڑ ایکوائر شدہ اراضی پر کسی بھی قسم کی مذہبی رسومات ادا کرنے پر پابندی کا حکم دیا۔ مرکزی حکومت اس مقام پر ''علامتی پوجا'' کرانے کے حق میں تھی اور اٹارنی جنرل سولی سوراب جی نے حکومت کی طرف سے اس سلسلہ میں باضابطہ عدالت سے درخواست بھی کی تھی لیکن سپریم کورٹ نے یہ درخواست ٹھکرا دی۔ بعد میں بی۔ جے۔ پی۔ حکومت نے اسے سولی سوراب جی کی ذاتی رائے قرار دے کر اپنی شرمندگی دھونے کی کوشش کی۔ مہنت پرم ہنس رام چندر داس نے معاملہ کو گرم کرنے کے لیے 14/ مارچ کو شیلا دان کی اجازت نہ دینے کی صورت میں 'خودکشی' کر لینے کی دھمکی دی لیکن بعد میں انہوں نے عدالت کے سخت رویہ اور حکومت کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور ایکوائر شدہ اراضی کے باہر کوٹلہ محلّہ میں شیلا دان کے لیے راضی ہو گئے۔ اس طرح وشو ہندو پریشد نے شیلا دان کی رسم ادا کر کے کسی طرح عزت بچائی۔ بی۔ جے۔ پی۔ حکومت نے وشو ہندو پریشد کی عزت بچانے میں بھرپور مدد کی۔ دونوں کے درمیان بظاہر نورا کشتی ہوتی رہی۔ وشو ہندو پریشد، بی۔ جے۔ پی۔ کو عوام کے درمیان سخت و سست سناتی رہی لیکن بی۔ جے۔ پی۔ حکومت نے اپنی جانب سے وشو ہندو پریشد کی عزت

بچانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔

وشو ہندو پریشد کا دعویٰ ہے کہ ملک بھر کے ہندوؤں کے ووٹوں پر اس کی اجارہ داری ہے اور وہ جس کی جھولی میں چاہے ان ووٹوں کو ڈال سکتی ہے۔ رام مندر کی یہ تحریک وشو ہندو پریشد کی عوام کے درمیان اپنی مقبولیت کو بنائے رکھنے کی انہی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ وہ رام کے نام پر ہندو ووٹوں کو جس کے حق میں چاہے استعمال کر سکتی ہے۔ 6/دسمبر 1992 کے بعد وشو ہندو پریشد نے ایک ایسے موقعہ پر رام مندر کا مدعا اُٹھایا ہے جب پانچ ریاستوں میں الیکشن کا اعلان ہو چکا ہے۔ مارچ 2002 میں شیلا دان کا پروگرام گجرات میں الیکشن کے پیش نظر رکھا گیا۔ اس کا فائدہ بھی اپنے طور پر بی۔ جے۔ پی۔ کو دلانے میں وہ کامیاب رہی لیکن اس کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کیے گئے وہ کسی بھی طرح ایک مہذب معاشرے کو زیب نہیں دیتے۔ اب پانچ ریاستوں میں اسمبلی انتخابات کے پیش نظر وشو ہندو پریشد نے 17/ اکتوبر کو اجودھیا میں سنکلپ سبھا کا جو اعلان کیا وہ بھی اس کی انہی کوششوں کا ایک حصہ تھا لیکن اس بار بھی وشو ہندو پریشد کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور اجودھیا میں سنکلپ سبھا کرنے کی اس کی کوشش ناکام ہو گئی۔ 17/ اکتوبر کو وشو ہندو پریشد کا کوئی بھی بڑا لیڈر منظر نامہ پر موجود نہیں تھا۔ اشوک سنگھل ڈرامائی طور پر رام سیوک پورم پہنچ کر گرفتاری دینے میں کامیاب ہو سکے لیکن یہ سب کچھ ایک ڈرامہ ہی لگ رہا تھا۔ وشو ہندو پریشد نے رام مندر تحریک کا سیاسی فائدہ اُٹھانے کے لیے رام کے وقار کو جس طرح ملیا میٹ کیا ہے اس کے لیے اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ وہ تمام سیاسی پارٹیاں جو اپنے فائدے کے لیے وشو ہندو پریشد کی ان سرگرمیوں میں شریک ہیں رام کو اپنے سیاسی مفادات کے لیے استعمال کرنے کی مجرم ہیں۔ وشو ہندو پریشد کی ان سرگرمیوں کی وجہ سے اجودھیا جیسا متبرک مقام آج خوف و دہشت کی علامت بن گیا ہے۔

سپریم کورٹ نے ایک بار سے زیادہ صاف لفظوں میں متنازع اراضی پر کسی بھی قسم کی پوجا کی اجازت دینے سے انکار کیا ہے۔ 5/فروری 2003 کو وزیر اعظم واجپئی اور کانچی کے شنکر آچاریہ کی میٹنگ کے بعد مرکزی حکومت نے سپریم کورٹ میں عرضی دی کہ ایکوائر شدہ اراضی پر مذہبی رسومات ادا کرنے پر عاید پابندی ختم کی جائے لیکن سپریم کورٹ نے اس معاملہ میں کوئی ڈھیل نہیں دی۔ مگر سپریم کورٹ کی ہدایات کو نظر انداز کرتے ہوئے 17/اکتوبر 2003 کو وشو ہندو پریشد کے کئی لیڈر متنازع مقام تک جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس پر کافی واویلا مچنے کے باوجود ان لیڈروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو

سکی۔ دراصل بی. جے. پی. حکومت نے اپنے فائدے کے لیے وشو ہندو پریشد کو کھلی چھوٹ دینے کی ٹھان رکھی ہے۔ جب ملک کا وزیر اعظم پرم ہنس رام چندر داس کی آخری رسومات کے موقع پر یکم اگست 2003 کو یہ عہد کرتا ہے کہ ان کی آخری خواہش پوری کی جائے گی تو پھر کہنے کو اور کیا باقی رہ جاتا ہے۔

بی. جے. پی. نے ملائم سنگھ یادو کو اس امید کے ساتھ اقتدار میں برداشت کیا تھا کہ وہ اس آگ کو ہوا دینے کا کام کریں گے لیکن ملائم سنگھ نے بہر حال اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی۔ انہوں نے وشو ہندو پریشد کی عزت تو بچالی لیکن اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھودنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اگر ملائم سنگھ اس وقت کسی بھی قسم کی محاذ آرائی کے لیے تیار ہو جاتے تو اس میں سراسر بی. جے. پی. کی کامیابی تھی۔ اس موقع پر ملک بھر کے مسلمانوں کے صبر و تحمل کی تعریف کی جانی چاہیے کہ انہوں نے اشتعال انگیزی کے باوجود کوئی جواب نہیں دیا اور وی. ایچ. پی. کو اس کی سازش کے کنویں میں دھکیل دیا۔ ☐ ☐

# مندر نہیں ـــ فسطائی نظام قائم کرنے کی تحریک

از: انل چمڑیا

اس بار کی طرح پہلے بھی کئی موقعوں پر ایسا نظر آیا ہے کہ بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ کے سلسلے میں آر. ایس. ایس. کی تنظیمیں مثلاً وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، بھارتیہ جنتا پارٹی میں داخلی انتشار ظاہر کرنے کی کوشش نہ کی گئی ہو لیکن اب لوگوں کو یہ سب ایک مذاق سے زیادہ کچھ نہیں لگتا۔ کیونکہ ایسے تنازعات کا انجام آخر کار یہ ہوتا ہے کہ سنگھ پریوار کی تمام تنظیموں اور اس کے حامیوں کی اس بارے میں ایک ہی رائے ہے کہ وہ اجودھیا جیسے تنازعات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس بار بھی اجودھیا میں منعقد ہونے والے سنکلپ سمیلن کو لے کر باہمی انتشار ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ان تمام باتوں کا نچوڑ پٹنہ میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے پرمود مہاجن کے بیان سے نکالا جا سکتا ہے۔ ان کے مطابق اجودھیا میں رام مندر تو اسی دن بن گیا تھا جس دن بابری مسجد منہدم کی گئی تھی اب تو اس مقام پر شاندار مندر تعمیر کرنا ہے یعنی حکومت اور تنظیم کے درمیان محض انتظامی قسم کا اختلاف ہی نظر آتا ہے، سیاسی مقصد میں کہیں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے۔

اجودھیا میں رام مندر اور بابری مسجد تنازعہ کے سلسلے میں کسی بھی موقع پر ہونے والی ہنگامہ آرائی کو اس وقت تک اچھی طرح نہیں محسوس کیا جا سکتا ہے جب تک ان باتوں کو ذہن میں نہ رکھا جائے۔ اول تو یہ کہ آر. ایس. ایس. کے ساورکر اسی طرح سے ناستک تھے جیسے پاکستان کے ''جناح''۔ ظاہر ہے کہ جو سیاسی شخص بے دین ہوگا وہ مذہبی نعروں کو اگر اچھالے گا تو اس کا مقصد سیاسی ہی ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہندوازم کے ساتھ اسے نافذ کرنے والے ایک نعرے کو بھی پیش کیا گیا۔ ''سیاست کا ہندوکرن کرنا ہوگا ہندو کا سینیہ کرن کرنا ہوگا۔'' سوچا جا سکتا ہے کہ جس ملک کا آئینی نظام سیکولر ہو ہندوؤں کی اکثریت میں سیاست زدہ ہندتو کا جذبہ نہ ہو، ایسے ملک کے سیاسی اور سماجی ثقافتی نظام میں اس نعرے پر عمل کرنے کے لئے ہندتو وادی طاقتوں کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔

اب تک ہندتو وادی طاقتیں یہی پروپیگنڈہ کرتی رہی ہیں کہ اجودھیا میں جس مقام پر بابری مسجد تھی وہیں پہلے رام مندر تھا اور وہ تلسی داس کے رام چرتر مانس کے ہیرو راجا دشرتھ کے بیٹے بھگوان رام کی جائے پیدائش رہی ہے۔ یہ بھی لوگوں کے ذہن میں ہوگا کہ بابری مسجد انہدام سے پہلے ہندو مذہب کے

پیروکاروں میں یہی پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے کہ اس مقام کی کھدائی کی جائے تو اس مقام کے نیچے رام مندر کے باقیات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس طرح کے پروپیگنڈہ میں یہ پہلو شامل رہا ہے کہ ہندوتو وادی عام لوگوں کو بابری مسجد کے انہدام کے لئے ذہنی طور پر تیار کرتے رہے ہیں۔ ہندوتو وادی طاقتوں کا سب سے بڑا ہتھیار ان کا پروپیگنڈہ ہے۔ اور ہر پروپیگنڈہ کی اتنی تہیں ہوتی ہیں کہ عام طور پر ان کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ وہ اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے لوگوں کو ذہنی طور پر ثقافتی حوالے سے تیار کرتے ہیں۔ یہ طاقتیں یہ بھی سمجھتی ہیں کہ قانون کی بالادستی والے معاشرے میں مسجد کو گرانا یا حکومت کو اس کے لئے تیار کرنا سیکولر ہندوستانی نظام کی موجودگی میں ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا انہوں نے 6 دسمبر 1992 کو خود ہی بابری مسجد شہید کر دی۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ہندوتو وادی طاقتیں یہ کام نہیں کر سکتی تھیں اگر اتر پردیش میں سنگھ پریوار کی سیاسی جماعت بی۔ جے۔ پی۔ کی سرکار نہیں ہوتی۔ ملک کے وفاقی نظام میں ریاستوں کے پاس ہی امن و قانون کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ دراصل ہندوتو وادی طاقتوں کی سیاسی تنظیم اور ان کی سرکار کی ضرورت اپنے ہی مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے ہوتی ہے۔ 17 اکتوبر کو بھی جو سنکلپ سمیلن منعقد کیا گیا اس کا مقصد بھی آنے والے انتخابات میں بی. جے. پی. کی سرکار بنانے کے لئے ماحول تیار کرنا ہے۔ واجپئی جیسے لبرل ہندتو امیج والے سیاست داں کو بھی اس فرقہ پرست طاقت نے اپنے سیاسی مقصد کے لئے ہی کھڑا کیا ہے۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ بابری مسجد انہدام کے بعد اس مقام کی کھدائی کرانے کا پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا اسی مقام پر کھدائی کا حکم دے دیا گیا لیکن بابری مسجد کے مقام پر کھدائی جوں جوں گہری ہوتی چلی گئی اس سے یہ بات بھی صاف طور پر سامنے آ گئی کہ اس مقام پر رام مندر یا کسی بھی ہندو بھگوان کا مندر ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کھدائی کی جو متنازعہ رپورٹ سامنے آئی اس میں بھی مندر ہونے کی بات نہیں کہی گئی۔ لہٰذا اب سنگھ پریوار کو حقائق کے بجائے نعروں کے ذریعہ یہ منوانا ہے کہ رپورٹ میں رام مندر ہونے کی بات کہی گئی ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رام مندر کا مسئلہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے تو وہ اپنے سیاسی مقصد کو تیز رفتاری سے پورا کرنے کے لئے اس مسئلہ کو اپنے ہتھیار بنائیں گے۔ اسی لئے بار بار کہا جاتا ہے کہ یہ آستھا کا سوال ہے اور اسے عدالت کے ذریعہ حل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن آستھا کی بنیاد کیا ہے۔ یہ واضح نہیں کیا جارہا ہے یعنی اس میں بھی ایک پہلو یہ جڑا ہوا ہے کہ ایسے نظام کا پس منظر تیار کیا جائے جس

میں کہ آستھا کو اولیت حاصل ہو اور اس آستھا کی کوئی ٹھوس بنیاد نہ ہو۔ اجودھیا کے مندر کے ساتھ 30000 مساجد کی بات بھی کی جاتی ہے اور سکھوں اور دوسری اقلیتوں کے بھی ہندو ہونے کی بات دوہرائی جاتی ہے۔ اس طرح کی آستھا کا مقصد حقیقت میں سیاسی اور اقتصادی منصوبوں کو پورا کرنا ہے۔ ایسے ہی دلائل ڈکٹیٹر شپ اور فاشزم کے نظام قائم رکھنے کے لیے کارگر ہوتے ہیں۔

اس پہلو پر بھی غور کرنے کیا جانا چاہئے کہ اسے کس طرح ہندو اور مسلمانوں کے بیچ کا معاملہ بنایا گیا جبکہ یہ دو فرقوں کے بیچ کا مسئلہ ہے ہی نہیں۔ یہ آئین اور قانون کا مسئلہ ہے اس پہلو پر بھی گفتگو ہونی چاہئے کہ ہندوتو واد اس طرح ہندوؤں کے درمیان بھی سماجی سطح پر نابرابری چاہتا ہے۔ اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کی علامتی تیاری کے طور پر ہندوتو وادیوں نے سرکار کے نمائندوں کو ایک پتھر دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جب فیض آباد کے کمشنر سرکاری نمائندہ کے طور پر اس پتھر کو لینے گئے تو انہیں دینے سے منع کر دیا گیا کیونکہ کمشنر کا تعلق دریشیہ ذات سے تھا جسے ذات پات کے نظام کے تحت چھوٹی ذات مانا جاتا ہے یعنی منوواد کے مطابق انہیں وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو اشراف کو ہے۔ بعد میں پی.ایم.او. سے اعلیٰ ذات کا سرکاری نمائندہ فیض آباد بھیجا گیا تھا۔ اسی طرح سے اس بار جب شنکر آچاریہ نے مسلم پرسنل لاء بورڈ کو ایک خط بھیجا تو سیاسی ہندوتو وادیوں نے انہیں ''شیو'' ذات کا بتایا اور دعویٰ کیا کہ رام مندر کا مسئلہ رام نندیوں کا ہے۔ لیکن جب مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بابری مسجد کے مقام پر رام مندر بنانے اور کاشی اور متھرا کے مندروں کو ہندوؤں کے حوالے کرنے سے انکار کیا تو ہندوتو وادیوں نے یہ الزام لگایا کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کے سب سے بڑے مذہبی گرو شنکر آچاریہ کی توہین کی ہے۔ ہندتو طاقتوں کو اجودھیا ایک ایسے مسئلے کی شکل میں ہاتھ لگ گئی ہے جسے وہ پھیلا کر اپنے نعرے کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اجودھیا کا مسئلہ مختلف مرحلوں میں ایک سیاسی ماحول بھی تیار کرتا ہے۔

چار ریاستوں کے اسمبلی انتخابات کی اہمیت اس لئے نہیں ہے کہ ان ریاستوں میں کس کی سرکار بنتی ہے زیادہ اہم یہ ہے کہ اس کے نتائج سے پارلیمانی انتخابات کے لئے کیسا ماحول بنتا ہے۔ ہندوتو وادی تنظیم کسی بھی قیمت پر اپنی سرکار چاہتی ہے۔ کیونکہ اسے پتہ ہے کہ سرکار کے بغیر سیاسی مقصد پورا کرنا آسان نہیں ہے۔ اپنی حکومت اور اپوزیشن کی حکومت کے بیچ ان کی حکمت عملی میں یہ فرق ہوتا ہے کہ وہ اپنی سرکار کے تحت بغیر کسی رکاوٹ کے مسجد گرا دیتے ہیں اور اپوزیشن کی سرکار ہونے کی وجہ سے سنکلپ سمیلن منعقد کرنے تک میں دقتیں پیش آتی ہیں۔ پہلے ہی یہ محسوس کر لیا گیا تھا کہ اتر پردیش میں اپوزیشن

کی سرکار بنانے کی راہ ہموار کر کے ہندتو وادی تنظیمیں ہندوتو کے جذبے کو بھڑکانے کی کوشش کریں گی۔ اشتعال پیدا کرنے کے لئے لاش اور خون کو ضروری سمجھا جانے لگا ہے ایک مثال بھی نہیں دی جاسکتی کہ لاشوں اور خونی مناظر کے بغیر فرقہ وارانہ تنظیموں کو ہندوتو وادی اشتعال پیدا کرنے میں کامیابی ملی ہو۔

یہاں ایک اور مثال سے پوری سیاست کو سمجھا جاسکتا ہے۔ 1984 میں جب گجرات میں سرکاری ملازمتوں میں ریزرویشن لاگو کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو وہاں فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اُٹھے۔ ایسا اس لئے ہوا تھا کہ آدیواسیوں، دلتوں اور پسماندہ طبقات کے لئے لاگو کیئے گئے ریزرویشن کی مخالفت میں سنگھ پریوار کے لوگ آندولن پر اُتر آئے تھے۔ اور انہوں نے مسلمانوں سے حمایت کے لئے کہا لیکن جب مسلمانوں نے حمایت نہیں دی تو فرقہ وارانہ فسادات کی تیاری شروع کر دی گئی۔ ٹھیک اسی طرح مرکز میں وشوناتھ پرتاپ سنگھ کی سرکار نے منڈل کمیشن کی سفارشات کو نافذ کیا تو لال کرشن اڈوانی کی رتھ یاترا اور پھر فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے۔ اب اعلیٰ ذات ہندوؤں کو ریزرویشن دینے کا ایشو بھی بی۔ جے۔ پی۔ کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ آج مختلف ذاتوں کے درمیان ایک نئی سیاسی صف بندی ہو رہی ہے وہ بھی سنگھ پریوار کے لئے ایک چیلنج بن گئی ہے۔ سنگھ پریوار سیاست کا ہندوکرن اور اس کا سینیہ کرن کرنے کے ارادے سے ہی اجودھیا کے لئے قانون بنانے اور اپنے کارکنان کو ترشول تقسیم کرنے جیسے پروگرام انجام دے رہا ہے۔ دہشت گردی کی مخالفت کو مسلمانوں تک ہی محدود رکھنا اس کے اس بڑے پروگرام کا ہی ایک حصہ ہے۔ مندر کا مسئلہ اس کے لئے رام راج قائم کرنے کے ارادے سے نہیں فسطائی نظام قائم کرنے سے جڑا ہوا ہے۔ اس سے سبھی طبقوں کی متحدہ کوششوں کے ذریعہ ہی نمٹا جاسکتا ہے۔ □ □

# وشو ہندو پریشد کی یاترائیں

از: پروفیسر اقبال انصاری

1990 میں سادھوی رتھمبرا نے مسلمانوں کو دھمکی دی تھی کہ "تم ہمارے آگے گھٹنے ٹیک دو ورنہ ہم تمہیں سبق سکھلائیں گے"۔ مسلمانوں کو سبق سکھلانے کا کام تو ان کے قبیلہ کے لوگ 40 سال سے کر رہے ہیں لیکن اجودھیا مسئلہ کے ذریعہ ہندوتو وادی طاقتوں نے مسلمانوں اور اس کے بعد عیسائیوں کو اپنی جارحیت کا ہدف بنانے کا جو کام اڈوانی کی قیادت میں 90-1989 سے شروع کیا اس کے تیسرے دور کا آغاز اب ہو رہا ہے۔ اس دور کے ہندو سور ماتو گڑیا نے برملا کہہ دیا ہے کہ وہ پورے ملک میں فساد برپا کرادیں گے بلکہ سول جنگ (جس کی نوبت اس لئے نہیں آئے گی کہ مسلمان کے پاس طاقت ہی کہاں ہے) اور مسلمانوں کو خیموں میں پناہ گزیں بنانے کے منصوبوں کا اظہار کر چکے ہیں۔ ہمیں بہت خوشی ہے کہ مسلمانوں نے کوئی جوابی بیان یا دھمکی نہیں دی۔ ہمیں ایک بار پھر اس کا افسوس ہے کہ ملک میں سیکولرزم کا لیبل لگانے والی سیاسی جماعتوں اور سماجی تنظیموں و دانش وروں نے اور امن و سد بھاونا اور گاندھی کے نام لیوا اقلیت نوزانوں نے ملک میں قانون کی بالادستی کے عملاً نفاذ کی تدابیر اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بیسٹ بیکری کیس کے ذریعہ ملک میں نفاذ قانون کی مشنری بشمول عدلیہ کی جو بھیانک تصویر واشگاف ہوئی جس نے عدالت عالیہ کے ضمیر کو جھنجھوڑا، اس کے بعد بھی وقتی پیوند کاری سے زیادہ کوئی تدبیر اختیار کرنے کا عزم کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔

وشو ہندو پریشد کے قائدین اقلیتوں کی جان و مال و عزت کو گاجر مولی کی طرح کچلنے کا جو خطرناک عمل اب شروع کرنا چاہتے ہیں ان کا حوصلہ بڑھا ہی اس لئے ہے کہ انہیں اطمینان ہے کہ "یہ اندر کی بات ہے پولیس ہمارے ساتھ ہے"۔ (اب یہ اندر کی نہیں باہر کی بات ہے)، یہی نہیں بلکہ عدلیہ کی جو حیثیت وہ سمجھتے ہیں جس کا اظہار اپنے قرطاس ابیض (1993) میں کیا ہے کہ ہماری زور زبردستی کے آگے عدلیہ جھکتی ہے۔ اس کی نوبت اسی لئے آئی ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ 1949 میں مسجد میں مورتی کے دخول کے قانونی جواز کے بعد 1986 میں گیٹ کھولنے اور اس کے بعد 1994 میں دہشت گردی کے عمل کے نتیجہ میں جو "مندر" وجود میں آیا اسے قانونی جواز سب عدالتوں ہی نے دیا۔ پولس کی متعصب ذہنیت و جانبداری اور ضلع حکام و پولس کو حکومتوں کی سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہدایات اور ہتھکنڈے کے علاوہ خود نظام عدل جس سستی، نااہلی اور بے حسی کا شکار ہے ان سب کے خلاف جدوجہد ملک میں انصاف پسند

لوگوں کے تعاون سے شروع کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ سیکولر سیاسی حلقوں اور حقوق انسانی کی تنظیموں اور سد بھاؤنا وشانتی کا کام کرنے والوں کو مشترکہ تحریک اس کام کے لئے شروع کرنی چاہئے۔

اتر پردیش حکومت نے ٹکراؤ کے ماحول کو نرم کرنے کے لئے اپنی نگرانی میں چھوٹے چھوٹے جتھوں کو مورتی کے درشن کی اجازت دی۔ یہ ممکن ہے کہ 17 راکتوبر کے بعد ابھی کوئی تشدد نہ ہو۔ لیکن جو عزم وشو ہندو پریشد کا مسلسل ہندو جاگرتی کے لئے تیس ہزار مسجدوں و دیگر مسلم تاریخی عمارتوں کی حیثیت بدلنے کا ہے، کیا دستور و قانون کی رو سے اس طرح کی تحریک، ریلی و یاترا نکالنے کا جواز ہے؟

1990 میں اڈوانی کی رتھ یاترا کے وقت علاوہ دیگر لوگوں کے سولی سوراب جی نے سپریم کورٹ سے اپیل کی تھی کہ اس پر اسلئے پابندی لگائی جائے کیونکہ اس جلوس سے جان و مال کے عظیم نقصان کا خطرہ ہے۔ سپریم کورٹ نے کوئی اثر نہیں لیا، اجازت دی اور دھوکا کھایا۔ 1992 میں کارسیوک کے بارے میں پھر دھوکا کھایا۔ 2002 میں عزم بالجزم کے ساتھ خبردار کیا۔ اس وقت اور اب بھی موضوع بحث صرف یہ رہتا ہے کہ ''متنازع وغیر متنازع اراضی جو حکومت کی تحویل میں ہے اس پر کوئی کام نہیں ہوسکتا زیادہ سے زیادہ اس کے قریب کچھ کرنے کی ممانعت بھی کی گئی'' لیکن جس طرح کا جنون دماغوں میں وشو ہندو پریشد پیدا کر رہا ہے اس کی وجہ سے ریلی، یاترا وغیرہ سے شہریوں کی جان و مال وعزت وعبادت گاہیں جس طرح تباہ ہوتی ہیں، اس کے باوجود کیا ان کارروائیوں پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی؟ کیرالہ ہائی کورٹ نے 'بند' پر پابندی لگا دی، مغربی بنگال عدالت نے حال میں ہر طرح کے جلوس پر پابندی لگائی (اگرچہ ابھی مزید نظر ثانی ہو رہی ہے) اس کے پیچھے جواز شہریوں کو سہولت اور شہری زندگی میں خلل سے بچانا ہے۔ پریشد کے جلوس و یاترا سے تو جان و مال وعزت وعبادت گاہوں کو خطرہ درپیش رہتا ہے۔

ہمارے خیال میں اس کا پورا دستوری و قانونی جواز ہے کہ وشو ہندو پریشد پر غیر قانونی کاموں میں ملوث ہونے کے سبب پابندی عائد کی جائے اور اگر پوری جماعت پر پابندی سیاسی مصلحت سے نہ عائد کی جاسکے تو اب جو اس کا لائحہ عمل پورے ملک میں مسجد، مندر ایشو پر تحریک چلانے کا ہے اس پر سپریم کورٹ کے ذریعہ دائمی پابندی کے احکامات جاری کرائے جائیں اور اس پر عمل درآمد کی ذمہ داری حقوق انسانی کمیشن کی نگرانی میں قائم شدہ اتھارٹی کرے۔ پریشد جو دھارمک ناموں پر بڑے اجتماعات اور جلوس کا اہتمام کرتی ہے وہ اگر محرم کے جلوس کی طرح روایتی مذہبی حیثیت بھی رکھتے ہوں تو امن کو خطرہ کے امکان کا لحاظ کرتے ہوئے اس پر جزوی یا کلی پابندی لگائی جاسکتی ہے، چہ جائیکہ شلا دان وشلا نیاس

اور درشن کی اجازت دی جائے جو روایتی مذہبی مناسک وشعائر میں شامل نہیں۔

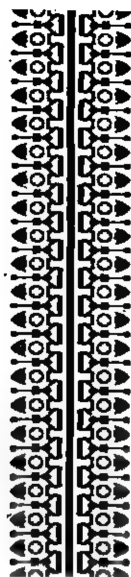
اس قانونی تدارک کی تدبیر کے لئے جدوجہد کے ساتھ ساتھ، سارے سیاسی، سماجی وفلاحی حلقوں و تنظیموں کو پارلیمنٹ کے ذریعہ ملک میں فرقہ وارانہ نزاعات کے تصفیہ کے لئے ایک بااختیار کمیشن جو ممتاز معتبر نمائندوں پر مشتمل ہو (جس کے تقرر کے طریقہ کی آزادی کی ایکٹ کے ذریعہ ضمانت ہو) کے قیام کا مطالبہ کرنا چاہئے جو نزاعی تاریخی مذہبی مقامات وعبادت گاہوں پر تحقیق کے بعد عدل کے مروج اصولوں اور فریقین کے مذہبی عقائد واصولوں کے درمیان باہمی خیر گالی کے ذریعہ مطابقت پیدا کرتے ہوئے حل پیش کرکے اسے عدالتی ٹرائیبونل کے ایوارڈ کا درجہ دے کر فیصلہ کو نافذ کرے۔

اس اسکیم میں کمزور سے کمزور طبقہ کے ہر شہری کی جان و مال وعزت کے تحفظ کے ساتھ منصفانہ و شریفانہ صلح جوئی کے جذبہ کے ساتھ مفاہمت کی گنجائش ہے لیکن کمزور اقلیت کو جو تکالیف اور دکھ 1947 سے اب تک ان کی تہذیبی، مذہبی ولسانی حیثیت کے سلسلہ میں اور امتیازی سلوک کے سلسلہ میں ہے، اس کی جانب بھی کمیشن کو تصفیہ طلب نزاعی امور میں شامل کرنا ہوگا تاکہ صرف عبادت گاہوں پر نزاع ختم ہوکر، کمزور مسلمان اسی طرح ٹھٹھرتا رہے جیسے اب ہے، تو پھر یہ کوئی منصفانہ کام نہیں ہوگا۔

مسلم دانشوروں اور علماء کو سیاسی وسماجی قائدین کو مشترکہ فکر عمل (پلیٹ فارم الگ الگ رہتے ہوئے) کے ذریعہ ان امور پر ایک رائے ہونے کے وسائل اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔

(بشکریہ: راشٹریہ سہارا، 19 /اکتوبر 2003)

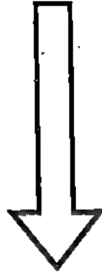







# شہید بابری مسجد
## ـــــ موجودہ صورت حال





مسلم ہندوستانی نے ہمیشہ تشدد اور دہشت گردی کے راستہ سے اجتناب کیا ہے، اس نے بین الاقوامی برادری سے کوئی اپیل نہیں کی، اپنی مدد کے لیے مسلم ملکوں کو آواز نہیں دی بلکہ اپنے معاملہ کو ہندوستانی عوام کی عدالت میں پیش کیا ہے، اس نے ان کے ضمیر کو آواز دی ہے اور معاملہ کو عدلیہ تک محدود رکھا ہے اور اس نے وقتاً فوقتاً اپنے اس موقف کا اعادہ کیا ہے کہ اس معاملے میں عدالت کا جو آخری فیصلہ ہوگا چاہے وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ جائے وہ اس کے لئے قابل قبول ہوگا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس معاملہ میں جو کچھ وہ کر سکتا ہے اس کے کرنے کے بعد نتیجہ کو اسے اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے اور اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا چاہئے۔

سید شہاب الدین

(سابق ممبر پارلیمنٹ اور صدر مسلم مجلس مشاورت)

# بابری مسجد کا مسئلہ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

از: محمد عبدالرحیم قریشی
(سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

یو. پی. کے شہر اجودھیا میں واقع بابری مسجد کا مسئلہ 1986ء سے ہندوستان کے سیکولرزم، عدل و انصاف اور قانون کی بالادستی کے اصولوں کے لئے ایک چیلنج بنا ہوا ہے۔ اس مسجد کے ساتھ اب تک ظلم ہوتا رہا ہے مگر مسلمان اور مصنف مزاج غیر مسلم برادران وطن اس کشمکش میں استقامت کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں اور ان قدروں کے استحکام کے لیے کوشاں ہیں۔

1528ء میں شہنشاہ بابر کے ایک گورنر میر باقی تاشقندی کی تعمیر کردہ اس مسجد میں 23-22/دسمبر 1949ء کی درمیانی رات کے اندھیرے میں چند شرارت پسندوں نے رام چندر جی کی مورتی رکھ دی، پولس کانسٹیبل نے اس کی رپورٹ تھانہ میں کی، متعلقہ سب انسپکٹر نے یہ جرم درج کیا لیکن خاطیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ الٹا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے. کے. نیر نے مسلمانوں کو مسجد کے قریب جانے سے روک دیا اور مسجد کو تالا لگا دیا۔ عدالتی کارروائیوں میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جے. این. اگروا نے سرکاری ریکارڈ کی بنیاد پر یہ حلف نامہ داخل کیا کہ یہ مسجد ہی ہے اور 22/دسمبر 1949ء کی رات تک اس میں بلا وقفہ نماز ہوتی رہی ہے۔ اس کے باوجود معاملہ جہاں کا تہاں رہا اور اس مقدمہ میں کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں ہوئی۔

پھر یہ ظلم بھی ہوا کہ ایک مقامی وکیل نے درخواست دی کہ مسجد کے اندر رکھی ہوئی مورتیوں کی پوجا کے لئے تالا کھولنے کا حکم دیا جائے۔ عدالت نے اس درخواست کو خارج کر دیا مگر ڈسٹرکٹ جج نے اس کے خلاف اپیل کی اور اتنی عجلت میں سماعت کی کہ اس کی تاریخ میں نظیر ملنی مشکل ہے۔ مسلمانوں کی اس درخواست کو کہ ان کے عذرات کو سنے بغیر فیصلہ نہ دیا جائے، رد کر دیا گیا اور تالا کھولنے کا حکم دیا گیا۔ یہ باور کرنے کی مضبوط وجوہات ہیں کہ یہ فیصلہ وزیر اعظم راجیو گاندھی کی حکومت اور بالخصوص ان کے وزیر داخلی سلامتی مسٹر ارون نہرو نے کروایا۔ تالا کھلتے ہی بابری مسجد عملاً مندر بن گئی۔ اس صورت حال میں مسلمانوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور بابری مسجد کی بازیابی کے

لئے جوش وخروش پیدا ہوا۔ اس کے لیے بابری مسجد تحریک رابطہ کمیٹی بنی۔ پھر بابری مسجد ایکشن کمیٹی وجود میں آئی۔ بابری مسجد کا مسئلہ ان کمیٹیوں کے ہاتھ میں رہا۔ ان کمیٹیوں نے کئی احتجاجی و دیگر پروگرام منظم کیے، رابطہ کمیٹی نے دہلی ایک بھاری احتجاجی جلسہ کا اہتمام کیا جس میں غیر مسلم لیڈروں نے بھی مسلمانوں کے حق وانصاف پرمبنی مطالبہ کی تائید کی۔

بابری مسجد کا مسئلہ ملک کے افق پر ایک اہم مسئلہ بن کر اُبھرا جس کی وجہ سے اس کے حل کی تلاش کی کوششیں شروع ہوئیں۔ عدل وانصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ مورتی ہٹا کر مسجد مسلمانوں کے حوالے کر دی جاتی لیکن سنگھ پریوار نے اس کو رام جنم بھومی مندر کی جگہ قرار دے کر عوام کو گمراہ کیا۔ بی. جے. پی. سیاسی فائدے کی خاطر اس میں شریک ہوگئی۔ حکومت اور بعض حلقوں میں جب سمجھوتہ اور 'کچھ لو اور کچھ دو' کی پالیسی کی بات ہونے لگی تو اس مسئلہ کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ سے رجوع کیا گیا۔

1990ء میں بابری مسجد کے قضیہ کو حل کرنے کے لئے مختلف تجاویز گشت کرنے لگیں۔ بعض تجویزوں میں بابری مسجد کی عمارت اور اس کی زمین کی تقسیم اور اس کا ایک حصہ مندر بنانے کے حوالے کر دینے کی بات کہی جانے لگی۔ ایسی تجویزوں سے بعض مسلم قائدین کے اتفاق کرنے کے رجحان کی بات بھی پریس کے پلیٹ فارم پر آنے لگی۔ مسلمانوں میں ایک تشویش بھی پیدا ہوگئی اور انصاف پسند غیر مسلم بھی تقسیم اور ایک حصہ کی سپردگی کی تجویزوں کی مذمت کرنے لگے اور ان میں سے بعض نے اس کو ظلم کے آگے سر جھکا دینے کے مترادف قرار دیا۔ ان حالات میں کانپور کے علماء اور دانشوروں کی ایک جماعت نے مولانا منت اللہ رحمانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ سے مل کر درخواست کی کہ سمجھوتہ کی مختلف شکلیں پیش کی جا رہی ہیں اور تجویزیں گشت کر رہیں ان کے تعلق سے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ شرعی موقف کو واضح کرے تاکہ سمجھوتہ کی گفتگو میں شرکت کرنے والی کمیٹیوں کے سامنے یہ موقف واضح انداز میں آ جائے اور اس کو پیش نظر رکھ کر وہ ان تجاویز پر اپنے ردعمل کا اظہار کر سکیں۔ مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے اتفاق فرمایا اور 3/دسمبر 1990ء کو دہلی میں بورڈ کی مجلس عاملہ اور مدعوئین خصوصی کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں ملک کے ہر علاقہ کے علماء کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔

## مسجد کی جگہ خدا کی ملک ہے

اس اجلاس میں غور و بحث کے بعد واضح کیا گیا کہ: ''مسجد اور مسجد کی جگہ خدا کی ملک ہے، نہ اسے تبدیل کیا جا سکتا ہے، نہ اس کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے، نہ کسی مصالحت کی بنا پر کسی فرد، جماعت یا حکومت کے حوالہ کی جا سکتی ہے اور نہ کوئی حکومت اسے ایکوائر کر سکتی ہے''۔ اس واضح شرعی موقف کے اعلان کے علاوہ قرارداد میں دیگر متعلقہ امور کے بارے میں بھی بورڈ کے نقطہ نظر کو پیش کیا گیا کہ:

① نا قابل تردید تاریخی و قانونی شواہد سے واضح ہے کہ بابری مسجد، مسجد ہی ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف حکومت اتر پردیش نے بھی عدالت میں دیے گئے تحریری بیان میں کیا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بابری مسجد کسی غصب کی ہوئی زمین پر یا کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی۔ اس لئے اس کا شرعی موقف وہی ہے جو ایک مسجد کا ہوتا ہے۔ بنا بریں یہ مسجد مسلمانوں کو اسی حالت میں جس میں کہ 22 دسمبر 1949ء تک تھی واپس کی جانی چاہئے۔

② مسجد سے ملحقہ قبرستان کی آراضی پر جو شیلانیاس 9 نومبر 1989ء کو ہوا تھا وہ غلط اور ناجائز تھا اس مقام پر کارسیوا یا ایسے کسی پروگرام کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

③ الہ آباد ہائی کورٹ کے صادر کردہ حکم امتناعی کی تعمیل حکومت کا فرض ہے اس حکم کی خلاف ورزی کو روکنا حکومت کا کام ہے۔ بابری مسجد کی جگہ یا اس کی آراضی پر مندر تعمیر کرنے کی کوشش واضح طور پر قانون شکنی اور دستور کے خلاف بغاوت ہے۔ دستور کی حفاظت اور قانون کی بالادستی کو برقرار رکھنا حکومت کی ذمہ داری ہے اس لئے اس کو ایسی کوششوں سے ایمانداری اور مستعدی سے نمٹنا چاہئے۔

اپنے اسی فیصلہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے گفت و شنید کے ذریعہ حل کی تلاش کو رد نہیں کیا اور کہا کہ 'حکومت اگر گفت و شنید کے ذریعہ تنازعہ حل کرنا چاہتی ہے تو بورڈ ایسے ہر حل کا استقبال کرے گا جو شریعت سے متصادم نہ ہو۔

اجلاس میں بابری مسجد کے مسئلہ کا استحصال کرتے ہوئے فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنے کی مذموم حرکتوں کا جائزہ بھی لیا گیا اور قراردادوں میں کہا گیا کہ ''تین سال سے فرقہ پرست گاؤں گاؤں، شہر شہر تقاریر، شر انگیز بیانات، آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کے ذریعہ فرقہ پرستی کی آگ بھڑکا رہے

ہیں۔ ان شرانگیزیوں کے نتیجہ میں ملک کے کئی مقامات پر قتل و غارت گری کے واقعات رونما ہو چکے ہیں لیکن ان تین برسوں میں حکومت نے اب تک اس اشتعال انگیزی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ان جرائم کے مرتکبین کے خلاف کوئی تعزیری کارروائی بھی نہیں کی۔ اس بدبختانہ مہم کو روکنے کے سلسلہ میں حکومت کو اپنا فرض ادا کرنا چاہئے کہ نفرت و جارحیت کے پرچار کی یہ مہم ملک کے مفاد، اس کی یکجہتی اور سالمیت کے خلاف ہے۔ ملک کے مفاد عامہ کی خاطر مسلمان ضبط و تحمل سے کام لیتا رہا ہے اور جوابی انتہا پسندی سے گریز کرتا رہا ہے۔

بورڈ نے ملک کے قائدین کو بھی متنبہ کیا اور کہا کہ حکومت، سیاسی قائدین اور ملک کے بہی خواہ اس حقیقت کو جان لیں کہ اس تنازعہ سے ملک کا مستقبل اور اس کا کردار وابستہ ہے۔ حق و انصاف اور قانون کی بالادستی کے ذریعہ ہی ملک اور اس کے جمہوری اور سیکولر کردار کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

## حکومت کے آگے شرعی موقف کی وضاحت

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی جانب سے بابری مسجد کے بارے میں شرعی موقف کے اعلان کے بعد کسی مسلم کمیٹی یا ذمہ دار شخصیت کی جانب سے مسجد کی تقسیم اور اس کے کسی حصہ پر مندر کی تعمیر کی اجازت کی تجویزوں پر سرد مہری کا اظہار کیا جانے لگا، مسجد کی منتقلی اور اس سے دستبرداری کا مشورہ دینے والے خاموش ہو گئے۔

اگست 1992ء میں وزیر اعظم پی. وی. نرسمہا راؤ کی جانب سے صدر بورڈ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو یہ پیام ملا کہ وہ بابری مسجد کے مسئلہ پر بورڈ سے ملنا چاہتے ہیں۔ 11/ اگست 1992ء کو لکھنؤ میں بورڈ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں اس پر غور کیا گیا اور 17/ اگست 1992ء کو صدر بورڈ کی قیادت میں (22) رکنی وفد نے دہلی میں وزیر اعظم نرسمہا راؤ سے ملاقات کی اور ایک تحریری میمورنڈم ان کے حوالے کیا۔ اس میمورنڈم میں 3/ دسمبر 1990 کو طے کیے گئے موقف کو پیش کرتے ہوئے بابری مسجد کی مسلمانوں کو واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔ میمورنڈم میں کیا گیا ہے کہ: ''انصاف کا تقاضا ہے کہ چوری چھپے رکھی گئی مورتیوں کو ہٹا کر 22/ دسمبر 1949ء تک مسجد جس حالت میں تھی اسی حالت میں بابری مسجد مسلمانوں کو واپس کی جائے۔''

یہ بات چیت خوشگوار ماحول میں ہوئی، وزیر اعظم پی. وی. نرسمہا راؤ نے کم کہا اور زیادہ سنا مگر

انہوں نے اپنی کسی قطعی رائے کے اظہار سے گریز کیا۔

## آزاد ہندوستان کا سیاہ ترین واقعہ

مرکزی حکومت نے انصاف کے تقاضوں کی تکمیل نہیں کی اور بابری مسجد کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ریاستی بی. جے. پی حکومت خود ان عناصر کی حمایت اور پشت پناہی کر رہی تھی جو بہر قیمت بابری مسجد کی جگہ مندر بنانے پر بضد تھے اور جو ملک میں مسلمانوں کے خلاف فرقہ وارانہ جذبات بھڑکا رہے تھے۔ رام مندر کا نام لے کر اشتعال انگیزی اور جارحیت کو روکنے کے لئے کچھ کرنے کے بجائے قانونی اقدامات سے گریز کے ذریعہ ہمت افزائی کی گئی۔ 6 ردسمبر 1992ء کو وشو ہندو پریشد کے کارسیوا کے پروگرام پر پابندی نہیں لگائی گئی۔ سی. آر. پی. ایف، ریپڈ ایکشن فورس جیسی نیم فوجی پولس فورس اور فوج کی تعیناتی کا ڈھونگ رچایا گیا۔ کئی مسلم قائدین کو بلا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی گئی کہ حکومت بابری مسجد کی حفاظت کرے گی اور اگر کچھ کرنے کی وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کی جمع کی ہوئی بھیڑ نے کوشش کی تو پولس، نیم فوجی دستے اور ریاستی پولس حرکت میں آ جائے گی، ضرورت ہوئی تو فوج پہنچ جائے گی، جس کو قریب ہی مستعد حالت میں رکھا گیا ہے۔ ان یقین دہانیوں کے ذریعہ وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے دراصل مسلمانوں میں 6 ردسمبر کو ہی کسی احتجاجی تحریک یا چلو اجودھیا، کے اعلان کے امکان کو ٹھنڈا کر دیا۔

6 ردسمبر 1992ء کو آزاد ہندوستان کی تاریخ کا سیاہ ترین واقعہ پیش آیا۔ ریاستی پولس، پی. اے. سی.، سی. آر. پی. ایف، اور پولس کے اعلیٰ عہدیداروں کے سامنے بابری مسجد شہید کر دی گئی، نہ پولس نے کوئی مؤثر کارروائی کی، نہ آنسو گیس استعمال ہوئی اور نہ گولی چلی۔ سپریم کورٹ کے حالت کو جوں کا توں رکھنے کے حکم، قومی یکجہتی کونسل کی اپیل، وشو ہندو پریشد کے قائدین کے سپریم کورٹ کو دی گئی یقین دہانیوں کے پرخچے اُڑا دیے گئے۔ وزیر اعظم پی. وی. نرسمہا راؤ کا قومی یکجہتی کونسل اور پارلیمنٹ میں اور 15 راگست کو لال قلعہ کی فصیل پر سے کیا گیا بابری مسجد کی حفاظت کا وعدہ جھوٹا ثابت ہوا۔ پارلیمنٹ میں مرکزی حکومت کا یہ بیان بھی ڈھونگ ثابت ہوا کہ بابری مسجد کی عمارت کو کسی خطرہ کی صورت میں اپنے گھیرے میں لے کر صرف 3 منٹ میں محفوظ کرنے کی خصوصی تربیت ریپڈ ایکشن فورس کو دی گئی ہے۔ مرکزی حکومت کی ساز باز اور ریاستی حکومت کے اشارے سے غارت گردوں نے بابری مسجد کو شہید کر دیا۔

## انہدام کے بعد

بابری مسجد کے انہدام کی اطلاع کے ساتھ ہی مسلمانوں میں غم وغصہ ایک فطری امر تھا۔ جمہوریت میں احتجاج کے حق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے جگہ جگہ احتجاج کیا، ان کا پرامن احتجاج بھی ایک آنکھ نہ بھایا۔ پولس نے پرامن احتجاجی مسلمانوں کے تعلق سے سخت رویہ اختیار کیا، لاٹھی چارج اور آنسو گیس پر ہی بس نہیں کیا، کئی مقامات پر ان کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حکومتوں نے یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ مسلمانوں کے احتجاج کو قوت سے دبا دیا جائے اور اتنی طاقت کا استعمال کیا جائے کہ مسلمانوں میں احتجاج کرنے کا حوصلہ ٹوٹ جائے۔ دوسری طرف یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ سنگھ پریوار اور شیو سینا نے یہ اشارہ دے رکھا تھا کہ اُدھر مسلم احتجاجیوں پر پولس گولیوں کی بوچھار کرے اُدھر اُن کے مکانوں اور دوکانوں کو لوٹنے اور جلانے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ یہی ہوا ہندوستان کے کئی شہروں اور کئی علاقوں میں مسلم کش فسادات پھوٹ پڑے۔ پولس اور سنگھی بلوائیوں وشیوسینکوں کی ملی بھگت سے مسلمانوں اور ان کی املاک کو نشانہ بنایا۔ ملک کے طول وعرض میں پھوٹ پڑے ان فسادات میں بھوپال (مدھیہ پردیش)، میسور (کرناٹک)، جے پور (راجستھان)، کانپور (یو۔پی۔) اور ممبئی (مہاراشٹر) کے فسادات میں بڑی تباہی مچائی گئی۔ ممبئی کے فسادات کو قیامت صغریٰ کہا جا سکتا ہے جہاں مسلمانوں پر حملوں کی رہنمائی پولس اور پولس کے عہدیداروں نے کی، شیو سینا نے کھل کر اشتعال پیدا کیا اور مرکزی وزیر دفاع شری شرد پوار اور فوجی دستوں کی موجودگی بے اثر ثابت ہوئی اور بے دریغ قتل وخون غارت گری کا سلسلہ دسمبر 1992ء سے فروری 1993 تک جاری رہا۔

جنرل سکریٹری مولانا نظام الدین صاحب نے بابری مسجد کی عمارت کے انہدام کے بعد شرعی موقف کی وضاحت اور حالات کی سنگینی پر غور کرنے کے لئے بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں طلب کیا۔ 10-9 جنوری 1993ء کو یہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت صدر بورڈ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمائی۔ مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے شرعی موقف سے اجلاس کو واقف کرایا اور اجلاس نے ایک قرارداد کے ذریعہ اس کا اعلان کیا۔

## منہدم مسجد کے سلسلے میں شرعی موقف

9/جنوری 1993ء کے اجلاس میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے یہ شرعی موقف واضح کیا کہ:

① مسجد کی عمارت کا انہدام مسلمانوں کے جذبات واحساسات کو مجروح کرتا ہے اور شعائر اسلام کی توہین ہے۔

② عمارت کے انہدام کے باوجود وہ مقام جہاں بابری مسجد کی بنیاد 1528ء میں رکھی گئی تھی اب بھی مسجد ہے اور قیامت تک وہ مسجد رہے گی۔

③ مسجد کی عمارت کا انہدام، اس کی جگہ غیر قانونی طور پر مورتیوں کی تنصیب یا وہاں مورتیوں کی پوجا، اس کے مسجد ہونے کی حیثیت کو ختم نہیں کر سکتی اور مسجد بہر حال مسجد ہی رہے گی۔

④ کسی مسجد میں کسی عرصہ کے لئے نماز کا ادا نہ کیا جانا، اس کے مسجد ہونے کی حیثیت کو ختم نہیں کرتا۔

⑤ کوئی مسلمان کسی حال پر مسجد کو کلی یا جزوی طور پر بت خانے میں تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

⑥ مسجد کو تحویل میں لینے کا حکومت کا فیصلہ شریعت کے تحت ناجائز اور باطل ہے اور مسلمانوں کی مذہبی آزادی میں صریح مداخلت ہے۔

⑦ اگر حکومت بابری مسجد کے بجائے کسی دوسری جگہ متبادل مسجد تعمیر کرتی ہے تو یہ شرعی نقطہ نظر سے مسجد نہیں ہوگی اور اس غرض کے لیے تشکیل پانے والے ٹرسٹ میں شرکت کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے۔

اس قرارداد میں بورڈ نے بابری مسجد کے انہدام، اسی جگہ پر ایک غیر قانونی تعمیر اور مورتیوں کی تنصیب کے لئے مرکزی حکومت کو ذمہ دار قرار دیا۔ مرکزی حکومت نے انہدام کے بعد بابری مسجد کی جگہ کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ پہلے تو وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے اسی مقام پر مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنے کا اعلان کیا، بعد میں وہ مکر گئے کہ انہوں نے اس مقام پر مسجد کی تعمیر کا وعدہ نہیں کیا تھا یعنی یہ کہ کسی اور مقام پر مسجد کی تعمیر کی جائے گی اور اس کے لئے ٹرسٹ تشکیل دینے کی تجویز بھی تھی۔ پرسنل لاء بورڈ نے اعلان کر دیا کہ ایسی مسجد شرعاً مسجد نہیں ہوگی اور کوئی مسلمان اس ٹرسٹ میں شرکت نہیں کر سکتا۔

## مرکزی حکومت سے مطالبہ

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ایک وفد نے 5/اپریل 1993ء کو دہلی میں صدر بورڈ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی قیادت میں وزیر اعظم پی.وی.نرسمہا راؤ سے ملاقات کی، بورڈ نے مطالبہ کیا کہ:

① بابری مسجد کی جگہ پر 6/دسمبر 1992ء کو نصب کی گئی مورتی اور اس پر کھڑی کی گئی نئی تعمیر کو ہٹا دیا جائے۔

② وزیر اعظم 6/دسمبر 1992ء اور اس کے بعد کئی موقعوں پر کیے گئے وعدہ کے مطابق اسی مقام پر مسجد کی دوبارہ تعمیر کریں۔

③ حکومت دستور کے آرٹیکل 143 کے تحت سپریم کورٹ میں پیش کیے گئے ریفرنس کو واپس لے لے اور اس کو بجائے حقیت کے مقدمہ (Title Suit) کے بشمول تمام کیسوں کو یکجا کر کے روز مرہ سماعت کے ذریعہ عدالت سے ان کا فیصلہ کرایا جائے۔ یہ بات بڑی بدبختانہ ہے کہ ریفرنس کی عبارت اس طرح مرتب کی گئی کہ سوال سنگھ پریوار کے اس جھوٹے ادعا سے بہت آگے اور بہت وسیع ہوگیا ہے کہ رام مندر کو بابری مسجد کی تعمیر کے لئے منہدم کیا گیا۔ ریفرنس نہ ہی رام مندر سے متعلق ہے اور نہ ہی بابر کے دور تک اسے محدود کیا گیا ہے بلکہ اس کو دور ماضی بعید تک طول دیا گیا ہے۔ مسلمان بجا طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ جس انداز میں سپریم کورٹ میں ریفرنس پیش کیا گیا ہے وہ آر.ایس.ایس، وی.ایچ.پی.، بی.جے.پی. کے ان مبینہ ادعات کو معتبر قرار دینے کی چال ہے جنہیں وہ ثابت کرنے سے قاصر ہے۔

④ بابری مسجد کی جگہ کے بشمول اجودھیا اراضی کے ایکوئیزیشن کو منسوخ کیا جائے اور اس تعلق سے منظور بل صدر کی توثیق کے لئے روانہ نہ کیا جائے۔ یہ امر افسوس ناک ہے کہ اس بل پر پارلیمنٹ میں 24/مارچ 1993ء کو بحث کرائی گئی جب کہ تقریباً تمام مسلم ارکان عید کے لئے اپنے مقامات کو روانہ ہو چکے تھے اس طرح بل کے خلاف اظہار خیال کا موقع مسلم ارکان کو عمداً نہیں دیا گیا۔ مسجد، مندر، چرچ یا گرودوارہ، کسی بھی عمارت کو ایکوائر کرنا قومی پبلک پالیسی سے اور دستور کی روح سے انحراف ہے جس میں مذہبی عقیدہ رکھنے، اس پر عمل کرنے اور اس کا پرچار کرنے کی آزادی دی گئی ہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے قبل ازیں ایک

مسجد کے ایکویزیشن کے خلاف احتجاج پر اس کو منسوخ کیا گیا اور مسجد مسلمانوں کو بحال کی گئی۔ اجودھیا میں اراضی کے ایکویزیشن سے ایک تشویشناک نظیر قائم ہو رہی ہے جس میں کئی خطرات ہیں۔ حقیت (Title) کے حامل کو اس کے حقوق سے محروم کر کے کسی تنازعہ کو حل کرنے کا رجحان قانون وانصاف کے مقاصد کے مغائر ہے۔ اس کے بجائے حکومت مسجد کی جگہ اور زیر نزاع وقف اراضی کو تا تصفیہ اپنے قبضے میں رکھے۔

ان مطالبات کو رکھتے ہوئے اس وفد نے وزیر اعظم کے سامنے 9رجنوری 1993ء کو بورڈ کے فیصلہ کے تمام امور کو بھی پیش کیا اور یہ بھی واضح کیا کہ اجودھیا میں کسی اور جگہ پر کوئی مسجد تعمیر کی جائے تو وہ شرعاً مسجد متصور نہیں ہوگی۔

## آنجہانی راجیش پائلٹ سے گفتگو

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے وفد سے ملاقات اور گفتگو کے موقعہ پر وزیر اعظم پی. وی. نرسمہا راؤ کے ساتھ مرکزی وزیر داخلی سلامتی شری راجیش پائلٹ، مملکتی وزیر دفتر وزارت عظمٰی شری بھوونیش چترویدی اور سکریٹری وزارت داخلہ شری گوڈبولے موجود تھے۔ وفد نے اپنی جانب سے 9رجنوری کے فیصلوں کے ایک ایک نکتہ اور میمورنڈم میں پیش کردہ ایک ایک مطالبہ کی کھل کر وضاحت کی مگر وزیر اعظم ''سنو زیادہ، بولو کم'' کی روش پر عمل پیرا رہے۔ البتہ اس میمورنڈم کی روشنی میں مزید گفتگو کے لئے بورڈ کے ذمہ داروں کو بلانے کا وعدہ کیا۔ شری نرسمہا راؤ نے اپنے اس وعدہ کو پورا نہیں کیا۔ ملاقات کر کے جب وفد باہر نکل رہا تھا شری راجیش پائلٹ نے ریفرنس کے بارے میں مزید گفتگو کے لئے خود اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ اسی شام ان سے ملاقات کی گئی، ملاقات کرنے والوں میں راقم الحروف کے ساتھ مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ، مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامی، جناب عبدالستار یوسف شیخ (سکریٹری بورڈ) اور شہزادہ شبیر بھائی نور الدین بھی تھے۔ تفصیلی گفتگو کے بعد آنجہانی راجیش پائلٹ نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ریفرنس کی عبارت واقعی قابل اعتراض ہے اور اس کا محرک مسلمانوں کو مسجد کی جگہ واپس لینے کے حق سے محروم کر سکتا ہے۔

اس غیر رسمی (Informal) گفتگو کے دوران 6ردسمبر 1992ء کو مسجد کے اطراف سارے ساز و سامان اسلحہ سے لیس ریاستی و مرکزی پولس فورسز کی تعیناتی اور ان کا رول بھی زیر بحث آیا۔ پائلٹ

نے یہ بتا کر سب کو چونکا دیا کہ انہوں نے داخلی سلامتی کی وزارت سنبھالنے کے بعد حملہ سے بچاؤ اور حفاظت میں تین چارمنٹ میں بابری مسجد کو لینے کے لئے ریپڈ ایکشن فورس کو دی گئی تربیت کی فائل طلب کی تھی۔ جس پر متعلقہ عہدیداروں نے انہیں بتایا کہ ایسی کوئی ٹریننگ نہیں دی گئی۔ ارکان کو مطمئن کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں ایسی ٹریننگ دینے کا بیان دیا گیا جبکہ کسی ٹریننگ کا انتظام نہیں کیا گیا۔

## دہلی میں دھرنا، گرفتاریاں اور یومِ دُعاء

5/اپریل 1993ء کو پیش کردہ مطالبات کے میمورینڈم پر مسلسل یاددہانی کے باوجود وزیراعظم پی۔وی۔ نرسمہا راؤ نے کسی ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا اور حکومت کی طرف سے کوئی جواب بورڈ کو وصول نہیں ہوا۔ ان مطالبات کو آگے بڑھانے اور یاد دلانے کے لئے بورڈ کی بابری مسجد کمیٹی نے طے کیا کہ 15/اگست 1993 کو دہلی میں پارلیمنٹ کے پاس دھرنا دیا جائے اور ارکان گرفتاری کے لئے پیش ہوں۔ چنانچہ اس دن بورڈ کی جانب سے دھرنے کا اہتمام کیا گیا اور کمیٹی کے ارکان کے علاوہ بورڈ کے دیگر ارکان نے بھی گرفتاری دی۔

9/اکتوبر 1993 کو جے پور میں منعقدہ اجلاس عام میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ نے 9/جنوری کو منظور قرارداد کے نکات اور مطالبات کا اعادہ کیا اور طے کیا کہ 6/دسمبر 1993 کو جملہ ارکان دہلی میں حاضر رہیں۔ بابری مسجد کی شہادت اور انصاف و جمہوریت کے قتل کے دن وزیراعظم سے مل کر پوری ملّتِ اسلامیہ ہند کی طرف سے ناراضگی کا اظہار کیا کریں۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ انصاف پسند غیر مسلموں اور نمائندہ شخصیتوں کے تقاضوں کو پیش کیا جائے۔

بورڈ کے گیارہویں اجلاس عام (جے پور) کے دوران مجلس عاملہ نے یہ بھی طے کیا کہ 6/دسمبر سے پہلے جمعہ کو ہر جگہ ایک تحریر اس مسئلہ پر پڑھ کر سنائی جائے، جو بورڈ کی طرف سے مرتب کرکے بھیجی جائے اور ایک مطبوعہ کارڈ لاکھوں کی تعداد میں دستخط کرا کر وزیراعظم کو بھیج کر مسلمانوں کے مطالبہ سے آگاہ کیا جائے۔

اس فیصلہ کے مطابق مولانا سید نظام الدین جنرل سکریٹری نے علماء کرام، ائمہ مساجد اور مسلم تنظیموں کے ذمہ داروں سے اپیل کی کہ وہ 3/دسمبر 1993ء کے جمعہ کو نماز سے پہلے یا بعد میں

مسلمانوں سے خطاب کریں اور درج ذیل نکات ہی کو پیش کریں اور بعد نماز جمعہ بابری مسجد کی بازیابی اور ملک میں امن وسلامتی کے قیام اور بحالی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی جائے۔

① بابری مسجد 465 سال پرانی ہے اس میں 400 سال سے زیادہ عرصہ تک نماز ہوتی رہی ہے۔ ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہاں پر کوئی رام مندر تھا جس کو توڑ کر اس کی جگہ مسجد بنائی گئی۔ یہ محض بے بنیاد الزام ہے جس کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت پیدا کرنے کے لئے اُچھالا گیا ہے۔

② 6/دسمبر 1992ء کو قانون اور انصاف کے تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر مسجد کو مسمار کرنا مذموم حرکت ہے، مسلمانانِ ہند مسجد کی شہادت کے لئے کارسیوکوں کے ساتھ مرکزی حکومت کو بھی ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

③ وزیر اعظم نے 15/اگست 1992ء کو لال قلعہ سے مسجد کی حفاظت کا عہد کیا، اس عہد کو پورا نہیں کیا، 7-6/دسمبر 1992ء کو مسجد کی شہادت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ساری دنیا کے سامنے مسجد کو اس کی اصل جگہ بنانے کا وعدہ کیا، اس کو بھی پورا نہیں کیا۔ ان وعدوں کے برخلاف وہ بار بار مسجد و مندر بنانے کا اعلان کر رہے ہیں اور یہ کہ مسجد اجودھیا میں دوسرے مقام پر بنائی جائے گی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا یہ فیصلہ ہے کہ کسی دوسری جگہ بابری مسجد کے عوض اس نام سے مندر کی تعمیر ہرگز منظور نہیں کی جائے گی۔ عمارت کے مسمار ہو جانے کے بعد بھی وہ جگہ مسجد ہی ہے۔

جنرل سکریٹری مولانا سید نظام الدین نے اس اپیل میں یہ وضاحت کرنے کی گزارش بھی کی کہ ہم سارے ہندوؤں کو اس واقعہ کا ذمہ دار نہیں سمجھتے۔ کچھ فرقہ پرست اور فسطائی ذہن رکھنے والی جماعتوں نے سیاسی مفاد کے لئے مسجد کو مسمار کیا ہے۔ بہت سارے انصاف پسند غیر مسلموں نے پرزور الفاظ میں اس کی مذمت کی ہے اور حکومت کے رویہ کو جمہوریت اور سیکولرزم کے خلاف قرار دیا ہے۔

کارڈ کے لئے تین مطالبات ❶ سپریم کورٹ میں پیش کردہ ریفرنس کی واپسی، ❷ بابری مسجد کی زمین کو ایکوائر کرنے کی واپسی اور ❸ شہید بابری مسجد کی اسی مقام پر تعمیر۔ تجویز کیے گئے۔

سارے ملک میں 3/دسمبر کو 1993 کو یوم دُعا منایا گیا اور مسلمانوں نے لاکھوں کی تعداد میں

ان مطالبات کے کارڈ روانہ کیے۔

## نرسمہا راؤ سے آخری گفتگو

اجلاس جے پور کے فیصلے کے مطابق آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے (52) رکنی وفد نے صدر بورڈ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی قیادت میں وزیراعظم پی. وی. نرسمہا راؤ سے ملاقات کی۔ وفد نے بابری مسجد کی شہادت کے لئے وزیراعظم کی بے عملی کو ذمہ دار قرار دیا اور سانحہ کے بعد اس مسئلہ کے متعلق جتنے بھی اقدامات وزیراعظم نے کیے ہیں ان کو غیر اطمینان بخش گردانا کہ مسلمان ہند ان سے غیر مطمئن ہیں۔ وفد نے ان کے سامنے بورڈ کے اس احساس کو رکھا کہ یہ سارے اقدامات حق و انصاف کے تقاضوں اور خود ان کے متعدد وعدوں اور یقین دہانیوں کے مغائر ہیں اور بابری مسجد کی جگہ پر سنگھ پریوار کے غاصبانہ قبضہ کو مستحکم اور مستقل کرنے کی غرض سے کیے گئے ہیں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی طرف سے مولانا سید نظام الدین صاحب جنرل سکریٹری اور جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب کنوینر، کمیٹی کا دستخط شدہ ایک خط پڑھ کر سنایا اور حوالہ کیا گیا۔ اس خط میں اس افسوس کا اظہار کیا گیا کہ 5/اپریل 1993ء کو پیش کردہ نکات و مطالبات پر مزید گفتگو کے لئے بورڈ کے نمائندوں کو بلانے کے وعدے کا انہوں نے ایفا نہیں کیا۔ اس کے برعکس اطلاعات کے مطابق ان کی حکومت بابری مسجد کی جگہ پر مندر کی تعمیر کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے اقدامات کر رہی ہے۔ مزید یہ کہ سنگھ پریوار کو چھوڑ کر پورے ہندوستان کے تمام سیکولر اور انصاف پسند طبقات کے مشترکہ مطالبہ کے باوجود انہوں نے اب تک سپریم کورٹ سے دستور کے آرٹیکل (143) کے تحت کیے گئے ریفرنس کو واپس نہیں لیا ہے جو نہایت جانبدارانہ انداز میں اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ سارا فائدہ سنگھ پریوار کو پہنچے۔ دن دہاڑے 6/دسمبر 1992ء کو بابری مسجد شہید کرنے والے خاطیوں میں سے کسی ایک کو بھی اب تک اس جرم کی سزا نہیں دی گئی اور بس ایک کمزور چارج شیٹ عدالت میں پیش کی گئی ہے۔ سانحہ کی تحقیقات کے لئے حکومت کی طرف سے جو کمیشن (جسٹس لبراہن کمیشن) مقرر کیا گیا ہے اس کے کام میں اب تک کوئی خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔

اس خط میں وزیراعظم سے دوٹوک انداز میں کہہ دیا گیا کہ بابری مسجد کے سانحہ کے تناظر میں

ملک کی تمام سیکولر طاقتوں اور خصوصاً مسلمانوں کا اعتماد ان پر سے اُٹھ چکا ہے اور مسلمانوں کو بالکل بھروسہ نہیں رہا کہ وزیر اعظم اس معاملہ میں حق و انصاف کے تقاضوں کو اور بابری مسجد کی دوبارہ اسی جگہ تعمیر کا جو وعدہ انہوں نے ہندوستانی قوم سے پوری دنیا کو گواہ بنا کر کیا ہے پورا کریں گے۔ اس لئے صرف ریکارڈ کی خاطر اپنے اس مطالبہ کو دہراتے ہوئے کہ یا تو حکومت خود بابری مسجد کو دوبارہ اسی مقام پر فوراً تعمیر کرے یا پھر یہ جگہ مسلمانوں کے حوالے کر دی جائے، آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ قطعیت کے ساتھ یہ واضح کرتا ہے کہ اس معاملہ میں اب تک مسلمانوں کے جذبات و احساسات اور ان کے مبنی برحق و انصاف مطالبات سے جس طرح بے اعتنائی برتی گئی ہے اور ان سے صرف نظر کیا گیا ہے اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بابری مسجد کے تعلق سے بورڈ آئندہ نہ ان سے کوئی ملاقات کرے گا اور نہ کوئی گفتگو کرے گا۔

اس تفصیلی ملاقات میں وزیر اعظم نے صرف اس بات کی تردید کی کہ ان کی حکومت بابری مسجد کی جگہ پر مندر کی تعمیر کے منصوبہ پر عمل پیرا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مندر مسجد کی تعمیر کرنا حکومت کا کام نہیں ہے بلکہ یہ تو مذہبی رہنماؤں کا کام ہے۔ وزیر اعظم کا یہ بیان تضاد سے خالی نہیں تھا، اس لئے کہ ساتھ ہی انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ ان کی طرف سے مندر و مسجد کی تعمیر کے لئے دو علیحدہ ٹرسٹوں کے قائم کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اس کے جواب میں وفد نے وزیر اعظم پر دوبارہ واضح کر دیا کہ شہید بابری مسجد کے بدلے میں کسی دوسری جگہ کسی مسجد کی تعمیر مسلمانوں کو کسی طرح قابل قبول نہیں ہے اور یہ شرعی اعتبار سے مسجد نہیں ہوگی۔ اس ملاقات میں وزیر اعظم کے ساتھ وزیر داخلہ شنکر راؤ چوان موجود تھے، زیادہ تر گفتگو وزیر اعظم نرسمہا راؤ کی جانب سے انہوں نے کی۔

اسی رات آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں وزیر اعظم سے ملاقات کے بارے میں متفقہ طور پر اس تاثر کا اظہار کیا گیا کہ اب بابری مسجد کے مسئلہ میں ان سے انصاف کی توقع رکھنا بیکار ہے اور یہ کہ بابری مسجد کی بازیابی کی تحریک ایک طویل مدت کی جدوجہد ہے۔

اس اجلاس نے مسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ وہ ایک طویل جدوجہد کے لئے تیار رہیں اور آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی بابری مسجد کمیٹی کی آواز پر لبیک کہیں اور اس کے پروگرام کو کامیاب بنائیں۔

## بابری مسجد کنونشن اور احتجاجی گرفتاریاں

7/دسمبر 1993 کو بورڈ کی بابری مسجد کمیٹی کا اجلاس صدر بورڈ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ 30/جنوری 1994ء کو دہلی میں بابری مسجد کنونشن منعقد کیا جائے اور یکم فروری کو جو بابری مسجد کے تالے توڑنے کا دن ہے، مسلم پرسنل لاء بورڈ کے ارکان اور مسلم تنظیموں کے قائدین دہلی اور ریاستی دارالحکومتوں میں ''بابری مسجد کی مسلمانوں کو حوالگی'' کے مطالبہ کو لے کر گرفتاری دیں گے۔ گرفتاری کے اس احتجاجی پروگرام میں عوام سے شامل نہ ہونے کی اپیل کی جائے گی تاکہ شرانگیزوں کو عوام کے ساتھ شامل ہوکر پروگرام کے امن ونظم کو متاثر کرنے کا موقعہ نہ ملے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ دہلی میں گرفتاری دینے والیوں کی تعداد (100) اور ریاستی دارالحکومتوں پر گرفتاری دینے والوں کی تعداد (50) ہوگی۔ بورڈ کی بابری مسجد کمیٹی کے ارکان دہلی میں گرفتاری دیں گے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ یکم فروری کو صبح دہلی میں صدر جمہوریہ شری شنکر دیال شرما کو میمورنڈم پیش کیا جائے گا۔ اس کے بعد ارکان بورڈ و دیگر قائدین وزیر اعظم کا گھیراؤ کرنے کی غرض سے ان کی کوٹھی کی طرف روانہ ہوں گے اور اس طرح اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کریں گے۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ وزیر اعظم کے گھیراؤ کی اطلاع متعلقہ پولس افسران کو دے دی جائے گی۔ اس طرح ریاستی دارالحکومتوں میں گورنر کی کوٹھی تک کسی متعینہ جگہ سے مارچ کیا جائے گا۔

بابری مسجد کمیٹی کے اس فیصلہ کے مطابق 30/جنوری 1994ء کو دہلی میں بابری مسجد کنونشن کا کامیابی کے ساتھ انعقاد عمل میں آیا اور یکم فروری کو دہلی اور کئی ریاستوں کے دارالحکومتوں میں علامتی گرفتاریاں دی گئیں۔ صدر جمہوریہ کو دیے گئے میمورنڈم کے خطوط پر ہی صدر جمہوریہ کو روانہ کرنے کے لئے میمورنڈم گورنر کو دینے کی ہدایت ریاست کے ارکان بورڈ کو دی گئی۔

صدر جمہوریہ کے موسومہ میمورنڈم میں وزیر اعظم کے اپنے وعدوں سے انحراف اور عدل و انصاف کے تقاضوں کی پامالی کے رویہ کو واضح کرتے ہوئے یہ مطالبات کیے گئے کہ:

① بابری مسجد کی اسی مقام پر دوبارہ تعمیر کی جائے اور یہ مسجد مسلمانوں کو بحال کی جائے۔

② پارلیمنٹ کے اس قانون کو منسوخ کیا جائے جس کے تحت بابری مسجد کی جگہ اور متصلہ اوقافی اراضی کو ایکوائر کیا گیا ہے اور الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ کے آگے زیر سماعت دیوانی مقدمہ

کی پیش رفت ختم ہوگئی۔

③ سپریم کورٹ میں پیش کیے گئے ایک نکتہ پر مشتمل ریفرنس کو جو دستور کے آرٹیکل 143(1) کے تحت پیش کیا گیا واپس لیا جائے اور بابری مسجد سے متعلق تمام مقدمات کو آرٹیکل (138) کے تحت سپریم کورٹ کو ان کے تصفیہ کے لئے منتقل کیا جائے۔ اس میمورنڈم میں ایکویزیشن اور ریفرنس دونوں کی قباحتوں اور ان سے مسلمانوں کے حقوق کے اتلاف کو واضح کیا گیا۔

## ٹائٹل سوٹ میں پیروی

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا بارہواں اجلاس عام 8-7/اکتوبر 1995ء کو احمد آباد (گجرات) میں ہوا۔ اس اثناء میں سپریم کورٹ نے دفعہ 143(1) کے تحت کیے گئے ریفرنس کو واپس کر دیا اور ٹائٹل سوٹ (حقیت کا مقدمہ) کی سماعت الہ آباد ہائی کورٹ میں کی جانے کی ہدایت کی۔

اس اجلاس میں بابری مسجد کے تعلق سے 9/جنوری 1993ء کو اعلان کردہ موقف کا اعادہ کیا گیا۔ اسی قرارداد میں سپریم کورٹ کی جانب سے ریفرنس کے رد کیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا کہ حکومت ہند انصاف اور قانون کی بالادستی کے اہم اصولوں کے ناطے، بابری مسجد کی حقیت کے مقدمہ کی جلد سماعت کروائے۔ اجلاس نے جنرل سکریٹری کو یہ ہدایت کی کہ وہ الہ آباد ہائی کورٹ میں حقیت کے مقدمہ کے ساتھ سپریم کورٹ میں زیر دوران تحقیر عدالت کی کارروائیوں اور ناجائز طور پر بنائے گئے مندر کے خلاف رٹ کیس میں موثر پیروی اور عاجلانہ سماعت کی کوشش کریں۔

1995ء کے اواخر الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں بابری مسجد کے مقدمات کی دوبارہ سماعت شروع ہوئی۔ پہلے عرضی دعویٰ دجواب دعویٰ وغیرہ میں ترمیم کی درخواستیں دی گئیں، ان پر احکامات جاری ہونے کے بعد تحقیقات (Issues) میں ترمیم و اضافہ ہوا۔ مقدمہ کی اصل کارروائی متفرق درخواستوں کے تصفیہ کے بعد 1996ء کے وسط میں شروع ہوئی۔ اس مقدمہ میں جناب ظفریاب جیلانی ایڈووکیٹ اور جناب عبدالمنان ایڈووکیٹ پیروی کررہے ہیں۔ بورڈ اس کی پیش رفت وغیرہ کی نگرانی کررہا ہے۔

اس دوران میں مرکز میں یونائیٹڈ فرنٹ کی حکومت بنی۔ اس فرنٹ میں شامل سیاسی پارٹیوں کے درمیان ایک مشترکہ اقل ترین پروگرام پر اتفاق رائے ہوا۔ اس میں بابری مسجد کا تصفیہ سپریم کورٹ

سے دستور ہند کے آرٹیکل (2)138 کے تحت کروانے پر اتفاق ہوا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی مجلس عاملہ نے 7/جولائی 1996ء کے اعلان میں اس پر غور کیا۔ دستور کے اس آرٹیکل کے تحت کسی قضیہ کو سپریم کورٹ میں سماعت اور فیصلہ کے لئے پیش کرنے سے پہلے اس قضیہ کے تعلق سے ریاستی حکومتوں اور مرکزی حکومتوں کے درمیان سمجھوتہ (ایگریمنٹ) طے پانا ضروری ہے۔ مشترکہ اقل ترین پروگرام میں مجوزہ سمجھوتہ کے بارے میں کوئی بات شامل نہیں تھی۔ چونکہ لکھنؤ بنچ پر حقیت کے مقدمہ کی سماعت شروع ہو چکی تھی اس لئے بورڈ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ سپریم کورٹ کو اس کیس کی منتقلی کے مراحل طے ہونے تک ہائی کورٹ میں سماعت کو ملتوی نہ کیا جائے بلکہ کیس کے جلد فیصلہ کے لئے روزانہ سماعت کی درخواست کی جائے۔ مجلس عاملہ کا یہ نقطہ نظر بھی رہا کہ سپریم کورٹ کو منتقلی کے لئے حکومتوں کے درمیان ایگریمنٹ کے نکات پر حکومت اور بورڈ کے درمیان تبادلہ خیال ہونا چاہیے یا حکومت نے اس کا کوئی مسودہ تیار کیا ہے تو اس کی تفصیلات سے پرسنل لاء بورڈ کو واقف کرانا چاہیے۔ مجلس عاملہ کے فیصلوں کی روشنی میں بورڈ کے ایک وفد نے سکریٹری بورڈ محمد عبدالرحیم قریشی کی قیادت میں وزیر اعظم ایچ. ڈی. دیوی گوڑا سے 15/جولائی 1996ء کے پارلیمنٹ ہاؤس نئی دہلی میں ملاقات کی اس وفد نے پرسنل لاء بورڈ کے ارکان جناب جی. ایم. بنات والا (ایم. پی.)، جناب ظفریاب جیلانی ایڈووکیٹ کے علاوہ جناب قمر الاسلام (ایم. پی.)، (موجودہ وزیر حکومت کرناٹک) اور جناب م. افضل (ایم. پی.) شامل تھے۔ وفد نے مرکزی حکومت کی جانب سے بابری مسجد کے مقدمہ کے عاجلانہ تصفیہ سے متعلق خاطر اور دلچسپی کی ستائش کی اور ایک میمورنڈم کے ذریعہ وزیر اعظم سے آرٹیکل (2)138 کے تحت سپریم کورٹ کو کیس کی منتقلی کے لئے ضروری مراحل کی تفصیلات پر گفتگو کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کو بلانے کی تجویز رکھی۔ وزیر اعظم جناب دیوی گوڑا نے غور کرنے کا وعدہ کیا۔ مگر یونائیٹڈ فرنٹ کی حکومت گر جانے سے سپریم کورٹ کے ذریعہ فیصلہ کروانے کی بات ختم ہو گئی۔

## بابری مسجد کمیٹی کی تشکیل جدید

بابری مسجد کی حقیت (Title) کے مقدمہ کی سماعت شروع ہونے کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کا موقف یہ رہا کہ عدالت کے فیصلہ کا انتظار کیا جائے اور تمام فریقین عدالتی چارہ کار کے ذریعہ جلد از جلد اس کے آخری وقطعی فیصلہ کی کوشش کریں اور عدالت کے اس فیصلہ کو تسلیم کریں۔

تاہم ہر سال 6 ر دسمبر کو بابری مسجد کمیٹی کی جانب سے کسی نہ کسی علامتی پروگرام کی اپیل کی جاتی رہی ہے اور مسلمان اس اپیل پر اس میں حصہ لیتے رہیں۔

2000ء کے آخر میں سنگھ پریوار اور خصوصاً وشو ہندو پریشد نے بابری مسجد کے تعلق سے جارحانہ پروپیگنڈہ شروع کیا اور بابری مسجد کے مسئلہ کا استحصال کرتے ہوئے فرقہ وارانہ منافرت اور کشیدگی کو بڑھاوا دیا جانے لگا۔ اس صورت حال کا بورڈ نے اپنے اجلاس عاملہ میں جائزہ لیا جو دہلی میں 31 رجنوری 2001ء کو منعقد ہوا۔ اس تعلق سے منظور قرارداد میں محبِ وطن ہندوستانیوں کو یہ ذمہ داری یاد دلائی گئی کہ وہ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے دستور کا بالادستی اور عدلیہ کے وقار کے تحفظ و دفاع کے لئے اُٹھ کھڑے ہوں۔ اجلاس نے ملک کے طول وعرض میں ایک تحریک چلانے کی ضرورت کو محسوس کیا جس کے ذریعہ عوام میں شعور پیدا کیا جائے تاکہ اجودھیا مسئلہ کی آڑ میں حقیر سیاسی مفادات کے تحت نفرت کے تازہ ترین پروپیگنڈہ سے وہ گمراہ نہ ہوں۔

مجلس عاملہ نے طے کیا کہ بابری مسجد کو شہید کرنے والے سماج دشمن اور ملک دشمن عناصر کے بیانات اور کارروائیوں سے پیدا ہونے والی صورت حال کا جائزہ لے کر مناسب اقدامات طے کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔ اجلاس نے صدر بورڈ مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو مجاز گردانا کہ وہ اس کمیٹی کے لئے ارکان نامزد کریں نیز اس کا ایک کنوینر مقرر کردیں جو بورڈ کی جانب سے اس کا ترجمان بھی ہوگا۔ فرقہ وارانہ منافرت کے موجودہ پروپیگنڈہ سے عوام کو محفوظ رکھنے کے لئے مناسب اقدامات، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی برقراری کے لئے کوشش اور بابری مسجد کے مسئلہ کی دستور ہند کے ضابطوں کے تحت حل کے لئے جدوجہد اس کمیٹی کی ذمہ داری قرار دی گئی۔

بات چیت کے ذریعہ مسئلہ کے حل کی کوششوں کے لئے بورڈ نے اپنا دروازہ کھلا رکھا۔ چنانچہ اس قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ”مرکزی حکومت کی طرف سے اگر دستور ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے بابری مسجد کے مسئلہ کے حل کے لئے معنی خیز مذاکرات کی پیش کش ہوتی ہے تو ہم اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ حکومت گفتگو کے لئے ماحول کو سازگار بنانے کی غرض سے ٹھوس اقدامات کرے۔“

صدر بورڈ مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے 23 رجنوری کو اس قرارداد کو عملی جامہ پہناتے ہوئے بارہ رکنی کمیٹی تشکیل دی۔ ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس کو اس کا کنوینر مقرر کیا۔ صورت حال پر نظر رکھنا،

مسجد کی شہادت میں ملوث افراد اور تنظیموں کے بیانات، پالیسیوں اور اقدامات کا جائزہ لینا اور تدارک کے لئے مناسب اقدام کرنا اس کمیٹی کی ذمہ داری قرار دی اور اختیار دیا کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی پیدا کرنے نیز جمہوریت وسیکولرازم کی فضا کو باقی رکھنے کے لئے تمام مذاہب اور فرقوں سے وابستہ افراد سے براہِ راست تعلق قائم کرکے ایک تحریک برپا کرے تاکہ عامۃ الناس کو فرقہ پرست قوتوں کے مذموم عزائم سے باخبر رکھا جاسکے۔ جمہوریت اور سیکولرزم کی فضا برقرار رہے اور قانون کو بالادستی حاصل رہے۔

اس کمیٹی نے اپنے پہلے اجلاس منعقدہ 17رفروری 2001ء میں طے کیا کہ اس کمیٹی کا نام آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کمیٹی آن بابری مسجد ہوگا۔

## دھرم سنسد کی دھمکی

وشو ہندو پریشد کی دھرم سنسد نے فیصلہ کیا کہ وہ رام مندر کی تعمیر کا کام مارچ ر2002ء میں شروع کرے گی، عدالت کے کسی فیصلہ کا انتظار نہیں کرے گی۔ سنسد اور وشو ہندو پریشد نے یہ بھی اعلان کردیا کہ وہ ملک کی عدلیہ کے اختیار کو تسلیم نہیں کرتے اور بابری مسجد اور اس سے متصل اوقات کی اراضی کے بارے میں عدالت کے فیصلہ کو قبول نہیں کریں گے۔ یہ گویا مملکت کے اقتدار اعلیٰ کو چیلنج تھا، جس پر حکومت کو سخت نوٹس لیتے ہوئے کارروائی کرنا چاہئے تھی مگر حکومت کے جانبدارانہ رویہ نے وشو ہندو پریشد کی جسارت کو اور بڑھا دیا۔ اس صورت حال میں بورڈ کی بابری مسجد کمیٹی نے برسراقتدار اتحاد، این۔ڈی۔اے۔ میں شریک غیر بی۔جے۔پی۔ پارٹیوں کو سیکولرزم و جمہوریت اور قانون کی بالادستی کے اہم اور بنیادی اصولوں کی حمایت میں ہموار کرنے کی کوشش کا آغاز ترنمول کانگریس کی صدر ممتا بنرجی سے ملاقات میں کیا۔ جنرل سکریٹری مولانا سید نظام الدین صاحب کی قیادت میں ایک وفد نے ان سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ ❶ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور امن کی فضا کو اپنے سیاسی مقاصد کے تحت بگاڑنے والے عناصر کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ اپنی سطح پر منظم کوشش کریں۔ ❷ دستور کے بنیادی اقدار اور عدلیہ کے وقار کی بے حرمتی میں ملوث عناصر کے خلاف سرکاری سطح پر قانونی کارروائی کی جائے۔ ❸ الہ آباد ہائی کورٹ میں زیرسماعت بابری مسجد کے کیس کی روزانہ سماعت کے لئے پارلیمنٹ میں ریزولیشن پاس کروایا جائے اور ❹ بابری مسجد سے متعلق سپریم کورٹ، ہائی کورٹ اور سی۔بی۔آئی۔ کورٹ میں زیر دوران مقدمات کی کارروائی کو تیز

کروانے کے لئے حکومت سے مطالبہ کیا جائے۔

سیاسی رہنماؤں سے مقدموں کے سلسلے میں بورڈ کی کمیٹی کے ایک وفد نے 7/اپریل 2001ء کو سی.پی.آئی. کے رہنما سردار ہرکشن سنگھ سرجیت سے ملاقات کی۔ ہرکشن سنگھ سرجیت نے اپنی پارٹی کی جانب سے ہر ممکن تعاون کا وعدہ کیا۔

پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کی لیڈر محترمہ سونیا گاندھی سے بورڈ کے ایک وفد نے 23/مئی 2001ء کو ملاقات کی۔ وفد کے ارکان نے زبانی گفتگو کے علاوہ مسز گاندھی کو ایک یادداشت بھی دی جس میں فرقہ پرست اور فسطائی عناصر کے عزائم اور منصوبوں کا ذکر کرتے ہوئے ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ پارلیمنٹ میں اپنی پارٹی کی جانب سے ان مذموم حرکتوں پر قدغن لگانے کی تحریک کریں۔ نیز بابری مسجد انہدام کے سی.بی.آئی. مقدمہ کے تعلق سے حکومت یو.پی. پر دباؤ ڈالیں کہ وہ نوٹیفکیشن کی تکنیکی خرابی کو دور کرکے نیا نوٹیفکیشن جاری کریں۔ مسز گاندھی نے وشو ہندو پریشد کے پروگراموں پر قدغن لگانے کی غرض سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں اس مسئلہ کو اُٹھانے اور حکومت پر ہر ممکن دباؤ ڈالنے کا وعدہ کیا۔

جیسے جیسے دھرم سنسد کی مندر کی تعمیر شروع کرنے کی مجوزہ تاریخ 15/مارچ 2002ء قریب آنے لگی سنگھ پریوار اور خصوصاً وشو ہندو پریشد کا پروپیگنڈہ تیز ہوگیا۔ یہ حکومت اور اعلیٰ عدالتوں تک کو چیلنج کرنے لگے۔ مختلف مقامات سے تعمیری سامان اجودھیا پہنچانے کا پروگرام، سنت چیتاونی یاترا وغیرہ۔ ان سب کا مقصد یہ تھا کہ دھونس کے ذریعہ بابری مسجد کے اطراف کی اوقافی اراضی کے حصہ کو حکومت کی تحویل سے لے کر مندر کی تعمیر کا آغاز کردیا جائے۔ بورڈ کی کمیٹی آن بابری مسجد کے کنوینر اور ترجمان ڈاکٹر قاسم رسول الیاس نے اخبارات اور ٹی.وی. کے ذریعہ گمراہ کن اور اشتعال انگیز بیانات کا جواب دیا اور عوام کو صحیح صورتحال سے واقف کرانے کی کوشش کی۔

## کانچی شنکر آچاریہ کی تجاویز

27/فروری کو گودھرا میں ہوئے سابرمتی ایکسپریس کی بوگی کی آتشزدگی کے مذموم واقعہ کے ساتھ ہی گجرات میں مسلمانوں کے قتل و غارت گری اور آبروریزی کے دلدوز واقعات شروع ہوئے جن کا مقصد اس ریاست سے مسلمانوں کا صفایا معلوم ہوتا ہے اور بلاشبہ طویل عرصہ تک جاری اس کشت و خون کو نسل کشی (Genocide) قرار دیا جاسکتا ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کے بہیمانہ حملوں

سے سارے ہندوستان کے مسلمان اور دیگر امن پسند اور منصف مزاج شہریوں میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ اس کشیدہ صورت حال میں وزیر اعظم کے دفتر کے افسر آن اسپیشل ڈیوٹی مسٹر سدھیر کلکرنی نے پرسنل لاء بورڈ کے دفتر سے رابطہ پیدا کیا اور بتایا کہ کانچی کے شری شنکر آچاریہ گجرات میں امن و سکون کی بحالی کے لئے مشترکہ اپیل کی اجرائی پر تبادلہ خیال کرنا چاہتے ہیں۔ اس اطلاع پر جنرل سکریٹری مولانا سید نظام الدین صاحب کی قیادت میں بورڈ کے ایک وفد نے دوسرے ہی دن یعنی 5 مارچ کو ان سے ملاقات کی۔ گجرات کے لئے مشترکہ اپیل سے اتفاق کیا گیا اور شری شنکر آچاریہ اور بورڈ کے وفد کی مشترکہ اپیل جاری ہوئی۔ اس ملاقات میں شری شنکر آچاریہ نے اجودھیا کی تمام غیر نزاعی اراضی پر رام جنم بھومی نیاس کی جانب سے رام مندر کی تعمیر کی اجازت دینے کے تعلق سے چند تجاویز رکھیں اور بتایا کہ رام جنم بھومی تحریک سے متعلق تمام پارٹیوں نے ان کو اختیار دیا ہے کہ وہ مسلمانوں سے ان کی طرف سے گفت وشنید کریں، یہ تمام پارٹیاں متنازعہ جگہ (یعنی بابری مسجد کی جگہ) کے تعلق سے عدالت کے فیصلہ کی پابندی کریں گی، رام مندر کی مجوزہ تعمیر ایکوائر کی گئی اراضی کے (42) ایکڑ کے رقبہ پر ہوگی جس سے بابری مسجد کی جگہ خارج ہوگی اور ایک دیوار درمیان میں اٹھا دی جائے گی اور عدالت کے قطعی فیصلہ تک اس جگہ کی حالت کو جوں کا توں رکھا جائے گا، اگر مسلمان حقیت کا مقدمہ جیت جائیں تو ان کو اسی جگہ مسجد کی دوبارہ تعمیر کی اجازت ہوگی اور بشمول حکومت فریقین پر اس تصفیہ کی پابندی قانوناً لازمی ہوگی۔ اس وفد نے ہندو برادرانِ وطن میں شری شنکر آچاریہ کے اونچے روحانی مرتبہ کے پیش نظر اور ان کے احترام میں ان کی تجاویز کو مجلس عاملہ میں پیش کرنے سے اتفاق کیا بشرطیکہ ❶ تجاویز اسی طور پر تحریراً بھیجی جائیں، ❷ مجوزہ عمارت کی تعمیر کیلئے نقشہ کی نقل دی جائے، ❸ محل وقوع کا نقشہ (سائٹ پلان) کی نقل دی جائے جس میں رنگوں کے ذریعہ شناخت کی گئی، ❹ وزیر اعظم کو رام جنم بھومی نیاس کی جانب سے دی گئی تحریری یقین دہانی کی نقل فراہم کی جائے اور ❺ وہ دیگر دستاویزات فراہم کیے جائیں جن سے مسئلہ کے تصفیہ میں سہولت ملے۔

مسلسل یاد دہانیوں کے باوجود یہ چیزیں فراہم نہیں کی گئیں۔ شنکر آچاریہ کے مٹھ سے 8/ مارچ کو جاری کردہ خط 9/ مارچ کو دو بجے دوپہر ملا۔ اس خط میں تحریری تجاویز کے علاوہ صرف سائٹ پلان منسلک تھا۔ دوسری دستاویزات فراہم نہیں کی گئیں۔

## مسلم پرسنل لاء بورڈ کا ردعمل

شری شنکر آچاریہ کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ بابری مسجد کے مسئلہ پر گفت وشنید کے لئے شنکر آچاریہ کی مساعی کی قدر کرنے کے باوجود ان تجاویز پر بورڈ کی جانب سے کسی مثبت ردعمل کا طے کرنا مشکل محسوس ہوا کیونکہ:

- تعمیر کے پلان کے بغیر رام جنم بھومی نیاس کی جانب سے دی گئی یقین دہانی کو سمجھنا مشکل ہے کیونکہ اصل سوال یہ ہے کہ مورتی کے نصب کرنے کی جگہ کہاں متعین کی گئی ہے۔
- یہ واضح نہیں ہے کہ نیاس کو اس تعمیر کے کام کا حق کیسے حاصل ہوا۔ مزید یہ کہ نیاس کے وشو ہندو پریشد اور سنگھ پریوار کی دیگر تنظیموں کے ساتھ ربط کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔
- تجاویز میں یہ تیقن نہیں ہے کہ وشو ہندو پریشد جو 1980ء سے رام مندر کی تحریک چلا رہی ہے عدالت کے فیصلہ کی پابندی کرے گی۔ ایسا تیقن نہ ہو تو وہ عوام کو اکسانے اور ایجی ٹیشن چلانے کے لئے آزاد رہے گی۔ کئی تنظیمیں جنہیں اجتماعی انداز میں سنگھ پریوار کہا جاتا ہے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر مربوط طریقہ پر کام کرتی ہیں مگر قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے ہوشیاری کے ساتھ باہمی تعلق پر پردہ ڈالے ہوئی ہیں، تجاویز میں سنگھ پریوار کی تمام تنظیموں کو پابند کرنے کی کوئی اسکیم شامل نہیں ہے۔
- مسلمانوں کو یہ تیقن نہیں دیا گیا ہے کہ ان کے مقدمے جیتنے کی صورت میں، مورتی کے تنصیب کی جگہ بدلی جائے گی اور مسجد کی تعمیر میں کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی کی جائے گی۔ وشو ہندو پریشد کو تحریک اور ایجی ٹیشن چلانے کی چھوٹ کی وجہ سے درمیانی دیوار کے بارے میں بھی کوئی ضمانت نہیں ہے۔
- تجاویز میں رام مندر کی تعمیر کے فوری آغاز کو یقینی بنایا گیا ہے جبکہ مسلمانوں کو عدالتی فیصلہ تک روک دیا گیا ہے۔ اس لئے بورڈ نے طے کیا ہے کہ شری شنکر آچاریہ کی ان تجاویز پر جو 8/ مارچ کے خط میں درج ہیں، ان کے نامکمل اور سرسری ہونے کی وجہ سے غور نہیں کیا جا سکتا۔ اس معذوری سے شنکر آچاریہ کو واقف کرایا جائے۔

بورڈ نے مقدمہ کی تیزی سے سماعت کے لئے 12/ جولائی 2002ء سے روزانہ سماعت کے

عدالت کے فیصلہ کا خیر مقدم کیا۔

بورڈ نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ زیر تحویل اراضی کو جوں کا توں رکھنے کے لئے اپنے فرض کو انجام دے، اس زمین پر علامتی کارسیوا یا پوجا پر پابندی لگائے اور سپریم کورٹ کے فیصلوں اور احکامات کو نافذ کرے۔

10 / مارچ ہی کی شام میں پریس کلب میں پریس کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اخبارات اور ٹی. وی. صحافیوں نیز بیرونی ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ بورڈ کی جانب سے جناب یوسف حاتم مچھالہ سینئر ایڈووکیٹ کنوینر لیگل سیل نے قرارداد اور اپیل کو پیش کیا۔ ملک میں عام طور پر بورڈ کے اصولی موقف کو سراہا گیا۔

## سپریم کورٹ کا حکم

بورڈ نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اجودھیا میں ایکوائر کی ہوئی زمین کے کسی حصہ پر حکومت رام مندر کی بنیاد رکھنے یا پوجا کرنے کی اجازت دے گی، طے کیا تھا کہ سپریم کورٹ سے اس معاملہ میں رجوع کیا جائے مگر یہ مسئلہ ایک رٹ درخواست کے ذریعہ سپریم کورٹ میں زیر سماعت آ گیا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ اس میں فریق بن گیا۔ سپریم کورٹ کے سامنے اٹارنی جنرل سولی سوراب جی نے یہ نکتہ پیش کیا کہ اگر چند ہندو مذہبی اشخاص کو کچھ دیر کے لئے زیر تحویل زمین پر علامتی پتھر (شیلا دان) رکھنے اور پوجا کرنے کی اجازت دی جائے تو اس پر سپریم کورٹ کے اس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوتی جو 1994ء میں دیا گیا تھا۔ چیف جسٹس کرپال، جسٹس پٹنائک، جسٹس کھرے پر مشتمل سہ رکنی بنچ نے اٹارنی جنرل کے اس استدلال کو رد کر دیا اور ہدایت دی کہ 67 / ایکڑ پر مشتمل زیر تحویل اراضی کی حالت کو جوں کا توں رکھا جائے۔ اس طرح علامتی پوجا یا کارسیوا پر روک لگا کر سپریم کورٹ نے اس کی پابندی کی ذمہ داری مرکزی حکومت پر ڈال دی۔ اس فیصلہ نے ہندوستانی عدلیہ پر تمام شہریوں کے اعتماد کو اور مضبوط کر دیا۔

بورڈ کی کمیٹی آن بابری مسجد نے 6 / دسمبر کو ائمہ مساجد سے گزارش کی تھی کہ وہ عید اور جمعہ کے خطبہ میں بابری مسجد کے مسئلہ سے مسلمانوں کو واقف کرائیں نیز اس موقع پر بابری مسجد کی بازیابی کے لئے دُعا بھی کریں۔ کمیٹی نے مسلم تنظیموں سے بھی گزارش کی تھی کہ وہ ریاستی گورنروں اور ضلع

مجسٹریٹ کے توسط سے ایک قرار داد صدر جمہوریہ ہند کو روانہ کریں جس میں اس بات کا مطالبہ کیا جائے کہ کورٹ کا فیصلہ آنے تک جو افراد اس قضیہ کو بنیاد بنا کر سماج میں انتشار پیدا کر رہے ہیں ان کی سرگرمیوں پر سختی سے روک لگائی جائے۔ نیز بابری مسجد انہدام کے مقدمہ میں تیزی لائی جائے تا کہ مجرمین کیفر کردار تک پہنچ سکیں۔

صدر جمہوریہ سے یہ گزارش بھی کی گئی کہ وہ حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ پارلیمنٹ میں بیان دے کر یہ عہد کرے کہ حقیت کے مقدمہ کے فیصلہ کو لاگو کرے گی۔ ان دونوں ہی تجاویز پر پورے ملک میں عمل ہوا۔ کمیٹی کی جانب سے ماہ دسمبر میں دہلی کے علاوہ ملک کے مختلف حصوں میں سمپوزیم اور خطابات عام کا بھی انعقاد عمل میں آیا جس میں بورڈ کے موقف کو مدلل انداز میں برادران وطن کے سوچنے سمجھنے والے طبقہ کے سامنے رکھا گیا۔ ان پروگراموں میں بڑی تعداد میں صاف ذہن و سنجیدہ غیر مسلم حضرات نے شرکت کی اور بورڈ کے موقف کی تائید کی۔ ان پروگراموں کے ذریعہ مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا کہ آئین و قانون کے دائرے میں رہ کر مسجد کی بازیابی کے لئے کی جانے والی جدوجہد میں عملی تعاون دیں گے۔ □ □

# تحریک برائے بازیابی بابری مسجد

از: ایڈووکیٹ ظفریاب جیلانی

یکم فروری 1986ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فیض آباد نے بابری مسجد کا فوری طور پر تالا کھولنے اور درشن و پوجا پر لگی پابندی ہٹا لینے کا فیصلہ صادر کیا۔ اس فیصلے کے آنے کے بعد اتر پردیش کے مختلف اضلاع میں مسلمانوں کی طرف سے مقامات پر احتجاج شروع ہو گئے تھے اور ایک دو مقام پر ٹکراؤ کی صورت حال بھی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ لکھنؤ میں 4/فروری 1986ء کو کچھ لوگوں نے عبدالمنان صاحب ایڈووکیٹ کے گھر پر ایک چھوٹی مشاورتی نشست کی جس میں مولانا مظفر حسین کچھوچھوی و فضل الباری (ایم.ایل.اے.) بھی آ گئے تھے۔ اس نشست میں یہ طے پایا کہ یو. پی. کے تمام مسلم ایم.ایل.اے. کی ایک میٹنگ فوری طور پر طلب کی جائے اور اس میں آئندہ اقدام کی بابت غور کیا جائے۔

5/فروری 1986ء کو بلائی جانے والی میٹنگ میں 18 یا 19 ایم.ایل.اے. حضرات نے شرکت کی اور اس رائے کا اظہار کیا کہ چونکہ عوامی تحریک کے دباؤ سے مسجد میں درشن اور پوجا کی اجازت حاصل کی گئی ہے لہٰذا مقدمات کے منصفانہ فیصلے سے مسئلہ کے حل کے لئے مسلمانوں کے ذریعہ بھی عوامی تحریک شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا نمائندہ مسلمانوں کی ایک میٹنگ فوری طور پر بلائی جائے۔ چنانچہ 6/فروری 1986ء کو لکھنؤ میں راعین برادری کی ایک عمارت میں لکھنؤ کے نمائندہ مسلمانوں کا ایک جلسہ طلب کیا گیا جس کی اطلاع ایک اخبار کے ذریعہ قرب و جوار کے مسلمانوں کو بھی ہو گئی تھی لہٰذا اس جلسہ میں قریبی اضلاع کے مسلم نمائندے بھی شریک ہو گئے۔ میٹنگ میں طے پایا کہ تحریک چلانے کے لئے ایک ایکشن کمیٹی قائم کی جائے اور اس کی باضابطہ تشکیل کے لیے دو لوگوں کو مجاز کیا گیا کہ وہ اسی دن شام کو دارالشفا میں محمد اعظم خاں صاحب (ایم.ایل.اے.) کے کمرے میں میٹنگ طلب کر کے ایکشن کمیٹی کی باضابطہ تشکیل کر لیں چنانچہ 6/فروری 1986ء کی رات میں 34، بی۔ بلاک، دارالشفا میں منعقد ہونے والی میٹنگ میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے صدر و دو کنوینر اور 24 ممبران منتخب کیے گئے اور اسی دن یہ فیصلہ کیا گیا کہ 14/فروری 1986ء کو یوم سیاہ منایا جائے اور 26/فروری 1986ء کو ایک بڑا عوامی مظاہرہ کیا جائے۔ اسی درمیان مسلم مجلس

مشاورت کی جانب سے اس مسئلہ پر 24/فروری 1986ء کو ایک میٹنگ طلب کی گئی جس میں مسلم مجلس مشاورت کی کمیٹی برائے بابری مسجد کی تشکیل پائی۔

ان دونوں کمیٹیوں کے اشتراک سے 30/اپریل 1986ء کو یو.پی. کے تمام ضلعوں میں گرفتاریوں کا اعلان کیا گیا اور دہلی میں بھی بابری مسجد ایکشن کمیٹی قائم کی گئی پھر ان دونوں نے دہلی کی ایکشن کمیٹی کے تعاون سے دسمبر 1986ء میں دہلی میں ایک کنونشن طلب کیا جس میں ایک دس رکنی کوآرڈینیشن کمیٹی تشکیل پائی بعد میں کوآرڈینیشن کمیٹی کے پانچ ممبران نے بابری مسجد ایکشن کمیٹی اتر پردیش و دہلی کے تعاون سے ایک اور کنونشن طلب کیا جس میں آل انڈیا بابری مسجد ایکشن کمیٹی تشکیل پائی۔

1991ء میں یو.پی. میں بی.جے.پی. کی سرکار بننے کے بعد بابری مسجد کے بیرونی صحن و اس سے ملحقہ کچھ اراضی کو ایکوائر کیا گیا تو دونوں کمیٹیوں نے مشترکہ طور پر لکھنؤ میں گرفتاریوں کا پروگرام رکھا اور بڑی تعداد میں گرفتاریاں دیں۔

اس سے قبل 1990ء میں بابری مسجد ایکشن کمیٹی نے لکھنؤ میں تیسری کل ہند بابری مسجد کانفرنس منعقد کی۔ اسی طرح کے عوامی پروگرام 6/دسمبر 1992ء کے واقعہ کے بعد ہی دونوں کمیٹیوں کی جانب سے مشترکہ طور پر عمل میں آتے رہے لیکن 24/اکتوبر 1994ء کے سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد عوامی احتجاج کو خصوصی نشستوں و سیمینار و سمپوزیم وغیرہ میں تبدیل کر دیا گیا اور مقدمات کی پیش رفت پر زیادہ زور دیا گیا۔

## مسلم پرسنل لاء بورڈ

2/فروری 1986ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت شاہ بانو کیس کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کے پیش رفت کے جائزے کے لئے منعقد کی گئی جس میں یکم فروری 1986ء کا یہ فیصلہ بھی زیر غور آیا اور بورڈ کی عاملہ نے طے کیا کہ چونکہ بورڈ پہلے سے ایک تحریک چلا رہا تھا لہٰذا بابری مسجد کے سلسلے میں مسلم مجلس مشاورت یا دیگر مسلم تنظیمیں ضروری اقدام کریں۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے صدر و جنرل سکریٹری و کچھ دیگر ممبران سے تحریک چلانے

والی دونوں کمیٹیوں کے ذمہ داران کا رابطہ قائم تھا لیکن باضابطہ طور پر مسلم پرسنل لاء بورڈ نے اس مسئلہ پر ایک تجویز دسمبر 1990ء میں پاس کی تھی جب کچھ لوگوں نے اکتوبر 1990ء کے واقعات کے بعد بورڈ کو یہ مسئلہ اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے رجوع کیا تھا۔ اس وقت بورڈ نے مسجد وقبرستان کے موقف کو واضح کرتے ہوئے یہ فیصلہ کیا تھا کہ مسجد کے کسی جز وکل کو نہ تو دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس پر کسی قسم کی تعمیر کی اجازت (مسجد کے علاوہ) دی جاسکتی ہے۔ اور ساتھ ہی بورڈ نے تحریک چلانے والی دونوں کمیٹیوں سے اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ باہمی اشتراک سے جدوجہد جاری رکھیں گے۔ مسجد کی شہادت کے بعد جنوری 1993ء میں بورڈ کی مجلس عاملہ نے بابری مسجد کے مقدمات کی پیروی اپنے ذمہ لیتے ہوئے دسمبر 1990ء کی تجویز کا پھر اعادہ کیا اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ مسجد ہمیشہ مسجد رہتی ہے چاہے اس کی عمارت باقی رہے یا نہ رہے۔ اس تجویز کی روشنی میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کی جانب سے نہ صرف مقدمات کی پیروی کی گئی بلکہ وقتاً فوقتاً بورڈ کے اجلاس و دیگر مواقع پر عوامی وخصوصی اجتماعات میں بھی اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا گیا اور دیگر اہم فیصلے کیے گئے۔ جنوری 2001ء میں بورڈ کی مجلس عاملہ نے صدر پرسنل لاء بورڈ کو مجاز کیا کہ وہ ایک کمیٹی تشکیل کر دیں جو اس سلسلے میں ہر قسم کے ضروری اقدام کرنے کے لئے مجاز ہو چنانچہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ نے بورڈ کی ایک کمیٹی تشکیل کر کے اس کا کنوینر ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس کو مقرر کیا اور اس وقت سے بورڈ کی جانب سے یہ کمیٹی مختلف قسم کے پروگرام رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے کرتی رہی ہے اور بابری مسجد کی بازیابی کی جدوجہد کر رہی ہے۔ □ □

# بابری مسجد کا انہدام اور مسلمان ـــــــ ایک جائزہ

از: سید شہاب الدین (سابق ممبر پارلیمنٹ)

1947ء میں ملک کی تقسیم اور 1971ء میں بنگلہ دیش کے قیام کی طرح 6/دسمبر 1992ء بابری مسجد کا انہدام مسلم ہندوستانیوں کے لئے ایک زبردست نفسیاتی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ آزادی کے موقع پر اس کے ذہن میں جو وسوسے اور اندیشے تھے وہ 1971ء تک بڑی حد تک دور ہو گئے تھے۔ مسلم ہندوستانیوں نے تقسیم کے صدمے اور مصائب پر قابو پا لیا تھا۔ انہوں نے اپنے دستور اور انسانی حقوق پر بھروسہ کرتے ہوئے اور احساس جرم پر قابو پاتے ہوئے سیاسی بالغ نظری حاصل کر لی تھی اور وہ قومی میدان میں ایک دم چھلے یا غلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک شہری کی حیثیت سے سرگرم عمل ہونے کے لیے تیار ہو گئے تھے اور یہ سمجھ رہے تھے کہ ایک مذہبی اقلیت کی حیثیت سے چاہے ان کی جو بھی شکایتیں ہوں اور چاہے اکثریتی طبقے کا ایک حصہ انہیں تاریخی حریف سمجھتا ہو مگر ان کے پاس اس کا دستور اور سیاسی حل موجود ہے اور یہ کہ وہی ایک ایسا سماجی گروپ نہیں ہیں جو مساوات اور انصاف سے محروم ہیں اور یہ کہ ایسے تمام گروپ متحد ہو کر اپنی شناخت، وقار اور مساوات کے لئے جدوجہد کریں گے۔ اس نے انتظامیہ کے سایہ عاطفت میں پناہ لینے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اقتدار یا کسی غالب سماجی گروپ کا سہارا لیا اس نے اپنے مسائل کو بڑے مناسب ڈھنگ سے پیش کیا اور اپنے حقوق پر اصرار کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ حقوق پر اصرار کرنے سے ابتداءً کچھ ایسے مسائل پیدا ہوں گے جن کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا۔ تاہم اس نے کھیل کے طور طریقے سیکھنے شروع کر دیے اور اپنی ڈگر پر چلنے لگا۔

غالباً وہ یہ محسوس نہ کر سکا کہ ہندو شاؤنزم میں اضافہ ہو رہا ہے اور جمہوریت کے نام پر اکثریتی طبقے کا راج ہے، ہندو رسوم و رواج کو بتدریج لاگو کیا جا رہا ہے۔ انتظامیہ میں ہندو فرقہ پرستی کا اثر و نفوذ بڑھتا جا رہا ہے اور ہندوستانی کلچر اور قومیت اور حب الوطنی کے نام پر ہندوازم کا پرچار کیا جا رہا ہے۔ اس کی نظر صرف سماجی اُتھل پتھل تک محدود رہی، اس نے صرف ان لاکھوں افراد کے کرب و اضطراب کو محسوس کیا جنہیں آزادی کے نام پر سوائے اس کے کچھ نہیں ملا کہ وہ پانچ سال میں ایک

بار اپنے حکمرانوں کے انتخاب کے عمل میں شریک ہو جائیں، اس نے یہ محسوس نہیں کیا کہ سیکولر جمہوریہ زعفرانی رنگ اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس کو ہندو راشٹر کی شکل دی جا رہی ہے جبکہ وہ خود اپنے آپ کو بدلنے کے عمل میں مصروف ہے اور ایک ہندوستانی مسلم کے بجائے مسلم ہندوستانی کی صورت اختیار کر رہا ہے نہ نوزائیدہ مسلم ہندستانی، ہندوستان کے دستور و جمہوری عمل، سیاسی یا ذہنی جن میں سے ہر ایک بظاہر اس کی حمایت کا طلب گار تھا، کے وعدوں پر اعتماد کرتا تھا۔ اس نے سیکولرزم کے اصولوں پر یقین کیا تھا کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں مگر وہ ہر مذہب کا احترام کرتی ہے اور یہ کہ ریاست غیر جانب دار، ناوابستہ اور فرقہ وارانہ معاملوں میں یکساں دوری پر رہے گی اور یہ کہ ریاست تمام شہریوں سے مذہب، ذات، زبان کے امتیاز کے بغیر برابری کا معاملہ کرے گی اور ریاست اس کی اور اس کے تشخص مذہب، زبان، کلچر اور طریقہ زندگی کی حفاظت کرے گی۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ تمام دنیا میں اقلیتوں کے مذہبی، لسانی، تہذیبی حقوق کے تحفظ کی، انسانی حقوق کے توسیع کی حیثیت سے، تحریکیں چل رہی ہیں، اس نے سمجھا کہ وہ جب تک کوئی خصوصی مطالبے نہیں کرتا، دستور پر عامل اور کار بند رہتا ہے، تشدد کا راستہ نہیں اپناتا اور جمہوری اور پر امن طریقوں پر عامل ہے تو اس کی آواز سنی جائے گی۔ اسے انصاف ملے گا یا کم از کم اس کی جان، عزت، جائیداد محفوظ رہے گی خواہ قومی دولت میں سے اس کا جائز حصہ نہ ملے۔

فروری 1986ء تک ایک اوسط مسلم ہندوستانی بابری مسجد کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی اس کی تاریخ اور 1949ء کے بعد اس معاملے میں ہونے والے واقعات سے واقف تھا۔ صرف مسلم ہندوستانی ہی نہیں بلکہ ایک اوسط ہندوستانی بھی نہیں جانتا تھا کہ اجودھیا نام کی ایک زیارت گاہ ہے، لہٰذا جب اس سلسلے میں پہلا قدم اُٹھایا گیا تو اس نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ حتیٰ کہ جب وشو ہندو پریشد نے سرجوندی کے کنارے میں بابری مسجد کے حصار سے رام کو آزاد کرانے کی قسم کھائی اور اس نے بابری مسجد کی جگہ پر بنائے جانے والے رام مندر کا ماڈل پیش کیا اور تالا توڑ دو کی مہم شروع کی تب بھی لوگوں نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔

رفتہ رفتہ مسلم ہندوستانیوں کو احساس ہوا کہ کس طرح اسے بابری مسجد سے نکال کر باہر کیا گیا ہے جہاں اس کے پرکھوں نے 500 برسوں تک عبادت کی تھی اور وجہ یہ بتائی گئی کہ دسمبر 1949ء کی ایک سرد رات کو رام چندر جی مسجد کے اندر مورتیوں کی شکل میں ظاہر ہو گئے اور ان کے ماننے والوں

کے لئے صرف اتنی بات مکمل ہوتی ہے کہ والمیکی اور تلسی داس کی اجودھیا میں دشرتھ کے بیٹے رام کی پیدائش مسجد میں ہوئی ہے۔ پھر اس پر دباؤ ڈالا جانے لگا کہ مسجد ان کے حوالے کر دی جائے، کبھی اس وعدے کے ساتھ کہ مسجد کی ایک ایک اینٹ اور پتھر کو اجودھیا سے باہر منتقل کر دیا جائے گا اور اس کی اصل صورت برقرار رہے گی یا اس کے عوض ایک شاندار نئی مسجد تعمیر کر دی جائے گی بعض وقت دھمکی دی گئی کہ مان لو ورنہ!

پھر قانونی داؤ پیچ کا دور شروع ہوا۔ یکم فروری 1986ء کو مسجد کا تالا کھول دیا گیا راک بھکتوں کو اجازت دی گئی کہ وہ اندر داخل ہو کر اس کو ایک مندر کی شکل دے دیں۔ تب اس کی آنکھ کھلی۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ کسی نے بھی خواہ کتنا ہی لبرل، ترقی پسند اور سیکولر کیوں نہ ہو، اس مسئلے کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ غالباً کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ خیال رہا ہوگا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ صحیح اور درست ہے۔ اس نے دیکھا کہ دسمبر 1949ء میں مندر کے اندر چوری چھپے اور غیر قانونی طریقے سے مورتیاں رکھ دی گئی ہیں۔ (جنہیں یو. پی. کے وزیر اعلیٰ جی. بی. پنت اگر چاہتے تو بہ آسانی ہٹوا سکتے تھے جب کہ نہرو اور پٹیل بھی جانتے تھے) اور اسی مسجد کو مندر بنا دیا گیا جبکہ قانونی کارروائی جاری رہی اور آئی. پی، سی. آر. پی. اور دستور کے باوجود مرکزی اور ریاستی حکومت اور ریاستی عدلیہ نے ملی بھگت کے ذریعہ اپنا رول بخوبی انجام دیا۔

مسلم ہندوستانیوں کو اپنی بے بسی کا احساس ہوا۔ اس کے بس میں اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ وہ ملک کے قانون کی مدد لے۔ لہٰذا اس نے مطالبہ کیا کہ عدالتی عمل کو تیز تر کیا جائے اور متنازع ڈھانچے کی ملکیت کے بارے میں تصفیہ کیا جائے۔ اس غرض سے اس نے پرامن اور جمہوری جدو جہد شروع کی۔ اس نے سیکولر پارٹیوں سے رابطہ کیا اور پہلے برسر اقتدار پارٹی کانگریس سے گزارش کی کہ ضلع کی عدالتوں میں اس سلسلے کے جو مختلف مقدمات چل رہے ہیں انہیں ایک جگہ کیا جائے اور الہ آباد ہائی کورٹ کی خصوصی بنچ میں جو سماعت ہو رہی ہے اس کی روزانہ سماعت کی جائے۔

مرکزی اور ریاستی حکومت نے پہلے انکار کیا مگر بعد میں راضی ہو گئے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کوشش شروع کر دی گئی کہ اس معاملے کو ایک مقامی معاملہ بنا دیا جائے تا کہ اجودھیا کی چھوٹی سی مسلم آبادی جو تلوار کے سائے میں جی رہی ہے کو سمجھا بجھا کر مسجد کی جگہ حوالے کرنے پر راضی کر لیا جائے۔ پھر مرکزی حکومت نے مسلمانوں پر دباؤ ڈالا کہ بات چیت کی جائے یعنی مسجد حوالے کر دی

جائے۔ اس سے کہا گیا کہ اس مسئلے کو مذہبی لیڈروں پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ طے کیا گیا کہ بابری مسجد اصل میں مسجد ہی نہیں ہے، اس کا رخ قبلے (مکہ) کی طرف نہیں ہے، مینار نہیں ہے، وضو کی جگہ نہیں ہے، یہ بھی کہا گیا کہ اس مسجد کو رام کی جائے پیدائش پر بنائے گئے یادگار مندر کو توڑ کر بابر یا اس کے صاحبزادوں نے بنایا ہے اور یہ جگہ جبریہ حاصل کی گئی ہے اور یہ کہ سعودی عرب اور ایران کے مفتیوں نے مسلم ہندوستانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اس جگہ سے دست بردار ہو جائیں اور یہ کہ بہت سے مسلم ملکوں میں مفاد عامہ کی خاطر مسجدوں کو منتقل کیا گیا ہے اور یہ کہ ان کے اس رویے سے ہندوؤں میں خیر سگالی اور خوشنودی حاصل ہوگی غرضیکہ ان کو طرح طرح کی صداقتوں سے بہلانے کی کوشش کی گئی اور جو کچھ کیا گیا، اس کا لب لباب یہ تھا کہ بہتر ہے کہ اس کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم اسے خود لے لیں گے۔ مسلم ہندوستانیوں کو عدالتی نظام پر اب بھی بھروسہ ہے۔ لیکن 1989ء میں اس وقت انہیں زبردست جھٹکا لگا جب وزیر اعظم راجیو گاندھی کو ان کے مشیر نے یہ غلط مشورہ دیا کہ مجوزہ مندر کا شلا نیاس بابری مسجد کے مشرق میں متنازعہ جگہ پر رکھنے کی اجازت دے دی جائے حالانکہ اس جگہ کی ملکیت کا مسئلہ عدالت کے زیر غور تھا اور ہائی کورٹ کے حالات کو جوں کا توں رکھنے کے حکم کے خلاف تھا۔ تب مسلم ہندوستانیوں کو احساس ہوا کہ کانگریس 1980ء کے بعد اپنی تجدید کے لئے ہندو کارڈ کھیل رہی ہے اور ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ ایک سیاسی حکمت عملی کے طور پر، تا کہ بی۔ جے۔ پی۔ کے ہندو ووٹ بینک میں اس کا حصہ بڑھ جائے۔

پھر مسلم ہندوستانیوں نے دیکھا کہ سیکولرزم کے دوسرے ستون بھی گر رہے ہیں۔ کانگریس کے باغی، وی۔ پی۔ سنگھ نے 1989ء میں بی۔ جے۔ پی۔ سے اشتراک عمل کر کے کانگریس کو شکست دی۔ وہ بی۔ جے۔ پی۔ کی حمایت سے وزیر اعظم بنے۔ انہوں نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اس غلطی کو تسلیم کیا ہے مگر تاریخ ایک سخت جج کی طرح یہ فیصلہ سنائے گی کہ انہوں نے ہندو راشٹر وادیوں کو لوک سبھا میں دو جگہ سے 84 جگہ حاصل کرنے میں زبردست مدد پہنچائی۔ حتیٰ کہ جب ایل۔ کے۔ اڈوانی نے رام مندر کے مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے کر رتھ یاترا شروع کی تو بھی انہوں نے نہیں روکا۔ اس کے برعکس وہ متنازعہ جگہ کو سرکاری تحویل میں لینے کے جال میں پھنس گئے تا کہ اگر ایک بار یہ جگہ حکومت کے قبضے میں آ جائے تو بی۔ جے۔ پی۔ اپنی حمایت جاری رکھنے کی شرط پر ان سے حاصل کر لے۔ مگر انہوں نے مصالحت سے انکار کر دیا اور دوسرا آرڈیننس جاری کر کے متنازع جگہ کو

حکومت کی تحویل سے باہر کر دیا اور انہیں اس کی قیمت چکانی پڑی۔

اس کے بعد چندر شیکھر آئے جو اس مسئلہ کو حل کرنے کے خواہش مند تھے انہوں نے مسلم ہندوستانیوں کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی کہ وہ بابری مسجد ہندوؤں کے حوالے کر دیں۔ انہوں نے بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور وشو ہندو پریشد کے اراکین کی میٹنگ کرائی مگر مسلم ہندوستانیوں نے مسجد حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے انکار کی سیدھی سادھی وجہ ہے۔ اگر وشو ہندو پریشد کا دعویٰ بے حد مضبوط ہے تو وہ اپنے ثبوت ہائی کورٹ کے سامنے کیوں نہیں پیش کرتا؟ اور اگر حکومت اس مسئلے کو جلد سے جلد حل کرنے کی خواہش مند ہے تو وہ ہائی کورٹ کی خصوصی بنچ کو روزانہ سماعت کرنے کا حکم کیوں نہیں دیتی؟ لہٰذا چندر شیکھر کا یہ خواب کہ وہ دونوں فریقوں کی باہمی رضا مندی سے رام مندر کی تعمیر کا سبب بنیں گے ادھورا رہ گیا۔

بعد ازاں مسلم ہندوستانیوں نے نرسمہا راؤ اور سنگھ پریوار جس کی نمائندگی یو. پی. میں کلیان سنگھ کر رہے تھے کے درمیان درپردہ سازش، گٹھ جوڑ اور تعاون کا ایک ناپاک منصوبہ دیکھا۔ اکتوبر 1991ء میں متنازعہ زمین کو اجودھیا میں زائرین کو سہولیات بہم پہنچانے کے لئے تحویل میں لے لیا گیا۔ آس پاس کی عمارتوں کو منہدم کر کے لوگوں کے احتجاج اور عدلیہ کے آرڈر کو پامال کرتے ہوئے برابر کر دیا گیا۔ جولائی 1991ء میں حکومت اتر پردیش نے وشو ہندو پریشد کے مجوزہ رام مندر کے سائٹ پلان کے 2/3 حصہ پر ایک پختہ چبوترا بنا دیا۔ واضح رہے کہ 1/3 میں مندر کا گربھ گرہ بابری مسجد کے مقام پر بننا تھا۔ عدلیہ کی مداخلت پر کام روک دیا گیا، لیکن وزیر اعظم نے وشو ہندو پریشد سے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے کا حل تین ماہ میں نکال لیں گے، جس کی حمایت آر. ایس. ایس. اور بی. جے. پی. نے بھی کی۔

مسلم ہندوستانیوں کو حکومت ہند کے اعلان، قومی یکجہتی کی قرار داد اور سپریم کورٹ کے آرڈر کی روشنی میں یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ مسجد کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دیا جائے گا۔ وزیر داخلہ کے ذریعہ اجودھیا میں نیم و جی دستے متعین کیے گئے، جس پر وزیر اعلیٰ یو. پی. نے احتجاج کیا کہ ان کی مرضی کے بغیر یہ نہیں ہونا چاہیے۔ مسلم ہندوستانیوں کے لیے یہ بات قابل افسوس اور حیرت انگیز تھی کہ حکومت ہند کی مرضی سے سپریم کورٹ نے وشو ہندو پریشد کو اس مقام پر علامتی کار سیوا کی اجازت دے دی جس کے لیے سنگھ پریوار نے اپنی پوری مشنری کو متحرک کر دیا۔ مرکزی حکومت چاہتی تو

ریاستی حکومت کو ہدایات دے سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ حکومت چاہتی تو بابری مسجد کو Protected Monument (محفوظ تاریخی عمارت) ڈکلیئر کر سکتی تھی، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، حکومت چاہتی تو پورے ضلع فیض آباد یا اجودھیا تحصیل کو اپنے راست انتظام میں لے سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ مرکزی حکومت اجودھیا میں باہر سے آنے والوں کا داخلہ بند کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا بھی نہیں کیا۔ یا وہ چاہتی تو کارسیوکوں کے اجودھیا میں داخلہ کا انتظام اسی طرح کرتی جس کے نتیجہ میں وہ متنازعہ مقام سے دور رہتے لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔ چنانچہ 6 ردسمبر 1992ء کو دن کے اجالے میں بابری مسجد کے ایک ایک گنبد کو یکے بعد دیگرے نہ صرف گرایا گیا بلکہ مسجد کی پوری بنیاد تک صاف کر دی گئی۔ پوری دنیا نے ہندوستانی دستور وملکی قانون کی پامالی اور عدلیہ کے وقار کے انہدام کا تماشہ دیکھا۔ مسلمانوں کا یہ تلخ احساس بیجا نہیں کہ اس دن اپنے مشترکہ مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سیکولر اور فرقہ پرست جمہوریت پسند اور فسطائی، انتظامیہ اور مجرمین ایک ہو گئے تھے اور ہر ایک نے اپنا کردار بخوبی نبھایا۔ بعد میں جب مسلم ہندوستانیوں کی پرنم آنکھ خشک ہوئی تو اسی نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔ ایک نئی تاریخ بنتے ہوئے دیکھی ایک بدنما حقیقت اس کے سامنے تھی، اور وہ تھا بابری مسجد کی زمین پر ایک عارضی مندر۔ وشو ہندو پریشد کی اس دھمکی کے ساتھ کہ اس کی حیثیت کو سوائے اس کے خوابوں کے مندر کی تعمیر کے کوئی اور نہیں تبدیل کر سکتا۔ مذکورہ بالا گٹھ جوڑ کا ایک شرمناک واقعہ اور سامنے آیا اور وہ تھا مرکزی حکومت کی جانب سے جاری ہونے وال، ایکویزیشن ایکٹ جس میں جوں کا توں حالت کو برقرار رکھنے کی شق بھی شامل تھی۔ 6 ردسمبر والی حالت نہیں اور نہ اس سے پہلے کی حالت بلکہ انہدام کے پندرہ دن بعد کی حالت جبکہ وہاں عارضی مندر موجود تھا۔ اس حیثیت کو برقرار رکھنے کی بات اس ایکٹ میں کہی گئی۔ بدقسمتی سے اسے عدلیہ کی حمایت بھی حاصل ہو گئی، ہاں ایک اور مذاق مسلمانوں کے ساتھ یہ ہوا کہ 7-6 ردسمبر 1992ء کو ملک کے وزیر اعظم نے پوری دنیا کو گواہ بنا کر یہ وعدہ کیا کہ وہ اسی مقام پر بابری مسجد کو دوبارہ تعمیر کرائیں گے۔ جو بعد ازاں وعدۂ معشوق بن کر رہ گیا۔ پھر مسلم ہندوستانیوں نے سپریم کورٹ میں چلنے والی ریفرنس پر بحث اور اکثریتی فیصلہ کو بھی دیکھا۔ جس میں مسجد اور اس سے متصل آراضی کو حکومت کی جانب سے تحویل میں لیے جانے کو صحیح ٹھہرایا گیا مگر حقیت کے مقدمہ کو دوبارہ زندہ کر دیا گیا، اور جوں کی توں حالت کی تصدیق کر دی، جس کے نتیجہ میں ایک غیر قانونی کام کو قانونی جواز حاصل ہو گیا۔

اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے کہ آج 10 سال بعد بھی مسجد کی از سرِنو تعمیر کا وعدہ پورا نہیں کیا گیا لیکن حیرت اس پر ہے کہ انہدام کی کارروائی اور اس میں ملوث افراد کے تعلق سے تحقیقات والے کمیشن کی رپورٹ ہنوز تکمیل کے مراحل سے بھی دور ہے۔ 10 سال گزر جانے کے بعد بھی انہدام کے مبینہ مجرم نہ صرف آزاد گھوم رہے ہیں بلکہ ان میں سے بعض اقتدار کی اعلیٰ کرسیوں پر براجمان ہیں۔ تحقیقات کے 10 سال بعد بھی حقیت کا مقدمہ جسے سپریم کورٹ نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا کچھوے کی چال سے ہی آگے بڑھ رہا ہے، گوکہ اب جا کر اس میں کچھ تیزی آئی ہے۔

لیکن ہاں ان 10 سالوں میں یہ تبدیلی ضرور آئی ہے کہ کل جو بات آہستگی سے یا سرگوشیوں میں کی جاتی تھی آج ان کا اعلان پبلک پلیٹ فارموں سے کیا جاتا ہے۔ انتہا پسندی اور عدم رواداری نے اسٹیج پر قبضہ جما لیا ہے۔ اب کھلے عام اسلام کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حملے کیے جاتے ہیں۔ مسلمانوں پر طنز و تشنیع کے تیر چھینکے جاتے ہیں، اور یہ سب کچھ ان لوگوں کے ذریعہ ہو رہا ہے جو قانون اور ملک کے قومی تفاخر کے محافظ ہیں۔ ان 10 برسوں میں مسلم ہندوستانیوں نے دیکھا کہ سوسائٹی کا بھگوا کرن ہو رہا ہے جس کے نتیجہ میں واجپئی، اڈوانی کمپنی اقتدار کے مراکز تک پہنچ گئی ہے۔ یہ سیاست میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت کا ہی نتیجہ ہے جس نے سنگھ پریوار کو گجرات میں بھیانک انسانی نسل کشی کا موقع فراہم کر دیا۔ پوری دنیا میں ملک کی بدنامی کا سبب بنا۔

بابری مسجد کی شہادت کے بعد صورت حال یہ ہے کہ مسلم ہندوستانی ایک کنارے کھڑا کنفیوزڈ ہے۔ اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز نہیں کر پا رہا ہے۔ کوئی سیکولر پارٹی اپنی ترجیحات کی فہرست میں بابری مسجد کے مسئلہ کو کوئی خاص مقام نہیں دینا چاہتی ہے، اس کی وجوہات واضح ہیں۔ یعنی مسلمانوں کی عددی حیثیت مسلم ہندوستانی معاشرہ میں جاری چپقلش جو بعض اوقات باہری عناصر کی مداخلت کا نتیجہ ہوتی ہے اس کا بھی وہ مشاہد ہے۔ اہل اقتدار تک رسائی حاصل کرنے کی ناپاک مسابقت، قیادت کو مطعون کر کے ان کی جگہ طفیلیوں کو اوپر لانے کی کوشش کو بھی وہ دیکھ رہا ہے۔ وہ یہ مذاق بھی دیکھ رہا ہے کہ کس طرح مسلمانوں کے سرکردہ افراد، انتظامیہ کے عہدوں پر فائز لوگ کس طرح اپنے مفادات حاصلہ کے لیے اسے اپنے رویہ کو تبدیل کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ بابری مسجد کو بھول جائے، آخر اس مسجد میں کیا خاص بات ہے؟ ملک میں بے شمار مقبوضہ مساجد ہیں۔

ایک اور مسجد وہ لے لیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ جان و مال زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

آپ اسے اس کی ہٹ دھرمی کہیں یا پامردی، اسے بیوقوف کہیں یا خیالی پلاؤ پکانے والا، اس کے رویہ کو غیر مصالحانہ کہیں یا گستاخی پر محمول کریں۔ اسے ظلمت پسند کہیں یا اپنے موقف پر مضبوط جم جانے والا۔ آپ اس کے رویہ کو اندھا دھند ٹکراؤ پر محمول کریں یا شجاعانہ مزاحمت پر۔ یہ بات مسلّم ہے کہ مسلم ہندوستانی بابری مسجد سے دست بردار ہونے کے لئے آمادہ و تیار نہیں ہے۔ وہ بابری مسجد کو صرف اپنے وقار اور حمیت کی نشانی ہی نہیں سمجھتا بلکہ ملک کی سیکولر حیثیت، قانون کی بالادستی، جمہوری نظام اور دستور کے لیے بھی ایک نشان (سمبل) مانتا ہے۔

مسلم ہندوستانی نے ہمیشہ تشدد اور دہشت گردی کے راستہ سے اجتناب کیا ہے، اس نے بین الاقوامی برادری سے کوئی اپیل نہیں کی، اپنی مدد کے لیے مسلم ریاستوں کو آواز نہیں دی بلکہ اپنے معاملہ کو ہندوستانی عوام کی عدالت میں پیش کیا ہے، اس نے ان کے ضمیر کو آواز دی ہے اور معاملہ کو عدلیہ تک محدود رکھا ہے اور اس نے وقتاً فوقتاً اپنے اس موقف کا اعادہ کیا ہے کہ اس معاملہ میں عدالت کا جو آخری فیصلہ ہوگا چاہے وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ جائے وہ اس کے لیے قابل قبول ہوگا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس معاملہ میں جو کچھ وہ کر سکتا ہے اس کے کرنے کے بعد نتیجہ کو اسے اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے اور اللہ کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا چاہئے۔ □ □ □

# بابری مسجد شہادت کیس میں نائب وزیر اعظم کا حرکیاتی رول

از: سید وسیم الدین، حیدرآباد

بابری مسجد انہدام (شہادت) کیس میں رائے بریلی کی خصوصی عدالت کی جانب سے بری کئے جانے کے ایک ہفتہ کے بعد وزیر داخلہ اور نائب وزیر اعظم ایل۔کے۔اڈوانی نے اعلان کیا کہ ''اجودھیا میں رام مندر اسی مقام پر تعمیر کیا جانا چاہئے جہاں لاکھوں عوام چاہتے ہیں''۔

25/ستمبر 2003ء کی اخباری اطلاع کے بہ موجب: ہندوستان کے نائب وزیر اعظم ایل۔کے۔ اڈوانی سوم ناتھ مندر گئے، پوجا کی، وہ مندر میں تقریباً 20 منٹ رہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ 25/ستمبر 1990ء سے برابر سوم ناتھ مندر کا دورہ کرتے رہے ہیں جہاں سے انہوں نے رتھ یاترا نکالی تھی۔ ان کا بیان ہے: ''25/ستمبر 1990ء کو اجودھیا کے لئے رتھ یاترا منظم کی تھی، یاترا ہنوز جاری ہے اور مجھے امید ہے کہ مندر کی تعمیر کے سلسلہ میں کئے گئے عہد کی تکمیل ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ہر سال آج ہی کے دن شہر سوم ناتھ کا دورہ کرتے ہیں۔ یہ ان کا 13 واں دورہ ہے۔

شہر سوم ناتھ مندر کے دورہ پر گئے ہوئے اور ممتاز مجاہد آزادی سردار سنہہ رانا کے پورٹریٹ کی نقاب کشائی کرتے ہوئے نائب وزیر اعظم ایل۔کے۔اڈوانی نے یہ بھی کہا: ''میں نہیں سمجھتا کہ عوام کی خواہش کے مطابق مقام پر مندر تعمیر کیوں نہیں کیا جا سکتا؟ بعض افراد کہتے ہیں کہ عدالت کے فیصلہ کا انتظار کیا جانا چاہئے اور بعض قانون سازی پر زور دیتے ہیں۔ تمام طبقات کو چاہئے کہ مل جل کر بیٹھیں اور اس بات کا فیصلہ کریں کہ ان لوگوں کی خواہش پر جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ اجودھیا بھگوان رام کا پیدائشی مقام ہے ہر ایک کی مدد اور تعاون کے ذریعہ عظیم الشان مندر تعمیر کیا جائے''۔

قومی اور حکومتی سطح پر اور سیاسی اور غیر سیاسی حلقوں میں رائے بریلی کی عدالت نے بابری مسجد کیس میں نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ شری ایل۔کے۔اڈوانی کو بری کرنے پر کافی مواد، بیانات اور تنقیدات کی شکل میں عوام الناس کے سامنے آیا ہے، جس کی تفصیلات میں جانے کے بجائے ہم کو یہ کہنے پر اکتفا کرنا پڑے گا کہ رائے بریلی کی عدالت کی جانب سے جو کچھ ہوا وہ بہت سارے ہندوستانیوں اور سیاسی مبصرین کے لئے تعجب کا باعث نہ بن سکا بلکہ ان کی توقعات اور اندازوں کے

عین مطابق ثابت ہوا جس کے ثبوت میں پیشگی یہ دلیل پیش کر دی گئی تھی کہ سی. بی. آئی. نے شروع ہی سے ان کے خلاف ایسی متضاد تحقیقاتی رپورٹس تیار کی کہ جس کے ذریعہ وہ آسانی سے کیس سے بچ کر نکل سکتے تھے خاص کر سی. بی. آئی. نے اڈوانی کے خلاف سازشی الزامات کو حذف کر دیا تھا اور رائے بریلی کی خصوصی عدالت کے سامنے 6 دسمبر 1992ء کے روز کے واقعات سے متعلق دو متضاد رپورٹس داخل کر کے عدالت کے لئے شبہ پیدا کیا گیا۔ ایک رپورٹ میں گواہوں کے بیانات کے مطابق 6 دسمبر کو روز اجودھیا میں کارسیوکوں کو بابری مسجد گرانے پر اکسایا جبکہ دوسری رپورٹ میں گواہوں کے بیانات سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اڈوانی نے مسجد گرانے والے کارسیوکوں کو روکنے کی ہر ممکنہ کوشش کی اور ان کے بار بار کی اپیل پر جو کارسویکوں نے ان کی ایک نہ سنی اور وہ کارسیوکوں کی اس حرکت سے ناراض بھی ہوئے اور خوش بھی ہوئے اس طرح متضاد دلیلوں کے بعد عدالت کے سامنے ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ فردِ جرم عائد کرنے کے بجائے وہ اڈوانی کو بری کر دے۔ اسی صورت حال پر انگریزی اخبار ''دی ہندو'' حیدرآباد کے کالم "Letters to Editor" میں ایک قاری نے یہ سوال اُٹھایا تھا کہ اگر واقعی شری ایل. کے. اڈوانی کا مقصد بابری مسجد کو بچانے کا تھا تو اس کے لئے انہیں یہ چاہئے تھا کہ وہ اپنے ہی جماعت کی قائد اور چیف منسٹر کلیان سنگھ کے ہمراہ ہونا چاہئے تھا اور نظم و نسق پر خاطر خواہ توجہ دینا چاہئے تھا۔ بابری مسجد کے قریب کارسیوکوں کے درمیان شری ایل. کے. اڈوانی کی موجودگی آخر کیا معنیٰ رکھتی ہے؟

رائے بریلی کی عدالت کے فیصلہ پر سیاسی اور غیر سیاسی حلقوں، شخصی اور اجتماعی طور پر جو بیانات آئے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رائے بریلی کی عدلیہ نے ماضی سے اور اپنی تاریخ کی روایات سے کچھ بھی نہیں سیکھا ہے بلکہ اس پر سرخ سیاہی سے سوالیہ نشان لگا دیا ہے جس کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ہم بابری مسجد کی شہادت کے گزرتے ہوئے دن کا یا پھر بابری مسجد شہادت کے تاریخی واقعہ کا جائزہ لیں جس کے لئے ہم انگریزی میں شائع کتاب "Crises in India" (by: K.L. Chanchreek and Saroj Parsad) سے استفادہ کرنا پسند کریں گے جس میں بابری مسجد کی شہادت کے الم ناک ترین تاریخی واقعہ کو صحافتی مواد کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے سی. بی. آئی. کی طرف سے رجوع ہوتے ہیں جس نے بھارت

سرکار کی ایماء پر کیس کی شکل میں اپنی تحقیقات کے لئے قبول کیا۔ شہنشاہ ظہیر الدین بابر کے سپہ سالار میر باقی کی نگرانی میں تعمیر کردہ بابری مسجد جو کہ 6 دسمبر 1992ء کے دن شہید ہو چکی تھی اس کے ایک ہفتہ کے بعد سرکار نے یہ حکم دیا تھا کہ وہ بابری مسجد (6 دسمبر 1992ء) کی شہادت کی تحقیقات کرے جس میں وشو ہندو پریشد کے کارسیوکوں کا حصہ تھا۔ بھارت سرکار کی سی. بی. آئی. کی تحقیقات میں یہ بھی شامل کیا گیا تھا کہ وہ بابری مسجد کی شہادت کی سازش کا پتہ لگائے اور ان کے محرکات کو دریافت کرے جو مسجد کی شہادت کا باعث بنے ہیں۔

بابری مسجد کی شہادت پر اتر پردیش فیض آباد کے پولس اسٹیشن میں 6 دسمبر 1992ء کے دن بی. جے. پی. کے اعلیٰ قائدین کے خلاف ایک کیس بک ہو چکا تھا، جن میں مرلی منوہر جوشی، لال کرشن اڈوانی اور اوما بھارتی اور وشو ہندو پریشد کے جنرل سکریٹری اشوک سنگھل اور دیگر قائدین شامل تھے جو کہ بعد میں سی. بی. آئی. کی تحقیقات کی بنیاد بن گیا۔ ریاستی پولس نے ان تمام قائدین کے خلاف دفعہ 153A (Section 153A) اور دوسری دفعہ 153B (Section 153B) کی دفعات لگائی گئیں۔

"Crises in India" (K.L. Chanchreek and Saroj Parsad: 1993) کے مطابق:

"The FIR lodged by the State Police lists against the accused under section the 153A and 153B of the IPC (Promoting Communal Hatred and Causing Damage to Religious Places) and also booked the accused for criminal trespass into the disputed structure."

سی. بی. آئی. تحقیقات میں بقول "Crises in India" (K.L. Chanchreek and Saroj Parsad: 1993) مندرجہ ذیل مقاصد کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔

"The terms of reference for the CBI probe include: (a) events leading to demolition of the disputed structure (b) the conspiracy behind demolition and individuals/other involved."

اگر ہم سی. بی. آئی. تحقیقات کی وسعت کا اندازہ لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ہم کو یہ کہنے میں تامل نہ ہوگا کہ اس وقت سی. بی. آئی. نے جان بوجھ کر نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو چھوٹ دے دی ہے۔

اپنی تمام تر شہادتوں اور ثبوتوں کی بناء پر یہ مفروضہ حقیقت میں بدل چکا ہے کہ بی. جے. پی. اور اس سے وابستہ تنظیموں کا تحریکی اور تنظیمی شکلوں میں واحد مقصد بابری مسجد کی شہادت کے سوا کچھ نہ تھا

جو بقول (K.L. Chanchreek and Saroj Parsad: 1993) "Crises in India" بی. جے. پی. کے قائد ایل. کے. اڈوانی کی رتھ یاترا (جس کا آغاز 25 ستمبر 1990ء کو ہوا تھا) کا یوگ دان قیامت خیز انداز میں رہا۔

"Crises in India" کا نواں باب "L.K. Advani, BJP and RSS" ایل. کے. اڈوانی کے اس قیامت خیز اور کلیدی کردار کے تدریجی ارتقاء کی تصویر پوری طرح اُجاگر کرتا ہے جو انہوں نے بابری مسجد کی شہادت میں ادا کیا تھا جس کی ایک وجہ قومی پریس نے یوں کہہ کر بتائی تھی کہ انہیں بطور قومی قائد کے اُبھرنا تھا اور وزیر اعظم کا منصب پانا تھا۔ ''دھوتی اور کھادی کا سلک کرتا پہن کر ایل. کے. اڈوانی عوام الناس پر یہ واضح کرنا چاہتے تھے کہ جس قائد کی وہ تمنا کر رہے ہیں وہ وہی ہیں''۔

تمام مؤرخین، سیاسی مبصرین اور دانشوروں کے طبقات بلا اختلاف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ 25 ستمبر 1992ء میں سوم ناتھ مندر گجرات سے نکالی گئی 'رتھ یاترا' (اے. سی.: ڈی. بی. ایم. ٹوپٹا) نے ہندوستان کی جدید تاریخ میں آزاد ہند اور تقسیم ہند کے بعد تاریخی پہلو رکھتی ہے جس کو کے. ایل. چنچرک نے ہندوؤں اور ہندوازم کی تاریخ میں تاریخی واقعہ کہتے ہوئے ہندوازم کے احیاء کی تحریک بتایا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ بی. جے. پی. کے اعلیٰ قائد ایل. کے. اڈوانی کی رتھ یاترا ہمہ گیر تھی جس میں مذہبی سیاسی اور انتخابی غایتیں پوشیدہ تھیں جو وی. پی. سنگھ کی سیاسی حکمت عملی کے خلاف ردعمل کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھیں۔ لیکن یہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ ہندو کٹر پسندوں کے قائد ایل. کے. اڈوانی کی رتھ یاترا ہندوستان کی تاریخ میں ایک ایسے واقعہ کی عکاسی کرتی ہے جس کے وجود میں مسلمانوں کے خون میں لت پت لاشوں اور زخمی دکراہتی روحوں کا ہولناک کرب بھی ہے۔

چونکہ بی. جے. پی. سرکار میں نہیں تھی اسلئے اس کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ عوام کی اجتماعیت سے اپنی سیاسی قوت کو بڑھا سکے۔ اسی مقصد کے تحت بی. جے. پی. اور مذہبی جماعتیں اور ہندو تنظیموں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا کہ ہندو اکثریت کے سماج میں اگر انتخاب اور سرکار بنانے میں کامیابی پانا ہے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سماج کے بالکل نچلی سطحوں سے آگے آنا پڑے گا جو کہ ''ماس سوشیالوجی'' (Mass Sociology) کا اصول ہے اسی اصول کے تحت ہندو اکثریت کی مذہبی جماعتوں نے بابری مسجد کی شہادت کو ماس موومنٹ (Mass Movement) کی شکل دے دی اور

کامیابی حاصل کر لی جس میں ایل. کے. اڈوانی کا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ جس طرح وی. پی. سنگھ کی منڈل تحریک نے ماس موومنٹ کی شکل اختیار کی تھی اس سے کہیں زیادہ بابری مسجد کی شہادت کے لئے ہندو کٹر پسندوں نے اکثریتی ہندو طبقات کے کارسیوکوں کو جمع کیا۔ انہیں توانائی دی، انہیں متحرک کیا اور ماس موومنٹ (Mass Movement) کی شکل دی۔

بابری مسجد کی شہادت کے لئے کارسیوکوں کو جمع کرنے کا کارنامہ ہندو کٹر پسندوں کی جماعتوں کو وہ بڑا کارنامہ ہے جس کا سہرہ ہندوستان کے وزیر اعظم شری اٹل بہاری واجپئی (جس کے بارے میں دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد ملک کے صدر کی رائے یہ ہے کہ ''وہ امن کے قائد ہیں: بہت خوب!'') اور نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ شری ایل. کے. اڈوانی کے ساتھ دوسرے قائدین کو بھی جاتا ہے جنہوں نے آزاد ہند کی تاریخ میں دوسری بار ہندوستان کے ہندومت کے ماننے والے مختلف سماجی اور مذہبی طبقات کو آزاد ہند کی تاریخ میں پہلی بار جمع کیا ہے جن کے سامنے ایک ہی راستہ رہا کہ رام مندر بنے یا نہ بنے مگر بابری مسجد نہ رہے۔

اب سوال یہ نہیں رہا کہ شہنشاہ ظہیرالدین بابر کے سپہ سالار میر باقی کی تعمیر کردہ مسجد بابری مسجد کی شہادت کے وقت شری ایل. کے. اڈوانی جی کیا کر رہے تھے؟ کیا سی. بی. آئی. پر یہ حقیقت آشکار نہیں کہ شری ایل. کے. اڈوانی جی بابری مسجد شہادت کی تحریک کے روح رواں نہیں رہے؟ کیا وہ ان قائدین مین سے نہیں رہے جنہوں نے بابری مسجد کی شہادت کے لئے ہندوؤں کی قوت کو اجتماع نہیں کیا؟ کیا وہ ان ہندو کٹر پسندوں کے قائدین میں شامل نہیں جنہوں نے بابری مسجد شہادت کی تحریک میں عملاً حصہ نہیں لیا؟

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ایل. کے. اڈوانی کے خلاف سی. بی. آئی. نے بہت ہی کمزور کیس بنایا ہے حالانکہ سی. بی. آئی. کی تحقیقات میں پہلے سے ہی یہ طے تھا کہ ان واقعات پر بھی تحقیق کی جائے جو بابری مسجد کی شہادت کے باعث بنے تھے؟

"Media Manhandled at Ayodhya" کے ساتویں باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ بی. جے. پی، آر. ایس. ایس. اور وی. ایچ. پی. کے قائدین کا یہ بیان بالکل غلط ہے کہ بابری مسجد کی شہادت کا ہولناک اور الم ناک اور نا قابل برداشت تاریخ ساز واقعہ اتفاقی تھا؟ "...but a pre-planned operation conceived and conduted with expertise." مگر پریس میں اور عوام اور

مسلمانوں کے سامنے پہلے سے منصوبہ بند واقعہ کو اتفاقی امر کی شکل میں پیش کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ ملکی و غیر ملکی اخبار نویسوں، 316 صحافیوں اور فوٹو گرافروں کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا کہ بیان سے باہر ہے مگر اس کے پیچھے حقیقت کچھ اور تھی:

"One explanation is that it was part of the larger plan to prevent any evidence of the demolition from reaching the out side world... It was feared that live coverage or photographic documentation of the demolition as it took place would have forced the Centre to take action at the site as well as against the UP Government."

بابری مسجد کی شہادت کے وقت فوٹو گرافروں اور اخبار اور پریس سے وابستہ رپورٹوں کے ساتھ کارسیوکوں، پولس اور ہندو قائدین کے رویہ کی تفصیل میں یہ حقیقت بھی سامنے لائی گئی کہ بی. جے. پی. اور ہندو تنظیموں کے قائدین یہ نہیں چاہتے تھے کہ فوٹو گرافی اور ڈاکومنٹری کی وجہ سے بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ ریکارڈ بن جائے۔

لیکن اس کے باوجود ہندوستانی قومی پریس نے اپنی خصوصی رپورٹوں اور اداریوں سے اس بات کی گواہی دے دی کہ بی. جے. پی، آر. ایس. ایس. اور وی. ایچ. پی. کے اعلیٰ درجے کے قائدین کی موجودگی میں بابری مسجد شہید ہوئی۔

7/دسمبر 1992ء کے انگریزی اخبار "The Indian Express" نے اپنے اداریہ بہ عنوان "A Nation Betryed" میں یہ لکھا کہ اگر چہ بی. جے. پی. کی قیادت بابری مسجد کی شہادت کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کرتی ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس سلسلے میں خود ایل. کے. اڈوانی کا بیان غور کرنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ خود بی. جے. پی. صدر ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کے ساتھ کارسیوا کی سرگرمیوں میں حصہ لیں گے جس کا ایک ہی صاف مطلب تھا کہ کارسیکوں کا ہجوم بے قابو ہو جائے گا۔ بابری مسجد کی شہادت سے آخری دنوں سے یہ اندازہ ہونے لگا تھا کہ وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل سے وابستہ ہجوم غنڈہ گردی کی طرف مائل ہونے کے بھرپور امکانات رکھتا تھا۔

انگریزی اخبار "The Pioneer" ("A Time to Prevent further damage to the Nation") میں لکھتا ہے کہ پہلے تو ہندوستانی قوم کے لئے یہ باعث شرم ہے کہ بابری مسجد کی شہادت

کا واقعہ پیش آیا۔ اس سے زیادہ شرمناک بات یہ ہے کہ شری ایل. کے. اڈوانی کی موجودگی میں یہ واقعہ پیش آیا۔ اخبار کے الفاظ یہ ہیں: "While demolition was carried out in the presence of L.K. Advani."

بی. جے. پی.، آر.ایس.ایس. اور وی.ایچ. پی. کی قیادت اور قائدین کے تعلق سے کئی سوالات انگریزی اخبار "The Pioneer" نے کئے ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ تمام قائدین جو ہندو کٹر پسندوں کی تمام جماعتوں سے تھے اور جو بابری مسجد کی شہادت کے وقت موجود تھے، وہ یہ جانتے تھے کہ بابری مسجد ضرور شہید ہوگی۔ سب سے اہم ترین یہ سوالات تھے کہ کیا ایل. کے. اڈوانی دیگر قائدین کے ساتھ بابری مسجد کی شہادت کا منظر دیکھنے گئے تھے یا پھر مقدس جگہ کی حفاظت کے لئے وہاں گئے تھے؟ آخر ہندو قائدین کی موجودگی کا مقصد اس وقت سمجھنے سے قاصر نظر آتا ہے جب ہم انہیں نااہل قائدین کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ اخبار کا یہ بھی کہنا ہے:

"It is tragedy that all the BJP Leaders, including Advani strove to exploit popular religious sentiments by blowing hot and cold on Ayodhya. In retrospect, it appears that perhaps the leaders did realise that they had understimated the mischief potential of the Karsevaks gathered in Ayodhya."

جنوبی ہندوستان کے مشہور اخبار "The Hindu" اپنے اداریہ "Unforgivable" میں لکھتا ہے: ''ایل. کے. اڈوانی اور دیگر قائدین اس بات کی ذمہ داری سے علیحدہ نہیں ہو سکتے کہ وہ بابری مسجد کی شہادت میں ملوث نہیں رہے۔ یہی وہ قائدین ہیں جنہوں نے ہندتو کی تحریک چلائی اور مسلسل سیکولرازم پر تنقید کرتے رہے۔ اڈوانی اور دیگر قائدین نے ملک میں ایسی مذہبی جنونیت پیدا کی کہ یہ بدترین واقعہ پیش آیا۔ اب سوال یہ ہے کہ ایل. کے. اڈوانی اور بی. جے. پی. قیادت نے کیا کیا؟''

"The Hindu, Madras" (7/دسمبر 1992ء) کے اداریہ کا حوالہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"The shrill tenor of the Hindutva a campaign, the continual jibes at "Pseudo Secular Policies", the inflammatory propaganda that minoraties are being appeased all served to present a dangerous and false picture of Indian social reality to the public; breeding the sort of ugly fanaticism that surfaced in Ayodhya yesterday."

ہندوستانی جمہوریت کی تاریخ میں بابری مسجد کی شہادت کو ایک غیر معمولی سانحہ قرار دیتے ہوئے "The Hindu, Madras" (7/دسمبر 1992ء) کا یہ بھی اصرار ہے کہ:

"But what is vital is to recognise that this is a defining movement in India's History, a moment at which the country can be plunged into a dark abyss of primitive emotions threatening to erase four decades of a successful track record of a progressive secular democracy."

"The Hindu, Madras" (7/دسمبر 1992ء) کے اداریہ سے صاف ظاہر ہے کہ بابری مسجد کی شہادت سے جڑے بی. جے. پی.، آر.ایس.ایس. اور وی. ایچ. پی. کے اعلیٰ قائدین مسجد کے انہدام میں کس حد تک اور کس طریقے سے ملوث ہیں اور ان کی کارکردگی کس حد تک موجود رہی ہے؟

نئی دہلی کا مشہور انگریزی اخبار "The Patriot" اپنے اداریہ (7/دسمبر 1992ء) بعنوان "Outrage at Ayodhya" میں بہ قلم سدھانشو داس لکھتا ہے کہ اگر ایل. کے. اڈوانی اور مرلی منوہر جوشی جھوٹ نہیں بول رہے ہیں تو کیا وہ دونوں شیر کی سواری نہیں کر رہے ہیں؟

نئی دہلی کے ایک اور اخبار "Hindustan Times" مورخہ 7/دسمبر 1992ء میں "National Shame", by: H.K. Das میں لکھتا ہے کہ اتوار کے تمام واقعات کی پوری ذمہ داری جن لوگوں پر عائد ہوتی ہے ان میں ایل. کے. اڈوانی بھی ہیں۔ جنہوں نے رتھ یاترا کی سواری کی جو یہ جانتے تھے کہ ان کی یہ یاترا ملک کو کہاں اور کس طرف لے جائے گی۔ ایل. کے. اڈوانی غالباً اپنی شخصی خواہش سے مجبور تھے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ بھارت کے وزیر اعظم بنیں۔ بہ قول H.K.Das:

"Advani perhaps was bothered more about personal ambition to be the Prime Minister of the Country than concerned about National Unity."

جبکہ ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی چاہتے تھے کہ وہ اپنی جماعت بی. جے. پی. کے دوبارہ صدر منتخب کئے جائیں۔

"Hindustan Times" مورخہ 7/دسمبر 1992ء کے بہ موجب قومی یک جہتی اور قومی وحدت جو ملکی اتحاد اور سالمیت کے لئے درکار ہے اور ہندوستانی جمہوری اور مختلف سماجی اور مذہبی طبقات کے درمیان رشتوں کی بنیاد ہے وہ کسی بھی صورت میں سرکار کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ چنانچہ بی. جے. پی اور اس سے جڑی ہوئی جماعتوں اور تنظیموں نے ملک میں قومی وحدت کو بابری مسجد کی

شہادت کی شکل میں نا قابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور ایسا کر کے مستقبل میں ہمیشہ کے لئے قومی وحدت کو خطرات اور اندیشوں میں ڈال دیا ہے۔

ہندوستان کا قومی پریس بابری مسجد کی شہادت کے ہولناک تاریخ ساز واقعہ کی ذمہ داری ایل. کے. اڈوانی، مرلی منوہر جوشی اور دیگر قائدین پر عائد کرتا ہے خصوصاً ایل. کے. اڈوانی کو اس واقعہ کا ذمہ دار قرار دیتا ہے جس کے لئے وہ اپنی منطق اور دلیلیں پیش کرتا ہے۔ جو اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ بی. جے. پی. قائد ایل. کے. اڈوانی کی قیادت نے بابری مسجد کی شہادت میں بہت بڑا حرکیاتی رول ادا کیا ہے جو زمانی طور پر ان کی رتھ یاترا سے قبل متعین ہو چکا تھا جس میں انہوں نے عدلیہ کے احکامات اور فیصلوں کی بھی پروا نہیں کی۔

بابری مسجد کی شہادت میں ایل. کے. اڈوانی کا حرکیاتی رول مسجد کی شہادت کے دن کی حد تک محدود نہیں کیونکہ بابری مسجد کی انہدام کا مقصد علانیہ طور پر ہندوستانی سرکار اور عدلیہ کے سامنے ایک ہندو قومی تحریک کی شکل میں آفتاب کی طرح روشن تھا۔ لہٰذا بابری مسجد شہادت کیس میں ایل. کے. اڈوانی کے حرکیاتی کردار اور ان کی شمولیت کو ایک تدریجی ارتقاء کی شکل میں لیا جائے اور سیاہ اتوار (6 ردسمبر) جس دن بابری مسجد کی شہادت ہوئی تھی کی حد تک محدود رکھا نہ جائے۔

قومی، صحافتی اور تحریری طور پر اتنا مواد موجود ہے کہ بابری مسجد شہادت کیس میں ایل. کے. اڈوانی کے حرکیاتی رول کا تعین بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے اور انہیں عدلیہ کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان کے عملی کردار کا ایک حصہ تو رتھ یاترا سے شروع ہوتا ہے جو بابری مسجد کی شہادت پر ختم ہوتا ہے۔ بابری مسجد کی شہادت میں ان کے ہمہ گیر کردار (Multiple Roles) رہے ہیں جن کی بنیاد پر ان پر کیس مستحکم کیا جا سکتا ہے جبکہ بھارت سرکار کے احکامات یہی تھے کہ سی. بی. آئی. یہ دریافت کرے کہ وہ کون سے حالات تھے جو بابری مسجد شہید ہوئی۔

سوم ناتھ مندر شہر میں اخباری نمائندوں سے بات کرتے ہوئے وی. ایچ. پی. کے جنرل سکریٹری پروین بھائی توگڑیا نے کہا کہ مندر کی تعمیر ہمارے لئے انتخابی موضوع نہیں ہے بلکہ اعتقاد کا معاملہ ہے۔ سنگھ پریوار تنظیم عوام کو متحرک کرتے ہوئے یقینی طور پر ایک ایسی صورت حال پیدا کرے گی کہ جس کے باعث کوئی بھی سیاسی جماعت اکثریتی فرقہ کی خواہشات کے خلاف نہیں جا سکے گی"۔

جنرل سکریٹری پروین بھائی توگڑیا نے یہ بھی کہا: "ملک میں سیکولر طاقتوں کو شکست دینا ضروری

ہے اور ملک میں ہندو اقتدار کی تائید کرنا ضروری ہے۔ سیکولر قوتوں کی وجہ سے ملک میں دہشت گردی اور فدائین کے حملوں کو تقویت مل رہی ہے۔" انہوں نے خبردار کیا کہ اگر مسلمان اجودھیا مسئلہ پر اپنے موقف پر ڈٹے رہتے ہیں تو ہندو فرقہ ان تمام 30000 مندروں کو جنہیں مسلم اقتدار میں مسجدوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا آزاد کرانے کی جدو جہد شروع کی جائے گی۔"

اس کے ساتھ جنرل سکریٹری پروین بھائی توگڑیا نے یہ بھی کہا کہ: "وی. ایچ. پی. کے تین مقاصد یعنی رام مندر کی تعمیر جہادی قوتوں کا صفایا اور ہندو مذہب و روایات کی مخالفت کرنے والی قوتوں سے لڑائی ہیں۔"

ہندوستان میں عدلیہ کا ادارہ ایسا رہ گیا ہے جس پر ہندوستانی شہریوں کا اعتماد ہے اگر وہ بھی اپنے افعال انجام دینے میں ناکام ہوتا ہے تو اس سے سماج میں اور مختلف مذاہب کے ماننے والے شہریوں میں عدل وانصاف کی اقدار سے اعتماد اُٹھ کر جو نفسیاتی اور اخلاقی بے چینی پھیلے گی وہ غالباً ایک نئی تاریخی تبدیلی کا امکان پیدا کرے گی کیونکہ قانونی اور سیاسی سطحوں پر جو ناانصافیاں ہوتی ہیں وہ نسل انسانی کی تاریخ میں انقلابی تغیر کے امکانات کو پیدا کر دیتی ہیں۔

شواہد اور قرائن و آثار سے یہ ثابت ہے کہ بی. جے. پی. اور اس سے وابستہ جماعتوں اور نام نہاد سیکولر جماعتوں کی تیسرے درجے کی سیاست کے درمیان میں نصف صدی سے زائد آزاد ہندوستان ایسے بحران سے گزر رہا ہے جس کی نوعیت نازک اور پیچیدہ ضرور ہے۔ نظریاتی اور عملی طور پر وہ اپنی "اصل" سے دور ہوتا جا رہا ہے۔

بی. جے. پی. اور اس سے وابستہ جماعتوں اور نام نہاد سیکولر جماعتوں نے بھارت کو ایسی راہ پر لگا دیا ہے جس کی منزل ایک خاموش انقلاب ضرور ہے!

مستقبل میں اللہ اور اس کے بشیر و نذیر آخر الزماں رسولِ اقدس محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم (جن پر اللہ کا پاک کلام (قرآن) نازل ہوا کو ماننے والی امت جو کہ اپنے دین سے انحراف سے گزر رہی ہے اُس کے لئے چنوتی ہے کہ وہ بابری مسجد کی شہادت سے سبق حاصل کرے اور ہندوستان میں اپنی اور اپنے دین کی حفاظت کے لئے تیاری کرے۔ ☐ ☐

# اجودھیا، مسلمان اور قومی سیاست

از: ریاض الدین خالد

اجودھیا ایک اسٹیج ہے جس پر مختلف سیاسی پارٹیاں الگ الگ کرداروں کے روپ میں اپنا اپنا رول ادا کر رہی ہیں۔ ایک ویلن ہے تو ایک ہیرو، کچھ بابری مسجد کے ہمدرد ہیں تو کچھ ڈھلمل یا گول مول رویہ رکھنے والے اداکار۔ 1989ء سے یہ ڈرامہ مسلسل جاری ہے۔ بہرحال بی. جے. پی. کے سوا تقریباً سبھی پارٹیوں کا موقف ہے کہ اس معاملہ کو عدالت کے فیصلہ کے لئے چھوڑ دیا جانا چاہئے۔

بی. جے. پی. نے اجودھیا مسئلہ اور وہاں مندر کی تعمیر کے سوال پر بار بار قلابازیاں کھائی ہیں۔ یہ بات سبھی لوگوں کو یاد ہوگی کہ اس پارٹی نے اجودھیا میں اسی مقام پر مندر کی تعمیر کے لئے تحریک چلائی تھی۔ پہلے 1990ء میں لال کرشن اڈوانی نے سوم ناتھ سے اجودھیا تک رتھ یاترا نکالی۔ پھر دسمبر 1992ء کو کارسیوا کی جب بابری مسجد کو منصوبہ بند طور پر منہدم کر دیا گیا تو پارٹی کے صدر اور تمام لیڈر وہاں موجود تھے (سوائے اٹل بہاری واجپئی کے جو ایک دو روز قبل لکھنؤ جا کر تمام امور کا جائزہ لے کر آئے تھے)۔

حالیہ برسوں میں بی. جے. پی. کے لیڈروں نے بابری مسجد کے واقعہ اور مندر کی تعمیر کے مسئلہ پر مستقل دوغلا اور مضحکہ خیز موقف اختیار کر رکھا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے آپ کو جمہوریت پسند اور آئین کا پابند ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دوسری طرف مندر کے معاملہ کو ''آستھا'' یعنی عقیدہ کا معاملہ بتاتے ہیں۔ کبھی وہ قانون کی حکمرانی برقرار رکھنے کی باتیں کرتے ہیں تو کبھی ''عوامی جذبات'' کی۔ وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے مسجد کی شہادت کو ایک بدبختی کا واقعہ کہا اور دوسرے موقعہ پر یہ کہا کہ رام مندر کی تحریک عوامی جذبات کا اظہار تھی۔

جب سے بی. جے. پی. نے مرکز میں بعض سیکولر کہلانے والی پارٹیوں کے ساتھ مل کر حکومت قائم کی ہے، اجودھیا کے معاملہ میں اس کی دوہری چالیں اور زیادہ نمایاں ہوگئی ہیں۔ بی. جے. پی. کا سرکاری موقف یہ ہے کہ اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر بدستور اس پارٹی کے ایجنڈے پر ہے خواہ وہ بات چیت کے ذریعہ ہو یا قانون سازی کے ذریعہ۔ اس نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اجودھیا میں مندر بنے یا مسجد، اس سوال پر وہ عدالت کے فیصلہ کا انتظار اور احترام کرنے کے حق میں ہے۔ اس دوران عملی

اقدامات کی کمان آر. ایس. ایس. کے وسیع تر منصوبہ کے تحت بی. جے. پی. کے بجائے وشو ہندو پریشد نے سنبھال لی ہے جس کے کارکن اور کئی لیڈر مثلاً ونے کٹیار پارٹی میں اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے دودھ میں شکر۔ جب رام مندر کے لئے شور شرابہ ہوتا ہے تو بی. جے. پی. وزراء دوسرے الفاظ استعمال کرتے ہیں اور یہی لوگ پارٹی عہدوں پر آجاتے ہیں تو قانون کے بجائے عقیدہ اور جذبات کا راگ الاپتے ہیں۔

دراصل بی. جے. پی. کو ہندوستان کے میدانِ سیاست میں اپنی ناکامی کا احساس بری طرح ستا رہا ہے اور اس احساس کے ساتھ ساتھ وہ دوبارہ اپنے جنونی رویہ کی طرف واپس آرہی ہے۔ یہ اس کی مایوسی کا ایک اظہار ہے۔ اس نے تاجروں کو اپنے حق میں کیا تھا جو کہ اب دل کھول کر اس کی مدد کرنے پر پچھتا بھی رہے ہیں خصوصاً بیرونی سرمایہ کے لیے دروازے بلاشرط کھول دینے پر۔ کسانوں میں اور صنعتی مزدوروں میں اس کی دال ہی نہیں گلی تھی، اب یہ اور زیادہ متنفر ہو گئے ہیں۔ پھر ذاتوں کے بل پر ''سماجی انجینئرنگ'' کو آزمایا گیا۔ اس میں مکمل ناکامی ہوئی۔ بی. جے. پی. کی کرپٹ اور نااہل حکمرانی نے اس کی بدنامی کے بوجھ کو اتنا زیادہ بڑھادیا ہے کہ ہند پاک جھگڑے کی آگ پر بھی بی. جے. پی. کی ہانڈی ٹھنڈی ہوتی جارہی ہے۔

ان حالات میں اجودھیا میں وہ آئندہ بھی اپنا دوغلا کردار برقرار رکھے گی۔ یو. پی. میں اس پارٹی کو چار پانچ فیصد ووٹ اسی سوال پر انتہا پسند ذہن کے ہندوؤں کے ملتے ہیں اور باقی دس فیصد پولنگ سے پہلے کی دھاندلی اور افترا پردازی کے سہارے۔ بابری مسجد کے انہدام کی تحقیقات کرنے والے لبراہن کمیشن کو اس پارٹی کے لیڈروں نے ایک طرف تو اپنے جھوٹے اور گمراہ کن پرچار کے لئے ایک اسٹیج اور لاؤڈ اسپیکر میں بدل لیا ہے اور کمیشن اپنا یہ استعمال ہونے دے رہا ہے، دوسری طرف مجرموں کی حیثیت سے اپنی گرفت کی نوبت آنے پر بی. جے. پی. کے ملزم وزرا کمیشن کے سامنے بیان دیتے وقت چبا چبا کر باتیں کرتے ہیں کیونکہ وہ بہر حال مندر کو اپنی سرکاری کرسی پر مقدم نہیں کرسکتے۔ گزشتہ فروری، مارچ میں اجودھیا میں وشو ہندو پریشد نے کارسیوا کا ہیجان پیدا کیا تب بھی وزیر اعظم اور دوسرے وزیروں کی یہی ترجیح نمایاں ہوئی کیونکہ سپریم کورٹ کے انتہائی سخت اقدامات کے سامنے وہ بے بس ہو گئے تھے۔ متنازعہ اراضی کو غیر متنازعہ کہہ کر ہر حال میں مندر کی تعمیر شروع کرنے کا اعلان کرنے کے بعد وشو ہندو پریشد کے شیر بھی عدیم المثال انتظامات اور

حفاظتی دستوں کے مقابلہ میں کبوتر بن کر اپنے ڈربوں میں چلے گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ بات سننے میں آئی کہ تمام انتظامات کا بار وزیر اعظم کے مشیر خصوصی برجیش مشرا نے سنبھال لیا تھا اور عین موقع پر موصوف کی ان کارروائیوں کے مقابلہ میں واجپئی یا اڈوانی اپنے پر بھی نہیں پھڑ پھڑا سکے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مشرا نے کہا تھا کہ اگر اجودھیا میں کچھ بھی ہونے دیا گیا تو حکومت پر آفت آ جائے گی۔ غرض بی. جے. پی. کو خود بھی نہیں معلوم ہے کہ یو. پی. میں پچھلا الیکشن ہارنے کے بعد اجودھیا میں اس کو کیا کرنا ہے، تاہم اس نے بجرنگ دل کے گندہ دہن لیڈر ونئے کٹیار کو یو. پی. میں شاخ کا صدر تو بنا ہی دیا ہے جس نے پارلیمنٹ میں باجپئی کو بھی نہیں بخشا تھا۔

## کانگریس ــــ آئندہ رویہ؟

برسوں کے گزرنے کے ساتھ ہی بابری مسجد کے مسئلہ پر کانگریس کے رویہ کی بظاہر کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ اس نے بابری مسجد کے انہدام کو روک نہ پانے کے لئے مسلمانوں سے معافی مانگی اور سونیا گاندھی کی قیادت میں پارٹی کے ارکان پارلیمنٹ میں ہر سال 6 ر دسمبر کو بی. جے. پی. کے ملزم وزیروں کو گرفت کے لئے ایوان میں آوازیں بلند کرتے ہیں، گوکہ یہ مہم پارلیمنٹ کی دیواروں تک محدود ہے۔ متعدد مسلم رہنماؤں کا کہنا ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے بارے میں رویہ ان کے حالیہ موقف اور آئندہ امکانات کو مدنظر رکھ کر متعین کیا جاتا ہے۔ خود کانگریس رہنما جے پال ریڈی کے الفاظ میں ''کانگریس واحد سیکولر پارٹی ہے۔ یہ ماضی کو اپنے اوپر بوجھ نہیں بننے دے گی اور ان سب چیزوں سے اوپر اُٹھے گی''۔ اس کے ایک اور لیڈر پرتھوی راج چوہان نے کہا کہ ''کانگریس اس وقت مرکز میں اقتدار سے محروم ہوئی جب یو. پی. اس کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہی بی. جے. پی. کے ساتھ ہوگا۔'' کانگریس مسلم اور دوسرے اقلیتی ووٹوں پر پہلے سے کہیں زیادہ انحصار کر رہی ہے اور اسی لئے سونیا گاندھی اپنے نپے تلے اندازِ گفتگو کے باوجود ہندو مسلم معاملات پر اور دوسری اقلیتوں پر حملوں کے خلاف کھل کر اظہارِ خیال کرتی ہیں۔ 14 ریاستوں میں اقتدار میں شرکت کی بنیاد پر ممکن ہے دسمبر میں گجرات بھی اس کے ہاتھ آ جائے یہ پارٹی تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہونے والے عام انتخابات میں (باجپئی حکومت ستمبر 2004ء میں پانچ سال پورے کرے گی مگر اس سے کئی ماہ پہلے ہی انتخابات ہو سکتے ہیں)۔

لوک سبھا کے انتخابات سے قبل آئندہ سال ملک کی 10 ریاستوں میں اسمبلی الیکشن ہوں گے۔

ان میں غلبہ حاصل کر کے لوک سبھا کے عام انتخابات کا معرکہ فتح کرنے کے لئے کانگریس اقلیتوں کے علاوہ دوسروں پر بھی توجہ مرکوز کر رہی ہے بلکہ سماج کے ہر طبقہ پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اقلیتوں پر زیادہ دھیان دینے کے ساتھ ساتھ وہ کٹر ہندوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کر رہی ہے اور عام ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے اس کا خیال رکھنا چاہتی ہے۔ یہ سونیا گاندھی کی ایسی حکمت عملی ہے جس کو کانگریس کے لئے تریاق خیال کیا جاتا ہے۔ چند ماہ پہلے اجودھیا مسئلہ پر ہیجان پیدا ہونے کے بعد جب راجستھان کے بھی کچھ علاقوں میں فرقہ وارانہ تصادم ہوا تو انہوں نے منہدم شدہ مسجد کی فوراً دوبارہ تعمیر اور وہاں سے مورتیاں ہٹانے کی ہدایت دی اور تقریباً اسی دوران شنکر آچاریہ سروپانند جی کے یہاں حاضری دی جنہوں نے اور مٹھ کے تمام سادھوؤں نے بہو کہہ کر ان کو آشیرواد دیا۔

اس تمام پس منظر میں اجودھیا کے موضوع پر واپس آتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بی.جے. پی. اقتدار کے مقابلہ میں کانگریس سے بہتر توقعات رکھنا بجا ہوگا لیکن بابری مسجد اور یو.پی. کے عام مسلمانوں کے مسائل کے بارے میں آئندہ کانگریس کا رویہ کیا ہوگا اگر یہ مرکز میں اور یو.پی. میں بھی برسر اقتدار آ گئی (جیسا کہ اس کو امید ہے) اس سوال کا جواب دو چیزوں کو ملا کر ان کی روشنی میں دیکھنا ہوگا۔ ان میں سے ایک ہے سونیا گاندھی کی پالیسی اور تدبر اور دوسرا پہلو موجودہ ریاستی کانگریس حکومتوں کا مجہول رویہ ہے جنہیں کیسریا بریگیڈ کی شر پسندانہ سرگرمیوں کی اس وقت تک عموماً خبر نہیں ہوگی جب تک کہ قوتیں خود ان کا ڈھول نہ پیٹیں یا پھر اخبارات اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ انکشاف نہ ہو۔ یہ افسر شاہی کی عام روش کا ایک قدرتی مظہر ہے۔ □ □ □



# اجودھیا پر آخری یلغار کی تیاریاں

از: ریاض قدوائی (معروف صحافی)

بابری مسجد کی شہادت کو 10 سال پورے ہونے کے بعد کئی سوالات ملت کے سامنے ہیں جن کا جواب دے کر مسلم عوام وخواص کو اپنی آئندہ راہ عمل متعین کرنا ہے۔ اس 10 سالہ مدت کی ابتداء میں فسطائی قوتوں کو سیاسی میدان میں جو پسپائی نصیب ہوئی تھی مسلم اور سیکولر حلقے اس موقع کا استعمال نہیں کر سکے۔ اس پسپائی میں سب سے نمایاں نظر آنے والی چیز بھارتیہ جنتا پارٹی کے اقتدار والی چار ریاستوں میں جہاں اس کی حکومتوں کو انہدام کے عمل میں حصہ لینے کی بنا پر برطرف کیا گیا تھا اس پارٹی کو 1993ء کے انتخابات میں مکمل شکست ہوئی۔ علاوہ ازیں مختلف ریاستوں میں خصوصاً جہاں وہ طاقتور تھی داخلی خلفشار پیدا ہونے لگا۔ ریاستی لیڈروں کی رقابت کے علاوہ پارٹی کے عام کارکنوں میں سر پھٹول کی ابتداء ہوئی جس میں ایک طرف وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کی معرفت بی. جے. پی. میں داخل ہونے والے غنڈہ عناصر تھے اور دوسری طرف پرانے اور سینئر کارکن جو اپنا مرتبہ زیادہ سمجھتے تھے۔ یہ تصادم اب انتہائی شدید ہو چکا ہے۔

اس کے برعکس بھی بابری مسجد کے انہدام کے عمل کا ایک نتیجہ برآمد ہوا یعنی سماج میں ہندو وادی سوچ اور نفسیات حاوی ہونے لگی۔ قومی صحافت مسلمانوں کی حق تلفی کے تذکرے سے خوف کھانے لگی اور سیاسی پارٹیاں بڑھ چڑھ کر بی. جے. پی. کی مذمت کے باوجود مسلم حقوق کے موضوع کو مغائر خیال کرنے لگیں۔ دانشوروں میں بھی کسی حد تک یہ رجحان پیدا ہوا۔ یہ متضاد تبدیلیاں ہماری نظر میں متوقع تھیں اور جنوری 1993ء میں افکار ملی کے ان صفحات میں ہم نے ان دونوں یعنی بی. جے. پی. کی فوری ہزیمت اور اکثریتی سماج میں اچانک ہندو ہونے کا احساس جاگنے کی پیش بینی کی تھی۔ ایک بار پھر یہ دونوں مظاہر پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں اور ہم سے اس صورت حال کا بھی جواب مانگ رہے ہیں جو دہشت گردی کا مسئلہ ملکی و بیرونی سطح پر دھماکہ خیز بن جانے سے ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے یعنی قوم پرستی کی ایک نئی شکل کا ظہور۔ اس کے ساتھ بی. جے. پی. کا عمومی زوال جو 1993ء کے مقابلہ میں کہیں زیادہ فیصلہ کن نوعیت کا ہے

ہم سے نئے تقاضے کر رہا ہے۔ غرض یہ کہ عام مسلم طرز عمل ورد عمل کو بدلنا اور اس کے لئے نفسیات میں تبدیلی، اس پر بالکل نئے سرے سے غور کرنے کی ضرورت اب زیادہ شدت سے اپنے آپ کو محسوس کرا رہی ہے۔

بابری مسجد تنازعہ کا مستقبل اور اس کے انہدام کے مجرموں کو سزا، یہ دو ایسے معاملات ہیں جن کے معلق رہنے سے صرف ملک کا مستقبل ہی مخدوش نہیں ہے بلکہ اس کا حال بھی متاثر ہے۔ اجودھیا کو جو بین الاقوامی شہرت ملی ہے وہ ہندوستان کی عالمی پیمانہ پر بدنامی کا پرتو ہے۔ ان 10 برسوں میں دونوں میں سے کسی چیز کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ انہدام کے مقدمے کی کارروائی تقریباً 10 سال بعد بھی سب سے نچلی یعنی سی. بی. آئی. کی خصوصی عدالت میں ہے اور اس کے ملزموں میں سے ایک خاصا حصہ جن میں بی. جے. پی. کے تین مرکزی وزیر نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی سمیت شامل ہیں، مقدمہ کے دائرے سے باہر نظر آ رہا ہے کیونکہ الہ آباد ہائی کورٹ نے خالص تکنیکی بنیادوں پر خصوصی عدالت کی تشکیل کو کالعدم کر دیا ہے اور تکنیکی خامی دور کرنے والا نیا نوٹیفیکیشن جاری کرنے سے مایاوتی حکومت نے انکار کر دیا ہے، اندیشہ ہے کہ یہ مقدمہ اب پہلے سے بھی بڑھ کر کچھوے کی چال سے چلے گا۔ اسی طرح مسجد کے اصل تنازعہ کے بھی دو پہلو ہیں، ایک تاریک اور دوسرا روشن۔ الہ آباد ہائی کورٹ میں زیر سماعت ٹائٹل مقدمہ جس کو 50 سال ہونے والے ہیں فریق مخالف کی جانب سے درخواستوں پر درخواستیں گزارنے کے نتیجہ میں ٹلتا جا رہا ہے اور اس طرح انصاف کو اندھا بنایا جا رہا ہے۔ لیکن دوسری طرف عملاً سماجی اور سیاسی اعتبار سے اس تنازعہ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ مسلم موقف کی قانونی مضبوطی نے وشو ہندو پریشد کے سب سے سرکردہ لیڈروں کو بار بار یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ عدالتی فیصلہ کو مسترد بھی کر سکتے ہیں اگر یہ مندر کے حق میں نہ ہوا۔ اس طرح آر. ایس. ایس. کے دائرے سے باہر ہر شخص پر فریق ثانی کے موقف کی کمزوریاں عیاں ہو گئی ہے۔ اس سے بڑھ کر مسلمانوں کی کامیابی یہ ہے کہ مسجد کے پلاٹ پر پختہ غیر قانونی تعمیر ہنوز ایک خواب یا نعرہ ہے۔ کیونکہ عدلیہ اب لاقانونیت کی دھمکیوں کے مقابلہ میں 1992ء کی نسبت زیادہ مستحکم ردعمل ظاہر کر رہی ہے۔

یہ حقیقت کہ 10 سال گزر جانے کے بعد بھی ملک اور اس کا ضمیر بابری مسجد کے قطعہ اراضی کو ہنوز مسجد کی زمین کے طور پر دیکھتا ہے۔ بابری مسجد کی قربانی کے بار آور ہونے کی دلیل ہے جس نے

ملک میں دراڑ ڈالنے اور اس کے سیکولر آئین کو ردی میں ڈال دینے کی کوششیں ناکام بنا دیں۔ آر. ایس. ایس. والوں کو خواہ وہ اس تنظیم میں ہوں یا حکومت میں، اپنے دیر پا اقتدار کے تمام منصوبے زمیں بوس ہوتے نظر آ رہے ہیں اور اب وہ دوسرے مسائل کی تلاش میں ہین۔ پھر آر. ایس. ایس. کے حقیقی نمائندے اڈوانی اجودھیا میں 1992ء میں ہونے والی غنڈہ گردی میں داغدار ہونے کے باعث اب تک وزیر اعظم نہیں بن سکے حالانکہ بصورت دیگر حالات ہر طرح باجپئی کے خلاف اور اول الذکر کے حق میں ہیں۔

بہر حال یہ محض رجحانات ہیں۔ فسطائی ٹولی کی شکست جو ریاستوں میں مسلسل جاری ہے مرکز میں جا کر مکمل ہو گی جب 2004ء کے عام انتخابات ہوں گے۔ بلاشبہ یہ ان ریاستوں میں کانگریس کی حکومتوں کی کارکردگی سے بھی مشروط ہے جس کو عموماً بی. جے. پی. کے چھوڑے ہوئے تمام قلعوں پر قبضہ حاصل ہوا ہے۔ تاہم شاید اس سے بھی بڑھ کر یہ مسلم رویہ پر، زیادہ واضح طور سے کہا جائے تو مسلمانوں کے فکری نظم و ضبط پر منحصر ہے۔ اگر (نادانستہ طور پر) آر. ایس. ایس. کی مرضی اور منشا پر چل کر ہم اجودھیا کے معاملہ کو 1980ء کی دہائی میں ایک ملک گیر مسئلہ بنانے میں حصہ نہ لیتے اور بابری مسجد کو ایک مقامی اور عدالتی موضوع رہنے دیتے تو آج حالات بالکل مختلف ہوتے۔ اس صورت میں ملک کے ہر طبقہ نے بی. جے. پی. کو محض اس کی سماجی اور عوامی کارکردگی اور فلاحی بنیاد پر آزمایا ہوتا۔ جس طرح وقت کو پیچھے نہیں لے جایا جا سکتا اسی طرح آج ملک کے مسلمان اجودھیا کے معاملہ سے جذباتی طور پر بے تعلق نہیں ہو سکتے۔ لیکن ضروری نہیں کہ وہ اس طرح مشتعل ہوں جیسے کیسریا بریگیڈ چاہتی ہے اور جیسا اس کے مفاد میں ہے۔ فرقہ وارانہ نفرت و تصادم کی حالت اس وقت بی. جے. پی. کے لئے پہلے سے بڑھ کر زندگی اور موت کا سوال بن گئی ہے۔ کیونکہ اب ملک اس کی حکمرانی کو آزما چکا ہے اور مسترد کر چکا ہے۔ گجرات میں اسی مایوسی اور کھسیاہٹ کا اظہار ہوا۔

نیویارک اور واشنگٹن میں 11 ستمبر 2001ء کے دھماکہ کے بعد نئی عالمی صف بندی اور ہندوستان میں جنگ جوئی کی سرگرمیوں میں بظاہر اضافہ نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک دشوار صورت حال پیدا کر دی ہے۔ دہشت پسند کارروائیوں کے سلسلہ میں مسلم قائدین بے قصوروں کے قتل کی مذمت میں بلا تاخیر بیانات جاری کرتے ہیں (کئی وارداتیں انتہائی مشکوک اور مشتبہ حالات میں ہوئیں اور بعض فرضی مڈبھیڑیں بھی بتائی جا رہی ہیں) تاہم قیادت نے دہشت پسندی کے خلاف

اپنے موقف کو تقویت دینے کے لئے کوئی منظم مہم نہیں چلائی۔ اس قسم کی مہم کی ضرورت اجودھیا اور پورے ملک میں کیسریا بریگیڈ کی کامل شکست کی خاطر بڑھ گئی ہے۔ اگر یہ مہم مشترکہ طور پر یا تمام قائدین کے باہمی صلاح ومشورہ کے بعد چلائی جائے تو زیادہ کارگر ہوگی۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ دہشت پسندی کے خلاف (جہاں یہ واقعتاً اور خالص دہشت گردی ہے) مسلم قائدین کا موقف تقریباً متفقہ ہے پھر بھی حکومت کے علاوہ مختلف سیاسی پارٹیوں، اخبارات اور ٹیلی ویژن، یہاں تک کہ خود مسلم عوام میں ان کے اس موقف کا نوٹس نہیں لیا جارہا ہے حالانکہ یہ مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کی جان ومال کی سلامتی سے جڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کو خود اجودھیا کے تعلق سے کئی الجھنوں اور سوالات کا جواب فراہم کرنا ہے۔ بی. جے. پی. سے نالاں ہندوؤں کے ذہن میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ دسمبر 1949ء سے فروری 1986ء تک بابری مسجد سے بے پروا رہنے والے مسلمانوں کے لئے اچانک یہ مسجد اتنی اہم کیوں ہوگئی ہے۔ مسجد کی حیثیت کے بارے میں شرعی نکات کو وہ کیا، لاتعداد غریب مسلمان بھی نہیں سمجھتے۔ لیکن ان کو یہ بھی نہیں سمجھایا جاسکا کہ سوال صرف مسجد کا نہیں بلکہ زور زبردستی اور دھاندلی کو شکست دینے کا ہے۔

اجودھیا میں وشو ہندو پریشد اور دوسرے آر. ایس. ایس. کے ادارے، خود بی. جے. پی. بھی ہاری ہوئی جنگ لڑ رہی ہے۔ آئندہ ڈیڑھ سال میں جو کہ انتخابات کی تیاریوں کا عرصہ ہوگا، اجودھیا پر ایک آخری یلغار کی بھی تیاریاں ہورہی ہیں۔ اس قضیہ کو کسی بھی طرح ختم کرنے کی کوششیں تیز کرنا ضروری ہوگیا ہے۔ اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ کیا اس کیسریا سیاسی ٹولے کو کنارے کرکے عدالت کے باہر کوئی سمجھوتہ کیا جاسکتا ہے، ایسا سمجھوتہ جس کے ذریعہ بی. جے. پی. کو اور پورے آر. ایس. ایس. خاندان کو اس کے فکری حربہ سے یکسر محروم کیا جاسکے؟ □ □

(بشکریہ: افکار ملی، نئی دہلی)

## اجودھیا میں سیاحت کے نام پر جگموہن کا نیا منصوبہ

اتر پردیش کی سابق وزیر اعلیٰ مایاوتی کا تاج کاریڈور کے 1750 ملین روپے کا منصوبہ کے طشت ازبام ہونے کے بعد مرکزی حکومت کے ایما پر مرکزی وزیر سیاحت و کلچر مسٹر جگموہن کا اجودھیا پیکج شاید نیا گل کھلانے والا ہے۔ 24 ستمبر کو اجودھیا کا دورہ کرنے کے بعد بی. جے. پی. کے ریاستی صدر اور ایم. پی. ونئے کٹیار کے ساتھ مسٹر جگموہن نے لکھنؤ میں یہ اعلان کیا کہ ابتدائی مرحلے میں مرکز نے 10 ملین روپے اس لیے مختص کیے ہیں کہ اجودھیا میں ''رام کی پوڑی'' کی ترقی پر صرف کیا جائے۔ اس منصوبہ میں اجودھیا کے تمام تالابوں اور پارکوں کی صفائی کے ساتھ تین سے چار کلومیٹر تک گرین بیلٹ بنانے کا پروگرام شامل ہے۔ اس کے ساتھ ہی سرجو ندی کے اطراف میں سڑک تک اجودھیا کلچر کو فروغ بھی دیا جائے گا۔

اجودھیا کی سیاحتی وثقافتی ترقی کے اس منصوبہ پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے بابری مسجد ایکشن کمیٹی کے کنوینر مسٹر ظفریاب جیلانی نے کہا ہے کہ اگر اس ترقی کے ذریعے صرف ایک طرح کے کلچر کا اظہار ہوگا تو ہم پورے شدومد سے اس کی مخالفت کریں گے۔ تاہم انہوں نے یہ بھی کہا کہ چونکہ ابھی یہ بات میڈیا کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے لہٰذا اس سلسلے میں مزید تبصرہ مرکزی منصوبہ کے بلیو پرنٹ کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جاسکے گا۔

حال ہی میں مسٹر ودیا بھوشن راوت بھی لکھنؤ آئے تھے ان کی ایک کتاب "Sufi Shrines of Ayodhya" منظر عام پر آئی تھی۔ اس کتاب کو تحریر کرنے سے قبل انہوں نے ذاتی طور پر اجودھیا کا سفر کیا اور وہاں کی ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ مسٹر جگموہن کے اجودھیا منصوبے پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے مسٹر راوت کا کہنا ہے کہ اجودھیا کا مطلب ہے ''اَ۔یودھیا'' یعنی No War۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اجودھیا کو صرف ایک کمیونٹی کا شہر کہنا حق وصداقت کے منافی ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس یہ شہر لاکھوں غیر ہندوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ شہر دراصل بے شمار مسلمان، سکھ اور بدھ مذہب کے مقدس مقامات سے عبارت ہے۔ اپنی کتاب میں مسٹر راوت لکھتے ہیں: ''اجودھیا میں ایک بدھ کنڈ ہے جسے دامن کنڈ بھی کہا جاتا ہے اور یہ وہی جگہ ہے جہاں بدھ نے 16 برس تک 'دھیان' کرکے 'گیان' حاصل کیا تھا۔'' اسی طرح جینیوں کا ماضی بھی اس شہر سے وابستہ ہے۔ خیال

کیا جاتا ہے کہ پانچ جینی ''تیرتھانکر'' (مذہبی گرو) یعنی رشبھ دیو، اجیت ناتھ، ابھی نندن ناتھ، شکنت ناتھ اور انت ناتھ یہیں پیدا ہوئے تھے۔ مسٹر راوت کا کہنا ہے کہ اجودھیا تین سکھ گروؤں کا بھی مسکن رہا ہے۔ 1557 سمبت میں گرونانک جی نے برہمنوں کو یہیں خطاب کیا تھا جبکہ وہ ہری دوار سے پوری کے لیے محوِ سفر تھے۔ 1725 سمبت میں گرو تیغ بہادر نے اجودھیا میں ''دھیان'' کیا تھا اور 1729 سمبت میں سکھوں کے دسویں گرو 'گرو گوبند سنگھ' نے اجودھیا کا سفر کیا تھا۔

اجودھیا سے مسلمانوں کا کیا تعلق رہا ہے؟ اس سلسلے میں مسٹر راوت اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ ''مسلمان اجودھیا کو برسوں سے مقدس شہر تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اور مسلمانوں میں اسے ''خورد مکہ'' کا مقام حاصل ہے۔ کیونکہ یہاں کے چپے چپے میں بزرگانِ دین کی قبریں اور مزارات ملتے ہیں۔ اجودھیا میں حضرت شیث علیہ السلام کا مزار بھی ہے۔ جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ایک نبی تھے اور حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔'' موجودہ صورت حال یہ ہے کہ یہاں ایسے قدیم مزارات مقدسہ بھی پائے جاتے ہیں جو 1528 میں بابری مسجد کی تعمیر سے قبل کے ہیں اور ان سے یہ واضح ہے کہ اسلام تشدد اور تخریب کے ذریعہ یہاں نہیں آیا۔ مسٹر راوت نے اپنے حالیہ لکھنؤ کے سفر میں مسٹر جگموہن کے اجودھیا منصوبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ آج پورے اجودھیا میں اسلام کی عبقری شخصیتوں اور بزرگوں کی قبریں اور مساجد کے آثار بکھرے پڑے ہوئے ہیں۔ اور بہت سے آثار مکمل طور پر سرکاری عدم تحفظ کی وجہ سے تباہ ہو رہے ہیں۔ لہٰذا مسٹر جگموہن کو اپنی منصوبہ بندی سے قبل ان امور پر خصوصی توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔

دریں اثنا بابری مسجد ایکشن کمیٹی (BMAC) کے کنوینر مسٹر ظفریاب جیلانی نے مرکزی حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ''ہم ترقی کے نام پر تاریخ کو مسخ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیں گے۔ کیونکہ اجودھیا میں کل 13 صوفیوں کی درگاہیں ہیں۔ جن میں 10 فیض آباد میں اور 2 دیگر درگاہ ہیں اور درگاہ اشرف جہانگیر سمنانی اور درگاہ ردولی شریف اجودھیا کی اہم درگاہوں میں شامل ہیں۔ □ □

(انگریزی پندرہ روزہ، ملی گزٹ، نئی دہلی 30-16/اکتوبر 2003ء)

❖ ❖ ❖

# اجودھیا کی ہانڈی کتنی بار...؟

از: راجندر شرما

آخر کار سنگھ پریوار نے اپنے انتخابی پروگرام کا بھی اعلان کر دیا ہے اور خاص انتخابی مدعا کا بھی۔ جیسے کہ کافی پہلے سے آثار دکھائی دے رہے تھے اصل انتخابی مدعا اجودھیا میں رام مندر کا ہی ہوگا۔ اور اس مدعے کو لیکر تشہیری مہم اور حقیقت میں انتخابی مہم اکتوبر کے وسط میں شروع ہوگی۔ پانچ ریاستوں کے بہت ہی اہم اسمبلی انتخابات سے ٹھیک پہلے 15 ر اکتوبر کو دہلی اور لکھنؤ میں بھیڑ جمع ہوگی اور اجودھیا کے لئے کوچ کرے گی۔ 17 ر اکتوبر کو اجودھیا میں ''شکتی پردشن'' ہوگا۔ حالانکہ اجودھیا میں بھیڑ جٹائے جانے کے بعد کا پروگرام ابھی واضح نہیں ہے پھر بھی اس سلسلے میں وشو ہندو پریشد کے مارگ درشک منڈل کی اعلیٰ سطحی کمیٹی کی میٹنگ میں جس طرح بار بار 6 ر دسمبر 1992ء کے بابری مسجد کے انہدام کے جیسی ہی تحریک دوبارہ چھیڑنے کی بات کہی گئی ہے، بے شک اندیشے پیدا کرتی ہے۔ یہ اندیشے اس خیال سے اور بھی بڑھ جاتے ہیں کہ اتر پردیش میں اب ملائم سنگھ کی سرکار ہے اور 1995ء میں جب سماجوادی پارٹی اور بہوجن سماج پارٹی کے اتحاد میں رخنہ ڈال کر بھاجپا نے ملائم سنگھ کی سرکار گرائی تھی۔ اس کے بعد سے اتر پردیش میں یہ پہلا موقع ہے جب بھاجپا اپوزیشن کی بینچوں پر بیٹھ رہی ہے۔ اس لئے ملائم سنگھ سرکار کے بننے کے ساتھ ہی جو اندیشے ظاہر کئے جا رہے تھے کہ سنگھ پریوار لکھنؤ میں اس ''مخالف'' سرکار کی موجودگی کا استعمال مندر مسئلے کو گرمانے اور فرقہ وارانہ محوریت بڑھانے کیلئے کر سکتی ہے، جلد ہی سچ ثابت ہونے جا رہے ہیں۔

ملائم سنگھ کی سرکار کے لئے بیشک یہ ایک سخت امتحان کی گھڑی ہوگی۔ ایک طرف اسے اس مبینہ ''اجودھیا کوچ'' سے نظم ونسق کی مستعدی سے حفاظت کرنی ہوگی۔ دوسری طرف اسے یہ یقینی بنانے کی کوشش کرنی ہوگی کہ سنگھ پریوار کو مخالف سرکار کے استحصال کی جھوٹی سچی شکایتوں کا سہارا لے کر عام ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکانے کا موقع نہ ملے۔ بے شک سنگھ پریوار کا یہ پورا کا پورا کھیل نہ صرف بہت ہی پُر فریب اور شرارت سے بھرا ہے بلکہ اس کھیل میں بھاجپا کی قیادت والی مرکزی سرکار کی بھی ملی بھگت ہے، جسے پورے جمہوری نظام کی ہی جڑ پر وار کے طور پر لیا جائے گا۔ حقیقت میں وشو ہندو پریشد کے مارگ درشک منڈل کی میٹنگ سے ٹھیک پہلے بھاجپا اور آر. ایس. ایس. کے اعلیٰ رہنماؤں

کی راجدھانی میں ہوئی میٹنگ کے دوران بھاجپا کے اس اعلان میں کہ اسے وشو ہندو پریشد کے مندر کے مسئلہ پر تحریک چھیڑنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، مرکزی سرکار کا یہ عہد بھی چھپا ہوا ہے تھا کہ وہ اس معاملے میں ملک کی سرکار کی شکل میں اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرنے جا رہی ہے۔

جیسا کہ پہلے ہی اندازہ لگایا جا رہا تھا انتخابی مہم کے اس پروگرام کا اعلان وشو ہندو پریشد کے مارگ درشک منڈل کی نئی دہلی میں ہوئی میٹنگ میں لیا گیا ہے۔ حقیقت میں اس سے پہلے ہفتے بھر سے سنگھ پریوار میں جو کچھ چل رہا تھا اس نے سارے ملک کے لئے سنگھ پریوار کی حکمت عملی کے یک رخے چہرے کو پہچاننے کا بڑا اچھا موقع مہیا کرایا۔ حیرت نہیں کہ وشو ہندو پریشد کے مارگ درشک منڈل کے پانچ ریاستوں کے اسمبلی انتخابات کے متوقع پروگرام کو دھیان میں رکھتے ہوئے مندر تحریک کا نیا مرحلہ چھیڑنے کے پروگرام کے آرکیسٹرا کی سُر سادھنے کی کوششیں جاری تھیں۔ انہیں کوششوں کے تازہ ترین سلسلے میں پہلے بنگلور میں بھاجپا کی میٹنگ میں اس کے کھلے اشارے دئے گئے کہ بھاجپا کی قیادت کے انتخاب کے اگلے مرحلوں کو دیکھتے ہوئے مندر کے مرحلے کو براہِ راست طور پر گلے لگانے کی ضرورت شناخت کر لی ہے۔ یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ کہا تو یہ جا رہا تھا کہ ہندوستانی آثار قدیمہ کے ذریعہ اجودھیا میں متنازعہ مقام پر کھدائی کے بعد الٰہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بینچ کو جو رپورٹ دی گئی ہے اس کے بعد مندر کی تحریک کا تیز ہونا فطری ہے۔ لیکن فیصلہ اجودھیا کے مسئلہ پر ایک ایسا کتابچہ چھاپنے کا کیا گیا جس میں 6 دسمبر 1992 کو بابری مسجد کے انہدام کے بعد سنگھ پریوار کے کردار کے بچاؤ میں لال کرشن اڈوانی کے ذریعہ لکھے گئے دو مضامین کو خصوصیت سے شامل کیا جا رہا تھا۔ اڈوانی کے ان مضامین کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں بابری مسجد کے انہدام کی براہِ راست ذمہ داری سے سنگھ پریوار بری الذمہ ٹھہراتے ہوئے بھی بابری مسجد کے انہدام کا نہ صرف جواز فراہم کیا گیا ہے بلکہ بالواسطہ طور پر اس کے مندر ہونے کا بھی دعویٰ کیا گیا ہے۔

بھاجپا ارکان کی بنگلور میٹنگ اور وشو ہندو پریشد کے مارگ درشک منڈل کی میٹنگ کے درمیان راجدھانی میں ہی بھاجپا صدر وینکیا نائیڈو کی رہائش گاہ پر بھاجپا کے عہدیداروں اور آر. ایس. ایس. کے عہدیداروں کی اہم میٹنگ ہوئی۔ جہاں آر. ایس. ایس. کے رہنماؤں نے میٹنگ کے بعد یہ اعلان کیا کہ وشو ہندو پریشد کے مندر کے مسئلہ پر پھر تحریک چھیڑنے پر اس کی مکمل حمایت کی جائے گی۔ بھاجپا کے رہنماؤں نے اس میٹنگ کے بعد یہ اعلان کیا کہ وشو ہندو پریشد کی ایسی

تحریک چھیڑنے پر بھاجپا کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی بھاجپا کی جانب سے اجودھیا میں متنازع مقام پر مندر بنانے کے لئے اپنے وعدے کا بھی زور شور سے اعادہ کیا۔ ☐ ☐

(راشٹریہ سہارا، 19 ستمبر 2003ء)

# بابری مسجد کے ملبے پر بی.جے.پی.کی سیاست

از: عشرت علی صدیقی (معروف صحافی)

اجودھیا کے مسجد مندر تنازعہ سے تعلق رکھنے والے سب افراد اور ادارے اس معاملے کی چبھن روز افزوں طور پر محسوس کر رہے ہیں اور جیسے جیسے ریاستی اور مرکزی الیکشن قریب آتے جارہے ہیں ویسے ویسے اس چبھن کے احساس اور اظہار میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ کچھ لوگوں کے دل میں یہ بات کھٹک رہی ہے کہ 1949ء کی ایک رات کو مسجد کے اندر ایک مورتی پراسرار طور پر نمودار ہوگئی اور 6ر دسمبر 1992ء کو دن دہاڑے مسجد غائب ہوگئی اور اس کی جگہ سپاٹ میدان بن گیا۔ دوسری طرف کچھ لوگ اس بات پر فکر مند ہیں کہ جس جگہ ان کے خیال اور عقیدے کے مطابق رام چندر جی کا جنم ہوا تھا وہاں ابھی تک ان کے شایانِ شان مندر نہیں تعمیر ہو سکا ہے۔ جو اراضی متنازعہ بن گئی ہے اس کی ملکیت کا مقدمہ الٰہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں زیر سماعت ہے۔ عقیدے کی ملاوٹ نے معاملے کو پیچیدہ بنا دیا ہے۔ مسجد کے انہدام کے معاملے کی تحقیقات کے لیے حکومت نے جسٹس لبراہن پر مشتمل جو کمیشن مقرر کیا تھا اس کی کارروائی سے پیچیدگی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اور سی.بی.آئی.کی تفتیش کے دوران معاملے کے سلجھنے کی صورت نکلنے کے بجائے ایک ایسی الجھن پیدا ہوگئی جس کی وجہ سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں کئی دنوں تک ہنگامہ ہوتا رہا اور کوئی سنجیدہ غور و بحث نہیں ہوسکی وہاں اپوزیشن نے حکومت پر سی.بی.آئی.کی تفتیش میں مداخلت کرنے اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈروں لال کرشن اڈوانی، مرلی منوہر جوشی اور اوما بھارتی کو بچانے کے لیے ناجائز طریقہ کار اختیار کرنے کا الزام لگایا۔

اپوزیشن کا کہنا تھا کہ سی.بی.آئی.نے بھاجپا کے ان بڑے بڑے لیڈروں پر مسجد کے انہدام کے سلسلے میں مجرمانہ سازش کرنے کا الزام جو پہلی چارج شیٹ میں لگایا گیا تھا، وہ موجودہ حکومت کے دباؤ کی وجہ سے حذف کر دیا اور دوسری چارج شیٹ میں اس الزام کو شامل نہیں کیا گیا۔ اپوزیشن کے اس موقف کی تائید کلیان سنگھ نے بھی کی ہے جو بابری مسجد کے انہدام کے وقت اتر پردیش کی بھاجپائی سرکار کے وزیر اعلیٰ تھے اور جنہیں اس معاملے میں سپریم کورٹ نے مجرم قرار دے کر ایک دن کی علامتی قید کی سزا بھی سنائی تھی۔ بعد میں انہوں نے بھاجپا سے الگ ہوکر راشٹریہ کرانتی پارٹی

بنالی۔ان کا کہنا ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کا منصوبہ بھاجپا کے لیڈروں نے انہیں الگ رکھ کر بنایا تھا۔انہوں نے کہا کہ اگر سی. بی.آئی.عدالت انہیں طلب کرے تو وہ سازش کی پوری تفصیل بتا دیں گے۔فی الحال لبراہن کمیشن نے انہیں اگست میں بیان دینے کو بلایا ہے اور انہوں نے کہا ہے کہ وہ کمیشن کے سمن کا اپنے وکیلوں سے مشورہ کر کے جواب دیں گے اور حکومت کی طرف سے وزیر قانون ارون جیٹلی نے معاملہ عدالت میں زیر سماعت ہونے کا عذر کیا ہے۔لیکن ان کا کہنا ہے کہ چارج شیٹ میں کوئی کاٹ چھانٹ نہیں کی گئی ہے۔

یہ الجھن بہ ظاہر اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ ہائی کورٹ نے بھاجپا کے بعض لیڈروں کے خلاف لگائی جانے والی چارج شیٹ تکنیکی اسباب کی بنا پر رد کر دی تھی اور اس تکنیکی نقص کو دور کر کے دوسرا نوٹیفکیشن جاری کرنے میں اتر پردیش کی حکومت بہت دنوں تک ٹال مٹول کرتی رہی جس کی بنا پر اپوزیشن پارٹیاں اس کے خلاف بے جا پاسداری کرنے اور انصاف کے عمل میں رکاوٹ ڈالنے کا الزام لگاتی رہی تھیں۔بابری مسجد کے خلاف مہم چلا کر بھاجپا نے یو.پی.اسمبلی میں ایک بار مکمل اکثریت حاصل کر لی تھی اس مہم میں لال کرشن اڈوانی کی رتھ یاترا خصوصی اہمیت رکھتی تھی اور مسجد کے انہدام پر بھاجپا کے جن لیڈروں نے خوشی منائی انہوں نے بعد میں مرکزی حکومت پر اپنا تسلط جمانے کے لیے دوسری پارٹیوں کا تعاون یہ کہہ کر حاصل کر لیا کہ این.ڈی.اے.نامی گٹھ جوڑ کے ایجنڈا میں بابری مسجد والی جگہ پر رام مندر کی تعمیر شامل نہیں ہے۔لیکن بھاجپا کے لیڈر اپنے آر.ایس.ایس.کے ساتھیوں اور پیروؤں کو یہ یاد دلاتے رہے کہ ان کی پارٹی نے مندر کی تعمیر کا معاملہ اپنے پارٹی ایجنڈا سے خارج نہیں کیا ہے اور اسمبلی و پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل ہو جانے پر وہ اس ایجنڈا کو عملی جامہ پہنائیں گے۔

اڈوانی کی رتھ یاترا گجرات کے شہر سوم ناتھ سے شروع ہوئی تھی اور پچھلے سال گجرات اسمبلی کے الیکشن میں سنگھ پریوار کے وی.ایچ.پی.(وشو ہندو پریشد) نامی گھٹک نے اس مسئلے کو اُچھال کر بھاجپا کو لگاتار دوسری بار حکومت پر قبضہ دلا دیا۔اس کامیابی سے حوصلہ پا کر بھاجپا اس سال ہونے والے ریاستی الکشنوں میں مسجد مندر کا مسئلہ اُٹھانے کی تیاری کر رہی ہے۔اور وی.ایچ.پی.کے لیڈر پروین توگڑیا کی ترشول تقسیم کی مہم جس کا مظاہرہ پچھلے دنوں فتح پور سیکری میں ہوا ہے اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔توگڑیا کی پارٹی والوں نے کانچی کے شنکر آچاریہ جیندر سرسوتی کی اس کوشش کی

پہلے تو سخت مخالفت کی تھی جس کے تحت انہوں نے مسلم پرسنل لاء بورڈ سے اجودھیا کے تنازعے پر گفتگو شروع کی تھی مگر جب شنکر آچاریہ نے اپنے فارمولا کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان اجودھیا، کاشی اور متھرا کی مسجد مندر تنازعے والی جگہیں ہندوؤں کے حوالے کر دینے کا من بنالیں، اور مسلم پرسنل لاء بورڈ نے شنکر آچاریہ کے فارمولے کو رد کر دیا تو تو گڑیا اور سنگھ پریوار نے اپنی توپوں کا رخ مسلم پرسنل لاء بورڈ کی طرف پھیر دیا۔

اس اثناء میں شنکر آچاریہ نے ایک اخباری انٹرویو میں اپنی ابتدائی وضاحت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگر مسلمان اجودھیا کی بابری مسجد سے متعلق اپنا دعوا واپس لے لیں تو ہندوؤں کو کاشی اور متھرا کی عبادت گاہوں سے متعلق اپنا مطالبہ واپس لینے کی ترغیب دی جاسکتی ہے۔

شنکر آچاریہ نے کہا ہے کہ اب بابری مسجد کا وجود باقی نہیں رہا ہے۔ بہ ظاہر وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اس بات کو بھول جائیں کہ مسجد کا وجود کس طرح ختم ہوا تھا۔ یہی خواہش وی. ایچ. پی. اور سنگھ پریوار کے دوسرے حلقوں کی ہے۔ اور اگر یہ خواہش پوری ہوگئی تو بھاجپا آنے والے الکشنوں میں اس بات کو اپنے کارنامے کی حیثیت سے اُچھالے گی۔ اور اس کے بنیادی نظریے سے اتفاق کرنے والے کچھ لوگ بعد میں کاشی اور متھرا کے سلسلے میں بھی وہی حکمت عملی اختیار کرسکیں گے جو انہوں نے اجودھیا میں اختیار کی ہے۔ وی. ایچ. پی. کے لیڈر کہتے بھی ہیں کہ ماضی میں تین ہزار اور مندروں کو مسجدوں میں بدل دیا گیا تھا اور اب وہ ان مبینہ مندروں کو بحال کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں ایک طرف کچھ لوگ وی. ایچ. پی.، اور آر. ایس. ایس. کی حکمت عملی کی تائید کرتے ہیں وہیں دوسری طرف کچھ لوگ ان جماعتوں کی نمائندہ حیثیت سے انکار کرتے ہیں۔ شنکر آچاریہ جیندر سرسوتی نے 30/جون کو چینئی میں آر. ایس. ایس. کے لیڈروں سے ملاقات کی جس کے بعد آر. ایس. ایس. کے ترجمان رام مادھو نے اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس ملاقات میں یہ بات صاف ہوگئی کہ ہم دونوں تقریباً پوری طرح ہم خیال ہیں۔ لیکن اس سے ایک دن پہلے پوری کے جگت گرو شنکر آچاریہ سوامی ادھوکشانند دیو تیرتھ نے اجودھیا میں اس خیال کا اظہار کیا کہ آر. ایس. ایس.، وی. ایچ. پی. اور بھاجپا کا گٹھ جوڑ آنے والے الکشنوں میں سیاسی فائدہ اُٹھانے کے لیے شنکر آچاریہ جیندر سرسوتی کو آلہ کار بنا رہا ہے۔

اس معاملے میں اور اس گٹھ جوڑ کی الکشنی مہم میں وی. ایچ. پی. ہر اول دستے کا کام کر رہی

ہے۔اس نے بہ ظاہر بھاجپا سے زیادہ تیزی دکھاتے ہوئے وزیر اعظم باجپئی سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اجودھیا میں بابری مسجد والی جگہ پر رام مندر کی تعمیر کے لیے پارلیمنٹ میں قانون پاس کرائیں ورنہ کرسی چھوڑ دیں۔ واجپئی، اڈوانی اور بھاجپا کے دوسرے لیڈروں نے اس کے جواب میں کہا کہ موجودہ مرکزی حکومت اکیلے بھاجپا کی نہیں بلکہ کئی پارٹیوں کی مخلوط حکومت ہے جو قومی جمہوری اتحاد این.ڈی.اے. نے بنائی ہے اور وی.ایچ.پی.جس چیز کا مطالبہ کر رہی ہے وہ این.ڈی.اے. کے مشترکہ ایجنڈا میں شامل نہیں ہے۔ یہی عذر بھاجپا کے جنرل سکریٹری پرمود مہاجن نے 13 / جولائی کو ناگپور میں کیا جہاں وہ بھاجپا اور شیو سینا کے عہدیداروں کی ایک مشترکہ کانفرس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔مگر شیو سینا کے صدر اودھوٹھاکرے کے ساتھ ایک مشترکہ پریس کانفرس میں مہاجن نے یہ بھی کہا کہ جب بھاجپا کو لوک سبھا میں واضح اکثریت حاصل ہو جائے گی تو وہ اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کے لیے بل پیش کر دے گی اور جب تک وہ اجودھیا میں اپنے وعدے کے مطابق ایک عالی شان مندر نہیں بنالیتی تب تک یہ مندر ایک الکشنی مسئلہ بنا رہے گا۔''

جولائی کے تیسرے ہفتے میں وی.ایچ.پی.کو منھ بھرائی دینے کے لیے ایک قدم اور آگے بڑھا کر کہا کہ کہ اگرچہ این.ڈی.اے. کے مشترکہ ایجنڈا میں رام مندر کی تعمیر کے لیے قانون سازی کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تاہم بھاجپا محسوس کرتی ہے کہ اس جھگڑے کو چکانے کے لیے ''اس متبادل تدبیر پر بھی غور کیا جانا چاہئے'' قانون سازی کے معاملے میں سنگھ پریوار کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے آر.ایس.ایس. کے ترجمان رام مادھو نے کہا ہے کہ ملک کی سب سے بڑی پارٹی نے جو حکومت چلا رہی ہے واضح طور پر قانون سازی کے ذریعہ مسجد مندر تنازعہ حل کرنے کی حمایت کر دی ہے'' اور اب اس مسئلہ کو حل کرنے کی ذمہ داری کانگریس اور دوسری اپوزیشن پارٹیوں کی ہے۔

ان سب باتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بھاجپا اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر کو الیکشن کا مسئلہ بنائے گی اس کی الکشنی مہم میں اشوک سنگھل اور پروین توگڑیا جیسے وی.ایچ.پی. کے لیڈر آگے آگے رہیں گے۔ اور وہ ووٹروں کو یہ سمجھانے کی کوشش کریں گے کہ مندر کی تعمیر میں رکاوٹ کانگریس اور دوسری بھاجپا مخالف پارٹیوں کی وجہ سے پڑ رہی ہے۔اسے امید ہے کہ جو دو درجن کے قریب پارٹیاں این.ڈی.اے. میں شامل ہیں وہ زبان سے سیکولرزم کی باتیں کرنے کے باوجود اس کے ساتھ جڑی رہیں گی اور اپنی غرض اور مصلحت کی وجہ سے اس کی الکشنی مہم میں مثبت اور منفی مدد

دیتی رہیں گی۔ ابھی تک بھاجپا کبھی کبھار مسجد مندر قضیہ کے سلسلے میں یہ کہتی رہی ہے کہ یہ معاملہ یا تو دونوں فرقوں کے باہمی سمجھوتے سے طے ہوسکتا ہے یا پھر عدالت کے فیصلے سے۔ لیکن اب قانون سازی کے امکان کا ذکر کر کے اس نے نہ صرف اپنے مخالفوں کو بلکہ اپنے حمایتوں کو بھی جتا دیا ہے کہ وہ اس معاملہ میں جابرانہ اکثریت بھی استعمال کر سکتی ہے۔

(بشکریہ: قومی آواز، نئی دہلی، 11راگست 2003ء)



# توگڑیا کی دھمکی

وشو ہندو پریشد کے بے لگام لیڈر پروین توگڑیا نے مرکز اور اتر پردیش سرکار کو دھمکی دی ہے کہ اگر رام بھکتوں کو اجودھیا جانے سے روکا گیا تو پورا ملک جل اُٹھے گا۔ توگڑیا نے براہِ راست وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی کو نشانہ بناتے ہوئے ان سے بھی کہا ہے کہ اگر ملک میں فرقہ وارانہ تشدد پھیلتا ہے تو اس کے لئے وہی ذمہ دار ہوں گے۔

جن لوگوں نے فرقہ وارانہ انتشار پھیلانے کو 'ہندوتو کی خدمت' مان لیا ہو، جنہوں نے 'ملک کی تعمیر و ترقی میں رکاوٹیں کھڑی کر کے تخریب کو اپنا شعار بنالیا ہو'، جن کے آدرش مہاتما گاندھی نہ ہوں اور جن کے ذہنی رشتے مہاتما گاندھی کے قاتلوں سے ہوں ان سے اس کے سوا اور امید ہی کیا کی جا سکتی ہے کہ وہ ملک کو جلانے کی دھمکیاں دیں۔ دنیا کا کوئی بھی محب وطن، کوئی بھی سمجھدار اور ذمہ دار شہری سرکار سے ٹکراؤ ہونے پر ملک کو جلانے کی دھمکیاں نہیں دے سکتا۔ تنکا تنکا چن کر آشیاں بنانے والے اپنے آشیاں کو جلانے کی بات کر ہی نہیں سکتے۔ یہ دھمکیاں تو ایسے ملک و دشمن عناصر ہی دے سکتے ہیں کہ جن کا آشیاں کی تعمیر میں کوئی رول نہ ہو، جن کے لئے حب الوطنی جیسے الفاظ ان کے فرقہ وارانہ جنون کے سامنے کمزور پڑ جاتے ہوں۔ جن کی فکر کے ڈانڈے 'ہندتو' تک محدود ہوں اور ملک وقوم کے وسیع تر مفادات کے بارے میں سوچنے سے جن کا شعور یکساں عاری ہو۔ اسی لئے پروین توگڑیا اور وی. ایچ. پی. کے لیڈر جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ باعث تعجب نہیں ہے۔ البتہ یہ بات باعث تعجب ہے کہ ایک طرف وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی وی. ایچ. پی. کے شتر بے مہار پر بھروسہ کرنے کی تلقین کر رہے ہیں دوسری طرف توگڑیا جیسے لیڈر وزیر اعظم کو دھمکیاں دے کر لگاتار یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے نزدیک سرکار اور قانون کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

وی. ایچ. پی. لیڈر پروین توگڑیا نے 13 راکتوبر کے روز میڈیا کے نمائندوں کے سامنے کہا کہ واجپئی سرکار کو رام بھکتوں کو اجودھیا جانے کی اجازت دینی چاہئے ورنہ اگر ملک میں فرقہ وارانہ تشدد بھڑکتا ہے تو اس کے لئے وہی ذمہ دار ہوں گے۔ بڑبولے توگڑیا نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ رام مندر تحریک نے ہی کانگریس کو مرکز کے اقتدار سے بے دخل کیا اور اگر موجودہ سرکار نے بھی ''ہندوؤں کا استحصال'' کیا تو اس کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ توگڑیا یہ دعویٰ کرتے وقت شائد یہ بات بھول

گئے کہ اگر بھاجپا مرکز میں حکومت سازی کے لئے اجودھیا ایشو کو مبینہ سیکولر پارٹیوں کے دباؤ میں بالائے طاق نہ رکھتی تو آج واجپئی جی وزیراعظم نہ ہوتے اور جو حال وی. ایچ. پی. لیڈروں کا بہار میں راشٹریہ جنتا دل سرکار نے کیا ہے وہی حال پورے ملک میں ہوتا۔ وی. ایچ. پی. اور اس کے توگڑیا جیسے لیڈر اب تک جو زبان بولتے رہے ہیں اور جو لہجہ اقلیتوں کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں ان کا مذکورہ بیان بھی اس سے مختلف نہیں ہے اسلئے اس پر کوئی تبصرہ کرنا فضول ہے لیکن حیرت اس بات پر بھی ہے کہ مرکز کی واجپئی سرکار مسلسل توگڑیا جیسے لیڈروں کے بیانات کو نظرانداز کر کے ان کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے، حیرت اس بات پر ہے کہ این. ڈی. اے. میں شامل بھاجپا کے حلیف بھی توگڑیا کی مسلمانوں کو دی جا رہی دھمکیوں پر کان بند کئے بیٹھے ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ وی. ایچ. پی. کے اس مزاج اور اس رویہ کے باوجود ملک کے وزیراعظم وی. ایچ. پی. کے دفاع میں کھڑے نظر آرہے ہیں اور وی. ایچ. پی. پر بھروسہ کرنے کی تلقین کر رہے ہیں، یہ بات بھی باعث حیرت ہے کہ توگڑیا جس زبان میں بات کر رہے ہیں وہی زبان اگر اقلیت سے وابستہ کوئی لیڈر بولتا ہے تو اسے سرکار پوٹا جیسے قانون کے تحت جیل میں ڈال دیتی لیکن توگڑیا کے خلاف واجپئی اور ان کی سرکار سخت لہجہ تک کا استعمال کرنے سے گریز کر رہی ہے۔ کیا اسے مرکزی سرکار کا خوف مانا جائے؟ یا پھر وی. ایچ. پی. اور مرکزی سرکار مل کر یہ کھیل کھیل رہے ہیں؟ اگر توگڑیا کو سرکار سے کوئی شکایت ہے، انہیں واجپئی کی پالیسیوں سے اختلاف ہے انہیں مرکزی سرکار پر بھروسہ نہیں ہے تو وہ براہِ راست مرکزی سرکار کی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ اس کے وزراء کا گھیراؤ کرنے کی دھمکیاں کیوں نہیں دیتے؟ سرکار سے ناراضگی کے ردعمل میں فرقہ وارانہ تشدد کی دھمکیاں دے کر آخر توگڑیا کیا کہنا چاہتے ہیں۔ پورے ملک کی فضا کو اشتعال انگیز بنا کر وہ کون سی رام بھکتی یا حب الوطنی کا ثبوت پیش کرنا چاہتے ہیں۔

توگڑیا نے سرکار کو جو دھمکی دی ہے وہ انتہائی سنگین ہے اور سرکار کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کا سنجیدگی سے نوٹس لے۔ اس کے ساتھ ہی کیونکہ توگڑیا کی دھمکی اقلیتوں کے خلاف ہے اور اس کے نتیجے میں پورے ملک میں فرقہ وارانہ تشدد بھڑکنے کا اندیشہ ہے اس لئے قومی اقلیتی کمیشن اور قومی حقوق انسانی کمیشن جیسے اداروں کو بھی توگڑیا کی اس دھمکی کے خلاف مناسب کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔ ☐ ☐ ☐

(اداریہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی۔ 15/اکتوبر 2003ء)

# رام مندر سے اڈوانی کی توبہ؟

از: آر. کے. آنند

"مندر کے لیے سرکار کی قربانی نہیں دیں گے"۔ یہ الفاظ کسی اور کے نہیں بلکہ رام مندر تحریک کے سب سے بڑے رہنما اور مندر کے نام پر ہندوستانی عوام کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرنے والے نائب وزیر اعظم ایل. کے. اڈوانی کے ہیں۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، بی. جے. پی. کے لیڈر مختلف مواقع پر مختلف قسم کے بیان دینے کے ماہر ہیں۔ جس وقت ایل. کے. اڈوانی یہ بیان دے رہے تھے اس وقت وہ ایک طیارے پر سوار تھے اور ہوا میں پرواز کر رہے تھے، اقتدار کے جو مزے ہیں اس کے لطف اٹھا رہے تھے۔ اب ایسی صورت میں وہ رام مندر کے لیے سرکار قربان کرنے کی بات کیسے سوچ سکتے ہیں۔ اسی رام مندر کے مسئلہ نے تو انہیں اقتدار دلوایا تھا اب اگر ایک بار وہاں رام مندر بن جاتا ہے تو پھر بی. جے. پی. کے پاس الیکشن کے لیے کون سا موضوع رہ جاتا ہے لہٰذا اڈوانی کا یہ بیان مسلمانوں کے تئیں ان کے حقیقت پسند رویہ کا غماز نہیں بلکہ اس خوف کا نتیجہ ہے جو آئندہ انتخابات کے نتیجہ کی صورت میں ان کے سامنے آنے والا ہے۔ دہلی سے حیدرآباد آتے ہوئے فضائیہ کے ایک طیارے میں نامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے نائب وزیر اعظم ایل. کے. اڈوانی نے قبول کیا کہ وشو ہندو پریشد والے انہیں صلاح دے رہے ہیں کہ بی. جے. پی. رام مندر کی تعمیر کے لیے ایوان میں بل لائے اور اس پر بحث کرائے اور اگر یہ بل گر جاتا ہے تو بی. جے. پی. اسی موضوع کو لے کر آئندہ انتخابات میں عوام کے درمیان جائے۔ لیکن بی. جے. پی. اس کے حق میں نہیں ہے۔ اس وقت لوک سبھا میں بی. جے. پی. تنہا اکثریت میں نہیں ہے اور وشو ہندو پریشد اسے یہ خواب دکھا رہی ہے کہ اگر رام مندر کے موضوع پر سرکار چلی بھی جاتی ہے تو بی. جے. پی. کو اس کا زبردست فائدہ ہوگا۔ اور وہ پوری اکثریت سے کامیاب ہو کر واپس آئے گی لیکن بی. جے. پی. کو اس حقیقت کا علم ہے کہ وشو ہندو پریشد والے جذباتی لوگ ہیں انہیں سیاست کا علم نہیں۔ انہیں اس زمینی سچائی کا پتہ نہیں کہ مندر تحریک اب صرف چند شدت پسندوں تک سمٹ گئی ہے۔ رام مندر تحریک کے نام پر فسادات تو کرائے جا سکتے ہیں ملک میں اشتعال تو پھیلایا جا سکتا ہے لیکن اس موضوع پر اکثریت سے ووٹ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ساتھ ہی اس موضوع پر این. ڈی.

اے. میں پھوٹ پڑ جانا لازمی ہے۔ جہاں تک این.ڈی.اے. میں پھوٹ پڑنے کا سوال ہے اب اقتدار کے آخری دنوں میں بی. جے. پی. نے اپنی حلیف جماعتوں کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں چھوڑا ہے وہ اب تک ہر معاملہ میں بی. جے. پی. کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی ہے آئندہ بھی ملاتی رہیں گی اور اگر انہوں نے اس موضوع پر بی. جے. پی. کے خلاف جانے کا فیصلہ بھی کیا تو یہ ان کے مفاد کے لیے ہوگا اس کا مسلمانوں سے ہمدردی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا بلکہ صرف مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے ایک دکھاوا ہوگا اور انتخابات کے بعد یہ سب دوبارہ ایک ہو جائیں گے۔

سیاسی مبصرین کا ماننا ہے کہ اڈوانی اور ان کی پارٹی کو کانگریس اور حزب اختلاف کی دیگر پارٹیوں کی مخالفت کی صورت میں بل کے گر جانے سے زیادہ فکر این.ڈی.اے. میں شامل پارٹیوں کے درمیان اختلافات کے اُبھر کر سامنے آجانے کی ہے۔ اس طرح کے کسی بل کے گر جانے سے سرکار کا کوئی نقصان نہیں ہوگا لیکن اس بل پر جو بحث ہوگی وہ تمام پارٹیوں کو بے نقاب کر دے گی۔ بی. جے. پی. کا یہ خوف اسے رام مندر معاملہ میں بل لانے سے روک رہا ہے لہٰذا اڈوانی جی اب یہ کہہ رہے ہیں کہ بل صرف اس لیے نہیں پیش کیا جا سکا کہ وشو ہندو پریشد ایسا چاہتی ہے۔

گفتگو کے دوران اڈوانی نے ایک دلچسپ بات اور کہی کہ یہ مسئلہ دونوں فریقوں کے درمیان گفت وشنید سے ہی حل ہو سکتا ہے۔ ابھی پرم ہنس رام چندر داس کی آخری رسومات کے موقع پر یہی لیڈران کے خوابوں کی تکمیل کے لیے مندر کی تعمیر کا عہد کر رہے تھے۔ اس موقع پر اپنی تقریر کے لیے وزیر اعظم کو ایوان میں وضاحت بھی کرنی پڑی۔ دراصل اس وقت بی. جے. پی. دو کشتی میں سوار ہے۔ کانگریس پر سیکولرزم کا الزام لگانے والی یہ پارٹی اقتدار کے لیے اپنے چہرے پر سیکولرزم کا مکھوٹا لگائے رکھنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کی اکثریت فاشزم کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں اسے ہر قسم کی مذہبی شدت پسندی سے بیر ہے۔ اس کے علاوہ عدلیہ بھی من مانی کی اجازت نہیں دے سکتی اس لیے یہ لیڈر وقتاً فوقتاً اپنے بیان تبدیل کرتے رہتے ہیں تاکہ ضرورت پڑنے پر ان بیانوں کو عدالت میں پیش کیا جا سکے۔ بابری مسجد کی شہادت کے معاملہ میں بھی ان لیڈروں نے عدالت کے سامنے تمام الزامات سے انکار کیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ سی. بی. آئی. ان لیڈروں کے اجودھیا میں موجود ہونے کا بھی کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکی ہے۔ حالانکہ رتھ یاترا سے لے کر بابری مسجد کی شہادت تک ایل. کے. اڈوانی کا جو کردار رہا ہے اس سے پوری دنیا واقف ہے۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

بہرحال 'فخر سے کہو ہم ہندو ہیں' کا نعرہ لگانے والے ان لیڈروں کا بابری مسجد کی شہادت کے معاملہ میں کسی قسم کی شرکت سے انکار ان کی اخلاقی پستی کی نشانی ہے۔ ایک جانب تو اڈوانی جی کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ مردِ آہن ہیں۔ سردار پٹیل کے بعد بی۔ جے۔ پی۔ انہیں ہی مردِ آہن کا درجہ دیتی ہے لیکن دوسری جانب اس مردِ آہن میں اتنی بھی ہمت نہیں کہ وہ رام مندر کی تعمیر کے لیے بابری مسجد کی شہادت کی ذمہ داری قبول کرلے۔ بابری مسجد کی شہادت کے لیے اڈوانی اور ان کے ساتھیوں کا ضمیر یقینی طور پر ان کی ملامت کرتا ہوگا۔ ورنہ اگر وہ بھگوان رام کے اتنے بڑے بھگت ہیں تو رام مندر کی تعمیر کے لیے کوئی سزا قبول کرنے کو کیوں تیار نہیں۔ اور اب تو انہوں نے رام مندر کے لیے اپنی سرکار کو قربان کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ ان لیڈروں کے لیے کرسی ہی سب کچھ ہے۔ اس کے علاوہ سب کچھ بے معنیٰ ہے اگر رام مندر اقتدار میں واپس لا سکتا ہے تو پھر ٹھیک ہے ورنہ ایسے رام مندر کو جو اقتدار نہ دلا سکے بی۔ جے۔ پی۔ کا دور سے سلام۔ □ □ (ویوز نیٹورک)



# اجودھیا کا مسئلہ اور مذہبی وقار

از: ڈاکٹر مدن لال کپور

اجودھیا میں مندر مسجد کا معاملہ ایک ناقابلِ حل مسئلہ کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں مفاہمت کے لیے ابھی تک جو اقدام اُٹھائے گئے وہ سب بے سود ثابت ہوئے ہیں۔ فرقہ وارانہ تلخی قائم ہے اور بڑھتی جا رہی ہے۔ ہندو مسلم دونوں فریق اپنی مذہبی اقدار، سے کچھ ہٹ کر 'مذہبی وقار' کا شکار ہو گئے ہیں۔ رام مندر کی تعمیر کو وشو ہندو پریشد نے ہندوؤں کے مذہبی وقار سے جوڑ دیا ہے۔ وہ مندر کی تعمیر میں تاخیر کو ہندوؤں کی توہین سمجھتے ہیں اور اس کے لیے مسلم قیادت کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ مسلم لیڈر شپ بابری مسجد کے انہدام پر برانگیختہ ہے۔ کیونکہ وہ بابری مسجد کے انہدام کو مسلمانوں کی توہین سمجھتی ہے۔ لیکن وہ بھول جاتی ہے اس طرح کی توہین کا سامنہ ہندوؤں کو بھی کرنا پڑا تھا۔ یہ سب کچھ غلط اور گمراہ شدہ عناصر کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھا۔ دونوں فرقے کچھ شر پسند اور متعصب عناصر کے ہاتھوں زخم خوردہ ہیں۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔ بابری مسجد کی تباہی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اور اسی طرح سلطانوں اور حکمرانوں کے عہد میں بے شمار مندروں کو مسمار کرنے سے بھی آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ یہ ایک قسم کی 'باہمی توہین' ہے جس پر ہندو اور مسلمانوں دونوں کو شرمسار ہونا چاہئے۔

بابری مسجد کے شہید ہونے پر ہندو سیکولرسٹ عناصر نے اپنے گمراہ اور دیوانے ہم مذہبوں کی سخت مذمت کی۔ لعنت اور پھٹکار بھیجی۔ آج بھی ہندوؤں کا ایک با اثر طبقہ جس میں ہندوؤں کی بڑی تعداد شامل ہے ہندو انتہا پسندوں کو لگام لگائے ہوئے ہے۔ وہ ان کے ارادوں کی تکمیل کے خلاف بڑی چٹان ثابت ہو رہا ہے۔ اس وقت مسلم قیادت کو ایسے ہی لوگوں کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے۔

کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہندو اور مسلم ذہن کو جانبداری کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جائے؟ ان کی شکایتوں کے پس منظر کو سمجھا جائے۔ تاریخ کے صفحات پر تعصب کے جو بدنما دھبے لگے ہوئے ہیں ان کی مذمت کی جانی چاہئے۔ کسی بھی مذہبی گروہ کے خلاف ناانصافی پر خاموشی اختیار کر لینا قابل اعتراض عمل ہے جرأت سے کام لیتے ہوئے اپنے ہم مذہبوں کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اُٹھانے والے بلند حوصلہ انسانوں کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کو

جھوٹے وقار اور فرقہ وارانہ جانب داری سے اوپر اُٹھ کر باہمی مفاہمت کی طرف قدم بڑھانے ہیں...... مذہبی مقامات کے انہدام کا سلسلہ کب شروع ہوا؟ اور کیوں شروع ہے؟ اس سلسلے میں تاریخ صاف بولتی ہے۔لیکن مذہبی اور کمیونل وقار ہمیں نہ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ان دانستہ گونگوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔عالمی شہرت کے مالک تاریخ دان آرنلڈ ٹائن بی نے اپنے مولانا آزاد میموریل لیکچر 1960ء میں فرمایا تھا: ''میں حکومتِ ہند کی تعریف کرتا ہوں کہ اس نے اورنگ زیب کی بنائی ہوئی مساجد کو مسمار نہیں کیا جو اس نے بنارس میں گنگا کے گھاٹ پر تعمیر کروائی اور دوسری اس نے متھرا کے کرشن پربت پر بنائی۔اورنگ زیب کی تین مساجد (کاشی، متھرا اور اجودھیا) کی تعمیر کا مقصد جارحانہ طور پر سیاسی تھا۔یہ صاف اشارہ تھا کہ اورنگ زیب کی 'اسلامی حکومت' ہندوؤں کے متبرک ترین مقامات پر بھی حکمران ہے''۔اورنگ زیب اور اس کی حکومت کا یہ دعوا دورِ جدید کے ہندوستانی مسلمانوں کے احساسات کے لیے بھی تکلیف دہ ہے اور انہیں قابل قبول نہیں۔مسٹر ٹائن بی کے ارشادات کے ساتھ ہماری تاریخ میں ایسے حقائق بھی موجود ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ اورنگ زیب نے کئی مندروں کے ساتھ جاگیریں لگا دیں تا کہ ان مندروں کا انتظام اچھی طرح چل سکے اور پجاریوں کا اچھی طرح گزر ہو سکے۔نامور ہندوستانی تاریخ دان جناب بی۔این۔ پانڈے کے مطابق اورنگ زیب نے بنارس کے ایک مندر کو مسمار کرنے کا حکم دیا تھا جبکہ اس کے لشکر کے راجپوتی سرداروں کی بیویوں کی اس مندر میں بے حرمتی کی گئی تھی۔ان تضادات پر اعلا درجہ کی تحقیق ہونی چاہیے۔لیکن موجودہ دور میں ہندو اور مسلم قیادت کو ان باتوں کو اپنے مذہبی فرقے کا وقار بنا کر عوام کو مشتعل کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔رتھ یاترا اور بابری مسجد کے انہدام کے دنوں میں وشو ہندو پریشد نے ہندو نوجوانوں میں مذہبی جوش جنون کی حد تک بھر دیا۔دلی میں وہ ننگی تلواریں اور ترشول لیے سڑکوں پر مظاہرہ کر رہے تھے اور بار بار بھرپور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ رہے تھے: ''اب ہندو جاگ اُٹھا ہے''۔ہندو کی بیداری کا مطلب تھا کہ وہ ایسی مساجد کو مسمار کر کے دم لے گا جو اس کی تذلیل اور توہین کی علامت ہے۔لیکن ان کے رہنما یہ بھول گئے کہ وہ خود بھی اس بد کے مرتکب رہ چکے ہیں۔تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اپنی اصلی صورت دیکھی جا سکتی ہے اور شرمندگی محسوس کی جا سکتی ہے لیکن آئینہ کو توڑا نہیں جا سکتا ہے۔تاریخ کا آئینہ کوئی معمولی آئینہ نہیں ہے۔اس میں انسانی ضمیر دھڑکتا ہے۔مندر، مسجد، گرجا گھر اور ویہار مسمار کیے جا سکتے ہیں۔لیکن

تاریخ کے آئینہ کو چور چور نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ ہمارا منھ چڑھاتا رہے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے اور اسے پہچاننے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔ جناب ایس. آر. گوئل اپنی کتاب 'ہسٹری آف بدھ ازم' میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان میں بدھ ازم کے زوال کا ایک بڑا سبب برہمنوں کی بدھ ازم کی جانب دشمنی اور مخاصمت کا رویہ تھا"۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ برہمن کمارل بھٹ نے اُجین کے راجہ کو بودھوں کی نسل کشی کے لیے تیار کیا۔ جس طرح ہندو قیادت مسلمان حکمرانوں پر مندر گرا کر ان کی زمین پر مسجد بنانے کا الزام لگاتی ہے۔ اسی طرح بدھ مت کے پیروکار ہندوؤں پر بودھ ویہار توڑ کر ان پر مندر بنانے کا الزام لگاتے ہیں۔ محترمہ انورادھا دت اپنے ایک مضمون میں لکھتی ہیں۔ کشی نگر یعنی مہاتما بدھ کے مہاپری نروان (نجات) کے مقام پر ہندوؤں نے زبردست قبضہ کر لیا تھا۔ ساتویں صدی کے مشہور و معروف چینی سیاح ہیون سانگ کے مطابق گوڑا کے راجہ شاسنکار نے بودھی درخت جس کے نیچے مہاتما بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا کو کاٹ ڈالا تھا۔"

آج ہندوؤں اور مسلمانوں کے شرمسار ہونے کا وقت ہے۔ ویہار مندر اور مساجد گرائے گئے۔ اور اپنے اپنے مذہبی اقدار کو بالائے طاق رکھ دیا گیا مذہبی وقار کو ہی سب کچھ مان لیا گیا۔ لیکن آج انسانی شعور پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ پرانے راجاؤں اور بادشاہوں اور ان کے اہل کاروں نے پلورل ازم کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ وہ راجہ اور حاکم کے دھرم اور مذہب کو رعایا کا دھرم یا مذہب بنانا چاہتے تھے۔ ان کی سوچ کی دنیا نہایت محدود تھی۔ آج ان کی فکر کا اعادہ کرنا بربریت اور ذہنی پسماندگی کے مترادف ہے۔

'مذہبی وقار' اجودھیا مسئلہ کا حل ڈھونڈنے میں بڑی رکاوٹ ہے رام جنم بھومی کے مقام کا کچھ گز یا فٹ ادھر اُدھر ہونا رام بھکتوں کو قبول نہیں۔ استھان میں کچھ تبدیلی کی رعایت دینا ان کی برداشت سے باہر ہے کیونکہ یہ ان کے مذہبی وقار کا معاملہ ہے۔ مسلمانوں کا مسجد کے مقام کو بدلنا ان کی مذہبی آبرو پر کاری ضرب ہے۔ حالانکہ اسلامی ممالک میں کئی موقعوں کی بنا پر مسجدوں کے مقامات کو بدلا گیا۔ "مندر وہیں بنے گا" یا "مسجد وہیں بنے گی" یہ دونوں مطالبے مسئلہ کا حل ڈھونڈنے سے صاف انکار کرتے ہیں۔ اور مذہبی وقار کے نام پر ہندوستانی معاشرہ کے امن کے سر پر لٹکتی تلواریں ہیں۔ کیا علماء اور دھرم آچاریوں نے مسئلہ کے اس پہلو کو کبھی غور کیا ہے؟ اگر انہوں نے غور کیا ہوتا تو شنکر آچاریہ جی یہ نہ کہتے کہ اجودھیا میں پہلے ہی آٹھ مسجدیں موجود ہیں اور کسی نئی

مسجد کی ضرورت نہیں۔ اور علماء ہندوؤں کے مطالبات کو دھمکیوں کا نام دے کر زیادہ پیچیدہ نہ بناتے۔ مطالبات کو دھمکی نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ ان کی سچائی کو پرکھنا چاہئے اور بات چیت کے سلسلہ کو جاری رکھنا چاہئے۔

وشو ہندو پریشد متھرا اور کاشی کے مندروں کے بارے میں پختہ ثبوت کا دعوا کرتی ہے۔ لیکن اجودھیا کے رام مندر کے بارے میں ہندوؤں کی بھگوان شری رام کی جانب عقیدت کی بات کرتی ہے۔ ہندوؤں کا یہ عقیدہ قابلِ قبول ہے کہ رام چندر جی کی جنم بھومی اجودھیا ہے لیکن اس سے کچھ زیادہ نتیجہ نکالنا مشکل ہے کہ مسجد کی عمارت کے نیچے رام مندر کے دبے ہونے کی بات قابلِ توجہ ہو سکتی ہے اسی لیے ہائی کورٹ نے اس سال 5 مارچ کو اس خطے کی کھدائی کا حکم دیا۔ آر. ایس. آئی. (آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا) نے ساڑھے تین مہینے تک اسی خطہ کی کھدائی کی۔ اور فاضل عدالت کو تین رپورٹیں پیش کر دیں۔ ان رپورٹوں کا خلاصہ جو اخبارات میں شائع ہوا ہے وہ اس طرح ہے: ① متنازعہ خطے کو مناسب گہرائی تک کھودا گیا ہے اور بابری مسجد کے نیچے ایک پرانی مسجد کے آثار ملے ہیں۔ ② مسلم عہد کے برتن بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ ③ انسانوں اور جانوروں کی ہڈیاں بھی ملی ہیں جو ایسی آبادی کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس میں مردہ انسانوں کو دفن کرنے کا رواج تھا اور گوشت خوری کا چلن تھا (ہائی کورٹ نے سروے کے افسران کو ان دریافتوں کا مکمل ریکارڈ پوری حفاظت کے ساتھ رکھنے کی ہدایت دی ہے)۔ ④ زمین کے نیچے دبے فرشوں اور دیواروں کی تعمیر میں چونے اور سرخی کا استعمال بکثرت ہوا ہے جو کہ عہد وسطیٰ کے مسلم فنِ تعمیر عمارت کا ایک خاصہ ہے۔

یہ ساری دریافتیں اور اراضی پر وقف کے مالکانہ حقوق صاف اشارہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے دعوے میں کافی مضبوطی ہے۔ اگر وشو ہندو پریشد عقیدہ کی بنا پر مسلمانوں سے یہ خطۂ اراضی لینا چاہتی ہے تو اسے مسلم قیادت سے بات کرنی ہوگی۔ اس سے فراخدلی کی توقع رکھتے ہوئے خود بھی فراخدلی کا ثبوت دینا ہوگا۔ دونوں فریقین کو غیر ضروری مذہبی وقار کو بھولنا ہوگا۔ ▢ ▢ ▢

(روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی۔ 19 اگست 2003ء)



# سنگھل کا ریفرنڈم

از: شاہد لطیف

ہندتو بریگیڈ سے وابستہ افراد اکثر ایسی باتیں کہتے ہیں کہ جو قطعی غیر اہم ہوتی ہیں اور جنہیں 'مجذوب کی بڑ' کہا جا سکتا ہے لیکن یہی لوگ کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں جن پر کان دھرنے کو جی چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر جس روز (جمعہ، 19 ستمبر 2003ء کو) رائے بریلی کی خصوصی سی. بی. آئی. عدالت نے اجودھیا معاملہ میں نائب وزیر اعظم اور وزیر داخلہ شری لال کرشن اڈوانی کو بری کر دیا اور سات دوسرے لیڈروں کے خلاف فردِ جرم داخل کرنے کا فیصلہ کیا، اُسی روز بابری مسجد انہدام کے اہم ملزم اور وشو ہندو پریشد کے لیڈر اشوک سنگھل نے ایک ایسی بات کہی جسے غیر اہم کہہ کر مسترد کرنے کے بجائے اسے عمل میں لانے کی ضرورت ہے تاکہ ہمیشہ کے لئے ایک بات طے ہو جائے کہ ہندوستان کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا یہ ملک سیکولر ہی رہے گا جیسا کہ ہے اور آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے اور سیکولر آئین کے اختیار کئے جانے کے پہلے سے ہے، یا، ہندوتوا وادیوں کی خواہش اور آرزو کے مطابق اسے بھگوا رنگ میں رنگ دیا جانا چاہئے؟ جمعہ 19 ستمبر کو اشوک سنگھل نے مطالبہ کیا کہ رام مندر کی تعمیر کے سلسلے میں پورے ملک میں استصواب رائے (ریفرینڈم) کروایا جائے تاکہ اس بات کا تعین ہو جائے کہ کتنے لوگ رام مندر کی تعمیر کے حق میں ہیں۔ اشوک سنگھل سمجھتے ہیں کہ پورا ملک رام مندر کی تعمیر کا خواہشمند ہے یعنی اس ملک کے عوام کی اکثریت ہندوتوا کی حامی و ہمنوا ہے۔ جبکہ ایسا نہیں ہے۔ ہم ایسے کسی استصواب رائے کی حمایت اپنے اسی ایقان کی بنیاد پر کر رہے ہیں، کسی خوش خیالی یا خوش گمانی کی بنیاد پر نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بالخصوص 1990ء سے ہندتوا کے نظریہ کا پرچار اس ملک میں اتنے شد و مد کے ساتھ کیا گیا کہ عوام کا ایک طبقہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا لیکن یہ وہ طبقہ تھا جس سے وابستہ لوگ کسی نہ کسی خانے میں یا تو پہلے سے متعصب واقع ہوئے تھے یا جنہیں اس رتھ پر سوار ہو کر اپنا قد اونچا کرنے کے مواقع ہاتھ آتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دیگر سیکڑوں طبقات نے اس پرچار کا کوئی اثر قبول نہیں کیا کیونکہ وہ ہندوستان کی صدیوں پرانی رواداری، بھائی چارگی اور فرقہ وارانہ اتحاد پر یقین رکھتے تھے اور اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ وہ طبقات یا وہ فرقے جو صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل

کررہتے آئے ہیں اُنہیں الگ کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی نیز اُن کے الگ کئے جانے کا کوئی جواز بھی نہیں ہے۔ اس بات کا ثبوت بھارتیہ جنتا پارٹی کی محدود مقبولیت ہے۔ ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی نے بہت کم وقت میں اچھی خاصی مقبولیت حاصل کرلی ہے لیکن مقبولیت کے اس اضافے کا سبب صرف اور صرف ہندتوا کی مقبولیت نہیں بلکہ اس کے کچھ دوسرے اسباب بھی ہیں جن کی تفصیل میں جانا اس وقت مناسب نہیں ہے۔ اگر ہندتوا کا نظریہ من حیث القوم اکثریتی فرقے کے تمام عوام کے لئے قابل قبول ہوتا تو بھارتیہ جنتا پارٹی کو واضح اکثریت سے کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ سنگھل یہ نہیں جانتے کہ عام انتخابات اور ریاستی انتخابات میں بی. جے. پی. کے حق میں یا اس کے خلاف جو ووٹ پڑتے ہیں وہ بھی استصواب رائے ہی ہیں۔ بی. جے. پی. نے چند ایک ریاستوں میں بھلے ہی حکومت قائم کرلی ہو لیکن آج بھی اس کے پاس اتنی ریاستیں نہیں ہیں جتنی کانگریس اور مجموعی طور پر دیگر جماعتوں کے پاس ہیں۔ اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ عوام کی اکثریت بھارتیہ جنتا پارٹی کو تسلیم نہیں کرتی یعنی اُس کے نزدیک ہندوتوا کا نظریہ قابل قبول نہیں ہے۔ اس صورت حال کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ رام مندر کی تعمیر یا ہندتوا کے قابل قبول ہونے نہ ہونے کے سلسلے میں استصواب رائے کروایا گیا تو اس کے حق میں 33 فیصد سے زیادہ ووٹ نہیں پڑیں گے۔

اگر اس حقیقت کے روزِ روشن کی طرح عیاں ہونے کے باوجود اشوک سنگھل چاہتے ہیں کہ مندر کی تعمیر کے لئے استصواب رائے کروایا جائے تو ہمارے خیال میں اس تجویز کی حمایت کی جانی چاہیئے، ہندوستان میں انصاف اور امن پسند عوام کی تعداد آج بھی اتنی زیادہ ہے کہ جب بھی کسی ایک فرقے یا طبقے پر ظلم ہوتا ہے، اُس طبقے کے لوگوں کو ظلم کے خلاف صف آراء ہونے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ اُن کی حمایت میں دوسرے طبقات سے تعلق رکھنے والے کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ گجرات میں اقلیتی فرقے پر جتنا ظلم کیا گیا وہ ہندوستان کی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے لیکن اس سے قبل کہ اقلیتی فرقہ اس کے اثرات سے باہر نکلتا، گجرات حکومت پر اس ملک کے مختلف دوسرں فرقوں نے ایسی شدید تنقید کی کہ اگر مودی کے بجائے کوئی دوسرا وزیر اعلیٰ ہوتا تو فوری طور پر مستعفی ہو جانے ہی کو ترجیح دیتا اور اسی میں اپنی خیر مناتا۔ کیا یہ ہندوستان کے سیکولر ہونے کی اعلیٰ ترین مثال نہیں ہے؟ آیئے ہم اس سلسلے کی چند اور مثالوں کا ذکر کرتے چلیں۔

اکتوبر 1990ء کو اجودھیا میں کارسیوکوں کو بابری مسجد کی طرف جانے سے روکنے والا یو. پی. کا وزیر اعلیٰ (ملائم سنگھ، جن کے بارے میں اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ بدلے بدلے مرے سرکار نظر آتے ہیں) اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والا فرد نہیں تھا، اسی دور میں لال کرشن اڈوانی کی رتھ یاترا روکنے اور بی. جے. پی. کے اتنے طاقتور لیڈر کو سمستی پور میں گرفتار کرنے والا وزیر اعلیٰ (لالو پرساد یادو) بھی اقلیتی فرقے کا نمائندہ نہیں ہے، گزشتہ سال ہندتوا وادیوں کو اجودھیا میں شیلا دان کی اجازت نہ دینے والے جج کا تعلق بھی اقلیتی فرقے سے نہیں تھا۔

گجرات فسادات کے دوران اور اس کے بعد حقوق انسانی کمیشن نے مودی حکومت کی مذمت اور سرزنش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا اور ہم سب جانتے ہیں کہ کمیشن کا سربراہ بھی اقلیتی فرقے کا رکن نہیں تھا، بیسٹ بیکری سمیت گجرات فسادات کے دیگر تمام مقدمات کو کسی دوسری ریاست کی عدالت میں چلانے کی سپریم کورٹ سے اجازت بھی اقلیتی فرقے نے طلب نہیں کی، گجرات فسادات ہی کے معاملے میں حکومت گجرات کو کھری کھری سنانے والے جسٹس کھرے بھی اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والے جج نہیں ہیں، پروین توگڑیا کو مطب کرنے کا جو اجازت نامہ دیا گیا ہے اُسے واپس لینے کی درخواست مسلمانوں کی کسی تنظیم نے پیش نہیں کی بلکہ میڈیکو فرینڈ سرکل کی عرضداشت پر دستخط کرنے والے ممبئی کے جتنے بھی ڈاکٹر ہیں اُن میں ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ملک بھر کے طول وعرض میں اکثریتی اور اقلیتی فرقہ کے اتحاد اور تال میل کے ہزاروں مظاہر روزانہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کیا یہ تمام مظاہر استصواب رائے ہی کی جھلکیاں نہیں ہیں؟ اشوک سنگھل کو استصواب رائے کی تجویز نہیں پیش کرنی چاہئے بلکہ اس کے لئے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے اسے عمل میں لانے کی پرزور کوشش بھی کرنی چاہئے لیکن اس شرط پر کہ ایک بار جب استصواب رائے سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ ملک کی اکثریت ہندتوا وادی نہیں ہے بلکہ مل جل کر رہنے پر یقین رکھتی ہے تو اس کے بعد وہ پھر کبھی ہندتوا کا ڈھول نہیں بجائیں گے۔ کیا شری اشوک سنگھل کو یہ شرط منظور ہے؟

ہمیں ہندوستانی عوام کی اکثریت کی انصاف پسندی اور رواداری پر کوئی شبہ نہیں ہے لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ پچھلے 14-13 برسوں میں بھگوا بریگیڈ نے اپنے اثر ورسوخ میں اضافہ کیا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سیکولر طاقتیں متحد نہیں ہیں، اُن کے پاس ملک کے تمام فرقوں اور

طبقوں کو متحد رکھنے کا ویسا کوئی ایجنڈا نہیں ہے جیسا ان فرقوں کو توڑنے اور اُنہیں ایک دوسرے سے دور کرنے کا وسیع تر ایجنڈا آر۔ ایس۔ ایس۔ اور اس کی ذیلی تنظیموں کے پاس ہے اور جسے وہ پورے انہماک اور خلوص دل کے ساتھ عمل میں لا رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ زہر لے کر گلی گلی جانے والوں کو شکست دینے کے لئے وہ لوگ میدان عمل میں آ جائیں جن کے پاس تریاق تو ہے لیکن وہ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے ہیں یا مختلف خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس ضمن میں باقاعدہ کوشش شروع کی گئی تو بہت جلد وہ دور آئے گا جب فرقہ پرست طاقتیں بے یار و مددگار ہو جائیں گی۔ □ □ (روزنامہ انقلاب، ممبئی)

# اجودھیا معاملے میں تحمل اور ہوشیاری کی ضرورت

از: ظفر آغا

حسب دستور چناؤ کی سرگرمیاں شروع ہوتے ہی وشو ہندو پریشد کی جانب سے رام مندر تعمیر کا مسئلہ پھر کھڑا کر دیا گیا ہے۔ ادھر دہلی، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ اور راجستھان جیسے صوبوں میں چناؤ کی سرگرمیاں تیز ہو رہی ہیں اور اِدھر وی. ایچ. پی. کی اجودھیا کوچ کی تیاریاں زور وشور پر ہیں۔ اخباروں اور ٹی. وی. پر ایک بار پھر اجودھیا سرخیوں میں ہے''اجودھیا چھاؤنی میں تبدیل'' تو ''اشوک سنگھل کا چیلنج'' جیسی سرخیاں اخباروں کے ذریعہ عام ہندوؤں میں جذبات کا ہیجان پیدا کرنے کے لئے آج کل خوب نظر آ رہی ہیں۔ وشو ہندو پریشد کی قیادت میں ایک بار پھر پورے سنگھ کنبے کا رام مندر تعمیر کی آڑ میں وہی خطرناک سیاسی کھیل شروع ہو گیا ہے جو آج سے کوئی 12 یا 15 برس سے جاری ہے۔ ویسے آپ اور ہم اور بہت حد تک عام ہندو بھی سنگھ کے اجودھیا کھیل سے اب واقف ہو چکا ہے۔ عام ہندوستانیوں کے ذہن میں اب یہ بات بیٹھتی جا رہی ہے کہ رام مندر تعمیر کا مسئلہ مذہبی کچھ کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ اخباروں میں یہ خبریں بھی آ رہی کہ شیو سینا کا اجودھیا کوچ ناکام رہا اور ابھی تک وشو ہندو پریشد کے اجودھیا کوچ میں وہ رونق نہیں دکھائی پڑ رہی ہے جو پہلے کبھی دکھائی دیتی تھی۔ ظاہر ہے کہ دس بارہ برس سے رام مندر کے نام پر ووٹ بٹورنے کی سیاست کا مقصد اب عام ہندو بھی سمجھنے لگا ہے اور یہی سبب ہے کہ ابھی تک رام مندر تعمیر تحریک میں وہ جوش وخروش دکھائی نہیں پڑ رہا ہے جو پہلے دکھتا تھا۔ لیکن اس کے معنی یہ قطعاً نہیں کہ وی. ایچ. پی. اور سنگھ رام مندر تحریک میں جوش وخروش پیدا کرنے کے لئے کوئی کوشش نہیں کریں گے۔ رام مندر تحریک ہی وہ تحریک ہے جس نے سنگھ کا خواب شرمندۂ تعبیر کروا دیا۔ وہ بی. جے. پی. جو کبھی چار پارلیمانی سیٹوں پر قناعت کرتی تھی وہی بی. جے. پی. آج ہندوستان پر حکومت کر رہی ہے اور سنگھ اس حکومت کے ذریعہ اس ملک کو ہندو راشٹر میں تبدیل کر رہا ہے۔ اور بی. جے. پی. کی اس قسمت کی تبدیلی کا سبب محض رام مندر تحریک ہی ہے۔ چنانچہ وی. ایچ. پی. اور سنگھ رام مندر تحریک میں جوش وخروش پیدا کرنے کے لئے کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھیں گے۔ آخر پورے سنگھ پریوار کے پاس ایک یہی کارڈ ہے اور وہ اس کارڈ کو بھنانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ اس نقطۂ نگاہ سے یہ سمجھنا لازمی ہے کہ آخر اس بار سنگھ اور وی. ایچ. پی. رام مندر تحریک میں جوش پیدا کرنے کے لئے کیا

حکمتِ عملی اختیار کریں گے؟

رام مندر تحریک کی کامیابی محض اس بات پر منحصر رہی ہے کہ رام مندر تعمیر کے نام پر ہندوؤں میں پہلے ہندو جذبات جوش میں آئیں اور پھر وہ جذبات اس شدت پر پہنچیں کہ عام ہندوؤں میں ایک غصہ کی لہر دوڑے اور وہ اس غصے میں رام مندر ''دشمن'' کے خلاف بی. جے. پی. کو ووٹ ڈال دیں۔ یعنی رام مندر تحریک کی کامیابی کے لئے اور ہندو جذبات بھڑکانے کے لئے ''دشمن'' کا عنصر ہونا بے حد ضروری ہے اور وشو ہندو پریشد پچھلے دس بارہ برسوں میں وہ عنصر مسلمانوں کو بنا کر بہت خوبصورتی سے عام ہندوؤں کے ذہن میں مسلمانوں کی 'دشمن' امیج پیدا کرتی رہی ہے۔ مسلمانوں کو ہندو دشمن کی امیج دینے کے لئے وی. ایچ. پی. اور سنگھ کو ایک کٹر مسلم تنظیم کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے جیسے رام مندر تحریک کے خلاف اس طرح کی کوئی تنظیم اپنے بیانات عام کرتی ہے۔ ویسے ویسے سنگھ مسلمانوں کے خلاف تو گڑیا جیسے کٹر ہندو کرداروں کے ذریعہ عام ہندوؤں کے ذہن میں نفرت اور غصے کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

جس طرح ملک میں پچھلے دس بارہ برسوں میں مسلمان ہندو نفرت کا شکار ہوئے اس سے خود مسلمانوں میں کافی عقل آئی اور ان کو یہ احساس ہوا کہ بابری مسجد تحفظ اور مسلمانوں کے حق کے نام پر پرجوش بیان دینے والے مسلم لیڈر مسلمانوں کی مدد کم اور سنگھ کی خدمت زیادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں کی جانب سے اس معاملے میں گرم گرم جذبات کی سیاست میں کافی کمی ہوئی ہے اور یہی بات وی. ایچ. پی. اور سنگھ کے لئے پریشان کن ہے۔ اب وی. ایچ. پی. رام مندر تحریک کے نام پر کس کو ہندو دشمن کی ٹوپی پہنائے؟

وی. ایچ. پی. کا پہلا نشانہ اس بار اس سلسلے میں ملائم سنگھ یادو ہیں وجہ یہ ہے کہ ملائم سنگھ یادو کی پرانی امیج عام ہندوؤں میں مولانا ملائم یعنی مسلم پسند لیڈر کی ہے۔ 1990ء میں ملائم سنگھ یادو نے رام مندر تحریک کی بڑی شدو مد سے مخالفت کی تھی اور سنگھ کے خلاف بھی کافی نفرت پھیلائی تھی۔ اس وقت اتر پردیش میں پھر ملائم سنگھ وزیر اعلیٰ ہیں اور باحیثیت وزیر اعلیٰ۔ صوبے میں نظم وضبط برقرار رکھنے کی ذمہ داری ملائم سنگھ یادو پر ہی ہے اور پھر کورٹ نے بھی ملائم سنگھ کو یہ ہدایت دے دی کہ وہ اجودھیا میں ہر حال میں امن برقرار رکھیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ ملائم سنگھ یادو وشو ہندو پریشد کی رام یاترا کو روکنے پر مجبور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اتر پردیش حکومت اجودھیا کو چھاؤنی بنانے میں

مجبور ہے۔ اجودھیا میں لوگوں کا مجمع اکٹھا نہ ہو اس کے لئے ٹرینوں اور بسوں کو اجودھیا تک جانے سے روکنا بھی ضروری ہے۔ اب وی. ایچ. پی. ان قانونی پابندیوں کا ہوا کھڑا کر کے ملائم سنگھ کے نام پر ہندوؤں کو یہ سگنل دینے کی کوشش کر رہی ہے کہ مسلم حامی مولانا ملائم پھر ہندو دشمنی پر آمادہ ہیں۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ اس بار خود ملائم سنگھ بھی اس مسئلے میں بہت سمجھداری سے کام لے رہے ہیں۔ وہ مولانا ملائم کی امیج ترک کر کے محض ایک وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے ہی پیش آ رہے ہیں۔ ملائم سنگھ نے ابھی تک رام مندر کے معاملے میں ہر قسم کی بیان بازی سے گریز کیا ہے اور یہ عقلمندی کی بات ہے۔

ظاہر ہے کہ ان حالات میں وشو ہندو پریشد کے لئے عام ہندوؤں میں غصہ اور ہندو جذبات پیدا کر پانا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن وشو ہندو پریشد کے ساتھ پورے سنگھ کنبے کے لئے 'رام یاترا' ایک سیاسی موت و زندگی کا سوال بن گئی ہے۔ اگر ہندوؤں میں 'رام یاترا' کے نام پر غصہ پیدا نہیں ہوا تو بی. جے. پی. کے لئے حالیہ اسمبلی انتخابات میں کہیں بھی چناؤ جیت پانا تقریباً ناممکن ہو جائے گا۔ اس لئے اگر وشو ہندو پریشد مولانا ملائم کے نام پر ہندوؤں میں غصہ نہیں پیدا کر سکی تو ملک کے کسی کونے میں مسلمانوں کو کسی طرح اس مسئلہ میں پھر گھسیٹ کر غصہ پیدا کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔ چنانچہ آئندہ ایک ڈیڑھ مہینے تک سنگھ کنبے کی جانب سے مسلمانوں میں غصہ پیدا کرنے کی بھرپور کوشش ہوگی۔ یاد رہے کہ پچھلی بار جب کہیں کامیابی نہیں ہوئی تو گودھرا اسٹیشن پر مسلمانوں میں ہیجان پیدا کر کے گجرات میں قیامت بپا کر دی اور اسی قیامت کے نام پر گجرات کا مسلمان گجراتی ہندو کا دشمن بن گیا اور مودی چناؤ جیت گیا۔

اس لئے تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ ڈیڑھ مہینے سخت امتحان کے مہینے ہیں۔ پورے ملک میں مسلمانوں کو انتہا سے زیادہ صبر و تحمل سے کام لینا ہوگا ورنہ اسی غلطی پر سنگھ کہیں بھی دوسرا گجرات بنا سکتی ہے، اور اس کی آڑ میں ہندو جذبات بھڑکا کر چناؤ جیتنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، 15 اکتوبر 2003)



## حکومت، عدالت، انتظامیہ اور بے چارے مسلمان...

از: محمد سراج الدین شریفی

رائے بریلی کی خصوصی عدالت کے جج نے بابری مسجد انہدام کے کیس میں نامزد بھاجپا اور وشو ہندو پریشد کے چوٹی کے لیڈران کے خلاف قانونی کارروائیوں کے لئے حکم دے دیا ہے مگر اس کیس کے سب سے بڑے ملزم لال کرشن اڈوانی کو بری کر دیا ہے۔ ان کی برأت سرکاری افسران کے بیانات کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ الزامات تو سبھی ملزمین پر ایک ہی قسم کے تھے پھر بھی اڈوانی بری ہو گئے بہت ممکن ہے کہ جلد ہی کسی داؤ پیچ کے سہارے اعلیٰ عدالتیں بقیہ ملزمین کو بھی بری کر دیں گی۔ جب حکومت ان کی ہوگی، عدلیہ و انتظامیہ میں ان کے ہم خیال اور ہمدرد ہوں گے، اکثریت کی حمایت حاصل ہوگی، ڈنڈے کا زور ہوگا اور ہر طرف زعفرانی رنگ کا بول بالا ہوگا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے یہاں تک کہ ججوں کو ان کے مذہب کا واسطہ یا انہیں لالچ اور دھمکی دے کر ایسا کرنے کے لئے مجبور بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی سال کی بات ہے جھارکھنڈ کی حکومت نے جب مستقل جائے سکونت (Domicile) پالیسی کا اعلان کیا تو پورے صوبے میں آگ لگ گئی کیونکہ یہ بہت خطرناک پالیسی تھی تب وہاں کے ہائی کورٹ کے ججوں نے اس پالیسی کی خامیوں پر غور و خوض کرنے کے بعد جب مذکورہ پالیسی کے خلاف فیصلہ سنایا تو جھاکھنڈیوں نے ان ججوں کو دھمکیاں دی تھی۔ واضح رہے کہ اس صوبے میں ریاست کے قیام سے اب تک بھاجپا کی حکومت ہے۔

چند سال پہلے بابری مسجد انہدام کے کیس میں الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے بھاجپا اور وشو ہندو پریشد کے نامزد ملزمین اڈوانی، جوشی، گری راج کشور، ڈالمیا، سنگھل، کٹیار، اوما بھارتی اور رتمبھرا کے خلاف Notification میں موجود خامیوں کی بنیاد پر آگے کی کارروائیوں پر روک لگا دی تھی ٹھیک اسی طرح جس طرح ممبئی 1992ء کے مسلم کش فسادات کو ذمہ دار ٹھہرا کر شیو سینا کے بال ٹھاکرے کو Charge Sheet میں موجود خامیوں کی بنیاد پر رہا کر دیا تھا۔

اس طرح کہ ان کی گرفتاری کے فوراً بعد ممبئی کی ایک عدالت نے ان کی رہائی کا حکم دے دیا تھا۔ اس سے پہلے بابری مسجد کی شہادت سے قبل فیض آباد کی عدالت نے یک طرفہ سماعت کے بعد اس مسجد کا تالا کھلوایا تھا تاکہ ہندو اس میں پوجا کر سکیں۔ مسلم دشمن طاقتوں کی کارستانیوں کی یہ تو

صرف جھلکیاں ہیں اصل نظارے تو بہت ہی وحشتناک ہیں۔ عدالتوں کی ایسی روشیں ہمارے لئے بہت تشویشناک ہیں اور اسے ہمیں بہت سنجیدگی سے لینا چاہئے۔

مذکورہ تمام فیصلوں سے پہلے سپریم کورٹ نے شاہ بانو کیس میں شریعت اسلامیہ کے خلاف فیصلہ دیا تھا اور اس فیصلے کے اثرات کو کم کرنے کے نام پر حکومت نے ایک قانون بنایا تھا جس میں طلاق کے بعد نان ونفقہ کے مسئلے پر سپریم کورٹ کے فیصلہ ''لازی'' کی جگہ ''اختیاری'' کر دیا گیا تھا، یہ بہت بڑا فریب تھا اور اس فریب کے تحت آج تک مسلمان یہ سمجھ رہے ہیں کہ مذکورہ قانون ہماری کامیابی کی نشانی ہے، جب کہ حقیقت میں یہ ایک خود فریبی ہے کیونکہ آج ملک کی تمام چھوٹی بڑی عدالتیں مذکورہ خامی Loop-Hope یعنی قانون اختیاری نان ونفقہ کی بنیاد پر روز روز غیر اسلامی فیصلے سنا رہی ہیں۔ چند روز پہلے ہی کی بات ہے کہ سپریم کورٹ نے یکساں شہری قانون Uniform Civil Laws عمل میں لانے کے لئے حکومتِ ہند کو صرف مشورہ ہی نہیں دیا ہے بلکہ اس بات پر اپنی ناراضگی کا بھی اظہار کیا ہے کہ اس معاملے میں بہت دیر ہو رہی ہے۔ پچھلے مہینے محکمہ آثار قدیمہ (A.S.I.) نے عدالت کو ایک تحقیقاتی رپورٹ دی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بابری مسجد کے ملبے کے نیچے رام مندر کی بنیاد موجود ہے۔ کچھ دنوں پہلے یو. پی. میں بھاجپا حکومت کی نگرانی میں وہاں کے ایک انتخابی حلقے سے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے نام ہٹا کر ہندوؤں کے نام ڈال دیئے گئے تھے جب الیکشن کمیشن کو اس سازش کی خبر ہوئی تب اس نے اصلاحی اقدامات کروائے۔ اس وقت ملک کے مختلف حصے میں ایک خطرناک سازش کے تحت ان مسلم اکثریتی انتخابی حلقوں کی بناوٹ کو بگاڑنے کی کوششیں ہو رہی ہیں تاکہ ایسے انتخابی حلقوں کو کم سے کم کیا جا سکے جہاں سے مسلمانوں کا انتخاب یقینی ہے۔ یہ شرارت پارلیمانی، اسمبلی سے لیکر میونسپل حلقۂ انتخاب تک ہو رہی ہے۔ ایک تازہ شرارت ـــ کہ تحت مردم شماری دو ہزار ایک Census 2001 کے فارم میں مسلمانوں کے مذہب کا نام مسلمان لکھا ہوا تھا اس لئے کچھ مسلمانوں نے اپنے مذہب کا نام مسلمان تو کچھ نے اپنے مذہب کا نام اِسلام لکھوایا تھا۔ ظاہر ہے کہ کمپیوٹر میں تو دو میں سے کوئی ایک ہی نام درج ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس مردم شماری میں مسلمانوں کی تعداد خود بخود کم ہو جائے گی حکومت ہند تو پہلے ہی سے ان کی تعداد کو کم کر کے بتاتی آ رہی ہے۔ ایسے واقعات، امثال ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ بلا شبہ مذکورہ تمام افعال جو مسلمانوں کے خلاف ہیں وہ حکومت اور انتظامیہ کی مشترکہ سازشوں کے نتیجے میں اس ملک

میں سچے مسلمانوں کو نظر انداز کر کے بنام مسلم مرتدین اور ملحدین کی سرپرستی کی جاتی ہے۔ اس سلسلے کی نئی کڑی محمد فضل صاحب ہیں جو اس وقت مہاراشٹر کے گورنر ہیں انہوں نے پچھلے مہینے ناگپور مہاراشٹر کے کمبھ میلے میں اسنان کیا، پوجا کی، قشقہ لگوایا، پرشاد کھایا، امرت پیا اور اس میلے کی فضیلت میں بیان دیا ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا کہ میں الہ آباد کے کمبھ میلے میں بھی پوری عقیدت کے ساتھ حصہ لیتا آرہا ہوں ان کی مذکورہ تمام مرتدانہ کارستانیوں کو ملک کے ٹی۔ وی۔ نیوز چینلوں نے دو دن تک بار بار دکھایا ہے۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اور اتنے کم وقفے میں اتنے زیادہ اور دور رس نتائج کے حامل مسلم دشمن افعال اور سازش کبھی نہیں ہوئی ہیں جن میں ملک کی سب سے بڑی اور سب سے کمزور اقلیت کے مذہب، ان کے اعتقادات، آثار و شعائر، معاشی و معاشرتی اور سیاسی مفادات کے ساتھ ننگا کھیل کھیلا گیا ہو۔ اس ناپاک کھیل میں حکومت اور انتظامیہ کے ساتھ ساتھ محمد فضل جیسے ہزاروں سرکاری انعام یافتہ نام نہاد مسلمان بھی شامل ہیں۔ عدلیہ کی مذکورہ روشوں اور انتظامیہ کی جانبداریوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس ملک میں سیکولرزم اور برابری کا نعرہ صرف نمائشی ہے حقیقت یہ ہے کہ بے ضابطہ طور پر Undeclaredly اس سونے کی چڑیا کو ہندو ملک بنا دیا گیا ہے۔ یہاں کی حکومت اور انتظامیہ جس قسم کے فیصلے اور سازشیں کر رہا ہے اور وہ جس طرح ملک دشمن جماعتوں اور ان کے لیڈروں کا دفاع کر رہے ہیں اس سے اب مسلمانوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آخر عدالتیں بار بار معمولی طریق کار کی خامیوں کے نام پر یعنی Charge Sheet اور Notification کی معمولی خامیوں کی بنیاد پر فسادی، ہندو لیڈروں کو قانونی شکنجوں سے آزاد کیوں کرتی آرہی ہیں؟ اور یہ بھی کہ آخر انتظامیہ کس کے اشارے پر مذکورہ چور دروازہ یعنی خامیوں کی گنجائش رکھ دیتا ہے؟

بھاجپا بہت وقت شناس اور عیار پارٹی ہے اس کے اندرونی اختلافات نمائشی ہوتے ہیں مگر افسوس کہ ہم اس کے فریب میں آجاتے ہیں۔ برخلاف اس کے کہ وہ ان سے گلے ملتے رہے اور ان سے گفتگو پر گفتگو کرتے رہے جب کہ ان کے نشانے پر متھرا اور کاشی کے علاوہ فتح پور سیکری، مولانا کمال الدین جامع مسجد دھار جسے ہندو بھوج شالہ کہتے ہیں کے علاوہ کئی ہزار دوسری تاریخی عمارتیں بھی ہیں۔ آخر ہمارے رہنما بار بار یہ اعلان کیوں کر رہے ہیں کہ بابری مسجد کے سلسلے میں وہ ہر حال میں عدالتی فیصلے کو مانیں گے؟ آخر انہیں اس پیشگی اعلان کی کیا ضرورت جبکہ ہم عدالتی

روشوں سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں؟ ہمارا Stand تو یہ ہونا چاہئے کہ اس وقت ہم محکوم و مجبور ہیں اس لئے ہمارے سامنے سوائے تماشہ دیکھنے کے اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے لیکن ہمارا مذہبی تقاضہ اور مرضی یہ ہے کہ بابری مسجد اس کے سابقہ مقام پر بحال کی جائے اس سے کم پر ہم کسی قیمت پر راضی نہیں ہو سکتے۔

قوم کی کم نصیبی یہ ہے کہ اس کے کچھ رہنما اس نظریہ کے قائل ہیں کہ تعصب و زیادتی مسلمانوں کے علاوہ عیسائیوں اور سکھوں کے ساتھ بھی ہوتی ہے اسلئے نام نہاد رہنما و مفکرین کو معلوم ہونا چاہئے کہ عیساؤں کے پیچھے امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس کے علاوہ تمام یورپی ممالک کے مضبوط ترین ہاتھ ہیں ان ممالک کی کھلی حمایت و سرپرستی عیسائیوں کی خوشحالی اور حفاظت کے لئے کافی ہیں۔ مثال کے طور پر اڑیسہ کے گراہم اسٹینس اور ان کے بیٹوں کے قتل کو ہی لیں اس معاملے میں مذکورہ ممالک کے علاوہ عیسائی اور یہودی میڈیا نے آسمان پر سر اٹھا لیا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک کہ قاتل کو سزا نہیں ملی۔ واضح رہے کہ اس کیس میں عدالت نے وشو ہندو پریشد کے دارا سنگھ کو پھانسی کی سزا سنائی ہے۔ مقتولین آسٹریلیا کے تھے اس لئے تمام عدالتی سماعتوں کے وقت آسٹریلیائی حکومت کے عہدیدار حاضر رہا کرتے تھے۔ جہاں تک سکھوں کا تعلق ہے تو وہ اس وقت صنعت و تجارت کے میدان میں بہت آگے ہیں اتنے آگے کہ مسلمان اس سلسلے میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس وقت سیکڑوں کی تعداد میں سکھ کھرب پتی اور ہزاروں کی تعداد میں ارب پتی اور لاکھوں کی تعداد میں کروڑ پتی ہیں اور لکھ پتی تو تقریباً سبھی سکھ ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کی کھلی حمایت کرنے والا پوری دنیا میں آج ایک بھی ملک نہیں ہے۔ گجرات جیسے فسادات کو پوری دنیا بھول گئی ہے، لہٰذا انہیں صرف اپنی خیر منانی چاہئے اور سب سے بڑھ کر ان کے اندر موجود یعنی داخلی دشمنوں کو شناخت کرنے اور انہیں کنارے Shunt کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ ہماری راہ کے روڑے ہیں۔ ☐ ☐

(ملت کا ترجمان، جام نور، سہسرام، نومبر 2003ء)



# اجودھیا معاملے میں پھر نیا موڑ

از: ڈاکٹر رمیش والیا (میڈیا اسٹار)

اجودھیا سے متعلق معاملے میں سپریم کورٹ کے نئے قدم کے بعد اس معاملے میں ایک بار پھر نیا موڑ آ گیا ہے۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلہ سے اجودھیا متنازعہ ایک بار پھر سیاسی طور پر اہم موضوع بن سکتا ہے۔ سپریم کورٹ نے اسلم بھورے کی پٹیشن پر اتر پردیش حکومت، سی. بی. آئی. اور تمام ملزمان کو نوٹس جاری کئے ہیں۔ اسلم بھورے نے سی. بی. آئی. کے ذریعہ 30 رُکنی کو پیش چارج شیٹ میں نائب وزیر اعظم لال کرشن اڈوانی، مرکزی وزیر مرلی منوہر جوشی، اوما بھارتی، اشوک سنگھل اور ونے کٹیار وغیرہ کے خلاف بابری مسجد کے انہدام کی سازش میں شامل ہونے کے الزامات واپس لئے جانے کو چیلنج کیا ہے ساتھ ہی ساتھ اجودھیا سے متعلق تمام مقدمات کی ساعت ایک ہی جگہ لکھنؤ کی عدالت میں کرانے کا مطالبہ کیا ہے۔

سپریم کورٹ نے اسلم بھورے کی پٹیشن کی زبان پر اعتراض کرتے ہوئے اسے درست کر کے دوبارہ داخل کرنے کی ہدایت دی ہے ساتھ ہی ساتھ کچھ معاملات پر وضاحت بھی طلب کی ہے۔ حالانکہ سپریم کورٹ نے اتر پردیش حکومت، سی. بی. آئی. اور ملزمان کو نوٹس جاری کرائے ہیں لیکن رائے بریلی کی خصوصی عدالت میں اجودھیا سے متعلق مقدمہ کی کارروائی کو روکنے سے انکار کر دیا ہے۔ سپریم کورٹ کے نوٹس جاری کرنے کے بعد اب سی. بی. آئی. کو یہ واضح کرنا ہوگا کہ اس نے ملزمان پر سازش میں شامل ہونے کے الزامات کن حالات اور شواہد کی بنیاد پر واپس لئے ہیں۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلہ سے اجودھیا معاملے میں تفتیش کی سمت بھی متاثر ہو سکتی ہے۔

اتر پردیش کی موجودہ سیاسی صورتحال میں اس فیصلہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ گذشتہ 11 برسوں میں اجودھیا موضوع پر اتر پردیش کی سیاست نے کئی رنگ بدلے ہیں۔ اس فیصلہ کی اہمیت اس لئے بھی زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ حال ہی میں اتر پردیش کی سابق وزیر اعلیٰ مایاوتی نے کھلا الزام لگایا ہے کہ بی. جے. پی. کے مرکزی لیڈروں نے ان پر بابری مسجد انہدام سے متعلق مقدمہ واپس لینے کے لئے دباؤ ڈالا تھا۔ ممکن ہے کہ مایاوتی کا یہ الزام سیاست پر مبنی ہو لیکن اس بات کا خدشہ اس وقت ظاہر کیا گیا تھا جب مایاوتی بی. جے. پی. کی حمایت سے وزیر اعلیٰ بنی تھیں۔ اس وقت عام رائے تھی کہ بی. جے. پی. اور مایاوتی کے درمیان اجودھیا معاملے پر کوئی خفیہ سمجھوتہ ہوا ہے۔

جہاں تک بات مایاوتی کے اِس الزام کی ہے اس کو پوری طرح نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سی. بی. آئی. نے چارج شیٹ کو تبدیل کر کے اس میں بی. جے. پی. اور وشو ہندو پریشد کے لیڈروں کے نام سازش میں شامل ہونے والوں کی فہرست میں سے غائب کرائے۔ اجودھیا معاملے میں اصل الزام تو انہدام کی سازش سے متعلق ہی ہے۔ بابری مسجد کے انہدام کی سازش میں کون لوگ ذمہ دار تھے؟ سی. بی. آئی. نے اچانک ہی اہم ملزمان کے نام چارج شیٹ سے کیسے اور کن ثبوتوں کی بنیاد پر ہٹائے یہ ایک پیچیدہ سوال ہے؟ سی. بی. آئی. نے یہ کام کس بنیاد پر کیا اور کیا اس پر کوئی دباؤ تھا یا پھر اسے کچھ نئے ثبوت ملے؟ ان تمام باتوں کی وضاحت اب بے حد ضروری ہو گئی ہے؟

اڈوانی، جوشی، اوما بھارتی، ونے کٹیار اور اشوک سنگھل وغیرہ کو پہلے دن سے ہی بابری مسجد کے انہدام کی سازش میں شامل مانا جاتا رہا ہے۔ یہ بات انتہائی تفتیش میں بھی سامنے آئی اور بعد میں گواہوں کے بیانات میں بھی۔ پچھلے دنوں اجودھیا معاملے میں ملزمان کارسیوکوں نے کہا تھا کہ انہیں مسجد کو منہدم کرنے کے لئے لال کرشن اڈوانی نے اکسایا تھا۔

اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ بھی کھل کر الزام لگا چکے ہیں کہ یہ لوگ ہی انہدام کے لئے ذمہ دار تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ ان سب کے نام چارج شیٹ سے ہٹائے گئے؟ کیا یہ ان الزامات کی تائید نہیں ہوتی کہ مرکزی حکومت سی. بی. آئی. کا غلط استعمال کر رہی ہے۔

اس سلسلے میں مایاوتی کے بیان کا بھی نوٹس لیا جانا چاہئے کہ بی. جے. پی. کے مرکزی لیڈران پر بابری مسجد کے انہدام سے متعلق مقدمے واپس لینے پر دباوء ڈال رہے تھے۔ اب اس سلسلے میں اتر پردیش حکومت، سی. بی. آئی. اور ملزمان سپریم کورٹ میں کیا وضاحت کرتے ہیں یہ دیکھنا ہے۔ اتر پردیش میں اب مایاوتی کی حکومت نہیں ہے۔ ملائم سنگھ یادو اقتدار میں آ چکے ہیں ایسے میں اجودھیا معاملے میں نیا موڑ آ سکتا ہے اگر سی. بی. آئی. نے دباؤ میں کام کیا ہے تو بے حد افسوس ناک ہے اور اس سے مرکزی حکومت کٹھ گھرے میں کھڑی ہو جائے گی۔

سپریم کورٹ کے نئے فیصلے پر بی. جے. پی. کی قیادت فکرمند ہو گی کیونکہ آنے والا سال لوک سبھا الیکشن کا سال ہے حالانکہ بی. جے. پی. کے لئے اجودھیا موضوع گرم ہونا فائدے کا ہی سودا ہے لیکن اتر پردیش میں اب اقتدار ملائم سنگھ کے ہاتھ میں ہونے کے سبب اس کے وہ پروگرام پورے نہیں ہو سکیں گے جو وہ چاہتی تھی۔ بی. جے. پی. کا مایاوتی کے ساتھ جو خفیہ سمجھوتہ تھا وہ بھی اب

مکمل نہیں ہو سکتا اور ملائم سنگھ اس معاملے کو اپنی مرضی کے مطابق نیا موڑ دینے کی کوشش کریں گے حالانکہ اس کا فائدہ بی. جے. پی. ہی حاصل کرے گی ویسے عدالت کے فیصلہ سے اپوزیشن کو بی. جے. پی. کے خلاف ایک اور ہتھیار مل گیا ہے جو الیکشن میں کام آئے گا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے آئندہ اسمبلی اور لوک سبھا الیکشن ایک بار پھر اجودھیا تنازعہ کو ہوا دے کر ہی لڑا جائے گا۔ □ □ □

(قومی آواز، نئی دہلی۔ 16/دسمبر 2003ء)

# چار مقدمے: جو ملک کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے

از: ریاض قدوائی (صحافی)

چار مقدمے جن پر ہر ایک کی نظر ہے ملک کے مستقبل کے لئے بے حد اہم ہو گئے ہیں بلکہ ان کی روش فیصلہ کرنے والی ہے کہ اس ملک کا کیا ہوگا۔ بلاشبہ یہ مقدمے بی. جے. پی. اور مرکز میں اس پارٹی کی حکومت کے لیے عذاب بن کر رہ گئے اور ان سے بڑی حد تک اس کے بھی برے بھلے کا فیصلہ ہوگا۔

## بابری مسجد کے انہدام کا جرم

ان میں پہلا مقدمہ ہے بابری مسجد کے انہدام کے جرم کا جس میں رائے بریلی کی خصوصی عدالت نے حال ہی میں فردِ جرم طے کی ہے اور جس میں وزیر داخلہ لال کرشن اڈوانی کو الزامات سے پیشگی بری کر دیے جانے کا اس وقت پورے ملک میں چرچا ہے۔ اس سے منسلک درخواستیں سپریم کورٹ میں بھی زیر سماعت ہیں جن پر اڈوانی اور دوسروں کو نوٹس بھیجا جا چکا ہے۔ دوسرا گجرات کے قتل عام کے مظلومین کے لیے اور وہاں کے مقتولین کے ورثا کے لیے انصاف کا مقدمہ جو انسانی حقوق کمیشن نے دائر کیا ہے۔ جو سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ قومی انسانی حقوق کمیشن کے وجود کے برسوں میں یہ پہلا موقع ہے جب اس نے کسی معاملہ میں قانونی دادرسی کے لیے سپریم کورٹ میں عرض داشت دائر کی ہو۔ تیسرا وشو ہندو پریشد کے سابق کارکن پر عیسائی پادری گراہم اسٹینس اور ان کے دو بچوں کے بہیمانہ اور سازشی قتل کا مقدمہ۔ اگرچہ ضلعی سطح پر مکمل ہو گیا ہے اور اس قتل کے اول ملزم دارا سنگھ کو 22 ستمبر کو موت کی سزا سنائی جا چکی ہے۔ لیکن اس سزا کی ہائی کورٹ سے توثیق جو قانوناً لازمی ہے ابھی باقی ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے عمر قید کی سزا پانے والے ملزم بھی ہائی کورٹ جائیں گے لہٰذا یہ مقدمہ بھی جاری ہے۔ چوتھا خود اجودھیا کی بابری مسجد کے قطعہ اراضی کے حقوق کا پرانا کیس ہے جو ابھی کے انہدام کے بہت پہلے سے الہ آباد ہائی کورٹ میں چل رہا ہے۔ اس مقدمہ میں محکمہ آثار قدیمہ (مرکزی حکومت) نے اپنی رپورٹ حال میں داخل کی ہے جو خود اپنی جگہ عدالت میں ایک تنازعہ بنتے جا رہی ہے۔ عدالت کے باہر اس رپورٹ پر ماہرین حیران ہیں اور خود مندر کے

حامیوں کے ایک طبقہ میں بے چینی ہے لہٰذا آر. ایس. ایس. خاندان کا اپنے منصوبوں کے مطابق اس کو بطور سیاسی حربہ استعمال کرنا مشکل ہو جائے گا۔

ان مقدموں پر ملک میں جمہوریت، قانون کی عمل داری اور اجتماعی وجود کے نظام کا دارو مدار ہے۔ جس کا محض ایک پہلو سیکولرزم ہے۔ اسی وجہ سے اور جمہوریت کو درپیش خطرے کی بنا پر ملک کے بیشتر پڑھے لکھے لوگ خصوصاً دانشور اور صحافی ان عدالتی معرکوں میں عموماً حق و انصاف کے طرفدار ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ملک کے صف اول کے قانون دانوں کی ایک تعداد بذات خود ان میں حصہ لیتے ہوئے انصاف کی لڑائی لڑ رہی ہے اور بی. جے. پی. و آر. ایس. ایس. کے تحت کام کرنے والی تنظیموں یا ان کے افراد کو چیلنج کر رہی ہے۔ ان عدالتی جنگوں میں پورا کیسریا خاندان الجھ کر رہ گیا ہے، اس کی حکمت عملی توقعات کے برخلاف چوپٹ ہوتی جا رہی ہے اور اس قیادت کو ایسے وقت جب کئی ریاستی اسمبلیوں اور خود لوک سبھا کے بھی انتخابات نزدیک آ رہے ہیں، یکسوئی کے ساتھ سیاسی داؤ پیچ کی کارگر بساط بچھانے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔

ان چار، خصوصاً اول الذکر تین مقدموں کے علاوہ بھی حالیہ عدالتی الجھنوں نے بی. جے. پی. کو پریشان کر رکھا ہے۔ خصوصاً سپریم کورٹ کے کسی نہ کسی فیصلے یا ملامتی کلمات اور احکامات نے۔ مثال کے طور پر ستمبر کے مہینے میں عدالت عظمیٰ کے فیصلوں اور احکامات کے ہجوم میں عوامی زمرے کی تیل کمپنیوں کی فروخت کو یکسر روک دیا جانا بھی شامل ہے۔ گجرات کے مظالم کے بعد ہونے والی قانونی دھاندلی پر سپریم کورٹ کی سرزنش سے ابھی کیسریا پریوار سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے حکمرانوں کو دو اور صدمے جھیلنے پڑے۔ اس عدالت نے بھارت پیٹرولیم اور ہندوستان پٹرولیم کمپنیوں کے شیئر پرائیوٹ سرمایہ داروں کے حوالے کرنے کی آئینی بنیاد پر ممانعت کر دی تاوقتیکہ پارلیمنٹ اس فروخت کو منظوری نہ دے دے اور پھر رائے بریلی کی عدالت کے کھچڑی فیصلے (اڈوانی کی برأت اور جوشی کی گرفت) نے خود بی. جے. پی. قیادت کی اعلیٰ ترین صفوں میں ایک نیا بحران پیدا کر دیا ہے۔

اس سے قبل اسی عدالت کے احکامات کے نتیجے میں ملک کی سب سے بڑی اور ایک کلیدی ریاست یو. پی. میں اس پارٹی کو حکومت میں اپنی حصہ داری سے محروم ہونا پڑا اور اس طرح لوک سبھا کے انتخابات کے سلسلہ میں اس کے منصوبوں اور حکمت عملی کا ایک اور ستون ڈھے گیا۔ یہ تاج محل کوریڈور پروجیکٹ اور مجوزہ شاہراہ کا معاملہ تھا جو بی. جے. پی. کی شرکت والی ریاستی حکومت نے

کھیلہ بازی کی غرض سے شروع کیا تھا اور جس سے مہینوں تک مرکزی حکومت نے چشم پوشی اختیار کی تاوقتیکہ سپریم کورٹ میں ایک عرضی کے بعد عدالت نے اس کو روک دیا اور ریاستی ذمہ داروں کے علاوہ مرکزی حکومت کے بھی ایک اعلیٰ افسر کی گرفت کی گئی۔ بہرحال سی. بی. آئی. کے زیر تفتیش اس معاملہ میں مرکزی وزیر سیاحت و ثقافت جگ موہن ابھی تک بچے ہوئے ہیں جن کو سابق وزیر اعلیٰ مایاوتی نے مورد الزام ٹھہرایا تھا۔ اگلی سطور میں ہم اجودھیا اور قاتل دارا سنگھ سے متعلق مقدموں اور ان کے اثرات کا جائزہ لیں گے۔

## اجودھیا انہدام کیس

6/دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کو سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے واضح احکامات کی دن دہاڑے خلاف ورزی کرتے ہوئے گرائے جانے کے جرم، فتنہ وفساد پیدا کرنے اور اس طرح دو فرقوں کے درمیان نفرت پھیلانے والے دانستہ اقدام پر 1993ء میں کیس درج کیا گیا تھا مگر ملزموں کو کٹہرے میں کھڑے کرنے کی نوبت اب آرہی ہے۔ تقریباً 12 سال تک یہ مقدمہ تکنیکی پیچیدگیوں اور عدالتی کاروائیوں اور سب سے بڑھ کر ملزموں کی جانب سے عدالت کے سمن سے گریز کی وجہ سے کھنچتا چلا گیا اور حکومت و استغاثہ کی جانب سے ملزموں پر شکنجہ ڈھیلا ہوتا چلا گیا خصوصاً یہ کہا جارہا ہے کہ 1998ء میں باجپئی حکومت کے اقتدار سنبھالنے کے بعد سے سی. بی. آئی. نے وزیر داخلہ اڈوانی کے خلاف کیس نرم کر دیا۔ بہرحال ہم یہاں بتا دیں کہ سی. بی. آئی. نے ابتدا ہی سے بی. جے. پی. اور وشو ہندو پریشد کے لیڈروں کے جرائم کی پوری طرح گرفت نہیں کی۔ دسمبر 1992ء کے ان چھ دنوں میں جن کو آج تک پوری دنیا ہندوستان کے لیے باعث رسوائی خیال کرتی ہے صرف بابری مسجد ہی کو نہیں گرایا گیا بلکہ کئی درجن دوسری مسجدیں، مزارات وغیرہ تباہ و برباد کیے گئے اور کئی مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ بابری مسجد منہدم کر کے فساد پھیلانے کے جرم کی طرح بی. جے. پی. اور پریشد نیز آر. ایس. ایس. کے لیڈر اس کشت وخون اور تباہی کے بھی ذمہ دار تھے مگر سی. بی. آئی. اس بارے میں خاموش ہے۔

اڈوانی کے خلاف ایک سنگین الزام ان کے نائب وزیر اعظم بننے کے بعد یکسر واپس لے لیا گیا۔ تعزیرات ہند کی دفعہ 120B کے تحت یہ الزام تھا خلفشار اور فتنہ وفساد پھیلانے کے لیے مجرمانہ

سازش تیار کرنے کا۔ مزید براں خاص طور سے اڈوانی کے بارے میں سی. بی. آئی. نے دو طرح کے شواہد مقدمہ کی فائل میں شامل کر دیے جن میں کچھ ان کے خلاف جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کو تسلیم کرنے پر وہ بےقصور پائے جاتے ہیں۔ یہ بات رائے بریلی کی خصوصی عدالت نے اپنے فیصلہ میں تحریر کی ہے جس کو سی. بی. آئی. عدالت بھی کہا جاتا ہے۔ سنگین جرائم کے مقدمات کو ''تیز رفتاری'' سے نبٹانے کے لیے خصوصی حکم نامہ کے ذریعہ ایسی عدالتیں قائم کی جاتی ہیں۔ اس کے چیف جوڈیشنل مجسٹریٹ وی. کے. سنگھ نے فیصلہ میں کہا کہ بعض شواہد ایسے ہیں جن کے مطابق اڈوانی نے مجمع کو مسجد گرانے سے روکنے کی کوشش کی، وہ کارسیوکوں سے اتر کر نیچے آ جانے کے لئے کہہ رہے تھے۔ یہاں ہم یاد دلانا چاہیں گے کہ مجمع کو اکسانے والے بیشتر لیڈر گنبدوں وغیرہ سے نیچے آ جانے کے لیے لوگوں سے کہہ رہے تھے کیونکہ گنبدوں کو رسوں وغیرہ کی مدد سے تربیت یافتہ لوگ گرا رہے تھے اور اس طرح اوپر چڑھے ہوئے لوگوں کی جان کو خطرہ تھا۔ درحقیقت اس منظم اور منصوبہ بند کارروائی میں کئی کارسیوک ہلاک بھی ہوئے تھے جو سرکاری ریکارڈ میں ہے۔ نیچے آنے کی اپیل کے ساتھ ان سے یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ ان کے لیے خطرہ ہے۔ اس طرح اڈوانی یا کسی اور کا نیچے آنے کی اپیل کرنا پیشگی سازش میں شامل ہونے کا ثبوت ہے نہ کہ ان کی برأت کا۔ لوگوں کا اوپر چڑھ کر اپنے انداز میں توڑ پھوڑ کرنا ایک ہجوم کی عام جنونی ذہنیت کا غماز تھا جو اشتعال انگیزی سے پیدا ہوئی تھی بلکہ یہ اصل کارروائی اور اس کے منصوبے سے عام ہجوم کی بےخبری کا بھی مظہر تھا۔

چارج شیٹ میں یا استغاثہ کے دلائل میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مرلی منوہر جوشی اور وی. ایچ. پی. لیڈروں کے اشتعال انگیز تقریں کرنے پر ہجوم نے مسجد گرا دی۔ دو لاکھ سے زیادہ افراد کو صرف اس لیے اکٹھا کیا گیا تھا کہ اس تعداد سے سب کو رعب میں لے کر یعنی جو بھی اس کارروائی کو روکنا چاہیں (ایڈمنسٹریشن) اور جو اس کو عریاں کرنا چاہیں (میڈیا) ان کو ایسا نہ کرنے دیا جائے اور ہجوم کی افراتفری کی آڑ میں رسوں، اوزاروں، مشینوں (چین پکی) وغیرہ کے ذریعہ انہدام کا اصل منصوبہ انجام دیا جائے۔ اشتعال انگیزی کے پہلو پر زور دے کر اس تمام قیادت کے منصوبہ بند جرم کو ہلکا کیا جا رہا ہے۔

اب ہم اڈوانی کی برأت کے تعلق سے عدالتی فیصلہ کے اس نکتہ کو لیتے ہیں جو ملک کی سیاست پر بالکل سیدھے سیدھے اور اس کے مستقبل پر بھی اثر انداز ہونے جا رہا ہے اوپر مجسٹریٹ کے فیصلے

کا حوالہ دیا گیا ہے کہ زیر تفتیش گواہوں کے متضاد (مخالف اور موافق) بیانات کی صورت میں ملزم کو بری کر دیا جانا چاہئے مگر اڈوانی کی اور شاید سی. بی.آئی. کی بھی بدقسمتی سے متعدد قانونی ماہرین نے اس تاویل کی تردید کرتے ہوئے بتایا کہ فاضل مجسٹریٹ نے اڈوانی کو یکسر بری کرنے، ان کی ضمانت اور ضمانت داروں کی پابندی ختم کرتے ہوئے اپنی توجیہ میں سپریم کورٹ کے فیصلے اور ہدایات کا جو حوالہ دیا ہے وہ غلط ہے کیونکہ مذکورہ فیصلہ میں متضاد شہادت کی بنیاد ہے (منجملہ دوسری بنیادوں کے) بری کرنے کی بات اصل مقدمہ یعنی ملزم کی سزایابی کے مرحلہ کی بابت کہی گئی ہے۔ فردِ جرم یا الزامات طے کرنے کے مرحلہ (Framing of Charges) سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا اڈوانی کو محض مجسٹریٹ کے فیصلہ پر، سی. بی.آئی. کی موجودہ ڈھیلی ڈھالی چارج شیٹ کی روشنی میں بھی ابھی پوری طرح بری نہیں خیال کرنا چاہئے۔ خصوصاً اس لیے کہ اگر سی. بی.آئی. نے اڈوانی کی برأت کے خلاف آگے اپیل نہ کی تب بھی کئی دوسرے فریقوں نے اعلیٰ عدالتوں میں اپیل کرنے یا مداخلت کرنے (Iintervention) کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

سی. بی.آئی. پر الزام لگایا جا رہا ہے کہ جب مقدمہ لکھنؤ کی خصوصی عدالت سے رائے بریلی منتقل ہوا تو اس کا موقف بدل گیا۔ واضح رہے کہ یہ اڈوانی کے اقتدار میں شامل ہونے اور ان کے اثر و اختیار میں رفتہ رفتہ اضافہ کا زمانہ تھا۔ یہ بات کہنی ہوگی کہ سی. بی.آئی. بلاوجہ اپنی ساکھ پر آنچ نہیں آنے دیتی۔ قابل ذکر حقیقت یہ ہے کہ آسٹریلوی پادری اسٹینس اور ان کے دو بچوں کے اڑیسہ میں فرقہ وارانہ قتل میں سی. بی.آئی. نے خاص مجرم دارا سنگھ اور دوسرے بیشتر قاتلوں کو بالآخر جالیا اور اس تفتیشی ادارے کے وکیل نے ان کو سخت ترین سزا دلوانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا یہاں تک کہ ملزموں کو قصوروار ٹھہرا دیے جانے کے بعد جب عدالت نے صرف یہ فیصلہ باقی رکھا کہ ان کی سزا کتنی ہوگی اس وقت بھی سی. بی.آئی. کے وکیل نے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹوں کے کئی حوالوں کے ذریعہ زور دیا کہ صرف سزائے موت دینا ہی مناسب ہوگا۔ اجودھیا کے انہدام کیس میں سی. بی.آئی. کی اس قسم کی مستعدی یا دلجمعی کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے حالانکہ یہ دو تین افراد کے بجائے خود اجودھیا ہی میں درجنوں اور اس کے باہر ہزاروں افراد کی ہلاکت کا معاملہ تھا۔

سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ظاہر کی جا رہی ہے کہ ایک ہی پارٹی کے دو لیڈر اور موجودہ حکومت کے دو وزیر جو کہ اجودھیا میں ایک ہی جگہ یعنی بابری مسجد کے دروازے کے پاس صدر نشین

تھے ان میں سے ڈاکٹر جوشی اور ان کے ساتھ چھ دوسرے لیڈروں کے خلاف فردِ جرم طے کی گئی اور دوسرے یعنی اڈوانی جو کہ نویں دہائی سے رام جنم بھومی تحریک کا جھنڈا اُٹھائے ہوئے تھے، بری کر دیئے گئے۔ صرف اڈوانی کی فردِ جرم کی ایسی شہادتوں کا بھی تذکرہ کر کے ان کو عدالت میں پیش کیا گیا جو ان کو بے قصور ظاہر کرتی تھیں اور جوشی کے لیے ایسی کوئی شہادت نہیں تھی۔

اس بات کو اگر جوشی محسوس نہ کرتے تو وہ مٹی کے بے جان پتلے یا روبوٹ ہوتے۔ فردِ جرم طے ہونے اور با قاعدہ ملزموں کی صف میں کھڑے کیے جانے کے بعد جب وہ وزیرِ تعلیم کے عہدے سے استعفیٰ دے چکے تھے تو اڈوانی اور ان کے مقرب خاص پارٹی صدر وینکیا نائیڈو کے بارے میں میڈیا کے ہر سوال کا جواب بہت ہی روکھے اور جلے ہوئے لہجہ میں دے رہے تھے۔ دراصل موصوف کو عرصہ دراز سے پارٹی قیادت میں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اجودھیا میں بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنانے کی تحریک کے سرغنہ بلا شبہ اڈوانی تھے مگر جوشی ان کی یاترا اور انہدام کے وقت پارٹی کے صدر تھے۔ وہ اب بھی اپنے آپ کو پارٹی کی قیادت کے تکڑم کا (باجپی اور اڈوانی کے ساتھ) حصہ سمجھتے تھے۔ لیکن تمام اہم صلاح، مشوروں اور محدود میٹنگوں میں ان کو بعض اوقات بلایا تک نہیں جاتا تھا۔ رائے بریلی کے فیصلے سے عین پہلے بھی یہی ہوا تھا جب اڈوانی، وینکیا نائیڈو اور آر.ایس.ایس. کے لیڈر سر جوڑ کر بیٹھے تھے اور اسی میں متوقع فیصلہ کے بارے میں پارٹی کی حکمت عملی طے کی گئی تھی جس کی جوشی بھنک بھی نہیں پا سکے۔ اس سے بے خبر جوشی نے جو اڈوانی سے خار کھائے ہوئے تھے نائب وزیرِ اعظم کو زچ کرنے اور ان کو ناموافق فیصلہ کی صورت میں حکومت سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کرنے کے لیے ایک چال چلی اور میڈیا میں واضح اعلان کر دیا کہ اگر میرے خلاف فرد جرم طے ہوتی ہے تو میں حکومت سے استعفیٰ دے دوں گا۔ ان کا خیال تھا کہ اس پہل کے بعد اڈوانی کو بھی مجبوراً استعفیٰ دینا پڑے گا۔ جیسا کہ کہا جا رہا ہے کہ اس کا مقصد کچھ ہی عرصہ بعد اڈوانی کے وزارت عظمیٰ کا امیدوار بننے کا بھی راستہ روکنا تھا۔

ڈاکٹر جوشی کو معلوم نہیں کہ خود ان کا سیاسی کیریئر تقریباً ختم کرنے کا انتظام کیا جا چکا ہے۔ وہ پلان کر چکے تھے لہٰذا فوراً مستعفیٰ ہو گئے۔ ان کی توقع کے برخلاف اس اقدام سے پارٹی میں کوئی اُبال نہیں آیا۔ البتہ آر.ایس.ایس. اور وی.ایچ.پی. لیڈروں نے ان کے اقدام کو سراہا ضرور۔ آر.ایس.ایس. نے حسب ذیل ایک ہی وقت میں دوہری زبان بولتے ہوئے کہا کہ اس کی ضرورت

نہیں تھی۔ اس طرح موصوف ادھیڑ بن میں رہے اور معاملہ بیرونی دورے سے وزیر اعظم واجپئی کی واپسی پر چھوڑ دیا گیا۔ غالباً واجپئی جی سے ٹیلی فون پر رابطہ تھا اور آر. ایس. ایس. کے زور دینے پر بی. جے. پی. نے اتنا ضرور کیا کہ اس فیصلہ کے خلاف اپیل کرنے کا اعلان کر دیا۔ بی. جے. پی. کا کوئی لیڈر جوشی سے ملنے نہیں گیا۔ وہ اپنے استعفیٰ پر قائم رہیں یا واپس لے لیں دونوں حالتوں میں ان کی سیاسی زندگی برباد ہوگی۔ جن لیڈروں پر مقدمہ چلانے کا عدالت نے فیصلہ کیا ہے ان میں جوشی کے علاوہ ادما بھارتی، اشوک سنگھل، گری راج کشور، پریشد کے صدر وشنو ہری ڈالمیا، ونے کٹیار اور سادھوی رتمبھرا شامل ہیں۔ اڈوانی نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ ''میرے ساتھیوں'' کو بری نہیں کیا گیا اور اس کے ساتھ یہ انوکھی بات کہی کہ 6 دسمبر کو واردات سے پہلے ''کوئی تقریر نہیں کی گئی تھی''۔ لہٰذا تقریروں میں اشتعال انگیزی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔ مرلی منوہر جوشی نے کہا کہ ''جب ہم سیاست میں ہوتے ہیں تو اخلاق و کردار سے جڑے ہوتے ہیں۔ اقتدار کے ساتھ ساتھ کردار کو برابر کا وزن دینا چاہئے۔''

## گجرات اور سپریم کورٹ

گجرات کی دو خواتین ظہیرہ شیخ اور بلقیس اور ریاست کے سابق سالیسٹر جنرل ہریش سالوے، ان تین ناموں کو آج کل خبروں میں جتنا دوہرایا جا رہا ہے اسی حد تک گجرات کے وزیر اعلیٰ نریند مودی کی زبان رکتی جا رہی ہے۔ ظہیرہ اور بلقیس کو قتل عام کے دو الگ الگ واقعات کا مشاہدہ کرنا پڑا ہے۔ ظہیرہ کے باپ اور بلقیس کی تین سال کی بیٹی، ماں اور دو بھائیوں سمیت 14-14 افراد کو دونوں جگہ قتل کیا گیا اور بلقیس پر قاتلوں نے مجرمانہ حملہ بھی کیا۔

قومی انسانی حقوق کمیشن ان دونوں عورتوں کی شکایت سپریم کورٹ لے گیا، جس نے گجرات کی حکومت سے کہا کہ وہ یا تو مظلوموں کو انصاف دلائے یا پھر کرسی چھوڑ دے۔ ظہیرہ شیخ کو بیسٹ بیکری مقدمہ قتل میں اپنا بیان بدلنے کے لیے جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دی گئی تھی اور بڑودہ کی مقامی عدالت نے سرسری سماعت کے بعد مقدمہ خارج کر دیا۔

سپریم کورٹ کو گجرات حکومت کی جانب سے قتل کے ملزموں کے خلاف ہائی کورٹ میں پیش کرنے کے لیے ایک عجلت میں تیار کی ہوئی اپیل دکھائی گئی، جو دراصل ردی میں ڈال دینے کے قابل

تھی کیونکہ پہلے حکومت یا پولیس اپیل کا ارادہ ہی نہیں رکھتی تھی۔ اب مودی حکومت نے نئی اپیل تیار کر کے سپریم کورٹ میں پیش کرنے کا وعدہ کیا ہے جس کو دیکھنے کے بعد یہ عدالت اسے ہائی کورٹ میں داخل کرنے کی منظوری دے گی۔ اس سلسلہ میں ریاست کے چیف سکریٹری اور ڈائریکٹر جنرل پولس کو بلا کر سخت سرزنش کی گئی۔

حالانکہ عدالت نے دیگر مظلومین اور ورثا کو بھی انصاف دلانے کی ریاستی حکومت کو سخت ہدایت دی تھی پھر بھی اس ہدایت کے بعد بلقیس کی جانب سے وکیلوں اور کارکنوں نے شکایت کی کہ پولس اس خاتون کو ہراساں کر رہی ہے۔ رات کے دس بجے اس سے گودھرا چل کر قبروں میں لاشیں تلاش اور شناخت کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ اس پر سپریم کورٹ نے ہدایت دی کہ پولس بلقیس سے دور رہے۔ انسانی حقوق کمیشن اور مذکورہ عورتوں نے مقدمات سی. بی. آئی. کے سپرد کرنے اور ان کو گجرات کے باہر سماعت کرانے کی درخواست دی تھی۔

بلقیس کے معاملہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ گجرات کے سالیسیٹر جنرل ہریش سالوے نے اپنی ذمہ داری چھوڑ کر بلقیس کی پیروی شروع کر دی ہے کیونکہ ایک تو انسانی حقوق کمیشن نے اس کے لیے ان سے کہا تھا، دوسرے اس کیس کا سرکاری ریکارڈ دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے جس میں خود پولس کے ایک افسر نے تفتیش میں سنگین بے ضابطگیوں کے بارے میں لکھا تھا۔ مزید یہ کہ مقامی عدالت نے بلقیس کی بات سنے بغیر مقدمہ خارج کر دیا۔ اگر واقعی مقدمات سنجیدگی سے اور سپریم کورٹ کی نگرانی میں دوبارہ چلائے گئے جیسا کہ عدالت عظمیٰ نے کہا ہے تو کیا مجرموں اور پولس والوں اور ان کے ساتھ انتظامیہ پر بھی شکنجہ کسا جائے گا؟ یہ ابھی دیکھنا ہے، مگر ابھی سے اخلاقی اور سیاسی طور پر احمد آباد و نئی دہلی میں بی. جے. پی. کی بدنامی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

## دارا سنگھ کو سزائے موت

قتل کے ایک اور معاملہ میں اڑیسہ کے مجرم رویندر پال سنگھ عرف دارا سنگھ کو آسٹریلیا سے آئے ہوئے پادری گراہم اسٹینس اور ان کے دو بچوں کو انتہائی سفاکانہ قتل پر سزائے موت سنائی گئی۔ کھردہ کے ضلع وسیشن جج مہیندر ناتھ پٹنائک نے اس کے علاوہ بارہ ملزموں کو عمر قید کی سزا دی۔ گراہم اسٹینس اس علاقے میں عیسائی مشن چلاتے تھے اور انہوں نے خاص طور سے کوڑھیوں کی دیکھ بھال اور علاج کا کام سنبھال رکھا تھا۔ وہ مسیحیت کے مبلغ تھے۔ اس تبلیغ کے خلاف لوگوں کو بھڑکا

کر جس میں قبائلی لوگوں کو گائے کا گوشت کھانے اور ان کے کلچر کو بھی بہانہ بنایا گیا۔ دارا سنگھ نے 22/جنوری 1999ء کو ایک دین میں چھپے ہوئے اسٹینس اور ان کے دونوں نونہالوں کو زندہ جلا دیا تھا۔ دارا سنگھ پر ایک اور عیسائی پادری راہل داس اور ایک مسلم تاجر شیخ رحمٰن کے بھی قتل کے الزام ہیں۔ اس موقع پر پھانسی کی سزا روا رکھنے کے خلاف اور اس کے حق میں ایک بار پھر بحث چھڑ گئی ہے۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ پھانسی پانے کے بعد مفاد پرست عناصر اس کو شہید کا نام دے کر نفرت پھیلائیں گے۔ دوسرا یہ ہے کہ پھانسی نہ دئے جانے پر اس قسم کی حرکتیں کرنے والوں کو عبرت نہیں ہوگی۔ بہر حال یہ قتل فرقہ وارانہ ہونے کے علاوہ قبائلیوں سے نفرت کا بھی معاملہ تھا آر.ایس. ایس. اور وشو ہندو پریشد نے خصوصاً مذکورہ دور میں عیسائیوں کے خلاف مہم چلائی تھی جو گجرات میں بھی چلائی گئی تھی مگر براہِ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر وہ بھی کٹہرے میں ہیں۔ سزا ہونے کے بعد بھی دارا سنگھ اپنی مکاری سے باز نہیں آیا اور وکیل کی معرفت اعلان کیا کہ وہ اس سزا کے خلاف اپیل نہیں کرے گا حالانکہ اسے معلوم ہے کہ سزائے موت کی توثیق ہائی کورٹ سے لازمی ہوتی ہے۔

(ماہنامہ افکار ملی، نئی دہلی، اکتوبر، 2003)



# اجودھیا جامع مسجد ٹرسٹ: پی.ایم.او.کی ایک اور شعبدہ بازی

از: یوگیش باجپئی

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ساتھ مفاہمت کی کانچی کے شنکر آچاریہ کی کوششوں کے ناکام ہونے کے بعد اجودھیا جامع مسجد ٹرسٹ کے سید اصغر عباس رضوی کا اچانک نمودار ہونا بہت معنی خیز ہے۔ یہ دراصل اجودھیا کے مسجد/ مندر تنازعہ کو ''مذاکرات'' کے ذریعہ حل کرنے کی واجپئی حکومت کی تازہ ترین ''اپیل'' ہے۔ مسٹر رضوی ویسے تو دہلی میں رہتے ہیں اور یہیں ان کا کاروبار ہے لیکن اصل میں ان کا تعلق اتر پردیش کے گونڈہ ضلع سے ہے، جو فیض آباد سے ملحق ہے۔ رضوی کے الفاظ میں انہوں نے اس تنازع کے حل کے لیے ایک ''سیدھی سادی'' تجویز پیش کی ہے۔ اس تجویز کے مطابق مسلمانوں کو بابری مسجد کی اس کی اصل جگہ پر تعمیر نو سے متعلق اپنے دعوے کو واپس لے لینا اور متنازعہ کمپلکس کے باہر ایک نئی مسجد کی تعمیر سے مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اس کے عوض ہندوؤں کو کاشی اور متھرا کی مساجد کو ''آزاد'' کرانے کے اپنے مطالبے سے دستبردار ہو جانا چاہئے۔

ایسا لگتا ہے کہ مسٹر رضوی بہت عجلت میں ہیں اور شاید اسی وجہ سے انہوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ اس ''دوسری'' مسجد یعنی نقلی بابری مسجد کی تعمیر 7 رفروری سے شروع ہو جائے گی۔ ان کے خیال میں ''اس سے رام نومی سے رام مندر کی تعمیر کے لیے راستہ ہموار ہو جائے گا''۔ یہ یقین کرنے کی ہر وجہ موجود ہے کہ مسٹر رضوی کے اجودھیا جامع مسجد ٹرسٹ کی ڈور مرکزی وزیر مملکت برائے داخلہ سوامی چنمانند کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی تجویز پر میڈیا میں جو چرچہ ہو رہا ہے۔ اس کا واحد مقصد مسئلہ کو حل کرنے کے بجائے لوک سبھا چناؤ سے عین پہلے اس حساس معاملے پر مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا ہے۔ رضوی کے ایک ساتھی کارتک چوپڑا ہیں، جن کا انہیں کی طرح دہلی میں کاروبار ہے۔ وہ خود کو شری رام جنم بھومی مندر نرمان سنوے سمیتی کا جنرل سکریٹری اور آزاد ہند فاؤنڈیشن کا صدر بتاتے ہیں۔ یہ سمیتی اجودھیا کے وشو ہندو پریشد مخالف مہنتوں نے قائم کی ہے، جن میں ہنومان گڑھی کے مہنت گیان داس بھی شامل ہیں۔

چوپڑا کا کہنا ہے کہ مندر یا مسجد کی تعمیر شروع ہونے سے پہلے یا تو حکومت کو یا اجودھیا جامع

مسجد ٹرسٹ کو سپریم کورٹ سے رجوع کر کے تمام تحویل شدہ زمین پر کسی بھی طرح کی سرگرمی کو ممنوع قرار دینے والے اسٹے کو ہٹوانا ہوگا۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ہمارا پہلا قدم متنازع پلاٹ سے باہر کی تحویل شدہ زمین کے اس حصے پر جہاں مندر اور ایک گرودوارہ پہلے سے موجود ہیں، تعمیر اور مرمت کا کام پھر سے شروع کرنے کے لیے سپریم کورٹ کی منظوری لینا ہوگا''۔

رضوی دہلی میں 14 راگست 2003ء کو قائم کردہ اجودھیا جامع مسجد ٹرسٹ کی مینجنگ ٹرسٹی ہیں جبکہ چوپڑا اور دہلی کے ایک وکیل سید قیصر کاظمی اس کے ٹرسٹی ہیں۔ جہاں تک چوپڑا کا تعلق ہے وہ اس وقت اجودھیا میں برہم کنڈ گوردوارے کی مرمت اور تزئین کے لیے پنجاب میں فنڈ جمع کر رہے ہیں۔

اجودھیا کے بارے میں مسٹر رضوی کی تجویز کو زیادہ تر مسلم اداروں اور مسلم لیڈروں نے مسترد کر دیا ہے۔ کل ہند بابری مسجد ایکشن کمیٹی اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس تجویز کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''کوئی غیر مجاز شخص اس معاملے میں ثالثی نہیں کر سکتا۔ رضوی کا دعویٰ ہے کہ انہیں وزیر اعظم کے دفتر کے اجودھیا سیل کی حمایت حاصل ہے۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور سینٹرل سنی وقف بورڈ جیسی تنظیموں کی جانب سے مضحکہ اُڑائے جانے کے باوجود رضوی نے کہا ہے کہ وہ اپنی تجویز کو ''اس کے منطقی انجام تک پہنچائیں گے۔'' ان کا دعویٰ ہے کہ ہندو اور مسلم تنظیموں کا جو خود کو مسلم کاز کا علمبردار بتاتی ہیں، اس معاملے سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔'' یہ فیصلہ کو عدالت سے باہر سمجھوتہ ہونا چاہیے کہ نہیں ان ہندو اور مسلمانوں کو کرنا ہے، جو اس مقدمے کے اصل فریق اور مدعی ہیں۔

پریشانی یہ ہے کہ متنازع مقام پر دعوے سے دستبردار ہونے کی رضوی کی تجویز کی اجودھیا تحریک کے ہندو لیڈروں نے بھی بادل نخواستہ حمایت کی ہے۔ انہوں نے کاشی اور متھرا کی مسجدوں پر اپنے دعوے سے دستبردار ہونے کے بارے میں ابھی تک زبان نہیں کھولی ہے۔ وشو ہندو پریشد کے لیڈر اشوک سنگھل کا کہنا ہے کہ ''تجویز کو قبول کرنے میں ہمیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہے۔ ہمیں تو خوشی ہے کہ مسلمانوں نے زمینی حقائق کو سمجھنا شروع کر دیا ہے۔''

80 سالہ ہاشم انصاری نے جو ملکیت کے مقدمے میں اصل مدعی ہیں، کہا جاتا ہے کہ اجودھیا اور

فیض آباد کا ایک بھی مسلمان اجودھیا جامع مسجد ٹرسٹ کے ساتھ نہیں ہے۔ سینٹرل سنی وقف بورڈ کے وکیل مسٹر ظفریاب جیلانی نے رضوی کی تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''وہ رائے زنی کے قابل بھی نہیں ہے۔''

لیکن رضوی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ''اگر مدعی راضی نہیں ہوتے ہیں تب بھی متنازع مقام سے باہر مسجد کی تعمیر شروع ہو جائے گی اور ایسا ہوتے ہی مسلم لیڈرشپ تصفیہ کے لیے چیخ پکار کرنے لگے گی۔ نئی مسجد کا نام جامع مسجد ہوگا اور حکومت آگے بڑھ کر اس کے لیے فنڈ بھی فراہم کر سکتی ہے۔

مسٹر رضوی کے مطابق اجودھیا جامع مسجد ٹرسٹ حصار بند جنم بھومی کمپلیکس سے باہر پانچ ایکڑ کا ایک پلاٹ خریدنے کی کوشش کر رہا ہے جس پر 7 رفروری سے جامع مسجد کی تعمیر شروع ہو جائے گی۔ یہ پلاٹ اس وقت ہنومان گڑھی کی ملکیت ہے، جس کے ایک مہنت گیان داس نے رضوی کے ساتھ ہاتھ ملا لیا ہے۔ ☐ ☐ (عالمی سہارا، نئی دہلی 17 رجنوری 2004)



# بابری مسجد تنازعہ: دلائی لامہ کی پیش رفت

دلائی لامہ کا بیان: ''ایک طویل عرصہ سے تنازع کا موضوع بنے رہنے والے اس مسئلہ کا حل باہمی احترام اور یقین و اعتماد سے ہی نکل سکتا ہے۔ سبھی متعلقہ فریقوں کو سنجیدہ، دور رس اور کھلا رویہ اپنانا چاہئے تاکہ دونوں فرقوں کے درمیان اخوت اور بھائی چارہ کے جذبات پیدا ہوں۔''

## ہندو رہنماؤں کا ردعمل

○ حکومت اجودھیا مسئلہ کو سلجھانے کے لیے ہر ممکن تیار ہے۔ اجودھیا تنازع کو ہندو اور مسلم فریق آپسی بات چیت سے حل کرنے کی کوشش کریں۔ حکومت ان مذاکرات کو کامیاب بنانے میں اپنا بھرپور تعاون دے گی۔ اجودھیا تنازع کو باہمی اعتماد اور احترام کے ساتھ حل کرنے کی دلائی لامہ کی اپیل کی حکومت اور بی. جے. پی. تائید کرتی ہے۔ مسلمانوں کو رام جنم بھومی پر رام مندر بنانے کی ہندوؤں کو اجازت دے دینی چاہئے اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے ذہن میں موجود تمام اندیشوں اور خوف کو دور کرنے کے لیے آگے آنا چاہیے۔ اجودھیا مسئلہ کے حل سے ملک میں دونوں فریقوں کے درمیان نئے دور کا آغاز ہوگا۔ ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات نئی نہج پر پہنچ جائیں گے۔

(لال کرشن اڈوانی، نائب وزیر اعظم)

○ دلائی لامہ کی اپیل کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ مسلمان متنازعہ جگہ کے لیے اپنا دعویٰ ترک کر دیں۔ ہندوستان کے سبھی لوگوں کی خواہش ہے کہ اجودھیا میں رام جنم استھان پر مندر بنے۔ یہ تبھی ممکن ہوگا جب عدالت میں چل رہا ملکیت کا مقدمہ مسلمان واپس لے لیں، چونکہ یہ ہندوؤں کی آستھا کا سوال ہے اور اس سے کروڑوں ہندوؤں کے جذبات وابستہ ہیں۔

(ایم وینکیا نائیڈو، صدر بی. جے. پی.)

○ رام مندر کی تعمیر رام جنم بھومی پر ہوگی۔ اس ملک کے مسلمانوں کو بابری مسجد پر سے اپنا دعویٰ ترک کر دینا چاہیے۔ مسلمان دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ ہندوستان میں محفوظ ہیں لہٰذا انہیں حالات کو سمجھ کر اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کا احترام کرنا چاہئے۔

(سوامی نتیانند سرسوتی، شنکرآچاریہ پوری)

## مسلم رہنماؤں کا ردعمل

○ اجودھیا تنازع ختم کرنے کے لیے روحانی پیشوا دلائی لامہ کی تازہ کوششوں کے تعلق سے بورڈ کے ذمہ داران آپس میں صلاح و مشورہ کر رہے ہیں۔ جب تک دلائی لامہ یا شنکر آچاریہ کی طرف سے کوئی حل سامنے نہیں آتا اس بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(مولانا رابع حسنی ندوی، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

○ بابری مسجد تنازع حل کرنے کے لیے دلائی لامہ کی پیش قدمی کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن وہ وشو ہندو پریشد سے قانون کی حاکمیت کا احترام کرنے کو اور حکومت سے اس مسئلہ کے لیے ایک متوازن، منصفانہ اور مساویانہ فارمولہ وضع کرنے کے لیے کہیں۔ لیکن اگر حکومت ابھی سے وی. ایچ. پی. کو سب کچھ دے دیتی ہے اور مسلمانوں سے کہتی ہے کہ آپ عدالتی فیصلہ کا انتظار کریں یا معاوضہ میں کچھ لے لیں تو کوئی سمجھوتہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ دھونس، دھمکی یا دباؤ سے کوئی سمجھوتہ نہیں کرایا جا سکتا۔ (سید شہاب الدین، صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت)

○ اجودھیا کا مسئلہ باہمی اعتماد اور احترام کے ساتھ حل کرنے کی ہندوؤں اور مسلمانوں سے دلائی لامہ کی اپیل کا ہم خیر مقدم کرتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی کسی بھی گفتگو میں آر. ایس. ایس. اور وشو ہندو پریشد کی شرکت نہیں ہونی چاہیے۔ آر. ایس. ایس. اور بی. جے. پی. کی شمولیت مستقبل میں کسی بھی بات چیت کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگی۔ ایک طرف تو مسٹر اڈوانی نے بابری مسجد تنازع کے پرامن حل کی بات کہی ہے اور دوسری جانب وہ کہتے ہیں کہ مسلمان مسجد کی زمین پر اپنے دعویٰ سے دستبردار ہو جائیں۔ دونوں موقف ایک دوسرے سے مختلف ہیں لہٰذا ہمارے لیے قابل قبول نہیں۔ ہم دلائی لامہ سے گفتگو کے خواہشمند ہیں لیکن بی. جے. پی. اور آر. ایس. ایس. کے ساتھ مذاکرات کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔ (مولانا سید احمد بخاری، امام شاہی جامع مسجد)

○ چند روز سے بابری مسجد کے مسئلہ پر گفت و شنید کا تذکرہ ہے، تبتی لیڈر دلائی لامہ نے بھی اس مسئلہ پر مذاکرات کے عمل کو جاری رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے جس کا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے تقریباً متفقہ طور پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ بابری مسجد مسئلہ کے حل کے لیے کھلے دل سے بات چیت کے لئے تیار ہیں۔ مسلمانوں نے ہمیشہ فریق مخالف کو دعوت دی ہے کہ شواہد کی روشنی میں اس کو جلد از جلد حل کیا جائے۔ (مولانا مفتی محمد مکرم، امام شاہی مسجد، فتح پوری)

جمعیۃ العلماء ہند اور ہندو انتہا پسند لیڈروں کی خفیہ میٹنگ کے تناظر میں

## ہندو مسلم لیڈروں کے رابطہ کار پنڈت این. کے. شرما کا انٹرویو

| پنڈت این. کے. شرما کے انٹرویو سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ عیار ہی نہیں شاطر بھی ہیں۔ (مرتب) |
| --- |

سوال: پنڈت این. کے. شرما جی! پچھلے دنوں جمعیۃ علماء، آر. ایس. ایس. اور وی. ایچ. پی. کے لیڈروں کی خفیہ میٹنگ کرانے میں آپ نے اہم رول ادا کیا، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ اس میٹنگ کے انعقاد سے کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟

جواب: دیکھئے نہ تو میٹنگ خفیہ تھی اور نہ ہی کوئی ایجنڈہ خفیہ تھا، میٹنگ ایک پبلک پلیس میں ہوئی۔ میرا مقصد صرف دونوں فرقوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر نفرت بھرے ماحول کو ختم کرنا تھا۔

سوال: آپ کو یہ خیال اچانک کیسے آیا؟

جواب: میں بہت عرصہ سے عالمی روحانی بیداری مرکز کے توسط سے یہ کام انجام دے رہا ہوں۔ لیکن اب میں نے محسوس کیا کہ بعض جماعتوں نے ہندو جوانوں کے ذہنوں میں زہر بھر دیا ہے اور اگر صورت حال کو سمجھ کر کوئی قدم نہیں اُٹھایا گیا تو بڑا بھاری نقصان ہوسکتا ہے۔ آج پوری دنیا ایک گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ آج دو بڑے فرقے ایک دوسرے کے دشمن بن کر بہتر زندگی نہیں گزار سکتے۔ کیوں کہ ہم کو آج بین الاقوامی سطح پر اقتصادی مقابلہ اور مسابقت کا سامنا ہے اور وہ ہم اس وقت کر سکتے ہیں جب ہم دونوں ایک ہو جائیں۔

سوال: کیا اس راستہ سے آپ سیاسی قد و قامت حاصل کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: بھگوان کا شکر ہے کہ میری ایسی کوئی خواہش نہیں، میرا کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے۔ آپ جو چاہیں اس سے نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔

سوال: میٹنگ کے انعقاد کے وقت آپ کے ذہن میں کیا تھا؟

جواب: دیکھئے 2000ء کے بعد سے پوری دنیا کا ماحول تبدیل ہو رہا ہے، اقتصادی، سیاسی، سماجی اور مذہبی گروپوں کے نقطہ نظر میں بڑی تبدیلیاں آرہی ہیں۔ مجھے یہ محسوس ہوا کہ اب ملک میں نفرت کے بجائے محبت کا ماحول بنانا بہت ضروری ہے تاکہ ہم دنیا کے سامنے ایک

مضبوط ملک کے طور پر کھڑے ہوں اور اس کا واحد طریقہ بات چیت اور افہام و تفہیم ہے۔ اگر اتنی جنگوں اور جھگڑوں کے باوجود ہند و پاک مل بیٹھ سکتے ہیں اور گفت و شنید سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش پر راضی ہو سکتے ہیں تو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان کیوں بات چیت نہیں ہو سکتی۔

سوال: اس وقت دونوں فرقوں کے درمیان گفتگو اور میٹنگ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟

جواب: بات چیت تو جاری تھی مگر سیدھی بات ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔

سوال: کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ جمعیۃ علماء، آر.ایس.ایس. اور وی.ایچ.پی. کی میٹنگ اجودھیا کو لے کر ہوئی تھی؟

سوال: دیکھئے اس سلسلہ میں پہلے سے بڑی کوششیں ہو رہی تھیں۔ کاشی کے شنکر آچاریہ اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے درمیان بھی گفتگو ہوئی، جس کو اس سمت میں اُٹھایا گیا سب سے بڑا قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقلیتی کمیشن نے بھی اس سلسلہ میں کچھ کوشش کی۔ شری روی شنکر جی نے بھی یہ معاملہ اُٹھایا تھا۔

سوال: یعنی آپ بابری مسجد رام جنم بھومی کے ہی حل کے لیے کوشاں ہیں؟

جواب: اخبارات کی رپورٹیں مظہر ہیں کہ میں بہت عرصہ سے ایسی کوششیں کر رہا ہوں۔ بابری مسجد کا انہدام ایک بہت ہی بھیانک واقعہ تھا۔ اس سے کوئی ذی ہوش انسان انکار نہیں کر سکتا لیکن اس مسئلہ پر ہمیشہ دونوں فرقے نفرت بھرے ماحول میں نہیں رہ سکتے۔

سوال: کیا آر.ایس.ایس. اور وی.ایچ.پی. تمام ہندوؤں کی اور جمعیۃ علماء تمام مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے؟

جواب: میں اپنی تنظیم اور اپنے مشن کے تحت پچھلے تین برسوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تقریباً تمام طبقات سے اس مسئلہ پر گفتگو کرتا رہا ہوں۔ لہٰذا یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ ہم نے مذکورہ جماعتوں کو دونوں فرقوں کے نمائندہ کے طور پر منتخب کر لیا ہے۔ کہیں نہ کہیں سے تو ابتداء کرنی پڑے گی۔ ابتداء تو ہو گئی ہے اب اس میں سب لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔

سوال: آپ نے آر.ایس.ایس. کے لیڈروں سے پاکستان کے مولانا فضل الرحمٰن کی بھی ملاقات

کرائی تھی کیا اس ملاقات کا مقصد بھی...؟

جواب: یہ بھی اچھی مثال ہے۔ جب ایک پاکستانی جماعت کے لیڈر پیار و محبت بھری ملاقات کر سکتے ہیں تو خود ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران بھی کچھ میٹنگیں ہوئی تھیں۔ حالانکہ آر. ایس. ایس. اور وشو ہندو پریشد کے نظریات سے مجھے سخت اختلاف ہے لیکن بہرحال ان کو جماعت بنانے اور اسے چلانے کا حق حاصل ہے۔ مختلف شعبوں میں وہ بعض کام اچھے بھی کر رہے ہیں مگر ان کے غلط کارناموں کی وجہ سے ان پر پردہ پڑ گیا ہے۔

سوال: جمعیۃ علماء، آر. ایس. ایس. اور وی. ایچ. پی. کا رویہ منفی تھا یا مثبت؟ آپ نے ایک ثالث کی حیثیت سے کیا پایا؟

جواب: میں کوئی بچولیا نہیں تھا میں اس میٹنگ میں عالمی روحانی بیداری مرکز کے صدر کی حیثیت سے موجود تھا۔

سوال: میٹنگ تو آپ نے ہی کرائی تھی؟

جواب: ایک طریقہ تو وہ ہے کہ ہم جس طرح پاکستان سے کہتے رہے ہیں کہ جب تک سرحد پار سے دہشت گردی ختم نہیں ہوتی، مذاکرات نہیں ہوں گے۔ یعنی جب تک وی. ایچ. پی. والے اپنے غلط کارناموں کے لیے پورے معاشرے سے معافی نہ مانگ لیں تب تک کوئی بات چیت نہ ہو۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جو ہندوستان نے پاکستان کے ساتھ اپنایا ہے کہ اس کے ساتھ گفتگو شروع کی ہے اسی طرح جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سیدھی گفتگو نہیں ہوگی ان کے اختلافات اور تنازعات دور نہیں ہو سکیں گے۔ اور یہ میٹنگ اچانک ہی نہیں ہو گئی پہلے ہم نے دونوں فریق سے متعدد دور بات چیت کے چلائے۔ یہ میرے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا اس لیے کہ میں ہمیشہ آر. ایس. ایس. اور وی. ایچ. پی. کی زبردست مخالفت کرتا رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جمعیۃ علماء اور مولانا محمود مدنی نے یہ بہت بڑا ہمت بھرا قدم اُٹھایا اور وہ قومی مفاد میں آگے آئے۔ یہ تو ابتداء ہے، آر. ایس. ایس. اور وی. ایچ. پی. نے بھی اس سلسلہ میں اپنے یہاں بحث و مباحثہ کیا ہے اور ہندوستان کی

تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ آر.ایس.ایس. نے ایک سہ سمپرک پرمکھ کی تقرری کی ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو قریب لاکر ان کے جذبات کو سمجھیں اور ان کی بات کو سنیں۔ کیا یہ ایک بڑی تبدیلی نہیں ہے۔

سوال: آپ کی نظر میں بابری مسجد کے مسئلہ کا حل کیا ہے؟

جواب: آج ہندو پاک کے عوام کے دل میں یہ خواہش ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات اچھے ہونے چاہئیں۔ اسی طرح ہندوستان کے عوام بھی یہی خواہش رکھتے ہیں کہ ہندو مسلمان بھی ایک دوسرے کے دوست بن جائیں۔ کروڑوں ہندوؤں اور کروڑوں مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ اب نفرت ختم ہونی چاہئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی مختلف جماعتیں کیا اپنے عوام کی خواہش کا احترام کریں گی۔

سوال: میں نے آپ سے پوچھا ہے کہ خود آپ کی نظر میں کیا حل ہے؟

جواب: ابھی کچھ کہنا ضروری نہیں ہے۔ یہ تو ابھی بات چیت کا آغاز ہے۔ دونوں طرف کی جماعتوں کو ابھی اپنے اپنے لوگوں سے بھی بات کرنی ہے۔

سوال: آپ میٹنگیں بھی کر رہے ہیں، بات چیت کے ذریعہ حل کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہیں مگر کوئی ممکنہ حل آپ کے ذہن میں نہیں ہے ایسا کیسے ممکن ہے؟

جواب: میں اس سلسلہ میں میڈیا سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔

سوال: اتنی دیر سے آپ کس سے بات کر رہے ہیں؟

جواب: میری خواہش ہے کہ پہلے بات چیت کا سلسلہ آگے بڑھے، ابھی کچھ مشترکہ میٹنگیں ہونا باقی ہیں۔ صرف میرے سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

سوال: کیا آپ کو وزیر اعظم کے دفتر کی جانب سے مامور کیا گیا ہے؟

جواب: نہیں میرا وزیر اعظم کے دفتر سے کوئی لینا دینا نہیں ہے نہ مجھے کوئی لالچ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی اس مسئلہ پر سودا نہیں کر سکتا۔

(ملاقاتی: ایم. ودود ساجد)

(بشکریہ: راشٹریہ سہارا، 18رجنوری 2004ء)



# دلائی لامہ کی اپیل میں دو مغالطے

از: محمد عبدالرحیم قریشی
(جنرل سکریٹری، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

ہز ہولی نیس دلائی لامہ نے بابری مسجد کے تنازع کے بارے میں مسلمانوں سے آپسی گفت و شنید کے ذریعہ اس کو حل کرنے کی اپیل کی ہے۔ ان کی اپیل اس نزاع کے جاری رہنے پر ان کے دلی درد اور فرقہ وارانہ امن کے استحکام کے لیے ان کی تمنا کا ثبوت ہے۔ ان کے اونچے مذہبی تقدس کے مقام کے پیش نظر ان کی اپیل قابل قدر اور قابل احترام ہے مگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ان کی اپیل میں دو مغالطے موجود ہیں جن کی نشاندہی کی جانی چاہئے۔

پہلا مغالطہ یہ ہے کہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی جھگڑا یا نزاع ہے۔ یہ ہندو مسلم نزاع قطعاً نہیں ہے۔ ہندو برادرانِ وطن کی ایک بڑی تعداد یہ حقیقت جانتی اور مانتی ہے کہ بابری مسجد کی جگہ کبھی کوئی رام مندر نہیں تھا، اس مسجد کی تعمیر کے لیے کسی مندر کو توڑا یا گرایا نہیں گیا، بابری مسجد کی تائید میں دورانِ مقدمہ کئی ہندو مورخین اور ماہرین آثارِ قدیمہ نے گواہی دی، کھدائی کے دوران مبصر کی حیثیت میں خدمات انجام دیں۔ ہندو سیاسی لیڈروں کی خاصی تعداد ہے جو مسلمانوں کو مسجد کی بازیابی کو انصاف کا تقاضہ قرار دیتی ہے۔ یہ نزاع اس لیے ہندو مسلم نہیں ہے، ہندو بھائی فریق نہیں ہیں، اس تنازع کے پیچھے سنگھ فریق نہیں ہیں، اس تنازع کے پیچھے سنگھ پریوار ہے جو اپنے نظریاتی اور سیاسی مقصد کے لیے اس کو آگے بڑھا رہا ہے۔

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ اس سے پہلے بات چیت کے ذریعہ حل نکالنے کی کوشش نہیں ہوئی۔ ہز ہولی نیس کی اپیل کی عبارت اور لب و لہجہ سے محسوس ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جو کوششیں ہوئی ہیں ان سے وہ پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ کسی نئی پہل سے پہلے پچھلی کوششیں کیوں ناکام ہوئیں جاننا ضروری ہے۔ ہم ہز ہولی نیس دلائی لامہ سے کہیں گے کہ مصالحت کار کی حیثیت میں عملی قدم اُٹھانے سے پہلے ان اسباب کا جائزہ لیں۔ ایک اور نکتہ پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہز ہولی نیس نے جو کئی دن سے اس پر سوچ رہے تھے کانچی کے شری شنکر آچاریہ اور وشو ہندو پریشد کے اشوک سنگھل سے ملاقاتیں اور گفتگو کی۔ بہتر ہوتا کہ وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر یا بابری

مسجد کمیٹیوں کے ذمہ داروں سے بھی ملتے اور گفتگو کرتے۔ مصالحت کار کے لیے فریقین کے درمیان غیر جانب داری اور توازن رکھنا ضروری ہے۔ ہمیں ہز ہولی نیس پر اعتماد ہے کہ وہ اپنی آزادانہ فکر و سوچ رکھتے ہیں۔ مگران کو احتیاط برتنا چاہیے کہ کسی کو ان کی غیر جانب داری پر انگلی اُٹھانے اور جانب داری کا الزام لگانے کا موقع نہ ملے۔

اس سے پہلے گفتگو کے ذریعہ حل نکالنے کی جو کوششیں ہوئی ہیں ان میں کانچی کے شری شنکر آچاریہ کی وہ کوششیں قابل ذکر اور اہم ہیں جو 2002ء میں کی گئی تھی۔ اہم اس لیے ہے کہ وزیر اعظم کا دفتر (PMO) اس کے پیچھے تھا۔ اس دفتر کے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی شری سودھیندر اکلکرنی نے ملاقات کا انتظام کیا، بات چیت کروائی حتی کہ ان کے توسط ہی سے کانچی کے شنکر آچاریہ کی تجویز بھیجی گئی۔ جو تحریری تجویز انہوں نے روانہ کی اور جس کی نقلیں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے 10 مارچ 2002ء کو پریس کو فراہم کیں، اس میں کانچی کے شنکر آچاریہ نے یہ تجویز رکھی تھی کہ بابری مسجد کی جگہ کے بارے میں فریقین عدالت کے فیصلہ کو تسلیم کرلیں۔ اس میں یہ بتایا گیا تھا کہ رام جنم بھومی نیاس نے تحریر میں یہ یقین دہانی وزیر اعظم کو کرائی ہے کہ نیاس عدالت کے فیصلہ کی تعمیل کرے گا۔ شری شنکر آچاریہ نے گفتگو میں اس پر اتفاق کیا تھا کہ اس تحریر کی نقل فراہم کی جائے گی۔ معلوم نہیں کہ وزیر اعظم کے آفس میں کیا ہوا کہ نہ صرف اس دستاویز کی نقل اور دوسری دستاویزات جو طلب کی گئی تھیں اور جن کے دینے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ فراہم نہیں کی گئیں، اسی وجہ سے بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔ ہز ہولی نیس دلائی لامہ شری شنکر آچاریہ کی اس کوشش کے بارے میں وزیر اعظم کے دفتر میں معلوم کریں کیوں کہ ایسا نہ ہو کہ وہ آگے بڑھیں اور کسی مرحلہ پر ان کو پیچھے پلٹ آنے کے لیے کہا جائے۔ ہز ہولی نیس کی مصالحت کاری کامیابی کی راہ پر گامزن ہوسکتی ہے۔ اگر وہ 2002ء میں رام جنم بھومی نیاس کی جانب سے دی گئی تحریری یقین دہانی کو حاصل کریں اور اس کو منظر عام پر لائیں کیوں کہ اس کے منظر عام پر آنے سے گفتگو کے لیے فضا ہموار ہوگی، ساز گار رائے عامہ بنے گی۔ حکومت کو ایسی اہم اور رائے ساز دستاویز عام کرنے کی ذمہ داری یاد دلائیں۔ ہز ہولی نیس مغالطے کا شکار نہ ہوں، پوری طرح غیر جانب داری اور توازن کا رویہ اختیار کریں، پچھلی کوششوں کی ناکامی کے اسباب کا جائزہ لیں اور اس کے بعد عملی قدم اُٹھائیں تو صورت حال بہتر ہوسکتی ہے اور حل کی طرف بڑھنے کا راستہ ہموار ہوسکتا ہے۔ □ □

(بشکریہ: راشٹریہ سہارا، 18 رجنوری 2004)

# بابری مسجد کی زمین پر قبضہ کرنے کی سازش

از: رشید انصاری

مرکزی حکومت آج کل کچھ ایسے موڈ میں ہے کہ جو بھی بابری مسجد کی متنازع جگہ پر مندر بنانے کے لئے راضی ہو جائے گا اسی کو ہندوستان کے 15 تا 18 کروڑ مسلمانوں کا نہ صرف نمائندہ بلکہ سب سے بڑا لیڈر بھی تسلیم کر لیا جائے گا۔ چنانچہ اس خطاب اور نا قابل تصور مراعات اور نوازشات سے سرفراز کئے جانے کے لئے کسی رضوی صاحب کی آزمائش ہو رہی ہے اور اجودھیا کے جامع مسجد ٹرسٹ کو مسلم پرسنل لاء بورڈ پر ترجیح دی جا رہی ہے جبکہ مسلم پرسنل لاء بورڈ ہندوستان بھر کی مسلم سیاسی و مذہبی جماعتوں کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے اور رہا مسلم پرسنل لاء بورڈ پر فوقیت اور ترجیح دیا جانے والا جامع مسجد اجودھیا ٹرسٹ تو اس کے اراکین کا کسی کو پتہ نہیں ہے کہ اس میں واقعی کچھ اراکین ہیں بھی یا نہیں؟ یا یہ سارا معاملہ فردِ واحد کا ہے۔

اس اجودھیا ٹرسٹ کا نام ہم نے پہلی بار جب سنا تھا جب اس ٹرسٹ والوں نے مسلم پرسنل لاء بورڈ پر شدید الزامات لگائے تھے اور ان کو بہ زعم خود مسلمانوں کا نمائندہ ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ کانچی کے شنکر آچاریہ نے بابری مسجد کی متنازع زمین حوالہ کر دینے کے تعلق سے مسلمانوں کو جو الٹی میٹم دیا تھا اس کو جب مسلم پرسنل لاء بورڈ نے مسترد کر دیا تو کسی نئی مہم کے منصوبے پر عمل درآمد شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ اجودھیا میں جامع مسجد کے نام سے تابڑ توڑ ایک ٹرسٹ بنا دیا گیا اور کسی رضوی صاحب کو "بابری مسجد فروش" بنانے کی تیاریاں بھی ہونے لگیں چنانچہ فیض آباد اور اجودھیا کے سرکردہ مسلمانوں اور خاص طور پر اس مقدمہ کے یعنی بابری مسجد کی ملکیت کیس کے اصل دعویدار محمد ہاشم انصاری نے کہا ہے کہ حال ہی میں قائم کیا گیا جامع مسجد اجودھیا ٹرسٹ نہ مسلمانوں کا نمائندہ ہے اور ہی یہ ٹرسٹ مسلمانوں کے خیالات کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہاشم انصاری نے تمام مسلمانانِ اجودھیا اور فیض آباد کے قائدین کی جانب سے وضاحت کی کہ جامع مسجد ٹرسٹ کا کوئی تعلق اجودھیا یا فیض آباد کے مسلمانوں سے نہیں ہے۔ مسلمانانِ ہندوستان نے اجودھیا تنازعہ کو بات چیت کے ذریعہ حل کرنے کا اختیار صرف مسلم پرسنل لاء بورڈ کو دے رکھا ہے اور نو قائم شدہ ٹرسٹ کے اراکین اپنے سوا کسی بھی مسلمان کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں نہ ہی عام مسلمانوں کا اس

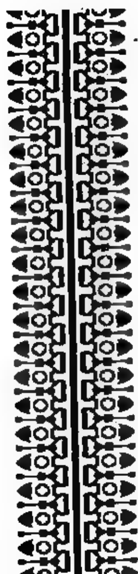
نام نہاد ٹرسٹ سے کوئی تعلق ہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ اس قسم کی سودے بازی کا مخالف ہے کہ جس سے مسلمانوں کو بابری مسجد سے اپنا دعویٰ واپس لینا پڑے اور جس جگہ بابری مسجد تھی وہاں کی ملکیت کے مقدمہ سے بھلا وہ (ہاشم انصاری) یا کوئی اور کیسے دستبردار ہو سکتا ہے؟ اور ہم عدالت کے فیصلے کے انتظار میں ہیں۔

سب ہی جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ عدالت میں زیر سماعت ہے اور دونوں ہی فریق اپنی اپنی ضد پر قائم ہیں۔ مسلمان شہید کردہ بابری مسجد کی جگہ سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں تو دوسری طرف رام جنم بھومی کی تحریک چلانے والے متنازعہ جگہ پر ہی مندر بنانے کے لئے بضد ہیں۔ بات چیت ناکام ہو چکی ہے اور یہ کامیاب ہو بھی کیسے سکتی ہے؟ جبکہ سنگھ پریوار صرف یہ چاہتا ہے کہ مذاکرات کے نتیجہ میں مسلمان بابری مسجد کی جگہ اس کے حوالے کر دیں ایسی صورت میں حکومت اگر خود کو غیر جانبدار رکھے تو ظاہر ہے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتی سوائے اس کے کہ وہ دونوں کو عدالت کا فیصلہ آنے تک صبر و تحمل سے کام لینے کا مشورہ دے اور عدالت کا جو بھی فیصلہ آئے اس کو نافذ کرنے کی تیاری کرے یا زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ مقدمہ یا مقدمات کی جلد یکسوئی کے لئے تمام عدالتوں کو پابند کرے۔ لیکن حکومت (خواہ وزیر اعظم ہوں کہ نائب وزیر اعظم یا کوئی اور وزیر یا سرکاری عہدیدار) نے تمام دستوری روایات اور حکومت کے فرائض و ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ کر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اڈوانی جی کی رتھ یاترا کے بدنام نعرے ''مندر وہیں بنائیں گے'' کو عملاً ممکن بنائیں گے اور رام مندر کو متنازعہ جگہ تعمیر کرنے کے ارادوں کو ہر حال میں ہر صورت میں پورا کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار ہیں۔ اب جبکہ یہ مسئلہ ایک اہم قومی مسئلہ ہے اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو خواہ وہ اجودھیا سے ہزاروں میل دور ہی کیوں نہ رہتے ہوں ان کو اس مسئلے سے گہری وابستگی اور قلبی تعلق ہے اور قومی سطح کی قیادت سے مذاکرات یا کسی بھی طرح سے اپنا مطلب نکالنے میں ناکامی کے بعد پہلے تو یہ کوشش کی گئی کہ کسی طرح سے مسلمانوں اور مسلم قیادت یا مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی جماعتوں میں پھوٹ ڈال کر کسی ایک گروہ کو اپنا ہم نوا بنا لیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مسلکی اختلاف کو بھی ہوا دینے کی کوشش کی گئی اور سنیوں کو مسجد کے تمام معاملات سے بے دخل کرنے کے لئے شہید کردہ بابری مسجد کو ''شیعہ مسجد'' قرار دے کر مسجد سے شیعوں کو دستبردار کروانے کی بھی کوشش کی گئی لیکن شیعہ عوام و خواص اور ان کی سیاسی و مذہبی قیادت

نے حکومت اور سنگھ پریوار کی مذموم کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد مسلم پرسنل لا بورڈ میں اختلافات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور آخر میں براہِ راست دھمکیاں بھی دی گئیں لیکن حکومت اور سنگھ پریوار کے سارے حربے ناکام ہو گئے تو اب یہ کوشش ہے کہ اس قومی مسئلے کو اجودھیا کا مسئلہ بنا دیا جائے اور مقامی مسلمانوں میں سے کچھ کو ''خرید'' کر ان کو اجودھیا کے مسلمانوں کا نمائندہ قرار دیا جائے اور اپنی مرضی کے مطابق متنازعہ جگہ رام مندر بنا دیا جائے اور مسلمانوں کے آنسو پوچھنے کی حد تک کوئی نمائشی کام کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ جمعیت اور وی. ایچ. پی. کے ان رسوا کن اور شرم ناک مذاکرات کا وسیلہ پنڈت این. کے. شرما تھے جو کسی زمانے میں بابری مسجد شہادت کی مجرمانہ سازش کے ملزم نمبر ایک نرسمہا راؤ سے بہت قریب تھے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کس قسم کی سازش ہے۔ الیکشن سے قبل بی. جے. پی. اور سنگھ پریوار چاہتا ہے کہ رام مندر کا مسئلہ کسی بھی طرح حل کر لیا جائے اور رائے دہندگان کے آگے سرخروئی حاصل کر لی جائے اور اس مقصد کے لیے چند منافق مسلمانوں کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ عام و خاص مسلمان، علماء اور قائدین اور مسلم اخبارات ہوشیار رہیں اور گربہ کشتن روز اوّل کے مصداق ابتدائی مرحلہ میں ایسے لوگوں اور ایسی کوششوں کو ناکام بنا دیا جائے۔

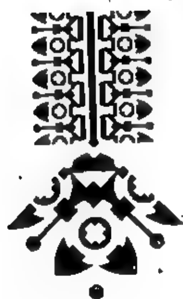
(بشکریہ: راشٹریہ سہارا، 18 رجنوری 2004ء)

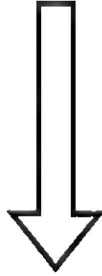







# موجودہ حالات میں مسلمانانِ ہند کے لیے راہِ عمل





"اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے." (سوۃ التحریم:6)

"...مسلمانوں میں (خاص طور پر جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور وہاں خطرات اور آزمائشوں کا امکان ہے) صلح پسندی، صبر و تحمل بلکہ ایثار و فیاضی کے ساتھ عزم و ہمت، صبر و ثبات، شجاعت و دلیری کی صفت، راہِ خدا میں مصائب برداشت کرنے اور اس پر اللّٰہ کے اجر و ثواب کی طمع اور جنت اور بقائے رب کا شوق اور شہادت فی سبیل اللّٰہ کے فضائل کا استحضار بھی موجود و زندہ رہنا چاہئے."

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

# مسلمانوں کے لئے راہِ عمل

از: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ عالمِ اسلام کے عظیم مفکر، دانشور اور عالمِ دین تھے۔ ہندوستان کی بدلتی ہوئی صورتحال پر مرحوم کی گہری نظر تھی۔ وہ مفکر بھی تھے اور داعی بھی۔ لہٰذا بابری مسجد کی شہادت سے قبل ہی آپ نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کی موجودہ صورت حال کس نازک موڑ پر ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے آپ نے 1990ء میں ''راہِ عمل'' کے نام سے یہ کتابچہ تحریر فرمایا۔ جس میں مسلمانوں کو قوموں کی تاریخ کے حوالے سے رجوع الی اللہ کی دعوت دی اور ملک کی نازک صورتحال میں ایک عملی خاکہ دیا۔ توقع ہے کہ یہ تحریر آج بھی مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہوگی۔ (مرتب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ.

اس وقت تک پورا عالم اسلام خاص طور پر ہمارا ملک ہندوستان (جو صدیوں تک اسلامی اقتدار، عزت و شرف اور اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہا ہے، اور جہاں ایسی زبردست اصلاحی تحریکیں، مصلحین اور علماء ربانیین پیدا ہوئے جن کی دعوت و اثرات عالم اسلام کے دور دراز ملکوں تک پہنچے) ایک ایسے آزمائشی دور سے گزر رہا ہے جس کی نظیر گذشتہ تاریخ میں صدیوں تک نہیں ملتی، اس دورِ آزمائش میں مسلمانوں کا صرف ملی تشخص دین کی دعوت و تبلیغ کے مواقع و امکانات اور ملک و معاشرہ کو صحیح راستہ پر لگانے اور اس کائنات کے خالق و مالک کی صحیح معرفت اور عبادت اور دین صحیح کی طرف رہنمائی کی صلاحیت اور استطاعت تو بڑی چیز ہے (کم سے کم اس ملک ہندوستان میں) ان کی زندگی کا تسلسل، جسمانی وجود، عزت و آبرو، مساجد و مدارس، اور صدیوں کا دینی و علمی اثاثہ اور قیمتی سرمایہ بھی خطرہ میں پڑ گیا ہے، وہ نہ صرف دور دراز قصبات اور دیہاتوں میں بلکہ بڑے بڑے مرکزی شہروں میں بھی جہاں وہ بڑی تعداد میں بستے ہیں، اور ممتاز صلاحیتوں، ذہنی امتیازات اور مہارتوں کے مالک ہیں، کچھ عرصہ سے خوف و ہراس کی زندگی گزار رہے ہیں اور کہیں کہیں ان کا

نقشہ بعینہ وہ ہو گیا ہے جس کی تصویر قرآن مجید نے اپنے بلیغ و معجزانہ الفاظ میں اس طرح کھینچی ہے:

ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ. (سورہ توبہ، آیت: 118)

زمین اپنی ساری وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر دوبھر ہو گئیں۔

اس صورت حال کی اگر کوئی مثال پچھلی تاریخ میں مل سکتی ہے تو وہ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں تاتاریوں کا ترکستان، ایران اور عراق پر حملہ ہے، جس نے شہر کے شہر بے چراغ اور تودہ خاک بنا دیے تھے اور عالم اسلام کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں، لیکن وہ ایک نیم وحشی قوم کی فوجی یلغار تھی جس کے ساتھ کوئی دعوت، تہذیب، فلسفہ، مذہبی نفرت و تعصب اور جسمانی و معنوی نسل کشی (Cultural Genocide) کا منصوبہ یا ارادہ نہ تھا، اور وہ کسی متوازی تہذیب و فلسفہ کے حامل تھے، اس وقت خوش نصیبی سے وہ اہل دل، صاحب روحانیت، دین کے مخلص اور صاحب تاثیر داعی و مبلغ بھی موجود تھے جن کے اثر و صحبت سے پوری کی پوری تاتاری قوم (جو لاکھوں کی تعداد میں تھی) اسلام کی حلقہ بگوش ہی نہیں، دین حق کی حامی و محافظ اور علمبردار بن گئی اور اس نے متعدد وسیع و زبردست اسلامی تنظیمیں قائم کیں۔ مشہور مورخ پروفیسر (T.W. Arnold) اپنی کتاب ''دعوتِ اسلام'' (Preaching of Islam) میں لکھتا ہے:

''...لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے پھر اُٹھا اور واعظینِ اسلام نے انہیں وحشی مغلوں کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم اُٹھا نہ رکھا تھا مسلمان کرلیا۔''

T.W. Arnold, The Preaching of Islam (London, 1935, Page 227)

آج کی صورت حال خاص طور پر جن ملکوں میں مسلمان عددی اقلیت میں ہیں اور ماضی میں وہ حکومت و اقتدار کے منصب پر فائز رہ چکے ہیں، دوسرے اسلامی ممالک سے مختلف اور زیادہ نازک ہے، یہاں ان کی تاریخ (ایک علمی اور سیاسی سازش کے تحت) اس طرح مرتب اور پیش کی گئی ہے کہ وہ اکثریت میں بغض و نفرت اور ''انتقامی جذبہ'' پیدا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے، پھر بعض اوقات ان ملکوں کی سیاسی قیادتوں یا وقتی پیش آمدہ مسائل میں مسلمانوں کی رہنمائی و نمائندگی کرنے والی تنظیموں اور جماعتوں نے غیر معتدل جذباتیت، عاقبت نااندیشی اور نام و نمود حاصل کرنے کے شوق میں ہنگامہ خیزی سے کام لینے کی غلطی کی، وہاں مسلمان شدید مذہبی منافرت اور تعصب، تہذیبی و ثقافتی محاذ آرائی (Confrontation) کا شکار ہوئے، پھر نصابِ تعلیم، صحافت (Press) اور ابلاغ

عامہ (Public Media) کے ذریعہ مسلمانوں کی آئندہ نسل کو اولاً تہذیبی و ثقافتی ارتداد، ثانیاً (خاکم بدہن) ایمانی و اعتقادی ارتداد کا شکار بنانے کا منصوبہ بنایا گیا اور اس کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، یہ حالات یقیناً نہ صرف ایمانی و مذہبی غیرت اور پختہ دینی شعور رکھنے والوں کے لیے بلکہ حالات پر سطحی نظر رکھنے والے عام مسلمانوں کے لیے بھی جو گردوپیش کے حالات کو دیکھتا، اخبار پڑھتا اور خبریں سنتا ہے سخت تشویش انگیز ہیں، وہ کبھی مایوسی اور بعض اوقات حالات کے سامنے سپر انداز ہو جانے پر بھی آمادہ کرتے ہیں۔

لیکن اس خدائے واحد پر ایمان رکھنے والے مسلمان کے لیے جس کے ہاتھ میں اس کارخانۂ عالم کی باگ ڈور ہے، اپنے دین کا محافظ، حق کا حامی، مظلوم کی مدد کرنے والا، پامال اور خستہ حال کو اُٹھانے والا اور سرکش و متکبّر کو نیچا دکھانے والا ہے اور جس کی شان ہے کہ "أَلاَ لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ" (دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا چلتا ہے) کوئی انقلاب اور تغیر حال ناممکن نہیں، اس خدائے واحد کے بارے میں مسلمان شہادت دیتا ہے کہ:

"کہو کہ اے خدا (اے) بادشاہی کے مالک تو جسے چاہے بادشاہی بخشے اور جس سے چاہے بادشاہی چھین لے اور جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے ہر طرح کی بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تو ہی بے جان سے جاندار پیدا کرتا ہے اور تو ہی جاندار سے بے جان پیدا کرتا ہے اور تو ہی جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق بخشتا ہے۔" (آل عمران:27-26)

ایک ایسے موقع پر جب ایک مفتوح و مغلوب قوم کے غالب آنے اور ایک فاتح اور غالب ملک کے مغلوب ہونے کے بارے میں نہ کوئی امید تھی نہ کوئی پیشین گوئی کی جرأت کر سکتا تھا۔ قرآن مجید میں صاف فرمایا گیا:

"پہلے بھی اور پیچھے بھی خدا کا حکم ہے اور اس روز مومن خوش ہو جائیں گے خدا کی مدد سے وہ جسے چاہتا ہے مدد دیتا ہے اور وہ غالب اور مہربان ہے۔"[1] (سورہ روم:4)

---

[1]: ساتویں صدی مسیحی کے آغاز میں ساسانی مملکت "ایران" کے بازنطینی سلطنت (روم و شام و مشرقی یوروپ) پر مکمل غلبہ پانے کے بعد اس کی پسپائی اور شکست اور رومیوں کے غلبہ کی طرف اشارہ ہے۔ 5ھ بعثت نبویؐ اور 616ء میں رومۃ الکبریٰ کی عین اس حالت نزع میں قرآن نے پیشین گوئی کی کہ رومی 9 سال کے اندر غالب ہو

لیکن اس تبدیلیٔ حال اور اس خطرہ سے بچنے کے لیے جواب مشاہدہ اور تجربہ کی شکل میں آ گیا ہے کچھ خدائی قانون، اس کے بھیجے ہوئے آخری پیغمبر انسانیت کی تعلیمات اور خود اس کا اسوہ اور سنت اور اس کے تربیت یافتہ اصحاب کاملین کا نمونہ عمل ہے، پیش نظر مقالہ میں قرآن و حدیث، سیرت نبوی اور اسوۂ صحابہؓ کی روشنی میں چند شرائط و ہدایات کو پیش کیا گیا ہے۔

① اس وقت دنیا کے تمام مسلمانوں اور خصوصیت کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے پہلا فرض اور ضروری کام رجوع الی اللہ، انابت، توبہ و استغفار اور دعا و ابتہال (گریہ وزاری) ہے۔قرآن مجید کی صریح آیت کا ترجمہ ہے:

''اے ایمان والو! مدد حاصل کرو صبر اور نماز سے بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

(البقرہ:153)

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا:

''بھلا کون بے قرار کی التجا کو قبول کرتا ہے جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور کون (اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے اور (کون) تم کو زمین میں (اگلوں کا) جانشین بناتا ہے۔'' (النمل:62)

دوسری جگہ فرمایا گیا:

''اے ایمان والو! اللہ کے آگے سچی توبہ کرو، عجب کیا ہے کہ تمہارا پروردگار (اسی سے) تمہارے گناہ تم سے دور کر دے۔'' (التحریم: 8)

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تھا کہ ذرا بھی کوئی پریشانی کی بات پیش آئی تو فوراً نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے اور دعا میں مشغول ہو جاتے۔حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی کی بات پیش آتی تو آپ نماز شروع کر دیتے۔''

(ابوداؤد)

---

جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔مشہور یوروپین مورخ ایڈورڈ گبن (Edward Gibbon) لکھتا ہے:

''محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے، جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ ہرقل کے ابتدائی 12 سال سلطنت روما کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔''

(Decline and Fall of the Roman Empire تاریخ زوال روما جلد 3، صفحہ 303، مطبوعہ، 1890ء)

حضرت ابوالدرداء کی روایت ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب تیز ہوا والی رات ہوتی تو آپ کی پناہ گاہ مسجد ہوتی۔ آپؐ وہاں اس وقت تک تشریف رکھتے کہ ہوا ٹھہر جاتی اگر آسمان میں سورج یا چاند کو گہن پڑتا تو نماز ہی کی طرف آپؐ کا رجوع ہوتا اور آپؐ اس وقت تک مشغول رہتے کہ گہن ختم ہو جاتا۔''

(الطبرانی فی الکبیر)

اس بنا پر اس وقت دعا و مناجات، تلاوتِ قرآن پاک، خاص طور پر ان آیات اور سورتوں کی تلاوت کا اہتمام کیا جانا چاہئے، جن میں امن و امان اور فتح و نصرت کا مضمون آیا ہے مثلاً ''اَلَمْ تَرَ کَیْفَ''، ''لِإِیْلَافِ قُرَیْشٍ'' اور آیت کریمہ ''لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَکَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ'' کا وِرد۔

② دوسری شرط اور ضروری اور فوری قدم یہ ہے کہ معصیتوں سے توبہ کی جائے، گناہوں سے اجتناب اور احتراز برتا جائے، حقوق کی ادائیگی ہو، اس سلسلے میں خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (م 101ھ) کے اس ایک فرمان کا حوالہ دینے پر اکتفا کی جاتی ہے، جو انہوں نے اپنی افواج کے ایک قائد کو بھیجا۔

وہ تحریر فرماتے ہیں:

''اللہ کے بندہ امیر المومنین عمر کا یہ ہدایت نامہ منصور بن غالب کے نام جبکہ امیر المومنین نے ان کو اہل حرب سے اور ان اہل صلح سے جو مقابلہ پر آئیں۔ جنگ کرنے کے لیے بھیجا ہے، امیر المومنین نے ان کو یہ حکم دیا ہے کہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کریں۔ کیونکہ اللہ کا تقویٰ بہترین سامان مؤثر ترین تدبیر اور حقیقی طاقت ہے، امیر المومنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمن سے زیادہ اللہ کی معصیت سے ڈریں، کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لیے خطرناک ہے۔ ہم اپنے دشمن سے جنگ کرتے ہیں اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ان پر غالب آ جاتے ہیں۔ اگر ہم اور وہ دونوں معصیت پر برابر ہو جائیں تو وہ قوت اور تعداد میں ہم سے بڑھ کر ثابت ہوں گے، اپنے گناہوں سے زیادہ کسی کی دشمنی سے چوکنا نہ ہوں، جہاں تک ممکن ہو اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ کریں''۔

(تاریخ دعوت و عزیمت، جلد 1، صفحہ 45-46)

③ غیر مسلموں کو اسلام سے متعارف کرانے کی کوشش کریں اور ایسے کسی موقع کو بھی ہاتھ سے

جانے نہ دیں، ہمارے پاس سب سے بڑی طاقت وہ فطری، معقول، پرکشش اور دل و دماغ کو تسخیر کرنے والا دین، قرآن مجید کا اعجازی صحیفہ اور نبی آخر الزماں علیہ ﷺ کی دلکش اور دل آویز سیرت اور اسلام کی قابل فہم اور قابل عمل اور عقل سلیم کو متاثر کرنے والی تعلیمات ہیں، جو اگر کھلے دماغ اور صاف ذہن سے پڑھی جائیں تو اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں، اور انہیں نے دنیا کے وسیع ترین رقبہ اور متمدن اور ذہین قوموں کو اپنا عاشق اور اپنے اوپر کاربند بنا لیا اور ملک کے ملک (جو اپنی صدہا سال کی تہذیبیں، فلسفے اور حکومتیں رکھتے تھے) ان کے حلقہ بگوش اور ان کے داعی و مبلّغ بن گئے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک میں اس فرض کی ادائیگی میں اور اپنی اس ذمہ داری کے احساس و شعور میں بڑی کوتاہی کی، اس کا نتیجہ ہے کہ یہاں کی اکثریت اسلام کی ان روز مرہ کی خصوصیات، نشانیوں اور اذان و نماز (جو شہروں، دیہاتوں اور محلوں میں پنج وقتہ ہوتی ہے) کے بارے میں بعض اوقات ایسے سوالات کرتے ہیں کہ بجائے ان پر ہنسی آنے کے اپنی کوتاہی پر رونا آنا چاہئے۔ وہ ان کے مفہوم و مطلب سے اتنے ناواقف ہیں جن کا قیاس میں آنا مشکل ہے، ان کے سلسلہ میں ایسے تجربے کثرت سے سفر کرنے والوں اور غیر مسلموں سے میل جول رکھنے والوں کو دن رات پیش آئے ہیں۔[1] اس مقصد کے لیے اُردو اور انگریزی اور ہندی میں اسلام کے تعارف میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔

④ اس سب کے ساتھ اس ملک میں جس میں صدہا سال سے مسلمان رہتے چلے آئے ہیں اور بظاہر ان کو اسی ملک میں رہنا ہے بقائے باہم (Coexistence) انسانی اور شہری بنیادوں پر اتحاد و تعاون اور انسانی جان اور عزت و آبرو کے تحفظ اور انسان کے احترام اور اس سے محبت کی تبلیغ اور تلقین ضروری ہے، جو اس ملک کی فضا کو مستقل طور پر معتدل اور پرسکون بلکہ پرراحت اور باعزت رکھنے کی ضامن ہے، اور جس کے بغیر اس ملک کے (جس کے لیے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا

---

[1]: راقم نے اپنی کتاب ''ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں'' میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس پر اظہار تعجب و شکوہ۔ [2]: مثال کے طور پر ''اسلام کیا ہے؟'' (از: مولانا محمد منظور نعمانی) ''ہندوستانی مسلمان ایک نظر میں'' (از راقم) ان سب کے ہندی، انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں۔ ''رحمۃ للعالمین'' (از: قاضی محمد سلیمان منصور پوری) "Introduction to Islam" (از: ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ) ان کے علاوہ دوسری مفید کتابیں اور رسائل:

مرکز اور دلیس ہونا مقدر ہو چکا ہے) ترقی اور نیک نامی الگ رہی، امن و امان اور سکون و اطمینان کے ساتھ باقی رہنا بھی مشکل ہے، یہ تحریک ''پیامِ انسانیت'' کے نام سے کئی سال پہلے شروع کی گئی اور ہندوستان کے تقریباً تمام مرکزی شہروں میں اس کے بڑے بڑے جلسے ہوئے جن میں خاصی تعداد میں غیر مسلم دانشور، فضلاء، سیاسی کارکن اور رہنما بھی شریک ہوئے۔ اس کے تعارف اور اس کی ضرورت کی تشریح اور اس کے پیغام پر خاص لٹریچر اُردو، ہندی اور انگریزی میں تیار ہو چکا ہے اور اہل شوق کو آسانی کے ساتھ دستیاب ہو سکتا ہے۔

⑤ ایک اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں (خاص طور پر جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور وہاں خطرات اور آزمائشوں کا امکان ہے) صلح پسندی، صبر و تحمل بلکہ ایثار و فیاضی کے ساتھ، عزم و ہمت صبر و ثبات، شجاعت و دلیری کی صفت، راہِ خدا میں مصائب برداشت کرنے اور اس پر اللہ کے اجر و ثواب کی طمع اور جنت اور بقائے رب کا شوق اور شہادت فی سبیل اللہ کے فضائل کا استحضار بھی موجود و زندہ رہنا چاہیے، اس کے لیے ان کو صحابۂ کرامؓ کے حالات اور داعیانِ اسلام کے کارناموں کا مطالعہ اور ان کا سننا سنانا جاری رکھنا چاہیے، جنہوں نے راہِ خدا میں بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھائیں اور قربانیاں دیں، اور اس کو افضل اعمال اور قربِ خداوندی و حصولِ جنت کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا۔

کچھ عرصہ پہلے پڑھے لکھے اور دیندار گھرانوں میں واقدی کی ''فتوح الشام'' کا منظوم اُردو ترجمہ ''صمصام الاسلام'' [1] گھروں اور مجلسوں میں پڑھا جاتا تھا، اور اس کا بڑا اثر تھا، اب بھی حکایاتِ صحابہؓ از: حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ صاحب سہارنپوری، ''شاہنامۂ اسلام''، از: حفیظ جالندھری، راقم السطور کی کتاب ''جب ایمان کی بہار آئی'' سے یہ کام لیا جا سکتا ہے، اُن کے مسجدوں مجلسوں اور گھروں میں پڑھنے کا رواج ڈالنا ہوگا۔

⑥ بڑی ضرورت اور آخری بات یہ ہے کہ اس وقت گھر کے ذمہ داروں، بچوں کے والدین اور موجودہ نسل کے لوگوں کو اپنے بچوں اور اپنی آئندہ نسل کو دین کی ضروریات سے، اسلامی عقائد، دینی فرائض اور اسلامی اخلاق سے واقف کرانے اور بنیادی تعلیم دینے کی ذمہ داری خود قبول کرنا

[1] : یہ منشی سید عبدالرزاق صاحب کلامی کی تصنیف ہے جو تیرہویں صدی ہجری کے عظیم مجاہد و مصلح حضرت سید احمد شہیدؒ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، وہ دو مرتبہ مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہوئی، ضرورت ہے کہ پھر اس کی طباعت و اشاعت ہو اور وہ گھروں اور مجلسوں میں پڑھ کر سنائی جائے۔

ہے اور ان پر لازم ہے کہ اس کو اپنا ایسا ہی انسانی و اسلامی فرض سمجھیں جیسا بچوں کی خوراک و غذا و لباس و پوشاک، صحت اور بیماری کے علاج کی ذمہ داری کو سمجھتے ہیں اور اس کا انتظام کرتے ہیں، بلکہ حقیقت میں دین کی ضرورت، عقائد کی تعلیم اور صحیح اسلامی عقیدہ کی حفاظت اور تقویت کا کام ان جسمانی و طبعی ضروریات کی تکمیل اور ان کے انتظام سے بھی زیادہ ضروری ہے، اور اس سے غفلت اُن انسانی ضروریات کی تکمیل سے غفلت برتنے اور اس کے بارے میں سہل نگاری سے کام لینے سے زیادہ خطرناک اور برے دائمی نتائج کا سبب ہے اس لیے کہ دینی تعلیم و تربیت اور صحیح اسلامی عقائد کا معاملہ ایک لافانی و ابدی زندگی (حیات بعد الموت) کے انجام اور اچھے بُرے نتائج سے تعلق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ صاف صاف ارشاد فرماتا ہے:

''اے ایمان والو بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے''

(التحریم:6)

اور صحیح حدیث میں آتا ہے: **کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ.**

(صحیح بخاری، کتاب الجمعہ، باب الجمعہ فی القریٰ والمدن)

تم میں سے ہر ایک حاکم اور زبردست اور زیرِ فرمان لوگوں کے ذمہ دار کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر ایک سے اس کی اپنی اس رعیت (زیر اثر لوگوں) کے بارے میں سوال کیا جائے گا، اس لیے گھر گھر، محلّہ محلّہ، مسجد مسجد اور مکتب مکتب اور مدرسہ مدرسہ بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے اور ہر عاقل و بالغ مسلمان اور عیال دار آدمی کو یہ ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔ □ □



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# ان کے نام جو کچھ کرنا چاہتے ہیں

از: مولانا عطاء الرحمٰن وجدی

---

سہارنپور کے ایک دینی و سماجی رہنما مولانا عطاء الرحمٰن وجدی کی زیر نظر تحریر فروری 1993ء میں کتابچہ کی شکل میں شائع ہوئی تا کہ بابری مسجد کی شہادت کے بعد ملّتِ اسلامیہ کے اضطراب اور احساسات کو تعمیری اور متعین رخ دیا جا سکے۔ (مرتب)

---

6 رد سمبر 1992ء کو ہندوستان کی تاریخ کا ایک سیاہ دن تھا جب بابری مسجد کی تاریخی عمارت ہندو جارحیت پسندوں کے ہاتھوں مسمار کر دی گئی۔ دستور کے حوالے، عدالت کا فیصلہ، جمہوریت اور سیکولرزم کے نعرے سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ قانون کے ہزاروں رکھوالوں کی موجودگی میں خود ان کے تعاون سے یہ عظیم سازش روبہ عمل آئی۔ مرکز کی نام نہاد اور سیکولر سرکار چین سے بیٹھی رہی، جو کچھ ہوا اس کا اُسے پہلے سے علم تھا بلکہ اس کی اجازت اور مرضی سے یہ سب کچھ ہوا۔ اس کے دلائل و شواہد موجود ہیں اور بذریعہ پریس منظر عام پر آ چکے ہیں۔

بابری مسجد شہید کر دی گئی مگر بابری مسجد کی جگہ موجود ہے اور اسلامی قانون کے تحت اصل مسجد وہ جگہ ہوتی ہے جس پر مسجد کی تعمیر کی جاتی ہے اس لیے مسلمانوں کا دعویٰ جوں کا توں برقرار ہے اور وہ اس سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ ملک کے وزیر اعظم کا یہ وعدہ بھی پوری دنیا کے سامنے ہے کہ وہ اسی جگہ مسجد تعمیر کرائیں گے۔ یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ ہوگا یا نہیں، یہ کہنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ جو پوری قوم کو یہ کہہ کر دھوکہ دے رہا ہو کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے اس پر بھروسہ کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ساتھ ہی ہندو فسطائی تنظیمیں جو ہراول دستہ کے طور پر آگے آگے رہتی ہیں بابری مسجد کی تعمیر کی کھلم کھلاّ مخالفت کر رہی ہیں بلکہ دوسری مساجد پر زبردستی قبضہ کرنے کی دھمکیاں بھی دے رہی ہیں۔

6 رد سمبر کو بابری مسجد کے انہدام کے ساتھ ہی وہ سارے اندازے اور بھروسے اس کے ملبہ میں دفن ہو گئے جو ہندوستان اور نام نہاد سیکولر حکومت اور اس کی انتظامیہ سے وابستہ کیے جاتے تھے۔

اگر چہ سچائی کو پہچاننے والی آنکھیں تو پہلے ہی سے دیکھ رہی تھیں کہ اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کو انصاف اور عزت اس حکومت اور نظام میں مل ہی نہیں سکتا جو مکر و فریب اور منافرت اور موقع پرست پر قائم ہو۔

بابری مسجد کے سانحہ پر مسلمانوں کا غم و غصہ فطری تھا، مسجد کا انہدام ان کی غیرت دینی اور ان کے ملی وجود پر ایک کاری ضرب تھی جس نے ان کے کلیجے زخمی کر دیئے، ان کے زخموں پر ہمدردی اور محبت کے پھائے رکھنے کے بجائے ان پر وحشیانہ جبر و ستم کا نمک چھڑکا گیا، ان کے جوانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کیے گئے، اور انہیں گھروں میں گھس کر زدوکوب کیا گیا۔ ان کی عزت و آبرو پر حملے کیے گئے، اور اس درندگی کے عمل میں بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہ چھوڑا گیا، قانون کے رکھوالوں نے اپنے ''معمولات'' اسی طرح ملک گیر پیمانے پر انجام دیئے جس طرح جب چاہے اور جہاں چاہے فرقہ وارانہ فساد کے موقعہ پر وہ انجام دیتے رہے ہیں۔

جن لوگوں میں عزتِ نفس کا احساس باقی نہیں رہا، جن کی ایمانی حمیت مردہ ہو چکی ہے، ان گنے چنے بے ضمیر لوگوں کو چھوڑ کر 6 ردسمبر کے سانحے نے ایک بار پھر ملت اسلامیہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ آج وہ اپنے ہی ملک میں بے وطنی کی حالت میں ہیں ان کا وطن جس کے وہ باشندے ہی نہیں، محسن بھی ہیں اور جس کے چپے چپے پر ان کی عظمت رفتہ کی نشانیاں موجود ہیں آج ان کے لیے ایک بے آب و گیاہ صحرا ہے جس میں کوئی نشانِ راہ انہیں نظر نہیں آتا۔ ان کے لیے یہاں نہ کوئی قانونی تحفظ ہے، نہ کوئی عدالت کی چارہ جوئی ہے، نہ کوئی ایسی سیاسی پناہ گاہ ہے جس پر وہ واقعی اعتماد کر سکیں۔ یقیناً ایک خاصی تعداد ان شریف لوگوں کی موجود ہے جو ان کے اس حالِ زار پر ہمدادانہ جذبات کا اظہار کرتے ہیں، مصیبت کی گھڑی میں اس ہمدردی کا شکریہ ادا کرنا ہم اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں مگر پوری متانت اور سنجیدگی سے یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ ہمدردی ہمارے دکھوں کا علاج اور ہمارے درد کی دوا نہیں ہے۔

ارباب سیاست کے منافقانہ وعدوں کی تو کوئی قدر و قیمت ہی نہیں رہ گئی آخر بار بار کے تجربات کی کسوٹی پر کھوٹا ثابت ہونے والی دھات کو سونا سمجھنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ سیکولر قوتوں کے ہاتھ مضبوط کریں۔ آخر کوئی بتائے کہ وہ کون سے ہاتھ ہیں اور کمزور کیوں ہیں؟ 45 سال تک ملکی اقتدار کی باگیں سنبھالنے والے ہاتھ کمزور کیوں؟ یہ ہاتھ پڑوسی ملکوں میں

امن اور جمہوریت کے نام پر فوجی مداخلت کر سکتے ہیں، سکھوں کے دربار صاحب کو مسمار کر سکتے ہیں، تو کمزور کیوں؟ اور اس سچائی کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ یہ یہی نام نہاد سیکولر قوت یا ملک کی ہندو فسطائیت کی پشت گاہ اور شریک کار ہے، بابری مسجد میں بت رکھوانے والی، اس کو ایک منظم سازش کے تحت ڈھانچہ کہنے والی اور بالآخر اسے مسمار کرنے والوں کی سرپرستی کرنے والی طاقت ہی اگر ''سیکولر طاقت'' ہے تو ہندو فسطائیت کے ساتھ ساتھ اس پر بھی لعنت اور 100 بار لعنت۔

یہ جال جس پر سیکولرزم اور جمہوریت کے خوشنما نعرے لکھے ہوئے ہیں اگر ہندوتو، کا خاموش حلیف ہے، اگر یہ مجرموں کو پھنسانے کے بجائے مظلوموں پر ہی اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے تو ہم سب سے پہلے اسی جال کو توڑ پھینکنے کی فکر کیوں نہ کریں؟ یہ ایک اہم سوال ہے جو اپنی مہیب صورت میں ہمارے سامنے کھڑا ہے جس کا صحیح جواب دینا انتہائی ضروری ہے۔ کیا اب بھی مسلمان ان سیاسی شعبدہ بازوں پر اعتماد کریں گے جنھوں نے انہیں مسلسل دھوکہ دیا، ان پر ستم ڈھائے ان کے دشمنوں اور غداروں کے ہاتھ مضبوط کیے، اپنے غلاموں کو ان کا لیڈر بنایا۔ اس چند روزہ زندگی کے پرستار، باطل اقتدار کے خدمات گار جو کچھ بھی ہوں مسلمانوں کے خیر خواہ اور رہ نما نہیں ہو سکتے۔ کیا اتنی بڑی سچائی کو جھٹلایا جاتا رہے گا؟

آج ہم مسلمان 1947ء کے نازک وقت جیسے ہی ایک موڑ پر کھڑے ہیں، ظالموں سے انصاف کی بھیک کبھی کسی کو ملی ہو، تو یقیناً ابھی تم بھی پیالہ ہاتھ میں لے کر ان دروازوں پر بھٹکتے رہو لیکن اگر ایسا نہیں ہوا اور کبھی نہیں ہوا اور کبھی نہیں ہوگا، تو ہوش میں آؤ اور خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے خود اعتمادی کے ساتھ جینے کا فیصلہ کرو، کیا یہ خدا پر توکل اور خود اعتمادی محض واعظانہ الفاظ ہیں، اگر ان کے کوئی معنیٰ تمہاری لغت میں نہیں ہیں تو انہیں اپنی لغت سے کھرچ کر پھینک دو۔ اس لیے کہ محض الفاظ کسی مسئلہ کا حل نہیں ہوتے، ہاں اگر ان کے معنیٰ ہیں اور یقیناً ہیں تو ان کو سمجھو اور ان کے تقاضوں کو پورا کرو۔ خواہ ان تقاضوں کی تکمیل کتنی ہی دشوار کیوں نہ ہو؟ زندہ قوموں کے لیے ہر دشواری آسان ہو جاتی ہے، اور مُردوں پر زندگی دشوار ہے۔

اگر تمہیں اب یقین ہے کہ اب تک ہم جن پر اعتماد کرتے رہے وہ نا قابل اعتماد ہیں، ہم جن راستوں پر چل کر منزل تک پہنچنا چاہتے تھے ان پر چل کر گرد و غبار کے سوا اور کچھ ہمارے حصے میں نہیں آ سکتا تو کچھ سچائیوں کو بھی آج ہی اچھی طرح سمجھ لو مبادا کل پھر خوابِ غفلت میں کھو جاؤ۔

طے کرو کہ تم ہندوستان میں کیوں اور کس طرح جینا چاہتے ہو، ایمان وعزت کے ساتھ یا ذلت و رسوائی کے ساتھ؟ اگر صرف زندہ رہنا ہی تمہارا مقصد ہے تو پھر ایمان وعزت کا نام لینا ہی چھوڑ دو، زندہ تو غلام بھی رہتے ہیں اور آقا بھی۔ مگر کیا اسلام کے آفاقی وانقلابی پیغام پر یقین رکھنے والے بھی غلامی پر رضامند ہو سکتے ہیں، اور ایسا ہے تو پھر اس سرزمین کے آفاقی وانقلابی پیغام پر یقین رکھنے والے بھی غلامی پر رضامند ہو سکتے ہیں اگر ایسا ہے تو پھر اس سرزمین پر حکمِ حق کو بلند کون کرے گا؟

اب تک دوسروں کی زبان بولتے رہے اب اپنی زبان استعمال کرو تاکہ تمہارے یقینِ کامل، تمہارے پیہم عمل اور تمہارے فاتح عالم محبت کا دنیا مشاہدہ کر لے۔ کسی شخص کا یہ کہنا کہ وہ ایک نئے سفر کے آغاز کی ساری تفصیلات سے تمہیں پیشگی آگاہ کر سکتا ہے۔ ایک بھاری بات ہے، متعدد تفصیلات تو وقت کے تقاضے خود ہی مرتب کراتے ہیں۔ جب کانٹے چبھتے ہیں تو ہاتھوں کو انہیں نکالنے کا ہنر بھی آ ہی جاتا ہے۔ شرط تو منزل کا یقین اور سفر کا مستحکم ارادہ ہے۔ یقیناً ہماری بے سروسامانی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے مگر منزل کی تمنا بجائے خود ایک بہت بڑا سامان ہے۔ تلاش کرو کیا واقعی یہ تمنا تمہارے دل میں زندہ ہے۔ اگر نہیں تو جاؤ سب سے پہلے ایسے دل لاؤ جن میں یہ زندہ تمنائیں پرورش پا رہی ہوں۔

آغازِ سفر میں کچھ اصولی باتیں اچھی معلوم ہونی چاہئیں۔ اگر یاد رہیں تو بہت سے نقصان سے بچا جا سکتا ہے۔ ہم جس دنیا میں سفر کرتے ہیں وہ خیالات کی نہیں بلکہ واقعات کی دنیا ہے۔ یہاں خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کو بھی اسی واقعات کی دنیا سے واسطہ تھا۔ دعوت، ہجرت، نصرت، جہاد محض اصطلاحیں نہیں مرحلوں کے نام ہیں۔ جو اسی واقعاتی دنیا میں پیش آتے ہیں۔ دنیا میں کچھ پانے کے لئے کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ اگر ان مرحلوں سے گزرنا اور منزلِ مراد تک پہنچنا ہے تو بہت کچھ چھوڑنا ہوگا، بولو، جواب دو، کیا تم کچھ چھوڑ سکتے ہو؟

دنیا کا کوئی انقلاب آسمان سے اس طرح نازل نہیں ہوتا کہ اس میں انسانوں کا کوئی اپنا کردار نہ ہو۔ یقیناً حالات انسان تبدیل نہیں کرتا مگر گھر بیٹھے کسی قوم کو سرخروئی کا پروانہ نہیں پہنچتا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی......

آج ہندوستان میں مسلمانوں کے وجود کو ان کی تاریخ وتہذیب کی علامتوں کو مٹانے کی جو سازشیں ہو رہی ہیں ان کا بنیادی محرک اسلام دشمنی ہے۔ اپنی اصلیت اور مزاج کے اعتبار سے اس

وقت ہندوستان میں نورِ توحید اور ظلمتِ شرک کی لڑائی ہے۔ مگر کیا خود مسلمان صحیح طور پر شمعِ توحید و رسالت کے پروانے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم 'نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم' کا مصداق ہوں۔ دوسرے ہمیں اس لیے ختم کر رہے ہیں کہ ہم اسلام کے نام لیوا ہیں اور ہم مرنے والوں کو خود یہ معلوم نہیں ہے کہ ہمیں کیوں مارا جا رہا ہے۔ اس نئے سفر کے آغاز میں اپنی حیثیت کا شعور اور وابستگی انتہائی ضروری ہے۔

## نیک و بد کی پہچان

ایک نئے حوصلہ اور ولولے کے ساتھ اپنی منزل کی طرف اگر قدم بڑھانا ہے تو نیک و بد کی پہچان پیدا کرو، مریض کا علاج کوئی طبیب کرتا ہے، مگر یہ فیصلہ کہ کون طبیب علاج کر سکتا ہے خود مریضوں اور تیمارداروں کو ہی کرنا ہوگا۔ افسوس اس قوم پر، جو رہبر و رہزن میں فرق نہ کر سکے جو ایک سوراخ سے بار بار ڈسی جائے، جبکہ اس کے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خبردار کر دیا ہو کہ مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔ حیف ان لوگوں پر جو اپنے محسنوں کو نہیں پہچانتے اور جنہیں نصیحتیں بری لگتی ہیں۔ اگر وہ تماشائی ہمارے لیے بیکار ہیں جو آج بھی مسلمانوں کو کچھ نہ کرنے کے گمراہ کن مشورے دیتے ہیں تو یقیناً وہ بھیڑ بھی کسی کام کی نہیں جو بغیر سوچے سمجھے جدھر چاہے چل پڑتی ہے اور جب چاہے بیٹھ جاتی ہے۔ اس اندھیری رات میں اگر صبح کی تلاش ہے تو سوچ سمجھ کر کسی کو رہنما بناؤ اور جسے رہنما بناؤ اس پر اعتماد کرو اس کی اطاعت کر کے اسے مضبوط کرو، قافلہ کی عافیت اسی میں ہے۔

## خود حفاظتی کا اصول

آج ہندوستان کے حکمرانوں نے ہمیں خود حفاظتی کے اصول کو اپنانے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون اس اصول کا انکار نہیں کرتا ایک فرد کو بھی یہ حق حاصل ہے اور ایک قوم کو بھی کہ جب دشمن اسے مٹانے کے درپے ہو اور ''دوست'' اس کا ساتھ نہ دیں تو اپنی حفاظت کے لیے ہر جائز قدم اُٹھائے۔ یہ خیال کہ اگر مسلمان اپنی حفاظت خود کرے گا تو برباد ہو جائے گا۔ سراسر ایک مہمل خیال ہے۔ جب تحریکات نے یہ ثابت کر دیا کہ کوئی بھروسہ کے قابل نہیں تو آخر ہم کیوں دوسروں پر بھروسہ کریں بعض عناصر ہماری جدوجہد میں معاون ثابت ہوں گے کیونکہ یہاں ہماری

طرح اور بھی مظلوم ہیں لیکن جدو جہد ہمیں خود ہی کرنی ہوگی، 20 کروڑ مسلمانوں کا بے حسی اور بزدلی کی موت مر جانا تاریخِ عالم کا سب سے زیادہ عبرتناک عجوبہ ہی ہوسکتا ہے۔

## اجتماعی جدو جہد

ہندوستانی مسلمانوں کی نئی نسل کو یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ انہیں جس فسطائیت کا مقابلہ کرنا ہے یا ایمان وعزت کے ساتھ زندہ رہنے کا جو مقصد حاصل کرنا ہے وہ مقصد تنہا حاصل نہیں ہوتا ان کا مقابلہ کسی ایک شخص سے نہیں ہے انہیں کسی پہلوان سے کشتی نہیں لڑنی ہے بلکہ ایک ظالم و جابر قوت اور انسان دشمن ذہنیت کی منصوبہ بند سازشوں کو ناکام بنانا ہے۔ یہ مقابلہ اجتماعی طور پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ مانا کہ اس وقت ان کی کوئی مضبوط اجتماعیت نہیں ہے اُن کے پاس مستحکم قیادت کا فقدان ہے اور مسلمانوں کی کوئی جماعت اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ تنہا سب کچھ کر سکے۔ اس دردناک حالت کا عوام اور خواص میں کون کتنا ذمہ دار ہے اس سوال سے صَرف نظر قابل عمل رویہ یہ ہے کہ یا تو ان جماعتوں کو ہی مضبوط کیا جائے اور اگر اس سے اتفاق نہ ہو تو کچھ نئی تنظیمیں وجود میں لائی جائیں اور اس کا سختی سے لحاظ رکھا جائے کہ یہ نئی اور پرانی تنظیمیں اپنے حصاروں میں قید ہوکر نہ رہ جائیں بلکہ مستقبل کی مضبوط قیادت کے صالح عناصر ثابت ہوں۔ 20 کروڑ مسلمانوں میں دس پانچ اچھی تنظیموں کا وجود مایوسی کا نہیں حوصلہ افزائی کا سامان بن سکتی ہیں۔ بشرطیکہ وہ خود کو اسلامی اجتماعیت کے اصولوں کا پابند رکھیں اور گروہی و جماعتی عصبیت کا شکار نہ ہو۔ یہاں ایک یہ سوال بھی اپنا جواب چاہتا ہے کہ کیا کسی تنظیم میں پانچ فیصد بھی مسلمان شامل ہیں؟ اگر نہیں تو یاد رکھئے کہ کسی تنظیم اور لیڈر کے پاس ایسا کوئی جادو کا ڈنڈا نہیں ہے کہ قوم اسے تعاون نہ دے اور وہ کوئی کرشمہ کر دکھائے۔

## عجلت پسندی

ہماری ایک کمزوری یہ ہے کہ ہم بہت جلد سب کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ خدا نے قوموں کے عروج و زوال کے لیے جو اصول بنائے ہیں وہ اٹل ہیں، دس پانچ سال قوموں کی زندگی میں کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتے آج جن لوگوں نے ہندو قوم کے ایک طبقہ میں نفرت کا زہر گھول دیا ہے وہ کسی فوری کوشش کا نتیجہ نہیں ہے اس کے پیچھے تقریباً ایک صدی کی منصوبہ بند کوششیں ہیں، خالی منزل کی آرزو ہی منزل پر نہیں پہنچا دیتی بلکہ اس کے لیے ایک طویل سفر کرنا پڑتا ہے اور راہ کی دشواریوں کا

سامنا بھی، نعرے اور تقریریں بھی اپنی افادیت رکھتی ہیں مگر سورج کا جو سفر 24 گھنٹوں میں طے ہوتا ہے اسے تبدیل کرنا کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ دو صدیوں کی غلامی اور اس کے اثرات کے خاتمہ کے لیے بھی یقیناً ایک مدت درکار ہے۔ فطرت کے اصولوں کے خلاف نہیں بلکہ خدائے فاطر السموات والارض کی ہدایات کے مطابق اپنے دشمنوں سے لڑنے اور اپنی منزل کے لیے چلتے رہنے کا مستحکم ارادہ کیجئے ایک دن منزل ہمارے قدموں تلے ہوگی۔

## کام بہت ہیں

آج مسلم نوجوان مضطرب ہے، اس کی روح بے چین ہے، محکومی و ذلت کا احساس اُسے جھنجھوڑ رہا ہے، اس کے دل میں حوصلے اور ولولے ہیں۔ وہ مظلوموں کی دادرسی کے لیے اپنے جان و مال کے تحفظ کے لیے کوئی بھی قدم اُٹھانے کا حوصلہ رکھتا ہے، ہندو فاشستوں کا مکر و فریب، فوج اور پولس کی گولیاں، اربابِ اقتدار کی جعل سازیاں کوئی بھی اس کے حوصلے کو ختم نہیں کر سکتا۔ جو لوگ ان نوجوانوں کو جذباتی کہہ کر ان کی ناقدری کر رہے ہیں وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ وہ اپنے ذاتی خیالوں، اپنے سیاسی ایوانوں اور ادارہ جاتی مصلحتوں میں گم رہ کر ہندوستان کی ملت اسلامی کی بربادی کا نظارہ کرتے رہیں اور اس تماش بینی کی پاداش میں خدا اور خلق کے مجرم بنتے رہیں۔ مگر یاد رکھیں کہ اس خالی خولی دانشوری سے وہ ملت کا نقصان ہی کریں گے، اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ انہیں ہمیشہ زندہ رہنے کی ہوس ہے تو ہوا کرے وہ بھی پوری نہ ہوگی۔ قوموں کی زندگی میں جان و مال کے تحفظ کی تعلیم ہی سب کچھ نہیں ہے یقیناً جان و مال کا تحفظ بہت ضروری ہے مگر ایسے وقت بھی آتے ہیں جب جان بچانا ہی نہیں جان قربان کر دینا بھی فرض ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ جہاد اور شہادت کی عظیم الشان اسلامی تعلیم کس لیے ہے؟ وہ برطانیہ جس کی سلطنت میں سورج غروب نہ ہونے کی بات کی جاتی تھی۔ اگر اس کے ظلم و جبر کے خلاف صف آرائی کارِ ثواب تھی تو آج ہندو فاشست کے خلاف لڑنا کیوں کارِ ثواب نہیں ہے۔ کیا خدا کے دین میں نعوذ باللہ کوئی ترمیم ہو گئی ہے؟ خدا ان علماء دین کی قبروں کو نور سے بھر دے جنھوں نے اپنے وقت کے جابروں کے خلاف کلمۂ حق کہا اور خدا ان نام نہاد قائدین اور دانشوروں پر رحم فرمائے جو اپنے ساتھ ساری ملت کو بزدل بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔

مگر مجھے اپنے ان عزیز نوجوانوں سے بھی کچھ کہنا ہے، جن کے پاس قابل قدر جذبات کا اُمڈتا ہوا طوفان ہے مگر اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ ان کے مخلصانہ جذبات انتہائی قابل قدر ہیں، یہ ہی وہ آخری سرمایہ ہے کہ اگر وہ ضائع ہو گیا تو پھر کچھ باقی نہ رہے گا۔ جس قوم اور ملت کی غیرت و حمیت بھی باقی نہ رہے اس کا کچھ باقی نہیں رہتا۔ مگر خالی جذبات کے سہارے ساری لڑائی نہیں لڑی جاسکتی۔ خالی جذبے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسے نہ تو دوا کہا جا سکتا ہے نہ قلم، نہ اخبار کہا جا سکتا ہے نہ تلوار اور نہ تنظیم و تحریک۔ اپنے ان جذبات کو پروان چڑھاؤ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس سوار کے لیے سواری بھی لاؤ۔ بہت کام کرنے کے ہیں، بہت کام کرنے ہیں۔ آج دسروں سے یہ پوچھنا کہ تم نے کیا کیا، کیا نہیں کیا؟ اس سے کہیں بڑھ کر یہ پوچھنا ہے کہ میں کیا کر سکتا ہوں؟ میں نے کیا کیا؟ جنگ تنہا وہ سپاہی نہیں لڑتا جو محاذ جنگ پر موجود ہوتا ہے اس کے پیچھے ایک پوری قوم ہوتی ہے، ایک پورا نظام ہوتا ہے۔ کیا آپ اس نظام میں کوئی بھی کردار ادا کر سکتے ہیں یا کر رہے ہیں، اگر نہیں تو کیوں؟

ایک مضبوط اجتماعیت کی تشکیل، جان و مال کا دفاع، شعائر اسلام کی حفاظت اسلام کی حفاظت دشمنوں کی سازشوں کا جواب، حالات کا متوازن تجزیہ، صحافت، سیاست، تجارت کے مختلف میدانوں میں آپ جہاں بھی قدم بڑھا سکتے ہیں، کوئی چھوٹی یا بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے آگے آیئے، خدا رب العالمین آپ کا حامی و ناصر ہے۔ (بابری مسجد کی شہادت کے سانحہ کی بازگشت)



# بابری مسجد کے سانحہ کے بعد مسلمانوں کا لائحۂ عمل

از: ڈاکٹر ظفر الاسلام
(شعبہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

6/دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کی شہادت کے بعد مسلمانانِ ہند کے اذہان وقلوب میں قیامت بپا تھی اور ہر طرف خوف وہراس کا سماں تھا۔ ایسے حالات میں مسلمانوں کے لیے ایک لائحۂ عمل کے طور پر زیر نظر تحریر لکھی گئی تھی جو فروری 1993ء میں ''شہید بابری مسجد'' کتاب میں شامل کی گئی۔ یہ تحریر موجودہ صورت حال میں بھی غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔ (مرتب)

6/دسمبر 1992ء کو بابری مسجد کو منہدم کرنے کا واقعہ ایسا سنگین، شنیع وشرمناک ہے جس نے بلا تفریق مذہب وملّت اور بلا امتیاز مقام وعلاقہ ہر حساس دل اور ہر سنجیدہ ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور کیوں نہ ایسا ہو جب کہ یہ واقعہ دستور، قانون، عدلیہ کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے اور مذہبی رواداری، اقلیت کے حقوق، ملک کے سیکولر کردار اور اس کی جمہوری روایات، ہر ایک پر گھاتک وار ہے۔ اس کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے۔ اس واقعہ سے عدل وانصاف کے اصولوں کی پامالی، لاقانونیت اور انارکی کا جو مظاہرہ ہوا ہے وہ خود اس کی سنگینی کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے یہی وجہ ہے کہ ملک اور بیرونِ ہند میں اس کے خلاف جس شدید ردعمل کا اظہار ہوا ہے اور جس قدر سخت ترین لفظوں میں اس کی مذمت کی گئی ہے وہ شاید ہی کبھی دیکھنے میں آئی ہو۔

6/دسمبر کا واقعہ کوئی ہنگامی سانحہ نہیں تھا جو آناً فاناً پیش آ گیا بلکہ اس کا سرا 22/دسمبر 1949ء کی اس منحوس تاریخ کی رات سے ملتا ہے جب یہاں زبردستی مورتی رکھی گئی اور اس کو مندر بنانے کی مذموم کوشش کی گئی اور پھر اس کے مین گیٹ پر تالا لگا کر مسلمانوں کو یہاں نماز پڑھنے سے محروم کر دیا گیا۔ اس میں ایک کڑی کا اضافہ فروری 1986ء میں ہوا جب اس کا تالا کھولا گیا اور یہاں عام پوجا پاٹ شروع ہوئی اور اس میں ایک گرہ اس وقت اور لگی جب دسمبر 1989ء میں حکومت کی زیرِ نگرانی اسی کے قریب رام مندر کا شلانیاس کرایا گیا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسجد کے خلاف جو سازشیں و ریشہ دوانیاں 1949ء سے جاری تھیں اس کا ایک باب 6/دسمبر کو اختتام پر پہنچا۔ یہ کسی معمولی عمارت کے تاخت وتاراج کا ایک عام واقعہ نہیں ہے۔ جسے بھلایا جا سکے یا اثرات کو ذہنوں

سے کھرچا جا سکے۔ جیسا کہ وزیراعظم درس دے رہے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک مقدس عبادت گاہ کی بے حرمتی و مسماری ہے جس سے ایک دو نہیں لاتعداد مسلمانوں کے مذہبی جذبات وابستہ ہیں بلکہ یہ واقعہ سیکولرزم کی پاسبانی، جمہوری اصولوں کی برقراری اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے اہل حکومت کے بلند و بانگ دعوؤں کے کھوکھلے پن کا بھی آئینہ دار ہے۔ یہ اس تاریخی مسجد کے انہدام کا مذموم ترین واقعہ ہے جو نہ صرف اپنے پیچھے ایک لمبی تاریخ رکھتی ہے بلکہ جس سے متعلق رونما ہونے والے واقعات میں لوگوں بالخصوص مسلمانوں کو زبردست جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔

6 دسمبر کے شرمناک واقعہ کے بعد عدل و انصاف اور قانون کی حکمرانی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اس واقعہ کے ذمہ داروں کے خلاف سخت ترین قانونی و انتظامی کارروائی کی جائے، اس لئے کہ وہ لوگ جو عدلیہ کے وقار کو مجروح کریں۔ حلف ناموں کے تقدس کو پامال کریں، اور لاقانونیت و انارکی کا ننگا ناچ ناچیں اور فرقہ وارانہ منافرت و عداوت کی آگ لگا کر خون کا بازار گرم کریں وہ کسی بھی طرح اس کے مستحق نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی رعایت کی جائے۔ اس لئے کہ انہیں قرار واقعی کی سزا دینا اور ان کے ساتھ نرمی برتنا نہ صرف مسلمانوں کے لئے تباہ کن ہوگا بلکہ ملک کی سالمیت اور اتحاد کے لئے بھی بڑا خطرہ ثابت ہوگا۔ یہ بات ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ کسی بھی ملک میں لاقانونیت آتی ہے تو اس کا وبال کسی خاص فرقہ وطبقہ تک محدود نہیں رہتا۔ یہ پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ 6 دسمبر کو اجودھیا میں جس لاقانونیت کا کھلے عام مظاہرہ کیا گیا ہے اس کا علاج نہ تو رسمی گرفتاری ہے اور نہ آر.ایس.ایس.، وی.ایچ.پی. اور بجرنگ دل جیسی تخریب پسند فرقہ پرست تنظیموں پر اس انداز کی پابندی عائد کرنا ہے کہ مبصرین کی رائے میں اصطبل اس وقت بند کر دیا گیا جب گھوڑے نکل کر بھاگ چکے تھے۔ اگر مرکزی حکومت یہ تسلیم کرتی ہے کہ بابری مسجد کے انہدام میں عدلیہ اور دستور ہند کی اعلانیہ خلاف ورزی ہوئی ہے تو پھر جو لوگ بھی اس کے ذمہ دار تھے، انہیں قانون کے مطابق سخت سے سخت اور عبرتناک سزا دینے میں حکومت کی ڈھیل و ہچکچاہٹ بلاشبہ لاقانونیت کو بڑھاوا دینا ہوگا۔

عدلیہ کا احترام اور قانون کی بالاتری کا اصول اس بات کا بھی شدت سے متقاضی ہے کہ بابری مسجد اپنی اصلی جگہ تعمیر کی جائے۔ یہ بات سبھی کو معلوم ہے کہ دسمبر کے واقعہ کے بعد ہی وزیراعظم دوبارہ مسجد تعمیر کرنے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ ان کی کابینہ کے وزراء بھی اس وعدہ کو بار بار دہرا رہے

ہیں۔ کانگریس پارٹی بھی حکومت کے اس فیصلہ کی تائید کرتی رہتی ہے۔ لیکن اس مسئلہ کا ایک تشویشناک پہلو یہ ہے کہ مسجد کب اور کہاں تعمیر ہوگی اس پر شروع ہی سے مرکزی حکومت کا موقف غیر واضح بلکہ وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ وزیر اعظم اور ان کے رفقاء کابینہ کے ابتدائی بیانات سے یہ صاف واضح ہوتا تھا کہ مسجد کی تعمیر نو کا کام جلد ہی شروع ہو جائے گا۔ پھر ایک مرکزی وزیر کا بیان سامنے آیا کہ ایک سال کے اندر ہی مسجد کی تعمیر مکمل ہو جائے گی۔ اس کے بعد مرکزی حکومت کی جانب سے صاف صاف لفظوں میں یہ واضح کیا گیا کہ حکومت نے مسجد کی تعمیر کے لئے کوئی میعاد یا مدت متعین نہیں کی ہے۔ جہاں تک اس کا سوال ہے کہ مسجد کہاں تعمیر ہو اس کے بارے میں بھی حکومت کا کوئی واضح موقف سامنے نہیں آیا۔ سب سے پہلے یہ تاثر دیا گیا کہ اس کی تفصیلات بعد میں طے کی جائیں گی۔ اس کے بعد نامہ نگاروں نے مختلف مواقع پر جب وزیر اعظم یا ان کے وزراء سے اس مسئلہ کے متعلق ان کی رائے جاننا چاہی تو یہی جواب ملا کہ اس وقت اصل مسئلہ حالات کو نارمل بنانے کا ہے۔ کبھی یہ کہہ کر صاف جواب سے احتراز کیا گیا کہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ اجودھیا میں مندر و مسجد ایک دوسرے کے قریب جلد بنائی جائیں۔ کس مقام پر ان کی تعمیر ہو یہ کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔ بعض دفعہ یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ مسجد کی دوبارہ تعمیر کے مسئلہ میں کچھ قانونی پیچیدگیاں ہیں۔ ماہرین قانون سے صلاح و مشورہ کے بعد ہی کوئی قطعی فیصلہ لیا جائے گا۔ اس طرح کے بیانات اور 6 ردسمبر کے بعد کے حکومت کے اقدامات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ مرکزی حکومت اس کام میں کتنی سنجیدہ اور اپنے وعدہ کی کس قدر پابند نظر آ رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح سیاسی قوت ارادی کی کمی اور ووٹوں کی سیاست نے مرکزی حکومت کو بابری مسجد کو تخریب کاری سے بچانے کے لئے کسی موثر اقدام سے باز رکھا۔ اس کی یہی پالیسی مسجد کی دوبارہ تعمیر میں بھی مانع بن رہی ہے۔

یہاں اس جانب اشارہ بے موقع نہ ہوگا کہ 6 ردسمبر اور اس سے قبل کے واقعات کی تفصیل اور مبصرین و ماہرین قانون کی رایوں کی روشنی میں اب یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ مرکزی حکومت نے بابری مسجد کے تحفظ کے لئے بروقت موثر اقدام نہ کرنے کے جتنے وجوہ و دلائل پیش کئے ہیں ان کی حیثیت عذر لنگ یا اپنی غلطیوں کی پردہ پوشی کی ناکام کوشش کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ دستوری قوانین کے ماہرین کی رائے واضح طور پر سامنے آ چکی ہے کہ 6 ردسمبر سے قبل اجودھیا میں بابری مسجد کے تحفظ کے لئے مرکزی حکومت کے اقدام کے لئے قانونی طور پر نہ تو یہ امر مانع تھا کہ

اسے متنازعہ عمارت کا ریسیور نہیں مقرر کیا گیا اور نہ 6 / دسمبر کو پیرا ملٹری فورسیز کے استعمال کے لئے بی. جی. پی. کی صوبائی حکومت اور اس کی مخالفت کوئی قانونی رکاوٹ تھی۔ دستور کی دفعہ 356 کے تحت صوبائی حکومت کو برخاست کرنے اور وہاں صدر راج نافذ کرنے کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے۔ دستور ہند میں بعض ایسی دفعات بھی (مثلاً آرٹیکل 355) موجود ہیں جن کے تحت مرکزی حکومت اتر پردیش میں بی. جی. پی. حکومت کے رہتے ہوئے بھی اپنے طور پر اقدام کر کے مرکزی فورسیز کو استعمال کر سکتی تھی اور مسجد کو مسماری سے بچا سکتی تھی۔ نہ مرکز کی اس توجیہ میں جان ہے کہ فورسز کو ضروری ہدایات دینے کے لئے وہاں کوئی مجسٹریٹ نہ تھا اور ہی اس دلیل میں کوئی وزن ہے کہ فورسز جب اجودھیا کی جانب بڑھنے لگیں تو ڈی ایم نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ صوبائی حکومت کی جانب سے فورس کو استعمال کرنے کا آرڈر نہیں ہے۔ مزید برآں ایک عام دیہاتی ان پڑھ بھی اسے بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ راستہ میں جلتے ہوئے ٹائر ہماری طاقتور مجرب و جدید آلات حرب سے مسلح مرکزی فورسیز کے لئے آگے بڑھنے سے کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ 6 / دسمبر کے واقعہ کے بارے میں مرکزی حکومت نے یہ صاف طور پر تسلیم کیا کہ یہ پہلے سے بنے ہوئے منصوبہ کے تحت رونما ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ خود اپنی کمزوری کا اظہار یا غلطی کا اعتراف ہے، بابری مسجد کو منہدم کرنے کی اتنی بڑی سازش رچی جائے اور ایک تاریخی عبادت گاہ کو مسمار کرنے کا اتنا خطرناک منصوبہ بنایا جائے اور مرکزی حکومت کی ایجنسیوں کو اس کی خبر نہ ہو یا خبر ہونے کے باوجود وہ حکومت کو اس سے آگاہ کرنے سے قاصر رہے۔ خفیہ ایجنسیوں کی غیر تشفی بخش کارکردگی پر کھلا ہوا فیصلہ ہے اور حکومت کے اس اہم محکمہ کی کمزوری کی واضح دلیل ہے اور اگر اس منصوبہ کی آگاہی ملنے کے باوجود حکومت نے اس کو ناکام بنانے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا تو دستور و قانون اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ میں کوتاہی و ناکامی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ یہ بہت پرانی مثل ہے کہ آدمی ایک غلطی کو چھپانے یا اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش میں نہ معلوم کتنی غلط بیانیوں کا سہارا لیتا ہے۔ یہی مثل اس وقت مرکزی حکومت کے سلسلہ میں پوری طرح صادق آرہی ہے۔ حکومت کی اصل غلطی کی تلافی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ وہ دوبارہ بابری مسجد کو اس کی اصل جگہ پر تعمیر کرائے۔

قابل غور بات یہ ہے کہ مرکزی حکومت بار بار اپنے اس فیصلہ کا اعلان کر رہی ہے کہ بابری مسجد دوبارہ تعمیر کی جائے گی اور یہ کہ اجودھیا میں مسجد و مندر دونوں بنائی جائیں گی، لیکن یہ بات قطعی طور

پر نا قابل فہم ہے کہ اگر مسجد اپنی اصلی جگہ کے بجائے کہیں بنائی گئی تو وہ منہدم کی گئی بابری مسجد کی دوبارہ تعمیر کیسے کہلائے گی۔ اور اس سنگین حادثہ کی تلافی کیسے ہو سکے گی۔ اصل مسئلہ اجودھیا میں محض کسی جگہ مسجد بنانے کا نہیں ہے بلکہ اس جگہ بنانے کا ہے جہاں پہلے موجود تھی۔ اس کے بغیر نہ تو اس سے متعلق عدالت کے فیصلہ کا احترام ہو سکتا ہے۔ نہ دستور و دستوری قوانین کی برتری ثابت ہو سکتی ہے۔ اور نہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی یقین دہانی پوری ہو سکتی ہے۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ بی. جے. پی.، آر. ایس. ایس.، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل وشیو سینا کی ناپاک سازش اور مرکزی حکومت کی مجرمانہ خاموشی و بے عملی (اور لازماً بالواسطہ ان کی حمایت) کے نتیجہ میں کارسیوکوں نے مسجد کو گرانے اور وہاں ایک عارضی نیا ڈھانچہ کھڑا کرنے کا گھناؤنا کام انجام دیا ہے اور اس طرح عدالت کے آرڈر اصل مقدمہ پر آخری فیصلہ ہونے تک اس کی موجودہ حالت بغیر کسی تبدیلی کے باقی رکھی جانے کی اعلانیہ خلاف ورزی کی ہے۔ اس خلاف ورزی کو حکومت بھی تسلیم کرتی ہے اس لئے حکومت و اس کی انتظامیہ پر جو عدالت کے فیصلہ کو نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے، یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ مسجد اسی جگہ تعمیر کرائے جہاں یہ پہلے موجود تھی۔ یا مسلمانوں کو ایسا کرنے کی اجازت دے، اسی عمل کے ذریعہ ہی بابری مسجد کی سابقہ حالت (Status quo) بحال ہو سکتی ہے جو عدلیہ کے احترام کا لازمی تقاضا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہے کہ بابری مسجد کو مسماری سے نہ بچا کر صوبائی حکومت نے سپریم کورٹ میں دیئے گئے اس حلفیہ بیان کو توڑا ہے کہ ''متنازعہ ڈھانچہ'' کی پوری طرح حفاظت کی جائے گی اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیا جائے گا، اس حلفیہ بیان کے تقدس کی بحالی اور عدالت کی توہین کی تلافی کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ بابری مسجد اپنی اصل پرانی جگہ پر تعمیر کی جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ 6 ردسمبر کے شرمناک واقعہ پر ملک کے مختلف طبقوں و علاقوں سے تعلق رکھنے والے حساس، انصاف پسند اور امن دوست لوگوں نے جو تاثرات و احساسات ظاہر کئے ہیں وہ ملک میں سیکولرزم کی بقاء جمہوری روایات کی برقراری اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے بہت خوش آئند و حوصلہ افزا ہیں، اس حادثہ پر پوری ہندوستانی قوم کے لئے باعثِ ننگ و عار مہاتما گاندھی کے قتل کے بعد آزاد ہندوستان کا سب سے سنگین واقعہ ملک کے تاریک ترین دن سیکولرزم کے ڈھانچہ کی مسماری، جمہوری روایات پر ضرب کاری، عدلیہ کے ساتھ وشواش گھات و عدالت عالیہ

کی توہین، قانون کی حکمرانی کی خلاف ورزی، دستور کے تقدس کی پامالی، ہندوستان کے روادار چہرہ پر بدنما داغ اور اقلیتوں کے حقوق پر دست درازی جیسے مختلف انداز میں ردِ عمل ظاہر کیا گیا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی قابل تعریف ہے کہ مبصرین، قانونی ماہرین، صحافیوں اور سیاستدانوں نے متعدد مضامین میں اس واقعہ پر بڑے بے باکانہ انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔ اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بہت بے لاگ تبصرہ کیا ہے ان تمام بیانات اور مضامین پر نظر ڈالنے سے یہ حیرت ناک پہلو سامنے آتا ہے کہ ان کے پیش کرنے والوں یا لکھنے والوں میں بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے مسجد کو اصل جگہ پر دوبارہ بنائے جانے پر زور دیا ہو یا اس مسئلہ کی نمایاں طور پر ترجمانی کی ہو، وہ لوگ جنہوں نے بابری مسجد کے انہدام، جمہوریت کا قتل اور عدلیہ کی کھلی ہوئی توہین قرار دیا ہے ان کے یہاں بھی اس بات کے لئے پرزور مطالبہ مفقود نظر آتا ہے کہ مسجد کو اس کی اصل جگہ پر بلا تاخیر تعمیر کی جائے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کے بغیر سیکولرزم کی بنیادیں مضبوط ہوسکتی ہیں اور جمہوریت کو زندگی مل سکتی ہے یہ ہر باشعور و انصاف پسند ہندوستانی کے غور کرنے کی بات ہے، دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض روشن خیال ماہرین قانون نے 6 ردسمبر کے واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے بابری مسجد کی تعمیر نو کے مسئلہ کو اہمیت نہ دیتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اصل مسئلہ عدالت عالیہ کا اختیار قائم رکھنا اور قانون کی حکمرانی باقی رکھنا ہے۔ یہ بات ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ان مقاصد کے حصول کا تقاضا ہی یہ ہے کہ بابری مسجد دوبارہ تعمیر کی جائے اور اس کی سابقہ حالت بحال کی جائے۔

اس مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سیاسی پارٹیاں اور ان کے لیڈر جنہوں نے شروع میں بابری مسجد کی دوبارہ تعمیر کا پرزور مطالبہ کیا تھا ان میں سے بعض نے اب اس مسئلہ پر سرد مہری اختیار کر لی ہے بلکہ وہ اپنے پارٹی ورکرس کو اب یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ آئندہ انتخابات پر اس کے اثرات کے پیش نظر وہ اس مطالبہ پر زور نہ دیں۔ اہل سیاست اور سیاسی مبصرین کی جانب سے اس مسئلہ پر مختلف تجاویز سامنے آرہی ہیں، ان میں سے چند اہم یہ ہیں۔

❶ الہ آباد ہائی کورٹ میں بابری مسجد سے متعلق اصل مقدمہ پر آخری فیصلہ کے بعد تعمیر کیلئے کوئی اقدام کیا جائے۔ ❷ بابری مسجد رام جنم بھومی سے متعلق تمام زیر سماعت مقدمات کو یکجا کر کے سپریم کورٹ کو ان پر فیصلہ کے لئے حوالہ کیا جائے۔ ❸ مختلف مذاہب کے رہنماؤں سے صلاح و مشورہ کے بعد ہی یہاں مسجد و مندر بنانے کے لئے پیشرفت کی جائے۔ ❹ مسجد و مندر کے بجائے

اسے کثیر المذاہب عبادت گاہ بنایا جائے۔ ⑤ اسے ایک قومی یادگار بنا کر محکمہ آثارِ قدیمہ کے حوالہ کر دیا جائے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ انسانی مذہبی و جمہوری قدروں کو ملیامیٹ کر کے بابری مسجد کو جس طرح شہید کیا گیا ہے اور ایک دو نہیں کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کو جس بری طرح مجروح کیا گیا ہے اور انصاف پسند و امن دوست غیر مسلموں کے دلوں کو جو ٹھیس لگائی گئی ہے کیا مذکورہ بالا تجاویز اس کا فوری مداوا بن سکتی ہیں۔ کیا ان تجاویز یا ان میں سے کسی سے اس لاقانونیت کو چیلنج کیا جا سکتا ہے جس کا گھناؤنا مظاہرہ 6 دسمبر کو اجودھیا میں کیا گیا، یہ تجاویز بابری مسجد کے تعمیر نو کے مسئلہ کو ٹالنے والی یا اس کو نظر انداز کرنے والی کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان میں اس اصل مسئلہ کا کوئی فوری و موثر حل نظر نہیں آتا۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اہل حکومت اور تقریباً تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈران (حتیٰ کہ بی. جی. پی. بھی دبے لفظوں میں) اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ بابری مسجد کی مسماری سے حلفیہ بیان کا تقدس ٹوٹا ہے۔ عدلیہ کا وقار مجروح ہوا ہے اور قانون کی بالاتری پر ضرب لگی ہے اور اس طرح ایک صریح غلطی کا ارتکاب ہوا ہے لیکن اس کے ازالہ یا تصحیح کے لئے بابری مسجد کے اس کی اصل جگہ پر تعمیر کے مطالبہ پر ہچکچاہٹ محسوس کی جارہی اور نظر انداز کیا جارہا ہے یا اس کی مخالفت کی جارہی ہے۔ بی. جی. پی. اور اس کی اتحادی تنظیمیں اور ان کے ہمنوا بابری مسجد کے گرانے کی سازش میں کامیاب ہونے کے بعد اب اس کے وہاں دوبارہ تعمیر کئے جانے کی مخالفت میں سر گرم ہیں اور وہ اپنی مخالفت کو ان بنیادوں پر آگے بڑھا رہے ہیں کہ ① رام مندر کے لئے تعمیر کئے گئے ڈھانچہ کو گرا کر وہاں مسجد تعمیر کرنا اکثریت کے جذبات کو مجروح کرنا ہوگا۔ ② مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنے سے دونوں فریق کے مابین منافرت و کشیدگی میں اور اضافہ ہوگا۔ ③ اگر وہاں دوبارہ مسجد تعمیر کی گئی تو پورے ہندوستان میں خون خرابہ ہوگا۔

اول یہ کہ بابری مسجد کو منہدم کرنے کے بعد جو کچھ بھی عارضی تعمیر وہاں ہوئی ہے وہ سراسر غیر قانونی، غیر آئینی اور ناجائز ہے اس لئے اس کی بنیاد پر کوئی بات کہنا ہی بے بنیاد و بے معنیٰ ہے، دوسرے رہی اکثریت کے جذبات کو مجروح کرنے کی بات تو یہ لائق توجہ ہے کہ وہ لوگ یا عناصر جو 1949ء سے کم از کم بابری مسجد کے سلسلہ میں مسلم اقلیت کے جذبات کو مجروح نہیں بلکہ مقتول کرتے آئے ہیں وہ کس منہ سے اس اقلیت سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اکثریت کے جذبات کا احترام کرے، غیر دستوری، غیر قانونی، غیر جمہوری و غیر اخلاقی ذرائع سے مسلمانوں کے ایک حق کو چھیننے بلکہ اس پر

ڈاکہ ڈالنے کی مسلسل کوشش جاری ہے اور مسلمان اپنے اس حق کے حصول کے لئے دستوری و قانونی دائرہ میں کوشاں ہیں اور جمہوری طریقہ سے حکومت سے اس کی بازیابی کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کے باوجود ان پر یہ الزام ہے کہ وہ اکثریت کے جذبات کو مجروح کر رہے ہیں اس سے بڑھ کر چوری و سینہ زوری کی مثال اور کیا ہوگی۔ رہی بابری مسجد کی تعمیر نو سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ کی بات تو یہ دلیل ایسی سیاسی پارٹیوں اور تنظیموں کی جانب سے پیش کیا جانا مضحکہ خیز نہیں تو اور کیا ہے جن کی بنیاد ہی تعصب تنگ نظری و مسلم دشمنی پر قائم ہے اور جن کے نمائندوں وممبروں کی تمام تر توانائیاں فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے، گروہی تصادم کو بھڑکانے اور ہندو مسلم کے دیرینہ سماجی رشتوں کو تار تار کرنے میں صرف ہو رہی ہیں۔ رہا یہ کہنا کہ مسمار شدہ مسجد کو دوبارہ بنانے کی کوشش کی گئی تو خون خرابہ ہوگا اگر یہ دھمکی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہندوستان کے امن پسند عوام اس طرح کی دھمکی سننے کے عادی بن چکے ہیں اور اگر یہ اندیشہ کا اظہار یا خطرہ کی آگاہی ہے تو مقامِ تعجب ہے کہ یہ ایسے لوگوں کی جانب سے ہے جو اپنی اشتعال انگیز تقریر و تحریر، کیسٹ اور ویڈیو فلم کے ذریعہ ذہنوں کو مسموم کر کے ماحول میں گرمی پیدا کرتے ہیں اور خون خرابہ کی فضا پروان چڑھاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ انسانی مذہبی اور اخلاقی قدروں کو پامال کر کے بابری مسجد کو شہید کرنے والوں نے ایسا کرتے وقت کیا ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سوچا کہ یہ امن و آشتی کا پیام اور اہنسا کے اصولوں پر عمل ہوگا یا اس سے جذبات مشتعل ہوں گے اور فرقہ وارانہ تصادم اُبھریں گے جو لامحالہ قتل و غارت گری کے منتج ہوں گے۔ اور امن و امان کو درہم برہم کریں گے۔ یہ طرفہ تماشہ ہے کہ خون و خرابہ کا ماحول پیدا کرنے والے خود اس کی آگاہی دیں یہ احساس جرم نہیں تو اور کیا ہے۔

ان تفصیلات سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی مسئلہ میں دلیل و حجت کی بات کرنا اور آئین و قانون کی دہائی دینا ان لوگوں کے لئے سود مند ثابت ہوسکتا ہے جو اس پر سنجیدگی سے مثبت انداز میں غور کرنے اور قانون کے دائرہ میں مسئلہ کو حل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ 6/دسمبر کے واقعہ کے بعد بی. جی. پی. اور اس کی ہمنوا پارٹیوں اور تنظیموں سے کم از کم بابری مسجد کی نسبت سے اس طرح کی کوئی توقع عبث و فضول ہے۔ بی. جے. پی. کے علاوہ جو اپوزیشن پارٹیاں ہیں ان میں سے متعدد بابری مسجد مسئلہ کو دستور و قانون کے مطابق حل کرانے اور عدلیہ کے احترام اور قانون کی بالاتری کی برقراری کے لئے کوشاں ہیں اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے حکومت پر زور بھی

ڈالتی رہتی ہیں۔ اور اس طرح ملک میں سیکولرزم، جمہوریت و قانون کی حکمرانی کے بقاء کے لئے جدوجہد کرتی رہتی ہیں لیکن اس وقت مسئلہ کانگریس پارٹی کا ہے جس کی مرکز اور بیشتر صوبوں میں حکومت ہے۔ یہ اپوزیشن میں ہے کہ بی. جے. پی. اینڈ کمپنی کی پھیلائی ہوئی فرقہ واریت اور لاقانونیت کے چیلنج کا مقابلہ قانونی، انتظامی و سیاسی طور پر کرسکتی ہے۔ بابری مسجد کے مسئلہ کو دستور و عدلیہ کی مدد سے حل کرا سکتی ہے اور اب کی مسماری کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر کے لئے موثر قدم بھی اُٹھا سکتی ہے۔ اس ضمن میں اہم بات یہ ہے کہ یہ پارٹی اپنے آپ کو سیکولرزم و جمہوری قدروں کا علمبردار تصور کرتی ہے۔ دستور کی پاسبانی اور عدلیہ کے احترام کا بھرم بھرتی رہتی ہے اور مزید یہ کہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کا قصیدہ پڑھتی رہتی ہے اور مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کے اہتمام کا قومی و بین الاقوامی سطح پر اعلان بھی کرتی رہتی ہے۔ ان تمام دعوؤں و یقین دہانیوں کے بارے میں 6/دسمبر سے قبل کانگریس پارٹی اور اس کی حکومت کا کچھ بھرم شاید باقی رہا ہو لیکن اس تاریخ کے بعد اب یہ ٹوٹ چکا ہے اور اس پارٹی سے مسلمانوں کا یقین واعتماد اب اُٹھ چکا ہے۔ وزیراعظم اور دوسرے کانگریسی لیڈران کا یہ کہنا ہے کہ 6/دسمبر کے واقعہ کے سلسلہ میں بی. جے. پی. کی صوبائی حکومت نے انہیں دھوکہ دیا اور ان کے ساتھ وشواش گھات کیا۔ بی. جے. پی. کے بعض لیڈران کا یہ بیان ہے کہ ہم اپنے ورکرس سے دھوکہ کھا گئے۔ لیکن تلخ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو دھوکہ نہیں دیا گیا بلکہ کانگریس اور بی. جے. پی. دونوں نے مل کر مسلمانوں کو دھوکہ دیا جس کا انجام بابری مسجد کے انہدام کے المناک سانحہ کی صورت میں رونما ہوا، مسلمانوں کی نظر میں بی. جی. پی. سے زیادہ کانگریس مجرم ہے۔ اس لئے کہ اس سے انہیں یہ امید نہ تھی۔ سچ یہ ہے کہ کہ شروع سے لے کر اب تک بابری مسجد کے سلسلے میں مسلمانوں کو جو کچھ ناانصافی، زیادتی اور حق تلفی کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ سب کانگری حکومت کے تحت (خواہ مرکز کی ہو یا صوبہ کی) اور اس کی در پردہ حمایت سے ہوا ہے۔ 6/دسمبر کے انتہائی تکلیف واقعہ کے بعد مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے مرکزی حکومت مسجد کی دوبارہ تعمیر کے مسئلہ پر بھی اپنی پرانی پالیسی (وعدہ کرکے ٹال جانا اور بہلا دے دینا) دہرا رہی ہے اور اکثریت کی منھ بھرائی کے لئے اس معاملہ میں بالواسطہ وہی سب کچھ کر رہی ہے جو بی. جے. پی. اور وشو ہندو پریشد چاہتی ہے۔ ایسی حکومت سے مسلم اقلیت کے معاملہ میں حق وانصاف کے رویہ کی کیا امید کی جاسکتی ہے، جس نے 6/دسمبر کے بعد کچھ تنظیموں کے

ساتھ جماعت اسلامی پر پابندی عائد کی جس کا اجودھیا میں 6 دسمبر کے واقعہ یا اس سے متعلق اس سے قبل کے واقعات سے کوئی تعلق نہ تھا اور یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ حکومت کی جانب سے 5 تنظیموں پر یہ پابندی 6 دسمبر کے سیاق و سباق میں لگائی گئی ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سرکاری اعلانیہ میں اس جماعت پر پابندی لگائی جانے کے سبب اس کے بعض رہنماؤں کی ڈیڑھ دو سال پہلے کی گئی تقریروں کے ایسے حصہ کو قرار دیا گیا ہے جس کا بابری مسجد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسے محض بیلنس کرنے کی پالیسی یا بی۔ جے۔ پی۔ اور اس کے حمایتیوں کی ناراضگی نہ مول لینے کا ذریعہ کہا جا سکتا ہے اور اسے عدل و انصاف کا تقاضا اور دستوری قوانین کا صحیح استعمال بھی سمجھا جاتا ہے۔ درحقیقت اسی بیلنس کی پالیسی اور کسی مسئلہ پر فیصلہ لیتے وقت اس کے سیاسی عواقب بلکہ انتخابی نتائج پر نظر رکھنے کی وجہ سے موجودہ مرکزی حکومت بابری مسجد کے معاملہ میں فوری و موثر اقدامات سے قاصر رہی جس کا خمیازہ نہ صرف مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے بلکہ پورے ملک میں اس کے بھیانک اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ 6 دسمبر کے سانحہ کے بعد مرکزی حکومت پر رائے زنی کرتے ہوئے ایک سیاسی مبصر نے صحیح کہا ہے کہ اُس حکومت سے بروقت و موثر اقدام کی کیا توقع کی جا سکتی ہے جس کی قوت فیصلہ و ارادہ لقوے کا شکار ہو گئی ہو۔

اس صورت حال میں یہ اشد ضروری ہو گیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے حقوق کے حصول بالخصوص بابری مسجد کی دوبارہ تعمیر کی جدوجہد کے لئے صرف دوسروں کی حمایت و تائید پر نظر رکھنے کے بجائے خود اپنی اجتماعی قوت کو مضبوط کریں اور اپنے اندر اتحاد و اتفاق کا وہ نمونہ دکھائیں کہ ملی مسائل پر ان کی متحدہ آواز پُر زور بن کر نکلے اور با اثر ثابت ہو۔ ہندوستانی مسلمانوں کے کسی مسئلہ کے حل کے لئے سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل کرنا اور بیرونی ممالک بالخصوص کسی مسلم ملکوں کے تائیدی بیانات یا مطالبات کا متنی ہونا کوئی معیوب بات نہیں لیکن صرف انہی ذرائع پر انحصار کرنا مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے موثر و مفید نہیں ثابت ہو سکتا جیسا کہ ماضی و حال کے تجربات بتا رہے ہیں۔ جب تک مسلمان یہاں علمی، سماجی و سیاسی طور پر ایک مضبوط طاقت بن کر سامنے نہ آئیں گے، اور ملت کی اپنی اندرونی قوت نہ اُبھرے گی، خارجی ذرائع سے کچھ حاصل ہونا مشکل ہے۔

اس بات سے ہر شخص بخوبی واقف ہے کہ ملت میں طاقت و قوت پیدا ہونے کے لئے سب سے زیادہ ضروری اتحاد و اتفاق ہے۔ یہ اتحاد عام مسلمانوں میں بھی درکار ہے۔ مذہبی و دینی جماعتوں اور

علمی و تحقیقی اداروں میں بھی مطلوب ہے۔ اور راہلِ سیاست میں بھی۔ یہ تو بہت مشکل ہے کہ تمام مذہبی جماعتیں و تنظیمیں ایک میں ضم ہو جائیں لیکن اس میں کوئی دشواری نہیں بلکہ موجودہ سنگین حالات اور ہندو جارحیت کے اُٹھتے ہوئے طوفان سے مقابلہ کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ مسلمانوں کے مشترکہ مسائل پر یہ جماعتیں و تنظیمیں اپنے نظریاتی و مسلکی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر مثالی اتحاد کا ثبوت دیں اور پوری طرح متحد ہوکر ان مسائل کے حل کے لئے کوشاں رہیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ سیاست سے دلچسپی رکھنے والے تمام مسلمان کسی ایک پارٹی میں شامل ہو جائیں یا ان کی کوئی ایسی پارٹی تشکیل پائے جو تمام مسلم سیاستدانوں کو قابل قبول ہو۔ لیکن اس وقت ملّت کو جو سنگین مسائل درپیش ہیں ان کا تقاضا یہی ہے کہ مختلف پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے مسلم سیاستداں اور کم از کم پارلیمنٹ و اسمبلی کے ممبران مسلمانوں کے مسائل پر آپس میں تال میل رکھیں اور اپنی اپنی پارٹی کی سطح پر ان کے حل کے لئے کوشاں ہوں اور بہتر ہو کہ اہم اور سنگین مسائل پر وہ متحدہ طور پر جدوجہد کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ پارلیمنٹ یا اسمبلی کا کوئی ممبر کسی خاص فرقہ یا طبقہ کا نمائندہ نہیں ہوتا لیکن اگر اپنے فرقہ کے لوگ ظلم و زیادتی اور ناانصافی کا شکار ہوں تو اس کے خلاف آواز اُٹھانا اور ان کا جائز حق دلانے میں مدد کرنا اور اپنے فرقے کے لوگوں کے مسائل کے حل کے لئے کوشاں ہونا نہ غیر دستوری ہے اور نہ فرقہ پرستی، بلکہ یہ ملک و قوم کی خدمت کا ایک حصہ ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ موجودہ صورتحال میں اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ مسلم لیڈران اور دوسرے حضرات بھی برادرانِ وطن کے سامنے بار بار اس نکتہ کو نمایاں کریں کہ دستور کی پابندی، قانون پر عمل آوری اور عدل و انصاف کی روشنی میں عوام کے مسائل کا حل ملک کی سالمیت و اتحاد کی بقاء امن و امان کے قیام اور سماجی و معاشی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے اس کے لئے وہ ایسے لوگوں کے ہاتھ مضبوط نہ کریں جو قانون شکنی عدلیہ کی توہین اور یہاں کے شہریوں کے ہی ایک طبقہ کے خلاف عداوت و منافرت پر برانگیختہ کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ، اسمبلی، سیمنار اور کانفرنسوں میں یہ باتیں یقیناً سامنے لائی جاتی ہیں لیکن مختلف ذرائع سے عوام بالخصوص اکثریت کے ذہنوں میں اس حقیقت کو جاگزیں کرانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔

آخر میں اس حقیقت کی جانب اشارہ بھی ضروری ہے کہ آج ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے مسائل کے حل کے لئے مختلف سطح پر جدو جہد کرنی ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ سب کی کوششوں کا میدان ایک

ہی ہو۔ اصل مقصد مسلمانوں کے مذہبی و ثقافتی تشخص کا تحفظ اور ان کی اجتماعی فلاح و بہبود ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ ہرایک کی اپنی اپنی صلاحیتیں، اس مقصد کے حصول کے لئے صرف ہوں۔ اور ایک دوسرے سے تعاون کے جذبہ کے ساتھ اس مشن کو آگے بڑھایا جائے اور عملی و تحقیقی میدان میں سرگرم رہنے کی ضرورت ہے اور سماجی و معاشی محاذ پر مضبوطی حاصل کرنے کی بھی، سیاسی تدبر پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور ملک و ملّت کی خدمت کا احساس بیدار کرنے کی بھی۔ اور ان سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم ذہنی واخلاقی سطح پر اپنی تعمیر کے لئے فکرمند وکوشاں ہوں۔ اس کے بغیر کوئی گوہر مقصود ہاتھ نہیں آ سکتا۔ جب بھی ملت اسلامیہ کسی سنگین حادثہ یا بڑی مصیبت سے دوچار ہوتی ہے تو ہم فطری طور نصرتِ الٰہی کے طلب گار ہوتے ہیں ان حالات میں بعض حضرات کو یہ بھی کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ آخر مسلمان کب تک آزمائشوں میں گرفتار رہیں گے۔ ان کے لئے اللہ کی مدد کیوں نہیں آتی۔ اس کے جواب کے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھے اور اپنا احتساب کرے کہ کیا وہ اپنے طرزِ عمل اور شب و روز کی مصروفات کی روشنی میں اپنے کو نصرت الٰہی کا حقدار سمجھتا ہے۔ کیا وہ ان اعمال کو انجام دیتا ہے جو نصرتِ الٰہی کی طلب کے لئے ضروری ہیں۔ انفرادی مثالوں کو چھوڑ دیجئے۔ اگر اجتماعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو نتیجہ کچھ تشفی بخش نہیں نظر آئے گا۔ عام خیالات کی بات نہیں غور طلب امر یہ ہے کہ مصیبت و پریشانی اور سخت آزمائش کے دوران ہم میں سے کتنے ہیں جو صدق دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اپنے گناہوں سے توبہ و مغفرت مانگتے ہیں اور اپنے کو برائیوں سے بچا کر نیک اعمال میں مصروف رکھتے ہیں۔ اسلام میں ہر چیز کے لئے ایک ضابطہ وقانون مقرر کیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کی کوئی ایسی حالت نہیں جس سے متعلق قرآن و حدیث میں رہنمائی نہ موجود ہو۔ مصیبت و پریشانی چاہے انفرادی ہو یا اجتماعی اس حالت میں اللہ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے جو چیزیں سب سے زیادہ ضروری ہیں وہ ہیں توبہ واستغفار، رجوع إلی اللہ، برائیوں سے پرہیز ونیکیوں سے قربت، مسائل کے حل اور مقاصد کے حصول کے ذرائع بھی اسلام نے متعین کئے ہیں اس لئے اس راہ میں سرگرم رہتے وقت ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہم انہی ذرائع کو اختیار کر رہے ہیں یا ایسا تو نہیں ہے کہ اس باب میں قرآن و حدیث کے مقرر کردہ حدود و قیود سے تجاوز کر رہے ہیں۔ مختصر یہ کہ نصرتِ الٰہی کا حقدار بننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پوری طرح دین اسلام کے پیرو بن جائیں۔ اور اسی طرح پیروی کو

عام کرنے کے لئے بھی جدوجہد کریں قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا واضح اشارہ ہے:

(اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا)۔

مفسرین کرام کا عام طور پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے دین کی مدد ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ کے دین کی مدد سے مراد یہ ہے کہ صدق دل سے اسے قبول کیا جائے، زندگی کے تمام شعبوں میں اس کے احکام کی پیروی کی جائے۔ شب و روز کا ہر لمحہ اس کے تقاضوں کے مطابق بسر ہو اور اپنی زندگی میں اس دین کو پوری طرح داخل کرنے کے ساتھ اس کی اشاعت و اقامت کا فریضہ بھی انجام دیا جائے۔ اس سے یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ اللہ کی مدد ان لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو اس کے دین کو اپنی زندگیوں میں جاری و ساری کرتے ہیں اور اس کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ جسے اللہ کی مدد نصیب ہو وہ سر بلند و غالب ہو کر رہتا ہے۔ اسے نہ تو دل شکستہ ہونے کی ضرورت ہے اور نہ مایوس ہونے کی اللہ کا برحق فرمان ہے:

**ترجمہ**: ''دل شکستہ نہ ہو اور غم نہ کرو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو''۔ (آل عمران:139)

پس موجودہ صورت حال میں غمگین و ناامید ہونے کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ایمان میں سچے و پکے بن جائیں اور پوری دیانتداری سے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہو جائیں۔ اللہ کرے ہمیں اس حقیقت کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب ہو۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

(از: کتاب: شہید بابری مسجد، مرتب: معصوم مرادآبادی رفروری 1993ء)



# بابری مسجد کے خون کو انصاف کا انتظار

از: مولانا اسرارالحق قاسمی

بابری مسجد کا انہدام نہ صرف ایک فرقہ اور ایک مذہب کے خلاف فسطائی قوتوں کی طرف سے طاقت کا مظاہرہ تھا بلکہ ہندوستان کی عدلیہ، سیکولرزم اور جمہوریت کا قتل بھی تھا۔ 6/دسمبر 1992ء کو فرقہ پرست جنونیوں نے جو کاری زخم لگایا تھا، وہ بابری مسجد کی بازیابی تک رستا رہے گا۔ اجودھیا اور ملک کے دیگر علاقوں میں دہشت و بربریت کا جو رقص بے لگام برپا کیا گیا تھا اس کی گونج صدیوں تک سنائی دے گی۔

ہندوستانی آئین سازوں نے ایک سیکولر نظام حکومت کا تصور پیش کیا تھا۔ اور کہا گیا تھا کہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں سے مساوانہ سلوک ہوگا۔ یہ نظام حکومت کسی بھی وسیع الظرف، روادار اور ترقی پسند معاشرے کی بنیاد بنتا لیکن آئین کے نفاذ سے پہلے ہی 1949ء میں 23-22/دسمبر کی درمیانی شب میں بابری مسجد میں مورتیاں رکھ کر، مستقبل میں ہندوتوا اور فرقہ پرستی کی سیاست کو قومی سیاست بنانے کے لئے ٹھوس بنیاد رکھ دی گئی اور حکومت نے اس مذموم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے بجائے، اسے ایک تناور درخت بننے کے لئے چھوڑ دیا۔

پنڈت نہرو کے نرم خو جمہوری مزاج نے فرقہ پرستی کے سیلاب پر بندھ باندھنے کی بہت کوششیں کیں لیکن اس میں اتنی کامیابی نہیں مل سکی جتنی کہ ضروری تھی۔ فرقہ پرست قوتوں کا مقصد اکثریت کو خوف کی نفسیات میں مبتلا کرنا اور اقلیتوں میں جارحانہ مدافعت کے جذبہ کو پروان چڑھانا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی منظرنامے پر ایسی طاقتیں اپنے کو مضبوط بناتی رہیں۔ ان قوتوں کو مستحکم کرنے اور معتبر بنانے میں بعض سیکولر جماعتوں نے بھی اہم رول ادا کیا اور راجیو گاندھی سرکار کے دور میں بابری مسجد کا تالا کھلنے اور ٹی. وی. پر اس منظر کو دکھانے کی غلطی کی تو ان فرقہ پرست اور فاشسٹ قوتوں کو جو ہندو مسلم منافرت کے رتھ پر سوار ہوکر ہندوستانی سیاست کو اکثریتی فرقہ کے عقائد اور اپنے ہندوتو نظریہ کے مطابق چلانے کے سالہا سال سے کوششوں میں مصروف تھی، ایک سنہرا موقع فراہم کر دیا۔ پھر کیا تھا سنگھ پریوار کے ان فسطائیوں کی فسطائیت کو وہ مقبولیت ملی جس کی انتہا وہ بھیانک صورت حال تھی، جس نے دستور، عدالت عالیہ، پارلیمنٹ اور قومی یکجہتی کونسل، سب کے وقار و اعتبار کو پامال کرتے ہوئے بابری مسجد کو شہید کر دیا۔ اس طرح کے سازشی حادثہ میں کسی کا ہاتھ

ہوتا ہے، کسی کی زبان ہوتی ہے، کسی کا دماغ ہوتا ہے تو اس میں ہاتھ کلیان سنگھ کا تھا، زبان اڈوانی کی تھی اور دماغ نرسمہا راؤ کا تھا۔

سنگھ پریوار کے تخریب پسندوں کے ہاتھوں بابری مسجد کے انہدام کو اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند و ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے ''ملک دشمنوں کی کامیابی'' کہا تھا اور سپریم کورٹ نے بابری مسجد کی مسماری کو پوری ہندوستانی قوم کے لئے باعث شرم و رسوائی قرار دیتے ہوئے لکھا تھا: ''جو کچھ بھی مسمار کیا گیا وہ صرف ایک پرانی تعمیر ہی نہیں تھی بلکہ اکثریت کے احساس عدل اور معقول پسندی پر اقلیت کے بھروسے اور اعتماد کے لئے ایک کاری ضرب تھی۔ جس نے آئینی عمل اور قانون کی بالادستی میں اقلیت کے یقین کو متزلزل کر دیا۔ ایک بے یارو مددگار 500 سالہ قدیم عمارت جس کی حفاظت صوبائی حکومت کے ہاتھوں میں ایک مقدس امانت تھی، توڑ دی گئی۔ 24/اکتوبر 1994ء کو سپریم کورٹ نے مسٹر کلیان سنگھ کو توہین عدالت کا مجرم گردانتے ہوئے ایک دن قید اور دو ہزار روپے جرمانے کی جو سزا سنائی تھی وہ بابری مسجد کے قریب پختہ پلیٹ فارم کے تعمیر کے سلسلے میں تھی۔ توہین عدالت کا اصل مقدمہ جس کا تعلق 6/دسمبر 1992ء کے شرمناک واقعات سے ہے، ابھی تک سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے جس میں بی. جے. پی.، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل کے لیڈروں کے ساتھ پی. وی. نرسمہا راؤ کو بھی فریق بنایا گیا ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں انصاف پسند لوگوں کی نگاہیں سپریم کورٹ پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ بابری مسجد کو شہید کرنے اور کرانے والے سیاسی مجرموں کو کیا سزا دیتی ہے۔ بابری مسجد کے تعلق سے حق ملکیت کے جتنے مقدمے زیر سماعت ہیں ان میں مسلمانوں کا کیس بہت مضبوط ہے۔ یہ مقدمات الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں زیر سماعت تھے۔ مقدمات کی بنیادی کارروائیاں مکمل ہو چکی تھیں۔ مسلمانوں کے حق میں دستاویزات اور ثبوت اتنے پکے تھے کہ کوئی بھی دیوانی عدالت اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ ریونیو ریکارڈ میں بھی اس عمارت کو مسجد کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ کہیں بھی اس کا مندر کے طور پر ذکر نہیں ہے۔ فسطائی طاقتوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ مقدمہ ہار جائیں گے۔ اس لئے ایک منصوبہ بند سازش کے تحت مسجد شہید کر دی گئی پھر صدارتی ریفرنس کا ایک ڈرامہ رچا گیا۔ وہ اس طرح کہ 7/جنوری 1993ء کو مرکزی حکومت نے صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ایک آرڈیننس جاری کرایا جو بعد میں پارلیمنٹ کی توثیق کے بعد اجودھیا حصول اراضی ایکٹ 1993ء بنا۔ اس ایکٹ کے ذریعہ حکومت نے بابری مسجد کی زمین اور

اس سے ملحقہ تقریباً 67 ایکڑ زمین ایکوائر کر کے اپنی تحویل میں لے لی اور بابری مسجد سے متعلق جتنے مقدمات تھے ان کو سوخت کر کے صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے دستور ہند کی دفعہ (1)143 کے تحت سپریم کورٹ سے اس بارے میں رائے دینے کی درخواست کی گئی کہ بابری مسجد کی تعمیر سے پہلے اس مقام پر کوئی ہندو مندر یا کوئی ہندو مذہبی تعمیر موجود تھی۔ لیکن سپریم کورٹ نے یہ کہہ کر ریفرنس کا جواب دینے سے انکار کر دیا کہ یہ مبہم ہے اس کا جواب دینے سے کوئی آئینی مقصد حل نہیں ہوگا۔ یہ ریفرنس اصل تنازعہ کا احاطہ نہیں کرتا اور یہ اکثریتی فرقہ کے حق میں جانبدارانہ ہے۔ سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے اس ریفرنس کو بصد احترام واپس کر کے اس ڈرامہ کو ناکام کر دیا جس کے تحت مسلمان عدالتی چارہ جوئی سے محروم ہو گئے تھے۔ اور ان کی شہادتیں اور دستاویزی ثبوت چشم زدن میں بیکار کر دیئے گئے تھے۔ اس کے بعد 1995ء سے لکھنؤ بنچ میں ان مقدمات کی سماعت ہو رہی ہے۔ عدالتوں کی سست رفتار کارروائی مرکز اور یو۔پی۔ کی صوبائی حکومت کی بے پروائی، فرقہ پرست جنونیوں کے مندر تعمیر کرنے کے منصوبوں اور سازشوں اور سیکولر سیاسی پارٹیوں کی مفاد پرست پالیسیوں سے مسلمانوں کی صفوں میں کچھ کچھ مایوسی آنے لگی ہے۔

بابری مسجد، مسجد تھی، مسجد ہے، انشاء اللہ مسجد ہی رہے گی۔ مسجد شہید ہو جانے اور اس کی جگہ مندر بن جانے سے مسجد کی حیثیت ختم نہیں جاتی، مسجد اینٹ اور پتھر کا نام نہیں بلکہ اس جگہ کو مسجد کہتے ہیں جہاں وہ قائم ہوتی ہے۔ مسجد تا قیامت مسجد ہوتی ہے نہ اس کی زمین بیچی جا سکتی ہے، نہ بطور تحفہ طشتری میں سجا کر کسی کو پیش کی جا سکتی ہے۔ بابری مسجد کے تعلق سے مسلمانوں کا موقف نہ صرف مبنی برحق ہے بلکہ اس کا حق ہونا ہندتو کے علمبرداروں پر بھی واضح ہے۔ مایوسی کے بجائے ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنا موقف ملک کے انصاف پسند غیر مسلموں کے سامنے واضح کیا جائے مقدمات کی پیروی پر بھی بھرپور توجہ دی جائے ایک نہ ایک دن حق و انصاف کو فتح حاصل ہوگی۔ اور انشاء اللہ بابری مسجد پھر سے آباد ہوگی۔

پچھلے 9 برسوں سے پورے ملک کے مسلمان، 6 دسمبر کو یوم سیاہ اور یوم دعا کے طور پر مناتے آئے ہیں۔ اس دن مساجد میں خصوصی دعاؤں کا اہتمام ہوتا ہے اور مسلمان کالی پٹیاں باندھ کر یا لگا کر احتجاج اور غم و غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک تکلیف دہ سلسلہ بھی چلتا ہے کہ فرقہ پرست اور جارحیت پسند گروپ اس دن کو یوم فتح اور یوم بہادری کے طور پر مناتے ہیں۔ جو

کھلے طور پر ظالموں کی طرف سے ایک مظلوم طبقہ کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے۔ اس بار وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل نے پورے جوش وخروش کے ساتھ اس دن کو سوریہ دوس اور وجے دوس کے طور پر منانے کا اعلان کیا تھا۔ گجرات میں جہاں سے وی. ایچ. پی. کو خوراک ملتی ہے اور جہاں کے فرقہ وارانہ حالات آج بھی نازک ہیں۔ شر پسندوں نے خم ٹھونک کر جلوس فتح نکالنے کا اعلان کیا تھا۔ بڑودہ، احمد آباد، بھروچ اور دوسرے علاقوں کے مسلمان جو حالیہ بھیانک فرقہ وارانہ اور سرکاری تشدد کے شکار ہوئے تھے۔ یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ بھی یوم سیاہ اور یوم شرم منائیں گے مگر انہوں نے مجھ جیسے سیاہ کار کے مشوروں کو قبول کیا اور اس طرح کے عوامی جلسے جلوسوں سے اجتناب کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ وی. ایچ. پی. اور بجرنگ دل نے پورے ملک میں سوریہ دوس اور فتح کے جلوس نکالے مگر گجرات میں اس کی لگام الیکشن کمیشن نے کس دی، باقی ملک کے دیگر حصوں میں خود مسلمانوں نے ضبط وتحمل سے کام لیا اور شر پسندوں کا کوئی جواب نہیں دیا اگر اس مرتبہ مسلمانوں نے ذرا سی بھی غفلت کر دی ہوتی تو بڑے پیمانہ پر فسادات پھوٹ سکتے تھے۔ مگر مسلمانوں اور امن پسند، ہندوؤں کی دانش مندی نے وی. ایچ. پی. اور بجرنگ دل کے ناپاک منصوبوں کی ہوا نکال دی۔ گجرات میں حالات خراب ہونے میں کوئی کمی نہیں تھی مگر ایک تو گجرات انتظامیہ مستعد تھا اور مودی سے نہیں بلکہ الیکشن کمیشن سے ہدایات حاصل کر رہا تھا۔ دوسری خود مودی جیسے ''سورماؤں'' کو بھی الیکشن کمیشن کی تلوار لٹکتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

جہاں تک بابری مسجد پر ہمارے دعوے کا تعلق ہے۔ وہ تا قیامت باقی رہے گا۔ اس سے دست بردار ہونے کا کسی مسلمان کو کوئی حق نہیں۔ اور جہاں تک اس کے خلاف ہر سال یوم سیاہ اور یوم احتجاج منانے کا تعلق ہے وہ بھی ہمارا اپنا جمہوری حق ہے اس حق کو ہم موقع محل کے اعتبار سے کم یا زیادہ استعمال کر سکتے ہیں۔ احتجاج کا مطلب کسی سے مقابلہ یا کسی کی شر پسندی سے تصادم نہیں ہے یہ اپنے غم وغصہ کے اظہار کا ایک مہذب طریقہ ہے جو حکومت کو یہ احساس دلانے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے کہ ہم پر ظلم ہوا ہے، ہمیں انصاف نہیں ملا ہے۔ ہم اس پر رنجیدہ ہیں۔ لیکن مسلمانوں پر ان سب سے زیادہ ضروری اور لازم جو طریقہ ہے وہ ''دعا'' ہے۔ یہ ہمارا حق بھی ہے اور ہتھیار بھی مسلمانوں کو باقی تمام امور پر ''دعا'' کو ہی ترجیح دینی چاہئے کہ احکم الحاکمین سے اپنی داد فریاد کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ یہ دنیاوی حاکم بھی اسی کے غلام ہیں۔ وہ جب چاہے گا ان کو فنا کر دے

گا۔ایک خوشی کی بات یہ ہے کہ اس بار 6ردسمبر کو عید کے موقع پر مسلمانوں نے خاموش احتجاج کیا مگر دعاؤں کا بھی خاص اہتمام کیا اور رب العزت نے اسی کی برکت سے ملک میں امن و امان قائم رکھا۔ ☐ ☐

(نقوش عالم، اگست۔ستمبر ر2003)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مسلمان کیا کریں

6 ردسمبر 1992ء کو بابری مسجد کی المناک شہادت کے بعد ملک میں فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا، اس موقع پر طلبا اور نوجوانوں کی ایک کل ہند تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا (S.I.O) حلقۂ دہلی نے مسلمانوں کے لئے ایک لائحہ عمل طبع کرا کر بڑے پیمانے پر دہلی اور اطراف میں لوگوں تک پہنچایا۔ ملاحظہ فرمائیں: (مرتب)

**واللّٰہُ خَیرُ المَاکِرِیْنَ**

علمبردارانِ باطل بڑے مسرور نظر آتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو زِک پہنچائی ہے اور ان کو شدید غم سے دوچار کیا ہے۔ لیکن وہ تاریخ کا یہ سبق بھول جاتے ہیں کہ بارہا اللہ تعالیٰ نے شر میں سے خیر برآمد کیا ہے اور شیطان کی چالوں کو اسی پر الٹ دیا ہے۔ باطل طاقتیں اپنی چال چلتی ہیں اور اللہ اپنی چال چلتا ہے۔ اور اللہ کی چال بڑی زبردست ہے۔

اس لئے مسلمان مایوس نہیں ہیں بلکہ وہ ان واقعات کو اپنے لیے چیلنج سمجھتے ہیں اور حوصلے کے ساتھ لائحہ عمل بنانے کو تیار ہیں۔ وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ اللہ انہیں کی مدد کرتا ہے جو اللہ پر بھروسا کریں، اپنے فرائض انجام دیں اور ساری تدابیر اختیار کریں۔

لائحہ عمل:- واقعہ یہ ہے کہ محض کوئی ایک کام ایسا نہیں ہے جس کے کر لینے سے ہم موجودہ سخت حالات سے عہدہ برآ ہوسکیں گے۔ بلکہ متعدد کام ہیں جو سب ایک ساتھ، کرنے ہونگے، ذیل میں کچھ مشورے پیش ہیں۔ عمل شرط ہے:-

تجدید عہد:- سب سے پہلا کام یہ ہے کہ ہم مسلمان اللہ کی طرف پلٹیں اور اس سے وفاداری کا عہد تازہ کریں۔ سچے دل سے اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کی معافی چاہیں۔ نئے عزم کے ساتھ اللہ کی عبادت، بندگی اور اطاعت کے لئے کمربستہ ہو جائیں، اپنے معاملات میں حلال وحرام کا خیال رکھیں، انسانوں کا خوف دل سے نکال دیں، انسانوں سے توقعات وابستہ نہ کریں۔ اللہ سے مدد مانگیں اور گناہوں سے بچ کر اللہ کی مدد کے مستحق بنیں۔

مسجد کی مرکزیت:۔ مسجد مسلمان معاشرے کا فطری مرکز ہے۔ ہم مسجد سے دور ہوں گے تو انتشار کا شکار ہوں گے۔ ہم سب کو نماز باجماعت کا اہتمام کرنا چاہئے۔ ہمارے اہل علم کو چاہئے کہ مسجد کے اندر، عام مسلمانوں کو دین کا علم سکھائیں، ان میں حوصلہ پیدا کریں اور شہادت کا شوق پیدا کریں۔

ثابت قدمی:۔ حالات سخت ہیں اور مزید سخت ہو سکتے ہیں ان حالات میں صرف اللہ پر توکل کرنا چاہئے۔ اور اللہ کے دین پر مضبوطی سے جمے رہنا چاہئے۔ گھبرا کر شیطانی طاقتوں کے آگے سر نہیں ڈالنی چاہئے، اور نہ اُن کے غلط مطالبات کو تسلیم کرنا چاہئے۔ ہماری زندگی اسلام پر گزرے اور ہم سخت سے سخت حالات میں بھی دین سے ذرہ برابر ہٹنے کے لئے تیار نہ ہوں اور ہماری موت ایمان کی حالت میں آئے۔

باہمی تعلقات:۔ مسلمانوں کے باہمی تعلقات کے لئے اسلام کچھ ہدایتیں دیتا ہے۔ ان کی پابندی ضروری ہے۔ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا خیر خواہ ہو اور اس کا احترام کرے۔ اگر تنقید کرنی ہو تو لہجہ نرم ہونا چاہئے اور بات صحیح ہو۔ اگر آپس میں اختلاف ہو تو قرآن و سنت کی طرف رجوع کر کے اس کو سلجھا لیا جائے۔ اختلاف کے باوجود مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے مل جل کر کام کیا جائے۔

مقامی اجتماعیت:۔ اپنے مسائل کے حل کے لئے ہر محلے کے مسلمانوں کو مل کر کچھ افراد کو ذمہ دار بنا لینا چاہئے۔ یہ افراد سمجھ دار، دین دار اور مخلص ہوں، لیڈری کی خواہش نہ رکھتے ہوں اور کسی سیاسی پارٹی سے ان کا تعلق نہ ہو۔ مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے لئے سارے مسلمانوں کو ان ذمہ دار افراد کی بات ماننی چاہئے۔ ان ذمہ داروں کو مشورے سے کام کرنا چاہئے۔

محلے کی یہ اجتماعیت کسی آل انڈیا جماعت یا تنظیم یا کسی مسلک یا مکتب فکر کے تحت نہ ہوگی اور نہ اس کی ترجمانی ہوگی، نہ کسی کی مخالفت ہوگی۔ یہ صرف محلے کی سطح پر ہوگی اور اس کا تعلق سارے مسلمانوں سے ہوگا۔ اس لئے ہر مکتب فکر، مسلک، جماعت اور تنظیم کے افراد کو مقامی اجتماعیت بنانے اور کامیابی سے چلانے میں پورا تعاون کرنا چاہئے۔ ان کے الگ الگ مسلکی اور جماعتی کام اپنی جگہ پر بدستور جاری رہیں گے اور اُن کاموں میں مقامی اجتماعیت کو کوئی مداخلت نہ کرنی چاہئے۔

تعمیر معاشرہ:۔ مقامی اجتماعیت کو چاہئے کہ محلّے میں تعمیری کاموں کا منصوبہ بنائے، تعلیمی

اور معاشی ترقی کے لئے کام کرے اور مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کے لئے تمام ضروری کام انجام دے۔

غیر مسلموں سے ربط:- مقامی اجتماعیت کو چاہئے کہ محلے کے اور آس پاس کے غیر مسلم عوام اور خواص سے ربط رکھے۔ اگر ان کو کوئی غلط فہمی ہو تو دور کرے اور اگر تعاون ممکن ہو تو اُن کا تعاون بھی حاصل کرے۔

افواہوں کا سدِّ باب:- افواہوں نے بہت سے فسادات کا آغاز کیا ہے اور مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اس مسئلے کی سنگینی کا احساس کریں اور غلطیوں سے باز آئیں۔

افواہیں پھیلانے سے مکمل گریز کرنا چاہئے۔ اگر کوئی آکر کوئی خبر سنائے تو اسے پھیلنے کا موقع نہیں دینا چاہئے بلکہ صرف ذمہ داروں کو باخبر کرنا چاہئے۔

اگر افواہیں نہ رُکیں تو افواہ پھیلانے والوں پر شدید گرفت کرنا چاہئے اور سماجی مقاطعہ کے ذریعہ اُن کو باز رکھنا چاہئے۔

دفاع:- مقامی اجتماعیت کا ایک اہم کام یہ ہے کہ مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے مل جل کر کوشش کی جائے۔ یہ کام قانون اور شریعت کی حدوں کے اندر ہونا چاہئے۔ کچھ باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

غیر متعلق لوگوں سے کوئی اہم گفتگو نہیں کرنی چاہئے ویسے بھی بلا وجہ غیر ضروری گفتگو سے بچنا چاہئے۔

اگر کوئی اشتعال دلائے تو خود کچھ نہ کرنا چاہئے بلکہ محلے کے ذمہ داروں کو بتانا چاہئے۔ وہ جو مناسب سمجھیں گے، کریں گے۔

نوجوانوں کو منظم کرنا چاہئے اور اُن میں ذمہ داروں کی اطاعت کرنے کا جذبہ اور ٹیم اسپرٹ پیدا کرنی چاہئے۔

اگر حالات کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو فوراً غیر مسلم ذمہ داروں، پولیس اور حکومت کے ذمہ داروں سے ربط قائم کرنا چاہئے۔ دوسری طرف لوگوں میں گھبراہٹ پھیلنے سے روکنا چاہئے اور ان کو ضروری ہدایات دی جانی چاہئیں۔

پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ٹکراؤ نہ ہو۔ اگر ہو جائے تو خوف اور بزدلی کے بجائے پامردی کے ساتھ ظالموں کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

عام انسانوں سے نفرت کے بجائے اپنی کش مکش کو صرف شیاطین کے خلاف رکھنا چاہیے۔ اور عام انسانوں کو شیطانی چالوں سے باخبر کرنا چاہیے۔ نہ عام انسانوں سے ہماری کوئی لڑائی ہے نہ حکومت کی مشینری سے بلکہ لڑائی صرف شیاطین سے ہے۔

اسلام ہمیں اپنے دفاع کی اجازت دیتا ہے مگر اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی عبادت گاہ کو نقصان پہنچایا جائے یا بے گناہوں پر ہاتھ اُٹھایا جائے۔ جس نے ہم پر دست درازی نہیں کی اس کے خلاف کارروائی کا ہمیں کوئی حق نہیں۔ جس نے جتنی زیادتی کی ہو اس سے اتنا ہی بدلہ لیا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ عورتوں، بچوں اور نہ لڑنے والوں پر ہاتھ اُٹھانا گناہِ عظیم ہے۔ شریعت کی ان حدوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اگر ہم ان حدوں کو توڑیں گے تو اللہ کی مدد ہمارے ساتھ نہ ہوگی۔ اور یہ دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہوگا۔ ہمارے بھائی اگر شریعت کی حدیں توڑیں اور ظلم پر اُتر آئیں تو اُن کا ہاتھ پکڑنا بھی ہمارا فرض ہے۔

فرسٹ ایڈ سکھانے، ریلیف، قانونی چارہ جوئی اور دوسرے ضروری کاموں کے لئے محلّے کی سطح پر مستقل کمیٹیاں بنا دینی چاہئیں جو ضرورت پڑنے پر فوراً متحرک ہو جائیں۔

توحید اور انصاف کی دعوت:- ہم مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور ان حالات میں خاص طور پر ضروری ہے کہ ہم سارے انسانوں کو توحید کی طرف بلائیں اور انصاف کرنے کی دعوت دیں۔ یہ کام ہمیں پوری محنت اور دل سوزی کے ساتھ کرنا چاہیے۔ جب انسان شرک کے پھندے سے نجات پائیں گے اور اسلام کے دامن میں آئیں گے اور جب وہ ظلم و نا انصافی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے تبھی انسانوں کے مسائل بھی حل ہوں گے اور مسلمانوں کے بھی۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الہ الا اللہ

(اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا، حلقہ دہلی)



# سنگھی مہابھارت، بابری مسجد اور مسلمان: لائحہ عمل

از: عبدالرشید اگوان

بابری مسجد کی شہادت کے بعد اس کی جگہ پر رام للا کا خیمہ گڑے دس سال پورے ہو گئے۔ 1857ء کے بعد فرقہ وارانہ منافرت کا جو کھیل انگریزوں نے شروع کیا تھا وہ بابری مسجد انہدام کے بعد ایک خاص مرحلے میں داخل ہو گیا ہے جہاں ایک طرف سنگھیوں کی مہابھارت کے گھمسان کی دھمکی منظر عام پر آ چکی ہے وہیں دوسری طرف بابری مسجد کے دفاع میں لگی قوتیں محض عدالتی فیصلوں کی منتظر ہیں۔ ملک کی فرقہ وارانہ صورت حال ایک خونریز موڑ پر کھڑی ہے اور فسطائیت کا رنگ چہار سو غالب نظر آتا ہے حالانکہ ابھی سنگھیوں کو سیکولرزم کی علم بردار قوتوں سے نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔ ملک کی سیاست جس طرح ذات پات، مذہب کے بے جا استعمال اور امریکی اسرائیلی سرمایہ دارانہ نظام کے جال بچھا رہی ہے اس میں اس بات کے زیادہ آثار نظر آتے ہیں کہ ملک ایک زبردست انارکی کے ذریعہ ہندو پرست قوتوں کے غلبہ کا شکار ہو جائے۔ ماضی کے واقعات اور موجودہ رجحانات کی روشنی میں مستقبل میں جھانک کر دیکھا جائے کہ آخر یہ فرقہ وارانہ منافرت کیا رخ لے سکتی ہے اور صورت حال کو مناسب رخ دینے کے لئے کیا کچھ کر سکتی ہے۔

## مہابھارت کا سایہ

راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے سربراہ کے. ایس. سدرشن نے کچھ عرصہ پہلے اور ان کے ایک سپہ سالار پروین توگڑیا نے ابھی حال ہی میں یہ دھمکی دی ہے کہ اگر بابری مسجد کو ان کے تصرف میں نہیں دیا گیا تو ملک میں ایک اور مہابھارت چھڑ سکتی ہے افسوس تو یہ ہے کہ ان کے اس بیان پر کہیں سے کوئی گرفت نہیں ہوئی ہے یہاں تک کہ بابری مسجد کے دفاع میں لگی قوتیں بھی خاموشی سے اس بیان کو ایک پاگل کی بڑ سمجھ کر بھلا دینا چاہتی ہیں۔ مگر طوفان سے پہلے شتر مرغ کا رویہ اختیار کرنے سے نہ حالات بدلا کرتے ہیں نہ تاریخ ایسے لوگوں کو معاف کرتی ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ ابھی ملک میں قانون کی چلتی ہے اور مرکزی حکومت پر چاہے سنگھی قوتوں کا قبضہ ہو مگر ملک کا سیکولر مزاج ابھی تک ان کے راہ کی ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جس طرح بابری مسجد شہید کرنے والے گنہگاروں کو قانون اپنی گرفت میں لانے میں اب تک

ناکام رہا بلکہ ان کا موجودہ غلبہ رام مندر تحریک کا ایک انعام سمجھا جاتا ہے اور مرکزی حکومت پر اس غلبہ کو مضبوط تر کرنے کے لئے اس تحریک کو مسلسل ذریعہ بنانے کی وکالت کی جاتی ہے۔ اس سے یہی محسوس ہوتا ہے کہ زبردست سیکولر دباؤ کے باوجود قانون کے ہاتھ بندھے ہیں اور سازشی لوگوں کے لئے اس بات کی کافی گنجائش ہے کہ وہ اپنی چالوں سے دستور اور قانون کو بھی اپنا آلۂ کار بنالیں۔ ہٹلر بھی تو دستور اور قانون کے راستے ہی سے اپنے ملک کے نظام پر قابض ہوا تھا اور اسی طرح بابری مسجد کی شہادت بھی تو ایک عدالتی کھیل کے بعد ملک کے حفاظتی دستوں کی موجودگی میں اور صوبائی حکومت کے سایہ میں ہوئی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دستور اور قانون بھی اکثر زبردست عوامی تحریک کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اس لئے بابری مسجد کو رام مندر کی تعمیر کے لئے نہ سونپنے کی صورت میں مہابھارت مچ جانے کی دھمکی کو بے وزن سمجھنا ایک نادانی ہوگی۔ باخبر افراد جانتے ہیں کہ بابری مسجد کی شہادت سے قبل میڈیا میں اس طرح کی پیشین گوئی موجود تھی جن میں سول وار (Civil War) کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا۔ مگر اس وقت مسلمانوں کے ردعمل کی سطح وہ نہیں تھی جو قیاس کی گئی تھی بلکہ مسلمان اس سانحہ کو بھلا دینا چاہتے تھے۔ لیکن ان پر مہابھارت کی تلوار لٹک رہی تھی اور انہیں جبراً ایک کشت وخون سے لبریز کھیل میں شامل کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ جس طرح گودھرا کانڈ کو ایک منصوبہ بند طریقے سے رچا گیا اور اسے مسلمانوں پر تھوپ کر پورے صوبہ میں قتل وغارت گری کا ماحول برپا کیا گیا اور پورے ملک میں گجرات تجربے کو دوہرانے کی دھمکی بھی کھلے عام دی جا رہی ہے اس سے یہ اندیشہ صحیح نظر آتا ہے کہ فسطائی اپنے مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس پر طرّہ یہ کہ شیو سینا خودکش دستے تیار کرنے لگی ہے۔ جو تنظیمیں کشمیر میں چھڑی سرد جنگ کے کٹھن مرحلے میں صرف سیاسی دباؤ پر عمل کرتی رہیں ان کے خودکش دستوں کے نشانے پر آخر کون ہوگا یہ سوچنے کی بات ہے۔ جب امریکہ جیسے ملک میں 11/ستمبر کو ڈرامہ کرکے پوری دنیا کو جنون میں مبتلا کیا جا سکتا ہے تو پھر کسی فرضی واقعہ کی آڑ میں اس ملک میں خوفناک حالات پیدا کر دینا کیا مشکل کام ہے۔ آخر گودھرا کا واقعہ ہماری کھلی آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ اس سلسلے میں قابل غور پہلو یہ بھی ہے کہ ایک عرصے تک فرقہ وارانہ فسادات میں ملک کے پسماندہ طبقات کو آپس میں لڑانے کی تکڑم کارفرما رہی ہے۔ میناکشی پورم سے اٹھی لہر نے دلتوں میں جو بیداری پیدا کی اس نے ان فسادات کو روکنے میں بڑی حد تک موثر رول ادا کیا مگر اسی لہر میں جنم لینے والا دلتوں کی قیادت کا ایک طبقہ اپنے سب

سے بڑے حریف کی چھاؤں میں حکومت کا عیش لوٹ رہا ہے۔ اور وہ کب پوری طرح 1947ء کے سکھوں یا گودھرا کے بعد گجرات کے آدی واسیوں یا آسام کے بوڈو قبائل کی طرح ملک کی امن مخالف قوتوں کا آلۂ کار بن جائے کہنا مشکل ہے۔

## الٰہی نظام

سیکولر قوتوں کے لئے اس پورے مسئلہ کی نوعیت اور اس کے حال کی تدابیر کا اپنا ایک میدان ہے اور اس پوری کشمکش میں ان کی حصہ داری کے محرکات جدا ہیں۔ مگر ملک کے مسلمانوں کے لیے یہ مسئلہ خدائی آزمائش کا درجہ رکھتا ہے۔ میناکشی پورم سے اُٹھی لہر کا رخ بدلنے کے لئے ملک میں ایک کے بعد ایک فرقہ پرستانہ کارڈ کھیلے گئے۔ قرآن کی آیات پر پابندی کی ناکام کوششیں، پرسنل لاء میں چھیڑ چھاڑ کی سازش، بابری مسجد مسئلہ کو عدالت سے باہر لاکر ایک عوامی تحریک بنا کر حق و باطل کی کشمکش کو آغاز ہی میں طبقاتی کشمکش میں بدلنے کا اصل ہدف دعوت اسلامی ہے۔ ابھی حال ہی میں آر. ایس. ایس. کے سربراہ نے کہا ہے کہ ملک میں امن وسلامتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تبدیلئ مذہب ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے بہت سے شواہد ہیں کہ الٰہی نظام کے تحت اس ملک میں توحید وشرک کی کشمکش برپا ہے۔ بابری مسجد اور رام جنم مندر تو اس کی علامتیں ہیں۔ اب یا تو شرک کا آخری محور توحید کے آگے سپر ڈال دے یا پھر یہ کہ توحید کی شمع پر ایک وقفہ خاص تک کے لئے ظلمت چھا جائے۔ مسلمانوں کو شاید اس کا شعور نہیں مگر ملک کی مشرک قیادت اس بات کے سارے جتن کر ڈالنا چاہتی ہے کہ ایک طرف تو بزور قوت بابری مسجد اور اس کے بعد کئی اور مسجدوں کو نشانہ بنانے سے عوام میں یہ پیغام پہنچے کہ حق کا راستہ شرک ہے نہ کہ توحید۔ اور دوسری طرف داعی اور مدعو کے بیچ نفرت کی ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی جائے کہ افہام وتفہیم اور دوستی اور ملاقات اور دعوت وخیر خواہی کی کوئی آواز اس پار نہ جا سکے۔

مشرکانہ قیادت دراصل ایک دفاعی منصوبہ اور ردعمل کے زیر اثر کام کر رہی ہے تاکہ اپنی فرسودہ سوچ کو وہ ملک کے عوام پر تھوپ سکے۔ میناکشی پورم سے اُٹھی لہر کے نتیجہ میں حالانکہ کوئی بڑی تعداد دائرۂ اسلام میں نہیں آئی مگر دلتوں کے پاس اسلام کے روپ میں اتنا بڑا ہتھیار آج موجود ہے کہ انہیں اس روشن زمانے میں شودر بنانا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی دلتوں پر جارح قوتوں کی

طرف سے کوئی دباؤ پیدا ہوتا ہے تو ان کی محض اس دھمکی سے حالات ان کے حق میں خوشگوار ہو جاتے ہیں کہ وہ اسلام قبول کرلیں گے۔

اللہ کا گھر اللہ کی موجودگی میں اس کے اذن سے ہی ٹوٹ سکتا ہے۔ اللہ نے باطل کو اتنا بے خوف کر دیا تھا کہ انہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ وہ کیا کر بیٹھے۔ حالانکہ آیات الٰہی ایک کے بعد ایک ان کے سامنے آرہی ہیں اور کبھی وہ اس سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور کبھی قدرت کے لطیف اشاروں کو نظر انداز کرنا پسند کرتے ہیں۔ بابری مسجد انہدام کے بعد لاتور میں آئے زلزلے اور کھلیاری گاؤں کی مکمل تباہی سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ بابری مسجد کو توڑنے کے لئے جس علاقہ سے ہراول دستہ اجودھیا پہنچا تھا اسے الٰہی نظام کے تحت سزا مل گئی۔ بابری مسجد کی شہادت کی تیاری کے لئے سورت کے قریب جن جنگلوں میں لاتور اور ملک کے دوسرے حصوں سے پہنچے نوجوانوں کو بابری مسجد توڑنے کی ٹریننگ دی گئی وہاں پھوٹے حیضہ نے بھی اپنا پیغام دیا۔ 25/جنوری 2001ء کی شام میں وشو ہندو پریشد کے نائب صدر گری راج کشور کے اس بیان کہ ''بابری مسجد کی جگہ پر رام جنم مندر بنانے سے مسلمانوں کا خدا بھی نہیں روک سکتا'' کے اگلے ہی دن بھج اور انجار میں بھیانک زلزلہ سے اس بیان کا جواب مل گیا۔

یہ بات بھی دھیرے دھیرے واضح ہوتی جارہی ہے کہ رام مندر تحریک اور اس کی سرپرست سیاسی جماعتوں کے پاس ایسی کوئی طاقت نہیں جو اخلاقی لحاظ سے بلند اور اپنے مقصد کے لئے واقعی مذہبی جذبہ سے سرشار ہو۔ ان کی آپسی پھوٹ اور غیر ملکی قوتوں کے ہاتھوں ان کی بے بسی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں حق کدھر ہے۔

اس کے باوجود پروین توگڑیا اور ان کے گرد مہابھارت کی دھمکی دیتے ہیں تو اس پر حیرت ہے۔ ایک طرف وہ لوگ جو قانون، دستور اور انصاف میں بھروسہ رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ معاملے کا تصفیہ پرامن طریقے سے ہو جائے تو دوسری طرف وہ قوتیں ہیں جو جارحیت اور آستھا کے تابع ہیں۔ جب کوئی دلیل نہ ہو تو آستھا کی دہائی دینا یا زور آزمائی کی دھمکی دینا ضروری سمجھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ حق کدھر ہے اور ظلم کا شیوا کس کا ہے۔ توگڑیا یا ان جیسے لوگ مذہب کا نام تو خوب لیتے ہیں مگر شاید انہوں نے مہابھارت بھی ٹھیک سے نہیں پڑھی۔ مہابھارت حالانکہ ایک افسانہ ہے مگر اسے تاریخ کا ایک حصہ ہی مان لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مہابھارت

حق و ناحق کے بیچ چھڑی ایک جنگ تھی جس میں بالآخر حق کی فتح ہوئی۔ ایک طرف تو اپنی نفری طاقت، بڑے بڑے سپہ سالار اور حکومت کے زور پر دریودھن اور اس کے حلیف موجود تھے تو دوسری طرف پانچ پانڈو اور ان کے کمزور حلیف۔ طاقت اور صلاحیت کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ ایک اقلیت کو ایک اکثریت نے زبردستی میدانِ جنگ میں کھینچ لیا، جہاں اقلیت کا سپہ سالار ارجن جنگ کرنے یا نہ کرنے کی کشمکش میں بیچ میدان میں بھی مبتلا تھا۔ مگر اس جنگ نے حالات یکسر بدل دیے۔ متکبرین کی سرکوبی ہوئی اور حق پسند اقلیت نے غلبہ حاصل کیا۔ پروین توگڑیا نے اگر مہابھارت پڑھی ہوتی تو ملک کو مہابھارت کی جانب دھکیلنے سے پہلے وہ مہابھارت کے اوراق میں اپنے انجام کو دیکھ لیتے۔

ہمارا کردار

الٰہی چال چلی جا چکی اور رلامحالہ ایک نہ ایک دن حق و باطل آمنے سامنے ہوں گے اور حق کے غلبہ کے لئے یہ مرحلہ ناگزیر ہے۔ مگر سوال یہ اُٹھتا ہے کہ اس کشمکش میں ہمارا کردار کیا ہو؟ اس سلسلہ میں ہمارا سب سے اہم کردار تو یہی ہوسکتا ہے کہ ملک کو مخدوش حالات سے بچانے کی انتھک کوشش کی جائے اور سیکولر قوتوں اور انصاف کی آخری شمع کو روشن رکھا جائے۔ مگر اس کے لئے سب سے موثر رول تو ملک کی عام بیداری ہی ادا کرسکتی ہے۔ ایک عوامی تحریک کے اثر کو ضائع کرنے کے لئے ایک عوامی تحریک ہی کارگر ہوسکتی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی جانب سے ایک عوامی تحریک برپا کرنے کی ضرورت ہے جس کی دعوتِ سخن توحید ہو نہ کہ سیکولر نظام۔ ملک کے عام شہری جب تک شرک کے مضر اثرات سے باخبر نہیں ہوں گے وہ شر پسندوں کی سازشوں کا شکار ہوتے رہیں گے اور کبھی بھی کسی سازش کے تحت وہ کشت و خون کی مہابھارت میں سنگھی جیالوں کے دام میں بھی آسکتے ہیں۔

شرک سے کراہیت اور توحید پسندی کا رجحان ملک میں پیدا کرنا بحیثیت داعی امت پر ضروری ہے۔ یہ فرضِ منصبی کا تقاضہ بھی ہے اور مسائل کا مداوا بھی۔ یہ خیال یقیناً سامنے ہوسکتا ہے کہ یہ تو ایک مشکل ڈگر ہے مگر ایک داعی کا کردار خیر پسندی کا ہوتا ہے۔ انسانوں کا خیر خواہ داعی جب اُٹھتا ہے تو شر کے بادل چھٹتے چلے جاتے ہیں بس ہمیں الٰہی نظام پر توکل پیدا کرنے اور عملی جدو جہد کی ضرورت ہے۔ □ □

(ماہنامہ افکارِ ملی، نئی دہلی، جنوری 2003ء)

# تاریخی بابری مسجد اور انقلابی سوچ

از: ایس.حق، پٹنہ

پُرانے زمانے اور آج بھی اجودھیا میں کیا مندر ہے، جسے وہاں کے پجاری رام کی پیدائش کی جگہ بتاتے ہیں۔ برطانوی دورِحکومت میں بابری مسجد کے باہر ایک جگہ کو رام کی جائے پیدائش بتایا گیا تھا جہاں چبوترہ بنوا دیا گیا۔ 22/دسمبر 1949ء کی شب بابری مسجد کا تالا توڑ کر مورتی نصب کرا دی گئی۔ اس رات اس علاقے میں تعینات ہندو پولس نے ایف.آئی.آر. میں درج کرایا کہ ہندو فرقہ پرست اس سازش کو رام للا کے سوئمبر پرکٹ (ازخود نمودار) ہونے کا پرچار کرتے رہے تو پُورے ملک کے مندروں سے مورتی چوری ہونے پر ایف.آئی.آر. کیوں درج کرائی جاتی ہے۔ جب مورتی از خود پرکٹ ہوسکتی ہے تو خود ہی غائب کیوں نہیں ہوسکتی؟ بھوج کی کمال مولا مسجد میں وہاں کی سرکار نے ہندوؤں کو درشن دینے کی اجازت دے رکھی ہے۔

مس اُوما بھارتی نے سبھی میڈیا کے سامنے بھوج کی کمال مولیٰ مسجد سے باہر آکر بتایا کہ یہ ایک مندر ہے جس کی مورتی انگریز سینکڑوں سال پہلے اپنے ساتھ لندن لے گئے تھے۔فرقہ پرستوں کا کمال یہی ہے کہ وہ جب چاہتے ہیں، مورتی پرکٹ (نمودار) کرا دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں مورتی لندن بھیج دیتے ہیں۔قدرت کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی جس کی مثال رام مندر کے ایک زمانہ کے ایک بہت بڑے ہیرو اور آر.ایس.ایس. کے سب سے پسندیدہ دھرتی پُتر کلیان سنگھ ہیں، جنہوں نے 14/جولائی کو بی.بی.سی. سے ایک انٹرویو کے دوران بتایا کہ بابری مسجد (کلیان سنگھ بھی سبھی فرقہ پرستوں کی طرح پہلے متنازعہ ڈھانچہ کہتے تھے) انہدام کی سازش سابق آر.ایس.ایس. کے سنگھ چالک راجندر سنگھ، اٹل بہاری واجپئی، ایل.کے.اڈوانی، مرلی منوہر جوشی، گری راج کشور، اشوک سنگھل نے رچی تھی جس کے نتیجہ میں بابری مسجد شہید ہوئی اور ان کو (کلیان) اس کے متعلق اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔ ادھر یہ انٹرویو دے رہے تھے اور دوسری طرف سابق سر سنگھ چالک راجندر سنگھ دنیائے فانی سے کوچ کر رہے تھے اور ان پر مسجد توڑنے کی سازش کا الزام ان کے ایک وقت کے پسندیدہ شخص لگا رہے تھے۔

میڈیا بشمول اُردو ذرائع ابلاغ ہی یہ باتیں بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ بابری مسجد، رام جنم

بھومی کا معاملہ الیکشن کے وقت اُٹھایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ''سہارا سمے'' نے اپنے 27/ستمبر 2003ء کے ایشو میں ایک مضمون ''ہر چناؤ میں چاہئے مندر'' شائع کیا ہے۔ دراصل اس طرح کے مضامین کے ذریعہ مسلمانوں کے سلگتے انقلابی انداز نظر پر ٹھنڈا پانی ڈالنے کا کام کیا جاتا ہے۔ 6/دسمبر 1992ء سے پہلے کہا جاتا تھا کہ الیکشن جیتنے کے لیے ایسی ذہنیت کے لوگ رتھ پر سوار ہو جاتے ہیں۔

کورٹ میں بھی حلف نامہ دائر کیا گیا تھا کہ مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا مگر نتیجہ اس کے برعکس۔ مسجد شہید کر دی گئی۔ مسجد کی زمین پر مندر تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا اور اب سرکاری محکمہ آثارِ قدیمہ (اے۔ایس۔آئی) نے مسجد کے نیچے مندر ہونے کے شواہد بھی پیش کر دیئے ہیں جس سے ہندو فرقہ پرستوں کی باچھیں کھل گئیں۔ حکومت بھاجپائی اور اے۔ایس۔آئی محکمہ حکومت کا ایک ماتحتی ادارہ ہے تو ظاہر ہے کہ ایسی ہی رپورٹ آتی۔ حکومت سے وابستہ افراد، سی۔ بی۔آئی، پولس، کسٹم، محکمہ ہوابازی، فیرا، انکم ٹیکس، الغرض یہ کہ ہر سرکاری محکمہ کا غلط اور ناجائز استعمال حکومت کے ہم نواؤں نے کیا ہے تو ایسے میں اے۔ایس۔آئی۔ کیا چیز ہے۔ کیا اس کا بے جا استعمال نہیں کیا جا رہا ہے۔ (''نئی صدی'' کا کہنا ہے کہ اے۔ایس۔آئی۔ کی رپورٹ آر۔ایس۔ایس۔ نے لکھی ہے'' بالکل درست ہے) اب قوم کو ایک نئے زاویے سے سوچنا ہوگا جس کے لیے قرآن کے پہلے لفظ ''اِقراءُ'' یعنی ''پڑھ'' تعلیم حاصل کیجئے۔ اس پر قوم کو سختی سے عمل کرنا ہوگا۔ حصولِ علم کے ذریعے ہماری قوم انقلابی فکر کی راہ ہموار کر سکتی ہے۔

(بشکریہ ''نئی صدی''، 15-9/اکتوبر 2003ء)



# مسلمانِ ہند کے لئے انتباہ

از: مولانا عبدالعلیم اصلاحی

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

بابری مسجد کے مسئلہ کا ایک بہت ہی خاص اور اہم پہلو ہے جس طرح یہ مسئلہ ملت اسلامیہ ہند کے لئے ملی اور قومی اعتبار سے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اسی طرح بحیثیت مجموعی پورے ملک کے لئے بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

بابری مسجد کا انہدام ایک قومی جرم اور اجتماعی ظلم ہے، قدرت انفرادی فروگذاشتوں سے اغماض کرتی ہے اور بخش دے سکتی ہے لیکن اجتماعی خطاؤں کو معاف نہیں کرتی ہے۔ دن کی روشنی میں ملک کے کونے کونے سے لاکھوں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ پوری شان وشوکت کا اظہار کرتے ہیں فخریہ انداز میں مسجد کو توڑتے ہیں، الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اس ظلم صریح کو پوری دنیا نے دیکھا، ہمارے ملک کے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بوڑھے، جوان، مرد، عورت، ہر ایک کے سامنے یہ منظر آیا۔ بہت ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے آنسو بھی بہائے ہوں، مگر ایک ارب انسانوں میں دو چار ایسے بھلے لوگ بھی نہیں نکلے جنھوں نے اس ظلم کو روکنے کی کوشش کی ہو۔ پھر دیکھئے مسجد توڑنے والوں کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک اختیار کیا گیا۔ ان کو بحفاظت ان کے گھروں تک پہنچانے کا انتظام ہوا۔ ان میں سے بڑی اکثریت کو ٹکٹ بھی خریدنا نہیں پڑا۔ جب یہ لوگ اپنے اپنے گھر پہنچ گئے تو ان کا گرم جوشانہ استقبال کیا گیا اور شاباشی دی گئی۔ اسی کے ساتھ سانحہ کی تحقیق کے لئے ایک کمیشن قائم کیا گیا جو 8 سال گذر جانے کے بعد بھی کسی نتیجہ تک نہیں پہنچا، عدالت میں یہ کیس 50 سال سے اٹکا ہوا ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ یہ تسلیم کرتے ہوئے ہو رہا ہے کہ یہ ایک جرم ہے جس کا ارتکاب ہوا ہے۔ تحقیق طلب بات صرف یہ ہے کہ جرم کس نے کیا ہے۔ انصاف کا تقاضہ تھا کہ مکان کا ڈھایا جانا جب ثابت ہے تو مکان بنا کر دے دیا جاتا یا کم از کم مالک مکان کو موقع فراہم کیا

جاتا کہ وہ خود اپنا مکان بنا لے لیکن انصاف کا یہ ادنیٰ تقاضا بھی پورا نہیں کیا جا رہا ہے۔ ملک کی یہ اخلاقی صورت حال ایسی ہے کہ جو ملک کی تباہی اور بربادی کے لئے آسمانی اور زمینی آفات کو دعوت دینے والی ہے اور شدید اندیشہ ہے کہ پورا ملک اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو جائے اور ہندوستانی قوم کا نام بھی ان اقوام میں آ جائے جو اجتماعی غلط کاریوں کی پاداش میں برباد کر دی گئیں۔

قرآن کی کئی آیات کی روشنی میں اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ اقوام عالم میں ہندوستانی قوم ذلیل اور رسوا ہو اور خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان کرے۔ قرآن نے بہت کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ جو عبادت گاہوں کو ویران کرتے ہیں، اور ان کو منہدم کرتے ہیں وہ سب سے بڑے ظالم ہیں، ان کے لئے اللہ کے پاس دردناک عذاب ہے اور اس دنیا میں ذلت و رسوائی ہے۔ اسی طرح قرآن کی بعض آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبادت گاہوں کو منہدم کرنے والے ظالموں کو اللہ تعالیٰ دفع کرنے اور اقتدار کی کرسی سے ہٹانے کے لئے کچھ لوگوں کو اُٹھاتا اور تیار کرتا ہے۔ ان کو عزت کے مقام سے ہٹا کر دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ بٹھاتا ہے۔ اس بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں عذاب کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے ملک کا نظام مسلسل عدم استحکام کا شکار ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں فرقہ واریت، طبقہ واریت اور آپسی بے اعتمادی کا دور دورہ ہو جائے، اور ملک مکمل نراج اور انتشار کے طوفان میں پھنس جائے۔

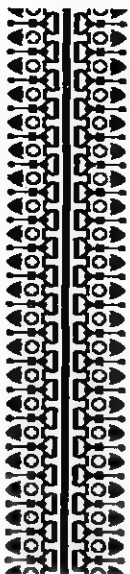
ان حالات میں ملک کے بہی خواہوں پر یہ بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان ظالموں کو قدرت کی جانب سے آنے والے عذاب سے آگاہ کریں۔ اور انہیں اجتماعی توبہ کرنے پر آمادہ کریں اور اگر یہ ظالم اس کیلئے تیار نہ ہوں تو ان کو بزور بازو اس ظلم سے روکیں، ملک کی بھلائی اور خیر خواہی چاہنے والوں کا یہ فرض بنتا ہے۔

اے کاش کوئی گروہ ایسا اُٹھتا جو اس فرض کو محسوس کرتا، اور اللہ کے بندوں کے ساتھ اپنی سچی بہی خواہی اور خیر خواہی کا حق ادا کرتا، ملک کا سب سے بڑا وفادار اور خیر خواہ حقیقت میں وہی گروہ ہوگا جو باشندگانِ ملک کو اس ظلم سے روکے۔

گجرات کا زلزلہ ایک قسم کے عذاب کا نمونہ تھا، تو دوسری قسم کے عذاب کا نمونہ سماجی اور سیاسی افراتفری کے وہ حالات ہیں جو تہلکہ ڈاٹ کام کی وجہ سے ملک میں پیدا ہو گئے ہیں۔ انسانیت کے سچے بہی خواہوں کے لئے ان واقعات اور حالات میں عبرت اور نصیحت کے بے شمار گوشے ہیں۔

جن کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنے والے تو نہیں دیکھ سکتے، لیکن دل کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ انسانی بنیادی اقدار کس طرح پامال ہو رہی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ روکا نہیں گیا تو نہیں معلوم قدرت کا کوڑا کس کس انداز میں ہم پر برسے گا اور ہماری تباہی کس انتہاء کو پہنچے گی۔ یہ معلوم ہے کہ قوم کو ظلم عظیم سے روکنے والوں کا استقبال نہیں کیا جائے گا لیکن کرنے کا یہی کام ہے، تاریخ میں انسانیت کے حقیقی بہی خواہوں کو بمشکل ہی برداشت کیا گیا ہے۔ اس لئے جو لوگ ہر طرح کی لالچ سے دور اور بے غرض ہوں گے وہی یہ کام کر سکتے ہیں۔

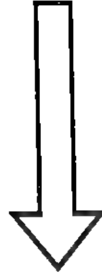
ملک کی ترقی، بھلائی اور نجات کا دارومدار نہ بائیں بازو کی حکومت پر ہے نہ دائیں بازو کی حکومت پر ہے۔ اسی طرح نہ ہندتوا کے برسر اقتدار آنے پر ہے اور نہ سیکولر گروپ کے گدی سنبھالنے پر ہے بلکہ سارا دارومدار صرف اس پر ہے کہ ملک میں انسانی اور اخلاقی اقدار پروان چڑھیں اور امانت، دیانت اور عدل و انصاف کا بول بالا ہو، ظلم و زیادتی کا خاتمہ ہو، اور خدا کی زمین پر خدا کی مرضی چلے۔ اللہ کا نام لینے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور عبادت گاہیں محفوظ رہیں۔ □ □






# دستاویزات
# DOCUMENTS





"23/دسمبر 1949، کی صبح کو جس کی شب میں بابری مسجد میں رام چندر جی کی مورتی رکھی گئی تھی قریب 9/بجے مجھے ضلع مجسٹریٹ نے بتایا کہ انھیں شری بھائی لال کے ذریعہ صبح 6/بجے معلوم ہوا کہ مسجد میں مورتی رکھ دی گئی ہے میں اسے دیکھنے گیا تھا، وہاں سے ابھی لوٹا ہوں. یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ مسجد میں جہاں پولس پہرا تھا ان پہرے داروں میں کسی کو خبر نہ ہو سکی اور بھائی لال کو اتنے سویرے اطلاع مل گئی اور یہ کہ ضلع مجسٹریٹ کو اس بات کی جانچ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ شری بھائی لال کو اتنے سویرے یہ خبر کیسے ملی."

— شری اکشے برہمچاری

933ھ

# بہادر، غازی، شاہ
# ظہیر الدین محمد بابر باد

وصیت نامہ مخفی ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ غازی بشاہزادہ نصیر الدین محمد ہمایوں ظل اللہ در استحکام سلطنت نوشتہ شد ای فرزند مملکت ہندوستان از مذاہب مختلفہ مامور است۔ بحمد اللہ کہ حق سبحانہٗ تعالیٰ بادشاہی آں چنوں کرامت فرمود باید کہ تعصبات مذہبی را از لوح دل پاک نمودہ موافق طریق ہر ملت معدلت کن خصوصاً از قربانی گاؤ بہ پرہیز کہ تسخیر قلوب اہل ہندوستانست ورعیت ایں ولایت با صفاتات بادشاہی وابستہ شود و منادر و معبدگاہ ہر قومیکہ زیر فرمان بادشاہی ست خراب مکن چناں عدل گستری اختیار کن کہ شاہ از رعیت و رعیت از بادشاہ آسودہ شود۔ ترقی اسلام از تیغ احسان بہتر است نہ کہ از تیغ ظلم و از منافقات اہل سنت و شیعہ چشم پوشی کن والاضعف اسلام موجود است و رعیت مختلف القلوب را بحکم اربعہ عناصر قائم کن کہ جسم سلطنت از امراض مختلفہ ایمن باشد و کارنامۂ حضرت امیر تیمور صاحبقرانی پیش باید روز و شب کہ بامور شہریاری پختہ شود۔

---

دستاویز نمبر 1

## بابر کی وصیت

بابر کے متعلق یہ بھی گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے یہاں آتے ہی مندروں اور مورتیوں کو مسمار کرنا شروع کر دیا، کیونکہ جس سال یہ مسجد بنی ہے اسی سال اس نے ہمایوں کے لیے یہ وصیت نامہ لکھ کر چھوڑ رکھا تھا:

''اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہوئی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے اس کی بادشاہی عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوح دل سے تمام مذہبی تعصبات کو مٹا دو، اور ہر مذہب کے طریقہ کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اس سے تم ہندوستان کے لوگوں

کے دلوں کو تسخیر کر سکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے، اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل و انصاف اس طرح کرو بادشاہ رعایا اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلاف کو نظر انداز کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملاؤ، جس طرح انسانی جسم ملا رہتا ہے، تا کہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے،

یکم جمادی الاولیٰ 935ھ (انڈیا ڈیوائڈڈ، صفحہ 39، تیسرا ایڈیشن)

---

دستاویز نمبر ❷

شری رام دوبے سب انسپکٹر پولیس اسٹیشن اجودھیا نے 23/دسمبر 1949ء کو درج ذیل ایف. آئی. آر. رجسٹرڈ کروائی۔

ماتا پرساد (پیپر نمبر 7) کے مطابق'' میں جب تقریباً نو بجے صبح جنم بھومی کے پاس پہنچا تو مجھے پتہ چلا کہ 60-50 افراد بابری مسجد کے صدر دروازے کے تالے کو توڑ کر یا دیوار پھلانگ کر اور سیڑھی لگا کر مسجد کے احاطے میں کودے اور شری بھگوان کی مورتیاں مسجد میں رکھ دیں۔ مسجد کی اندرونی و بیرونی دیواروں پر گیروے رنگ سے سیتا رام کے الفاظ لکھ دیے۔ ڈیوٹی پر موجود ہنسراج نے انہیں منع کیا لیکن وہ باز نہیں آئے۔ یہ لوگ پی. اے. سی. کے دستوں کو بلائے جانے سے قبل ہی مسجد میں داخل ہو چکے تھے۔ اس درمیان ضلعی انتظامیہ کے افسران جائے وقوع پر پہنچ گئے اور ضروری انتظامات میں مصروف ہو گئے، اس کے بعد پانچ چھ ہزار افراد کی ایک بھیڑ وہاں جمع ہو گئی جو مسلسل بھجن گا رہی اور نعرے لگا رہی تھی۔ انہوں نے مسجد میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن انہیں روک دیا گیا۔ مناسب انتظامات کی بنیاد پر کوئی اور حادثہ پیش نہیں آیا۔ رام داس، رام شکل داس، اور 60-50 نامعلوم افراد مسجد میں چپکے سے داخل ہوئے تھے اور انہوں نے مسجد کی حرمت کو پامال کیا۔ جائے وقوع پر موجود ڈیوٹی افسران اور کئی دوسرے اس واقعے کے عینی شاہد ہیں۔ چنانچہ یہ رپورٹ لکھی گئی اور اسے فائل کیا گیا۔ دستخط اسٹیشن ماسٹر

(یہ اس ایف. آئی. آر. کا ترجمہ ہے جو 23/دسمبر 1949ء کو رجسٹرڈ کی گئی تھی، جسے 11/فروری 1986ء میں باضابطہ ریکارڈ کر لیا گیا)

دستاویز نمبر ❸

## منصف کورٹ فیض آباد میں جے.این.اوگرا ڈپٹی کمشنر فیض آباد کا تحریری بیان

24/اپریل 1950ء فیض آباد کے ڈپٹی کمشنر جے.این.اوگرا نے فیض آباد کے سول جج کی عدالت میں ایک حلف نامہ داخل کیا جس کے مختلف پیراگراف یہ ہیں:

پیرا نمبر 14: یہ جائداد نزاعی بابری مسجد کے نام سے مشہور ہے اور لمبے عرصے سے اسے مسجد کے طور پر مسلمان استعمال کرتے آرہے ہیں وہ اس میں نماز پڑھتے ہیں۔ اس کا استعمال رام چندر مندر کے طور پر کبھی نہیں کیا گیا۔

پیرا نمبر 15: 22/دسمبر 1949ء کی رات میں رام چندر کی مورتی کو چوری چھپے اور غلط ڈھنگ سے مسجد کے اندر رکھ دیا گیا۔

پیرا نمبر 16: اسی غلط اور غیر قانونی واقعہ سے مسلمانوں میں کافی بے چینی پیدا ہوگئی اور علاقے میں نقض امن کا خطرہ پیدا ہوگیا اس لیے حکام کو امن وامان کی خاطر مداخلت کرنی پڑی۔

پیرا نمبر 17: ہندو مسلمانوں میں کشیدگی کے باعث سٹی مجسٹریٹ گرودت سنگھ نے 23/دسمبر 1949ء کو سیکشن 144 نافذ کر دیا۔

پیرا نمبر 18: اُسی دن ایڈیشنل سٹی مجسٹریٹ ماکنڈے سنگھ نے پولس کی رپورٹ اور دیگر اطلاعات پر دفعہ 145 (Cr.P.C.) کے تحت ایک حکم نامہ جاری کرکے فریقین سے کہا کہ وہ 17/جنوری 1950ء کو ان کی کورٹ میں اپنا تحریری بیان داخل کریں۔

پیرا نمبر 19: مجسٹریٹ مذکور نے صورت حال کو نازک پاکر جائداد کو تحویل میں لیے جانے کا حکم جاری کیا اور فیض آباد واجودھیا کے میونسپل بورڈ کے چیئرمین شری پریہ دت رام کو اس کا ریسیور مقرر کر دیا اور، ان کو اختیار دیا کہ وہ اس کے نظم ونسق کے لیے اسکیم پیش کرکے منظوری لے لیں۔

دستخط

جے این.اوگرا، ڈپٹی کمشنر فیض آباد

## دستاویز نمبر ❸ تحریری بیان کا عکس

Deputy Commissioner
Faizabad
For Deft No. 6

I, J.N. Ugra [Esqr?] Deputy Commissioner Faizabad do hereby verify that the contents of paras 12, 13, 15, 16 & 17 are true to my knowledge, the contents of paras 1 to 5, 7, 9, 14 and 19 are partly true to my knowledge and partly to my belief, and the contents of paras 6, 8, 10, 11, 18, 20 & 21 are true to my belief. Verified this 25th day of April 1950 at the Deputy Commissioner's Residence Faizabad.

knowledge in every case being based on record and information received

Deputy Commissioner
Faizabad

دستاویز نمبر ❹

# سول جج فیض آباد کا 1951ء کا فیصلہ

سول جج فیض آباد ـ مورخہ 3 / مارچ 1951ء مقدمہ نمبر 2 شری گوپال سنگھ وشاور مدعی بنام ظہور احمد مدعا علیہم

حکم

گوپال سنگھ وشاور نے موجودہ مقدمے کو 16 / جنوری 1950ء میں درج ذیل دعویٰ اور الزامات کے ساتھ پیش کیا تھا۔

وہ (مدعی) ایک سناتن ہندو ہے اور اجودھیا کا باشندہ ہے۔ وہ اجودھیا میں جنم بھومی میں شری رام چندر جی کی مورتی کی پوجا ہمیشہ سے کرتا رہا ہے اور وہاں جاتا رہا ہے۔ اسے 14 / جنوری 1950ء کو حکام یعنی مدعی علیہ نمبر 6 نے بے وجہ اور بے بنیاد اشتعال کی بنا پر جنم بھومی میں جانے سے اور وہاں مذکورہ مورتی کی پوجا پاٹ کرنے سے روک دیا تھا۔ مدعی علیہم 9-7 جو کہ مدعی علیہ نمبر 6 کے مقامی عہدیدار ہیں، مقامی ہندو عوام پر ناحق دباؤ ڈال رہے ہیں اور اس بات کی ترغیب دے رہے ہیں کہ وہ جنم بھومی میں داخل ہونے سے احتراز کریں۔ اس سلسلے میں ان کی عملی مدد ظہور اور ان کے رفقاء کی جانب سے ہو رہی ہے۔ حالانکہ مدعی علیہ نمبر 6 اور مدعی علیہم 9-7 اس کا اختیار نہیں رکھتے ہیں کہ وہ مدعی کے مذہبی معاملات میں مداخلت کریں یا اس کو جنم بھومی میں پوجا کرنے سے روک دیں۔

مدعی کی دادرسی ذیل ہے:

(الف) یہ قرار دیا جائے کہ وہ جنم بھومی میں شری رام بھگوان رام چندر اور دوسری مورتیوں کی ملکیت کا حقدار ہے اور بغیر کسی مزاحمت یا دشواری کے وہاں کی مورتیوں کے درشن کا اختیار رکھتا ہے اور

(ب) بذریعہ دوامی حکم امتناعی مدعی علیہم کو جنم بھومی سے مذکورہ مورتیوں اور شری رام بھگوان کی مورتی کو ہٹانے سے روکا جائے۔

اس نے ایک الگ درخواست میں بذریعہ بیان تحریری حلفی مطالبہ کیا کہ مدعی علیہ کے خلاف ایک عارضی حکم امتناعی جاری کیا جائے اور یہ کہ مقدمہ کا فیصلہ ملتوی کیا جائے۔ مدعی علیہم کو نوٹس جاری کیے گئے اور ایک عارضی حکم امتناعی کو منظور کیا گیا۔ دریں اثنا مدعی علیہم کو احکام 16 / جنوری 1950ء

ترمیم شدہ 19 رجنوری 1950ء جاری کیے گئے تاکہ میرے ذریعے صادر ہوئے یک طرفہ حکم امتناعی مورخہ 16 رجنوری 1950ء کی تصریح یا ترمیم ہو سکے اس وجہ سے فریقین کو عبوری حکم امتناعی کے ذریعے سے اس بات سے روکا گیا کہ وہ متنازعہ جگہ سے مورتیوں کو ہٹائیں یا پوجا وغیرہ کے ذریعہ دخل اندازی کریں، جیسا کہ موجودہ حالت ہے۔

حکم نامہ مورخہ 16 رجنوری 1950ء کا حکم اب تک برقرار ہے۔

مدعی علیہم ایک پانچ ❶ ظہور احمد، ❷ حاجی پھیکو، ❸ محمد فائق، ❹ محمد سمیع، ❺ محمد (اچھن میاں) نے عبوری حکم امتناعی کے خلاف 13 رفروری 1951ء کو ایک اعتراض داخل کیا، جس میں درج ذیل بنیادوں پر اس حکم کے جواز کو چیلنج کیا گیا تھا کہ:

❶ متنازعہ زمین، بابری مسجد کا ایک حصہ ہے، جس کی تعمیر بادشاہ بابر نے کرائی، ❷ اور یہ ہمیشہ سے مسلمانوں کے استعمال میں رہی ہے۔ ❸ اور یہ کہ ہندوؤں نے وہاں کبھی پوجا نہیں کی، ❹ اور یہ کہ وہاں موجودہ مورتیاں حال ہی رکھی گئی ہیں، ❺ انہوں نے یہ بھی دلیل دی کہ مقدمہ بوجہ عدم نوٹس زیر دفعہ یوراپس 80 ضابطہ دیوانی ناقص ہے۔

مدعی علیہم 6 تا 9: ❻ اتر پردیش اسٹیٹ، ❼ ڈپٹی کمشنر فیض آباد، ❽ سٹی مجسٹریٹ فیض آباد، ❾ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس فیض آباد کی جانب سے 25 رمارچ 1950ء تک مزید کوئی اور اعتراض داخل نہیں کیا گیا۔

یہ اعتراضات مورخہ 13 رفروری 1950ء بتاریخ 2 رمارچ 1950ء زیر سماعت آئے، اور سر اقبال احمد نے منجانب مدعی علیہم ایک تا پانچ اپنی فاضلانہ بحث میں عمارت کے مختلف پہلو اور اس کے گردو نواح کی طرف اپنی بحث کے استدلال میں توجہ دلائی جن کی تردید منجانب مدعی کی گئی۔ بایں حالت اجرائے کمیشن کی ضرورت پیش آئی کہ عمارت نزاعی کا نقشہ مرتب ہو، کمیشن کی تقرری کی تاریخ پر مدعی علیہم نے درخواست گزاری کی کہ عمارت کی تصویر لی جائے جو منظور کی گئی، نقشے اور تصویریں باضابطہ تیار کر لی گئیں اور اب وہ ریکارڈ کا حصہ ہیں۔

یہ مقدمہ 17 رفروری 1951ء کو دوبارہ سماعت کے لیے زیر بحث آیا جب کہ ڈسٹرکٹ گورنمنٹ وکیل نے جو کہ مدعی علیہم 6 تا 9 کی نمائندگی کرتا ہے، مدعی علیہم 1 تا 5 کے اعتراضات و دلائل کو تسلیم کر لیا اور مزید یہ بحث کی کہ مقدمہ بعد میں نوٹس زیر دفعہ 80 باضابطہ دیوانی ناقص ہے، اس نے اپنے

اعتراضات مورخہ 25راپریل 1950ء پر زور دیا۔

یہ کہنا کافی ہے کہ دفعہ 80 ضابطہ دیوانی والی دلیل لینا مدعی علیہم 1 تا 5 کے لیے کھلی نہیں ہے۔

اس مرحلہ پر فیصلہ صادر کرنا بے شک ایک نزاعی امر ہے، لہٰذا اس مرحلہ پر یہ فیصلہ کرنا قبل از وقت ہوگا کہ مقدمہ عدم نوٹس زیر دفعہ 80 باضابطہ دیوانی کی بنا پر لائق اخراج ہے۔

ان کارروائیوں کی خاطر یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا مدعی کے پاس کوئی زیادہ واضح سوال ہے، جو مطلوب حق کے وجود کے بارے میں اُٹھایا جاسکے یا پھر حکم امتناعی کے اُٹھا لینے کی صورت مین یہ خطرہ تو نہیں کہ وہ اس حق کو کھودے یا انجام کار وہ کوئی نا قابل تلافی زحمت یا تکلیف یا نقصان میں مبتلا تو نہیں ہو رہا ہے۔

ہر لحاظ سے یہ تسلیم ہے کہ زیر بحث معاملہ میں مقدمہ قائم ہونے سے پہلے، متنازعہ جگہ مورتیاں قائم تھیں۔

علاوہ ازیں اجودھیا کے کئی مسلمانوں کے تحریری بیانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم 1936ء سے مسلمانوں نے اس جگہ کو بطور مسجد استعمال نہیں کیا اور نہ وہاں نماز ادا کی ہے اور یہ کہ ہندو وہاں پوجا وغیرہ کرتے رہے ہیں۔ کوئی ایسی چیز بھی نہیں جس سے ان تحریری بیانات کے متعلق بدگمانی کی جائے، البتہ متنازعہ زمین پر مورتیوں کے وجود سے یہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ مدعی کو مقدمہ دائر کرنے کے لیے ایک واضح جواز دستیاب ہے۔ مدعی علیہم ایک 1 تا 5 ان متعدد دستاویزوں سے استدلال کرتے ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ متنازعہ زمین ہمیشہ سے مسجد رہی ہے۔ اس مرحلے پر یہ ممکن نہیں کہ کوئی بھی فیصلہ صادر کیا جائے کیونکہ اس کا فیصلہ اس وقت ہی ہوگا جب کہ فریقین کی جانب سے مہیا کردہ تمام زبانی اور تحریری شہادتوں پر غور کرلیا جائے۔ غیر متنازعہ حقیقت یہ رہ جاتی ہے کہ اس مقدمے کی تاریخ کے وقت شری بھگوان رام چندر کی مورتی اور دوسری مورتیاں اسی جگہ قائم ہیں اور ہندو اور مدعی ان کی پوجا کرتے رہے ہیں۔ گو اس راہ میں انتظامیہ کی جانب سے کچھ بندشیں عائد رہی ہیں۔

فریقین کے مذکورہ بالا بیانات مدعی کے لیے بادی النظر میں مقدمہ ضرور بناتے ہیں، جہاں تک توازن سہولت کا تعلق ہے، یہ واضح ہے کہ حکم امتناعی عارضی کو اس مرحلے پر خارج کرنے سے مدعی کو اس حق سے جس کو اس نے اپنے مقدمہ میں مانگا ہے محروم کرنا ہوگا۔ مزید برآں یہ درمیان فریقین

تسلیم شدہ معاملہ ہے کہ اس مرحلے میں کئی دوسری مسجدیں ہیں، اس لیے اگر مقدمے کے زیر سماعت رہنے تک حکم امتناعی بدستور جاری رہے تو مقامی مسلمانوں کے لیے نماز ادا کرنے میں زیادہ زحمت نہ ہوگی۔ ان اسباب کی بنا پر میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ موجودہ حالت بدستور جاری رہے۔

حکم

عبوری امتناعی مورخہ 16 /جنوری 1950ء جس میں ترمیم شدہ 19 /جنوری 1950ء وہ تا فیصلہ، مقدمہ ہٰذا نافذ رہے گا۔

---

دستاویز نمبر 5

## شری کے. ایم. پانڈے ڈسٹرکٹ جج فیض آباد کا فیصلہ یکم /جنوری 1986ء

مقدمے کے حقائق مختصر طور پر اس طرح ہیں کہ مقدمہ نمبر 2، الف، اے/5 میں مدعی نے ایک درخواست (422/C) اس مطلب کی گزاری کہ مدعی اور ہندو قوم کے دیگر افراد عام طور سے شری بھگوان رام چندر جی کی مورتی کی پوجا اور درشن کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ان مورتیوں کی بھی پوجا کرتے ہیں جو اس مقدمے کی اراضی سے متعلق ہیں تو مدعی علیہم 9-6 کو یہ ہدایت کی جانی چاہیے کہ مذکورہ جگہ کے داخلے کے دروازے کو بند کر کے یا وہاں تالا بندی کر کے اس پوجا اور درشن میں کسی قسم کی پابندی یا رکاوٹ نہ پیدا کریں۔

مدعی علیہم 9-6 میں اتر پردیش اسٹیٹ ڈپٹی کمشنر فیض آباد، سٹی مجسٹریٹ اور ایس. پی. ہیں۔ ان لوگوں نے یہ اعتراض نامہ داخل کیا کہ عدالت کے حکم مورخہ 3 /مارچ 1951ء کے مطابق مذکورہ مورتیوں کی پوجا میں مداخلت کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں۔ وہ صرف اس بنیاد پر درخواست کے مزاحم ہیں کہ نظم وضبط کی برقراری کے سلسلے میں ضروری اقدامات اُٹھانے کے لئے ان کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان کے اس حق کو کسی بھی طور پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ فاضل عدالت نے درخواست دہندہ کو اس کی درخواست پر کسی قسم کی دادرسی نہیں کی حتیٰ کہ اس معاملے میں کوئی حکم ہی نہیں صادر کیا کیونکہ 1961ء کے رہنما مقدمہ نمبر 12 کا ریکارڈ ہائی کورٹ کے پیش نظر ہے۔

یہ بات درخواست کی نامنظوری کے مترادف ہے لہٰذا مدعی نے موجودہ درخواست کو پیش کیا۔

مدعی نے اس درخواست میں صرف مقدمہ نمبر 2، 1950ء کے مدعی علیہم 9-6 کو بہ حیثیت مخالف پارٹی کے اپنا فریق بنایا ہے۔ مدعی کہتا ہے کہ اس کو دوسرے مدعی علیہم سے کوئی شکوہ نہیں اس لیے وہ ان لوگوں کو اپنا مخالف اور محاذی بنانا نہیں چاہتا۔ اس مقدمے میں حکم امتناعی کا جو آخری حکم نافذ کیا گیا وہ 3/مئی 1951ء کا ہے۔ اس حکم کے مطابق سول جج نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ حکم امتناعی مورخہ 16/ جنوری 1950ء ترمیم شدہ 19/1950، نافذ رہے گا۔ فاضل عدالت نے اس مفہوم کا حکم امتناعی جاری کیا کہ فریقین کو حکم امتناعی کے ذریعے بہرطور اس بات سے روکا جائے گا کہ وہ متنازعہ زمین کی مورتیوں کو ہٹائیں یا پوجا کے ذریعہ مداخلت کریں وغیرہ جیسا کہ اس وقت معمول ہے۔

فاضل عدالت کا یہ فیصلہ آج تک قائم ہے اور مقدمہ نمبر 2، 1950ء میں حکم امتناعی کے اس فیصلے کی ہائی کورٹ نے بھی توثیق کر دی ہے۔ موجودہ درخواست میں صرف یہ نقطہ قابل غور ہے کہ کیا مدعی علیہم کو تالا ہٹانے کی ہدایت دی جا سکتی ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پوجا کرنے اور پجاریوں کی آزادانہ آمدورفت میں وہی خاص رکاوٹ ہے۔ میں نے ضلع مجسٹریٹ اور ایس. پی. فیض آباد کو اس معاملے میں نوٹس جاری کیے۔ یہ دونوں میرے سامنے عدالت میں پیش ہوئے۔ ضلع مجسٹریٹ نے نہایت وضاحت سے کہا کہ متنازعہ جگہ پر رکھی مورتیاں باہر سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ بیرونی پھاٹک میں پلے نہیں ہیں، خاص پھاٹک ایک سلاخوں والا جنگلہ ہے اور 2 دروازے اندرونی احاطے میں ہیں۔ 1950ء کے مقدمہ نمبر 2 کے نظری نقشہ پیپر نمبر 5/136 میں ان دروازوں کو حروف "P" اور "O" کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔ ان دونوں پھاٹکوں پر تالے لگے ہوئے ہیں، یہ معلوم نہیں کہ یہ تالے کب لگائے گئے اور کس نے اُن کو لگانے کا حکم دیا تھا۔ پجاری کو پوجا کرنے اور بھوگ کرنے کے لیے پھاٹک "O" سے اندر جانے کی اجازت ہے۔ پھاٹک "O" کا تالا نہیں کھلا ہے۔ نقشہ میں جو مورتیاں دکھائی گئی ہیں ان کے علاوہ اندر کے حصے میں اور بھی مورتیاں ہیں، جب وہاں پوجا کی جاتی ہے تو ان کو باہر سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مہنت کے علاوہ دوسرے افراد بھی ضلع مجسٹریٹ کی اجازت سے مذکورہ جگہ جا سکتے ہیں۔ گزشتہ 35 یا 36 سال سے دوسرے فرقے کے کسی بھی شخص نے وہاں نماز نہیں ادا نہیں کی ہے۔ ان کو اس جگہ جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ اس مقام پر 1951ء سے اب تک نظم وضبط کا کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوا اور نہ ہی کوئی فساد ہوا۔ پھاٹک "O" اور "P" پر تالے صرف اس لیے پڑے ہیں کہ اندر رکھی ہوئی مورتیوں کی دیکھ بھال ہو سکے کہ کہیں وہ

غائب تو نہیں کر دی گئیں ہیں۔ اور یہ تالے بھی عدالت کے حکم امتناعی کے احترام کے طور پر لگے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ مورتیوں کی حفاظت کے لیے اور نظم ونسق ضبط کی برقراری کے لیے پھاٹکوں کو بند کرنے کے علاوہ اور بھی طریقے ہیں۔ ایس. ایس. پی. فیض آباد شری رام پرم ویر سنگھ سے بھی میں نے بیان لیا انہوں نے کہا کہ پولس فورس متنازعہ جگہ پر موجود ہے۔ ان کا بھی یہ کہنا تھا کہ خواہ پھاٹک کھولے جائیں یا بند رکھے جائیں نظم وضبط اور امن کو کامیابی کے ساتھ قائم رکھا جا سکتا ہے۔ تو یہ واضح ہوا کہ مورتیوں کی حفاظت یا نظم وضبط کے لیے پھاٹکوں پر تالے لگانا ضروری نہیں۔ اس سے غیر ضروری طور پر مدعی اور اس کے فرقے کے لوگوں کو اشتعال دلانا ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ضرورت بھی ظاہر نہیں ہوتی کہ مورتیوں اور عقیدت مندوں کے درمیان ایک مصنوعی رکاوٹ پیدا کی جائے۔ فریقین کی سماعت گزاری کے بعد یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تالے کھولے جانے کی صورت میں اور یاتریوں کے لیے درشن اور پوجا کی اجازت دینے سے دوسرے فرقے یعنی مسلمانوں کی جمعیت حد تصور تک بھی متاثر نہیں ہوتی۔ یہ امر غیر متنازعہ ہے کہ مذکورہ جگہ فی الحال عدالت کے عمل و دخل میں ہے اور گزشتہ 35 سال سے ہندو پوجا کرنے کا غیر محدود حق رکھتے چلے آئے ہیں۔ جیسا کہ عدالت کے احکام 135 وغیرہ سے ظاہر ہے۔ اگر ہندو ایک محدود پابندی کے ساتھ گزشتہ 35 برسوں سے پوجا پاٹ کرتے رہے ہیں تو اگر "O" اور "P" پھاٹکوں کے تالے کھول دیے جائیں تو آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔

اگر حالات یہی ہیں تو پھر تالوں کو ہٹا دینے کے نتیجے میں نظم وضبط کے مسائل کھڑے ہونے کی نوبت نہیں آئے گی۔ یہ قطعی طور پر متنازعہ جگہ کے اندر کا معاملہ ہے۔ موجودہ اپیل اس حکم کے خلاف ہے جو ایسی درخواست پر دیا گیا جو کہ آرڈر 39 کے مفہوم میں ایسے ہی آتی ہے جیسے کہ ضابطہ دیوانی کی دفعہ 115/S کے تحت آتی ہے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس. ایس. پی. فیض آباد کے ان مثبت بیانات کے بعد کہ نظم وضبط کی صورت حال دوسرے ذرائع سے بھی قابو میں رکھی جا سکتی ہے اور اس کے لیے ان دروازوں پر تالے بند رکھنا ضروری نہیں ہے۔ ان تالوں کا بدستور بند رہنا صحیح نہیں لہٰذا اس اپیل میں ایک وزن ہے۔ یہ اپیل منظور کی جاتی ہے اور مدعی علیہم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ فی الفور پھاٹک "O" اور "P" کے تالے کھول دیں اور وہ مدعی یا اس کے فرقے کے افراد پر درشن کرنے یا پوجا کرنے میں کسی طرح مانع نہ ہوں اور رکاوٹ نہ ڈالیں۔ بہرکیف مدعی علیہم نظم وضبط کو قابو میں رکھنے

کے لیے اور یاتریوں کے داخلے کی باقاعدگی کے لیے حالات کے تحت کسی بھی آزادانہ اقدام کے مجاز ہوں گے۔

---

دستاویز نمبر 6

## یو. پی. کے مسلم ممبران اسمبلی کا میمورنڈم

مذکورہ بالا فیصلے کے خلاف اتر پردیش کے مسلم ممبران اسمبلی نے یو. پی. کے وزیر اعلیٰ کے سامنے ایک میمورنڈم پیش کیا جس کا متن یوں تھا:

''ہم درج ممبران اسمبلی آنجناب کی توجہ بابری مسجد اجودھیا ضلع فیض آباد سے متعلق مندرجہ ذیل امور کی طرف کرانا چاہتے ہیں، جسے آج کل سرکاری ذرائع ابلاغ تک رام جنم بھومی یا جنم استھان کے نام سے پکار رہے ہیں۔ ہماری استدعا ہے کہ آنجناب فوراً ایسے اقدامات کریں جن سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کا قوم کے سیکولر اور جمہوری کردار پر اعتماد بحال ہو۔

1. یہ کہ معتبر کتب تاریخ بشمول تزک بابری کے مطابق بابر نے اجودھیا کے کسی مندر کو مسمار نہیں کیا۔ مذکورہ مسجد بابر کے کمانڈر نے ایک خالی جگہ پر بنائی تھی اور اسے گزشتہ 450 سو سال سے بابری مسجد کے نام سے جانا جاتا رہا ہے۔ کسی مندر کو منہدم کر کے اس کے کھنڈر پر کسی مسجد کے بنائے جانے کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ آئین اکبری اور عالم گیری نامہ، ان دونوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔
2. یہ کہ 1885ء میں ایک شخص رگھوبرداس نے خود کو جنم استھان کا مہنت بتا کر سب جج فیض آباد کی عدالت میں مقدمہ 61/280، 1885ء دائر کیا اور دعویٰ کیا کہ مسجد سے الگ ایک چبوترہ شرقاً غرباً 21 فٹ، شمالاً جنوباً 17 فٹ جنم استھان ہے، جس پر کوئی عمارت نہیں لہٰذا اسے اور دوسرے پجاریوں کو سردی اور برسات میں سخت پریشانی ہوتی ہے اس لیے اس چبوترے پر مندر بنانے کی اجازت دی جائے۔ 19 رجنوری 1885ء کی اسی درخواست میں پیراگراف نمبر 4 میں کہا گیا تھا کہ مارچ، اپریل 1883ء میں ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے بعض مسلمانوں کی طرف سے اعتراف کیے جانے کی وجہ سے مجوزہ مندر بنانے کی اجازت نہیں دی۔
3. 24رد سمبر 1885ء کو سب جج فیض آباد نے اس مقدمے کو خارج کر دیا اور لکھا کہ اگر چبوترے

پر ایسی جگہ میں مندر بنایا گیا تو سنکھ اور گھنٹیوں کی آواز گونجے گی، جب کہ ہندو اور مسلمان دونوں اس راہ سے گزر رہے ہوں گے اس لئے اگر ہندوؤں کو یہاں مندر بنانے کی اجازت دی جاتی ہے تو ایک نہ ایک دن فساد کھڑا ہو جائے گا اور ہزاروں آدمی مارے جائیں گے۔ اس لیے حکمت عملی کے پیش نظر اور انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ درخواست منظور نہیں کی جانی چاہئے۔ یہ جج ایک پنڈت صاحب تھے جن کا نام ہری کشن تھا۔

4. متذکرہ بالا فیصلہ کے خلاف اپیل کی گئی۔ اس اپیل کو بھی 26 / مارچ 1886ء کو ضلع مجسٹریٹ فیض آباد نے خارج کر دیا۔ (بحوالہ اپیل دیوانی نمبر 27، 1886ء مہنت رگھوبر داس بنام سکریٹری آف اسٹیٹ)

5. یہ کہ بابری مسجد کے کچھ حصوں کو 1934ء کے فرقہ وارانہ فساد میں نقصان پہنچا تھا، جسے حکومت نے مرمت کرا کے حسب سابق بنوا دیا تھا۔

6. یہ کہ 26 / فروری 1944ء کے سرکاری گزٹ میں کمشنر اوقاف نے اسے سنی وقف قرار دیا ہے۔

7. یہ کہ 1960ء کے مثل بند رجسٹر میں بھی اسے بابری مسجد دکھایا گیا۔

8. یہ کہ اس دستاویزی ثبوت کی بنیاد پر مسجد مذکور اور اس کے آس پاس کی زمین یو. پی. سنٹرل وقف بورڈ میں یو. پی. مسلم ایکٹ 1936ء کے مطابق وقف نمبر 26 فیض آباد کی حیثیت سے درج ہے۔

9. یہ کہ 22 / دسمبر 1949ء مسجد مذکور میں بے روک ٹوک نماز ہوتی تھی۔ 23 / دسمبر 1949ء کی رات میں شری رام چندر جی کی مورتی خفیہ طور پر مسجد میں رکھ دی گئی۔ یہ بات ڈپٹی کمشنر فیض آباد جے این. اُوگرا کے تحریری بیان سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ریاستی حکومت نے متنازعہ عمارت کو ہمیشہ سے بابری مسجد کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے نہ کہ شری رام چندر کی مندر کی حیثیت سے۔ لیکن یکم فروری 1986ء کو ضلع مجسٹریٹ اور ایس. پی. فیض آباد نے اچانک مقدمہ نمبر 2، 1950ء پر منصف صدر فیض آباد کے 28 / جنوری کے فیصلہ کے خلاف حقیقت کے بالکل برعکس اسٹینڈ لیا۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اپیل کنندہ رمیش چند پانڈے نہ اس مقدمے کے فریق تھے اور نہ مقدمہ نمبر 2، 1950ء میں فریق بنائے گئے تھے۔

10. یہ کہ مقدمہ نمبر 2، 1950ء کے مدعی شری گوپال سنگھ وشاور عرصہ ہوا انتقال کر چکے اور ان کی جگہ اب تک کسی دوسرے کو مدعی نہیں بنایا گیا ہے۔ اس صورت میں مقدمہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور قانونی طور پر یہ مقدمہ 25 جنوری 1986ء یا یکم فروری 1986ء کو عدالت میں قابل سماعت ہی نہ تھا۔ اس لئے اس مقدمے پر مسجد کے تالے کھولنے یا درشن اور پوجا پاٹ پر سے پابندی اُٹھانے کا حکم دیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ ریاستی قانونی مشیر ضلع مجسٹریٹ اور ایس. ایس. پی. نے جو عدالت میں موجود تھے مقدمے کے اس پہلو پر قطعاً توجہ نہ کی۔ ایسا لگتا ہے کہ پہلے سے منصوبہ بندی کے تحت ضلع انتظامیہ سے یہ حکم اس لیے حاصل کیا گیا کہ احتجاج کرنے والی اکثریت کے گروہ کو خوش کیا جائے اور یہ بات حلق سے نہیں اُترتی۔

## شری اکشے برہمچاری کا میمورنڈم جو وزیر داخلہ اور حکومت اتر پردیش کو دیا گیا

اجودھیا اور فیض آباد کے واقعات اور بابری مسجد کا مسئلہ محض ایک مندر اور مسجد کا مسئلہ یا ہندوؤں یا مسلمانوں کا جھگڑا نہ سمجھنا چاہئے۔ ان جھگڑوں کے پیچھے دراصل وہ رجعت پسندانہ سازش ہے جس کا مقصد کانگریس اور مہاتما گاندھی کے بلند اصولوں کی بیخ کنی ہے اور اس طرح الیکشن میں فرقہ وارانہ اور مذہبی جذبات اُبھار کر الیکشن جیتنا اور کانگریس گورنمنٹ کو الٹ دینا مقصود ہے۔ ان سازشوں میں مقامی حکام بھی شریک رہے ہیں، ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ فیض آباد اور اجودھیا میں ایک قسم کی نراج کی صورت پھیلی ہوئی ہے۔ ان رجعت پسندانہ عناصر کا حملہ خود میرے اوپر تین بار ہو چکا ہے۔ ایک بار لوگ میرے گھر میں گھس آئے اور مجھ کو مارا اور دوسری مرتبہ مجھ کو ضلع مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ پولس کے مکان کے سامنے گھیر لیا، پولس کو اطلاع بھیجی گئی لیکن انہوں نے ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ کانگریس کے معزز اشخاص کو بھی سرکاری عمال کے سامنے پبلک میں گالیاں دی گئیں، لوگوں کو مار پیٹ کرنے پر اُبھارا گیا لیکن باوجود اس کے کہ جن لوگوں نے یہ سب کیا ان کی حکام میں اور قدر بڑھ گئی۔ جب گنج شہیداں اور دوسری قبریں جو بابری مسجد کے قریب تھیں مجموعی طور پر کھودی جا رہی تھیں اور ان کی جگہ ایک چبوترہ تیار کیا جا رہا تھا اس کے متعلق چند معزز مسلمانوں نے ایک عرضی دفعہ 145 تعزیراتِ ہند کے تحت دی لیکن حکام نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ آج اجودھیا میں دفعہ 144 نافذ ہے، مسجد پر دفعہ 145 کی رو سے

گورنمنٹ نے قبضہ کرلیا ہے۔ لیکن ان احکامات کی برابر خلاف ورزی کی جارہی ہے۔ اسٹار ہوٹل کے واقعہ کی مثال اپنی قسم کی ایک ہی ہے۔ یہ ہوٹل ایک مسلمان کی ملکیت تھا، ضلع مجسٹریٹ نے اس ہوٹل کی عمارت کو زبردستی خالی کرایا اور اسے ایک دوسرے شخص کو دے دیا، جس نے گومتی ہوٹل کے نام سے ایک دوسرا ہوٹل کھول دیا۔

ان باتوں نے ہماری اس نامذہبی جمہوریت اور کانگریسی حکومت کے خلاف عوام میں غلط قسم کے خیالات پیدا کردیئے ہیں۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ کانگریس رجعت پسند طاقتوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کی تعداد ملک کی آبادی میں 85 فیصد ہے، وہ جو چاہیں کرسکتے ہیں، قانون کا انحصار ان کی مرضی پر ہے، اس غلط خیال کی وجہ سے جو لوگ اب تک فرقہ وارانہ اور رجعت پسندانہ خیالات کی مخالفت کرتے تھے وہ بھی ان کی موافقت کرنے لگے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب یہ ہونا ہی ہے تو ہم کیوں اس خیال کے مخالف رہیں۔ دوسری طرف رجعت پسندی نے اپنے میں خود اعتمادی پیدا کرلی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اب وہ کانگریس اور اس کے اصولوں کو کمزور کرسکتے ہیں، مجھے خوف ہے کہ اس قسم کی باتیں یہ لوگ دوسرے شہروں میں بھی پھیلائیں گے اور اس سے وہ حالات پیدا کردیں گے کہ کانگریس یا تو ان کی پیروی کرکے انہیں کا ایک جزو ہوجائے گی یا ہار کر نیست و نابود ہوجائے گی۔ اس لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں رجعت پسندوں کے حملے کی مخالفت پوری قوت سے کرنی چاہئے اور اس زہریلے ماحول کو پھیلنے سے پہلے ہی فنا کردینا چاہئے۔ میں اجودھیا کے حالات پورے طور سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔

گزشتہ 13 رنومبر 1949ء کو مجھے معلوم ہوا کہ بابری مسجد سے متصل قبروں کو مجموعی طور پر کھودا جارہا ہے۔ قبریں کھودی جارہی تھیں اور قبرستان کے وسط میں ایک پرانی بنیاد پر جسے مسلمان قناتی مسجد کہتے ہیں ایک چبوترہ بنایا جارہا تھا، مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری تھا۔ ان سے معلوم ہوا کہ انہوں نے حالات کو سنبھالنے کی غرض سے دفعہ 145 تعزیراتِ ہند کے تحت ایک درخواست سٹی مجسٹریٹ کو دی تھی کہ اس قسم کے افعال سے نقضِ امن کا اندیشہ ہے لہٰذا انہیں روک دیا جائے، لیکن اس پر کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ میں نے ضلع مجسٹریٹ سے خود تنہائی میں گفتگو کی۔ 15 رنومبر 1949ء کی رات کو میرے مکان میں تین آدمیوں نے گھس کر مجھے زدوکوب کیا اور تعجب کی بات ہے کہ جو باتیں میرے اور ضلع مجسٹریٹ کے بیچ ہوئی تھیں انہیں حرف بہ حرف ان لوگوں نے دہرایا اور

بعد میں دوسرے لوگوں سے بھی کہا۔

بابری مسجد کے سامنے جہاں قبریں کھودی گئی تھیں وہاں 9 روز تک راماین کا پاٹھ ہوتا رہا۔ بھوجن بھنڈار بہت دنوں تک ہوتے رہے، بڑی بڑی سبھائیں ہوئیں، تانگوں اور موٹروں میں لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعہ اعلان کیا گیا کہ رام چندر جی کی پیدائش کی زمین کو واپس لیا جا رہا ہے۔ یگیہ ہو رہا تھا، درشن کے لیے میلوں باہر سے لوگ موٹروں میں ہزاروں کی تعداد میں آنے لگے، جن میں جوشیلے لیکچر دیئے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ بابری مسجد کو رام مندر بنانا ہے۔ مہاتما گاندھی، کانگریس اور کانگریسیوں کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ میرے اور شری سدھیشوری پرساد صدر سٹی کانگریس کمیٹی فیض آباد کے خلاف بہت زیادہ جوش پھیلایا جاتا تھا، حملہ کرنے کے لئے للکارا جاتا تھا، اس مضمون کے اشتہار تقسیم کیے جاتے تھے اور مقامی ہفتہ وار اخبار ''ورگت'' میں غلط باتوں کے ذریعہ سے پبلک کے جذبات مشتعل کیے گئے تھے۔ راماین کا پاٹھ ہوتے وقت سرکاری افسروں کی موجودگی میں یہ سب کچھ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ پرانی قبروں اور مسلمانوں کے متبرک مقامات ہٹائے گئے اور ان جگہوں پر شیو جی کی مورتی اور دوسرے ہندو دیوتاؤں کی مورتیاں نصب کر دی گئیں۔ اس طرح منظم طور پر فرقہ وارانہ زہر پھیلایا گیا۔ حکام کے رویہ سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ جو کچھ ہو رہا ہے یا تو سرکار کی مرضی سے ہو رہا ہے یا سرکار نے فرقہ پرست طبقے کے سامنے اپنے کو ڈال دیا ہے۔

23/دسمبر 1949ء کی صبح کو جس کی شب میں بابری مسجد میں رام چندر جی کی مورتی رکھی گئی تھی قریب نو بجے مجھے ضلع مجسٹریٹ نے بتایا کہ انہیں شری بھائی لال کے ذریعہ صبح چھ بجے معلوم ہوا ہے کہ مسجد میں مورتی رکھ دی گئی ہے اسے دیکھنے گیا تھا، وہاں سے ابھی لوٹا ہوں، یہ بات سوچنے کے قابل ہے کہ مسجد میں جہاں پولس کا پہرہ تھا ان پہریداروں میں کسی کو خبر نہ ہوسکی اور بھائی لال کو اتنے سویرے اطلاع مل گئی اور یہ کہ ضلع مجسٹریٹ کو اس بات کی جانچ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ شری بھائی لال کو اتنے سویرے یہ خبر کیسے ملی۔

میں تقریباً بارہ بجے ضلع مجسٹریٹ کے ہمراہ بابری مسجد گیا جہاں مورتی رکھی ہوئی تھی۔ تھوڑے سے آدمی مسجد کے پاس جمع تھے، اس وقت آسانی سے مسجد کی حفاظت ہوسکتی تھی اور مورتی کو ہٹایا جا سکتا تھا، لیکن ضلع مجسٹریٹ نے اس کو مناسب نہیں سمجھا۔ صبح ہی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ منادی کی جانے لگی کہ بھگوان ظاہر ہوئے ہیں، ہندو درشن کے لیے چلیں۔ ضلع مجسٹریٹ کے ہمراہ جاتے وقت

میں نے فیض آباد نیز اجودھیا میں اس اعلان کی جانب ان کی توجہ موڑی۔ جوش بڑھتا گیا، نوٹس تقسیم کیے جانے لگے، موٹروں میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ درشن کے لیے آنے لگے، مجمع میں پر جوش تقریر ہوتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ کانگریس ہندو دھرم کو برباد کر رہی ہے۔ پاکستان میں ایک مندر بھی نہیں رہ گیا ہے، پھر اجودھیا میں مسجد اور قبرستان کیوں ہونا چاہئے۔ ہم لوگوں کو مل کر اجودھیا سے مسلمانوں کا نشان مٹا دینا چاہئے، یہ تبھی ممکن ہے جب کانگریس کا تختہ الٹ جائے۔ کانگریس کے اکثر لوگ اس خیال کو زیادہ پسند کرتے ہیں، لیکن پنڈت جواہر لال نہرو جی اور کچھ لوگ بھی مسلمانوں کا ساتھ دے رہے ہیں، انہیں ختم کرنا ہوگا۔ اجودھیا میں اکشے برہمچاری اور سدھیشوری پرشاد کو نہیں رہنے دینا چاہئے۔ یہ ہندو دھرم کو بڑھنے نہیں دینا چاہتے ہیں، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے قہقہوں کے درمیان یہ نعرے لگائے جاتے تھے۔ اکشے برہمچاری اور سدھیشوری کا ناش ہو، اکشے اور سدھیشوری کو مار ڈالو، یہ مذہب کے دشمن ہیں، مسلمان ہو گئے ہیں، مسلمانوں کی حفاظت کے لیے کانگریس حکومت پر اثر ڈال رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ پارلیمنٹری سکریٹری گوند سہائے کے ایک بڑے جلسے میں بھی ان لوگوں نے پکڑ کر کہا، اور مذکورہ بالا نعرہ لگا کر مجمع کو مشتعل کیا۔

شری وشمبھر دیال تر پاٹھی اور شیر رگھو داس وغیرہ جیسے کانگریسی لیڈران بھی اس موقع پر اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور انہوں نے اجودھیا کی مسجد والے جلسہ میں رجعت پسندوں کی حرکتوں کی موافقت میں تقریریں کی، انہوں نے کہا کہ جمہوریت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اکثریت جسے پسند کرے وہ ہو، میں دیکھتا ہوں کہ یہاں کے لوگ یہاں مسجد نہیں پسند کرتے، لہٰذا کوئی اس کو لوٹا نہیں سکتا، اگر گورنمنٹ نے اس معاملہ میں مداخلت کی تو میں استعفٰی دے دوں گا، میں گورنمنٹ کی طرف سے آیا ہوں اور ذمہ داری کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔

راشٹریہ سویم سنگھ اور ہندو مہا سبھا کے لیڈروں نے جلسوں میں کانگریس حکومت کو دھمکی دی اور کہا کہ یہاں مسجد نہیں ہو سکتی۔ دفعہ 144، کے نفاذ کے باوجود، سرکاری اجازت کے بغیر ان لوگوں کے بڑے بڑے جلوس نکلتے اور جلسے ہوتے تھے، دفعہ 144 کی پابندی صرف مسلمانوں تک ہی محدود تھی، جس کی وجہ سے یہ لوگ بابری مسجد میں نماز پڑھنے سے روک دیے گئے، کئی روز تک اجودھیا میں مسلمانوں کا داخلہ روک دیا گیا، لیکن ہندوؤں پر جنھوں نے جوش پھیلانے کے لیے یہ حرکتیں کی تھیں، اس دفعہ کا کوئی اثر نہ تھا، باوجود یہ کہ بابری مسجد پر گورنمنٹ نے حسب دفعہ 144 قبضہ کر لیا

تھا، لیکن اس پر پوجا پاٹ جاری رکھا گیا اور مسلمانوں کو نماز پڑھنے سے محروم کر دیا گیا۔

اسٹار ہوٹل کا سوال بھی بہت اہم ہے شری بھائی لال نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اطلاع دی کہ باہر کے کچھ مسلمان آ کر اسٹار ہوٹل میں ٹھہرے ہیں، ان کے پاس اسلحہ وغیرہ بھی ہے، ہوٹل کی تلاشی لی گئی وہاں کوئی دوسرا اسلحہ نہیں ملا، صرف چار آدمی ملے۔ ان میں سے ایک شخص سلطان پور کا باشندہ ہے اور بسکٹ کا کاروبار کرتا ہے، بسکٹ خریدنے فیض آباد آیا تھا، اس کے خلاف دفعہ 109 تعزیرات ہند کا مقدمہ چلایا گیا اور ہوٹل کو اسی وقت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنی موجودگی میں بے گناہ ہوٹل کے مالک سے خالی کرایا، بعد میں وہ ہوٹل کا مکان دوسرے کو دے دیا گیا، اب پتا چلا ہے کہ وہاں ایک دوسرا ہوٹل گومتی ہوٹل کے نام سے بڑے جشن کے ساتھ کھولا گیا ہے، اس کا افتتاح ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جج نے کیا، اس رسم میں دوسرے حکام نے بھی شرکت کی، اس واقعہ سے مقامی لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ مسلمانوں نے حقیقت میں کوئی بڑی سازش کی تھی اور ساتھ ہی ساتھ ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سویم سیوک سنگھ والوں کو اپنے پرجوش عمل کو صحیح ثابت کرنے کا ایک آلہ مل گیا ہے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی مذہب پرستی کی ساکھ بڑھ گئی ہے اور یہ چرچا ہونے لگا ہے کہ مذہب کی حفاظت کے لیے انہوں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا اور انہوں نے صورت حال کا نہایت ہوشیاری سے مقابلہ کر کے ہندو لیڈروں کی جانیں بچائیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسٹار ہوٹل کا مالک ایک پرانا نیشلسٹ ہے اور قوم پرستی کے سبب سے پچھلے دنوں الیکشن کے زمانہ میں لیگیوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا تھا اور ہوٹل پر دھرنا دیا تھا، یہ معلوم رہے کہ اس سے پہلے چار فرقہ وارانہ فسادات فیض آباد میں ہو چکے ہیں، جن میں مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان برداشت کرنے پڑے ہیں، لیکن گورنمنٹ کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ گزشتہ بقر عید کے موقع پر جس طرح مسلمانوں کے مکانات لوٹے اور جلائے گئے اور انہیں پیٹا گیا اور عورتوں اور بچوں پر وحشیانہ طریقہ سے حملہ کر کے زخمی کیا گیا وہ اتفاقی واقعہ نہیں تھا، اس سلسلہ میں ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی کے صدر شری راجہ رام مصرا ور سٹی کانگریس کمیٹی کے صدر شری سدھیشوری پرشاد اور ضلع بورڈ کے صدر للّن جی کو گالیاں دی گئیں، ان کے خلاف حملہ کرنے کے لیے لوگوں کو اکسایا گیا، نوٹسیں تقسیم کر کے ان کاموں کو حق بجانب قرار دیا گیا، حکومت کو یہ سب معلوم ہے، لیکن افسوس ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے عدم کارروائی کی وجہ سے شرارت پسند لوگوں کی ہمت بڑھتی گئی اور مسلمان

اپنے آنسو پی کر خاموشی اختیار کرنے کے لیے مجبور ہو گئے۔ آنریبل ہوم منسٹر نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں زخمی مسلمانوں اور ان کے لٹے ہوئے اور جلے ہوئے مکانوں کو خود آکر دیکھوں گا، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

آج فیض آباد اور اجودھیا میں مسلمانوں میں بہت زیادہ خوف و ہراس طاری ہے اور ان میں سے بیشتر لوگوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو اپنے رشتے داروں کے ہاں بھیج دیا ہے اور کچھ لوگ اپنے خاندانوں سمیت ترک وطن کر گئے ہیں، میں نے بہت زیادہ کوشش گورنمنٹ کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی کی، مگر ناکام رہا، اس طرف اس کا پتہ چلا ہے کہ اجودھیا کے مسلمانوں پر یہ دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اعلان کریں کہ بابری مسجد، ہندوؤں کا مندر ہے، اس کے لیے دھمکی بھی دی جا رہی ہے اور دکانداروں کو دکان خالی کرنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے، ان سے ترک موالات کرنے کا پروپیگنڈہ ہو رہا ہے، کچھ معزز مسلمانوں پر حملہ کر کے انہیں زخمی کیا گیا ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ میرے مکان واقع جانکی گھاٹ اجودھیا کا تالا توڑ کر سب سامان لوٹ لیا گیا ہے، مکان پر قبضہ کر کے کچھ لوگ رہنے لگے ہیں، وہاں جلسوں میں پرچار کیا گیا ہے کہ میں اجودھیا میں داخل نہ ہوسکوں اور جو ہندو مجھے دیکھنے کے بعد مجھ پر حملہ نہ کرے وہ گئو ہتیا کا گنہگار ہوگا وغیرہ۔ میں اس مسئلہ کو مسجدوں یا مسلمانوں کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا، بلکہ میرے پیش نظر کانگریس اور مہاتما گاندھی کے وہ بہت بلند اصول ہیں، جن کے لیے ہم اب تک لڑتے رہے ہیں، اگر ہم نے اپنی پوری طاقت سے ان رجعت پسندانہ خیالات کا تدارک نہیں کیا تو کیا کانگریس کا نصب العین ختم ہو جائے گا اور عوام میں رجعت پسند خیالات کا پرچار ہونے لگے گا، میں لیڈروں اور سرکار کا دھیان اجودھیا کی حالت کی طرف موڑ کر یہ التجا کرنا چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد وہاں کی صورتحال کو سنبھالیں، اس طرح فساد پھیلانے والے عناصر اور ان سرکاری حکام کے خلاف جنہوں نے اس میں مدد دی ہے، سخت کارروائی کریں، حملہ کرنے والوں کے خلاف پوری کارروائی کر کے مسلمانوں کو یہ محسوس کرنے کا موقع دیں کہ وہ ایسے ملک میں ہیں جہاں ان کی جان اور ان کا مال محفوظ ہے، ان کے عبادت خانوں اور متبرک مقاموں کو واپس کر کے ان کے مذہبی جذبات کی حفاظت کریں اور اس طرح ملک میں مہاتما گاندھی کے اصولوں کی تبلیغ کر کے سچے رام راج کو قائم

کرنے میں وہ کامیابی حاصل کریں، بابری مسجد کے سلسلہ میں یہ کہنا کہ چونکہ اس مسجد کی بنا شری رام مندر کو توڑ کر قائم کی گئی ہے، لہٰذا وہ ہندوؤں کو واپس ملنی چاہئے، یہ ایک تاریخی سوال ہے لیکن تاریخی نقطہ نظر سے فیصلہ کرنے کے بعد بھی ایسے مقامات کے بارے میں کیا طرزِ عمل ہونا چاہئے، ایسا اصولی سوال ہے، جس پر بنیادی طور پر غور کرنا ضروری ہے، میں التجا کرتا ہوں کہ ہمارے لیڈر اس بارے میں کوئی صاف اور مستقل حل مرکزی حیثیت سے نکالیں، ایسے معاملات میں خاموش رہ کر اپنی رضامندی نہ ظاہر کرنی چاہئے۔

مورخہ 20رفروری 1950ء اکشے برہمچاری ممبر پردیش کانگریس کمیٹی اور سکریٹری ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی فیض آباد (افکارِملی، نئی دہلی)

## وہ دستاویزی خط وکتابت جسے نمایاں اہمیت نہیں حاصل ہوسکی

ممتاز قانون داں اور مصنف اے. جی. نورانی نے انگریزی رسالہ ''مین اسٹریم'' میں ملک کے پہلے وزیر داخلہ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور اس وقت کے وزیر اعلیٰ یو. پی. گووند ولبھ پنت کی خط وکتابت شائع کی ہے۔ اور اس کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ دونوں رہنماؤں کو معلوم تھا کہ ایک مسجد کو مندر بنانے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن انہوں نے سچائی کو تسلیم کرنے کے باوجود اس کو طاقت کے ذریعہ بحال کرنے کی جگہ تصفیہ، افہام وتفہیم پر زور دیا اور ''یک طرفہ کارروائی'' سے احتراز کیا۔ آج بھی یہ خطرہ ہے کہ کہیں ''جذبات'' باہمی حل کے نام پر اس سے زیادہ بے انصافی نہ ہوجائے۔

بابری مسجد رام جنم بھومی کے مسئلہ پر سردار پٹیل کے خط کو نمایاں حیثیت نہیں حاصل ہوئی جو حیرت انگیز ہے۔ آج کے حالات میں اس کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔

اس کی اہمیت کو سمجھنے سے پہلے سیاق وسباق کو یاد رکھنا ضروری ہے۔ 23ردسمبر 1949ء کو وزیر اعلیٰ گوبند ولبھ پنت کے نام فیض آباد کے ضلع مجسٹریٹ کے. کے. نیّر کا ریڈیو پیغام آیا۔ یہ چیف سکریٹری اور ہوم سکریٹری کے نام بھی تھا۔ پیغام مندرجہ ذیل تھا: ''چند ہندو رات کے وقت جب بابری مسجد میں سناٹا تھا، مسجد میں داخل ہوئے۔ اور وہاں مورتی رکھ دی، ضلع مجسٹریٹ اور ایس. پی. موقع پر پہنچ گئے ہیں، صورت حال قابو میں ہے۔ 15 پولس والوں کی جمعیت رات کے وقت ڈیوٹی پر تعینات تھی، لیکن غالباً اسنے مزاحمت نہیں کی۔''

یہ پیغام پولس کانسٹبل اجودھیا پرشاد کی رپورٹ کی بنیاد پر بھیجا گیا تھا۔ جو اس سے پہلے درج کرائی گئی تھی۔ سب انسپکٹر رام دو بے تھانہ اجودھیا کی درج کی ہوئی رپورٹ (ایف.آئی.آر) کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ رپورٹ 23/دسمبر 1949ء کو درج کی گئی۔ اور جس کی تصدیق کی سندسٹی مجسٹریٹ کے دفتر نے اسی سال 11/فروری کو جاری کی۔

''ماتا پرشاد کے بقول جب صبح کو آٹھ بجے جنم بھومی (؟) پہنچا تو پتہ چلا کہ 60-50 افراد کا ایک گروہ بابری مسجد کے احاطہ کے گیٹ کا تالا توڑ کر یا سیڑھی کے ذریعہ احاطہ کی دیوار پھاند کر اس میں داخل ہوا۔ اور شری بھگوان کی مورتی وہاں استھاپت کر دی۔ نیز دیواروں پر گیرو سے سیتا رام وغیرہ لکھ دیا۔ ڈیوٹی پر موجود ہنسراج نے ان کو روکا مگر وہ نہیں مانے۔ جب تک موقع پر موجود پی. اے.سی. سپاہیوں کو ہدایت دی جاتی، یہ گروہ مسجد میں داخل ہو چکا تھا۔ ضلع ایڈمنسٹریشن کے افسران موقع پر پہنچے اور انہوں نے ضروری بندوبست کیا۔ اس کے بعد پانچ چھ ہزار کا مجمع ارد گرد اکٹھا ہو گیا۔ اور اس نے بھجن وغیرہ گانا شروع کر دئے اور دھارمک نعرے لگاتے ہوئے مسجد میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ لیکن ان لوگوں کو روک دیا گیا۔ بعد میں کوئی ناگوار واقعہ نہیں ہوا۔ کیونکہ انتظامات مکمل تھے۔ رام داس، رام شکتی داس اور 60-50 نا معلوم افراد نے مسجد میں غیر قانونی طور پر داخل ہو کر اس کی بے حرمتی کی۔ ڈیوٹی پر موجود سرکاری ملازمین اور دوسرے اس کے گواہ ہیں۔ لہٰذا یہ لکھا اور فائل کیا جا رہا ہے۔''

اب سردار پٹیل کے خط کا متن ملاحظہ کیجئے:

نئی دہلی۔ 9/جنوری 1950ء

عزیزی پنت جی!

وزیر اعظم آپ کو تار بھیج چکے ہیں، جس میں اجودھیا کے واقعات پر انہوں نے تشویش ظاہر کی ہے۔ لکھنؤ میں میری اس بارے میں آپ سے بات چیت ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ مجموعی طور سے ملک کے نقطۂ نظر سے اور خود آپ کے صوبہ کے لحاظ سے یہ تنازعہ انتہائی بے موقع کھڑا کیا گیا ہے۔ وسیع تر فرقہ وارانہ مسائل کا ابھی ابھی مختلف فرقوں کے لیے اطمینان بخش تصفیہ کیا گیا ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا سوال ہے وہ ابھی اپنی نئی وفاداریوں سے خود کو ہم آہنگ کر رہے ہیں۔ یہ کہنا معقول ہوگا کہ تقسیم کے ابتدائی جھٹکوں اور ان سے پیدا شدہ غیر یقینی حالات پر قابو پانے کا عمل

ابھی شروع ہوا ہے۔ لہٰذا اس کا امکان نہیں ہے کہ بہت بڑے پیانہ پر وفاداریاں منتقل ہوں گی۔ خود آپ کے صوبہ میں فرقہ واریت کا مسئلہ پریشان کن رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ آپ کی حکومت کا ایک نمایاں کارنامہ ہے کہ متعدد پریشان کن عوامل کے باوجود فرقہ وارانہ تعلقات میں عام طور سے 1946ء کے مقابلہ اصلاح ہوئی ہے۔ گروہ بندی کی وجہ سے یو. پی. میں تنظیمی اور انتظامی اعتبار سے ہماری داخلی دشواریاں بھی ہیں۔ کسی بھی گروپ کو اس معاملے سے ناجائز فائدہ اُٹھانے دیا گیا تو یہ ہماری انتہائی بدنصیبی ہوگی۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ یہ ایسا تنازعہ ہے جس کا حل باہمی طور پر، دونوں فرقوں کی باہمی خیر سگالی اور رواداری کے جذبے میں نکالا جانا چاہئے، مجھ کو احساس ہے کہ جو قدم اُٹھایا گیا ہے اس میں جذبات کا بہت زیادہ دخل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ، ایسے معاملات کو اس صورت میں نمٹایا جا سکتا ہے، کہ ہم کو مسلم فرقہ کی رضا مندی حاصل ہو جائے۔ طاقت کے ذریعہ یہ تنازعہ نمٹانے کا کوئی سوال نہیں۔ اس صورت میں امن و قانون کی قوتوں کو ہر قیمت پر پرامن برقرار رکھنا پڑے گا۔ لہٰذا اگر پرامن اور سمجھانے بجھانے کے طریقے اختیار کرنا ہیں تو کسی یک طرفہ کارروائی کا جو کہ جارحانہ اور دباؤ والے طریقوں پر مبنی ہو، مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا مجھے یقین ہے کہ اس معاملہ کو اتنا زندہ مسئلہ نہیں بنانا چاہئے اور یہ کہ موجودہ بے وقت تنازعات کو پرامن طریقوں سے حل کیا جانا چاہئے۔ نیز طے شدہ سچائیوں کو کسی باہمی تصفیہ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنانا چاہئے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ اس سمت میں آپ کی کوششیں کامیاب ہوں گی۔

آپ کا مخلص

ولبھ بھائی پٹیل

---

## پنڈت پنت کا جواب

عزیزی سردار صاحب!

اجودھیا کے مسئلہ پر آپ کے خط کے لیے میں مشکور ہوں۔ یہ ہم کو بہت مدد دے گا۔ معاملات پر اس ڈھنگ سے ٹھیک کرنے کے لیے کوششیں ہنوز جاری ہیں۔ اور کامیابی کا معقول امکان ہے۔ لیکن ابھی تک حالات مبہم ہیں اور اس مرحلہ میں کچھ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔

آپ کا مخلص

(سردار پٹیل کی خط و کتابت جلد 9)

صاف ظاہر ہے کہ سردار پٹیل اقدام کی حمایت نہیں کر رہے تھے جو اُٹھایا گیا تھا۔ یعنی 23/دسمبر

1979ء کو بابری مسجد پر قبضہ۔ وہ مسلمانوں کی رضا مندی پر زور دیتے تھے۔ مسجد پر قبضہ ایک طے شدہ سچائی تھی۔ لیکن ''تصفیہ'' کی ضرورت بھی محسوس کی جا رہی تھی۔

پنڈت پنت نے بھی اس قبضے کو نہیں سراہا۔ وہ بھی ''پر امن'' طور پر معاملات ٹھیک کرنے کے حق میں تھے۔ ابھی تک اس غلط کو صحیح نہیں کیا گیا اور اب یہ خطرہ ہے کہ اس سے زیادہ سنگین بے انصافیوں کو ''جذبات'' کے نام پر قائم و دائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

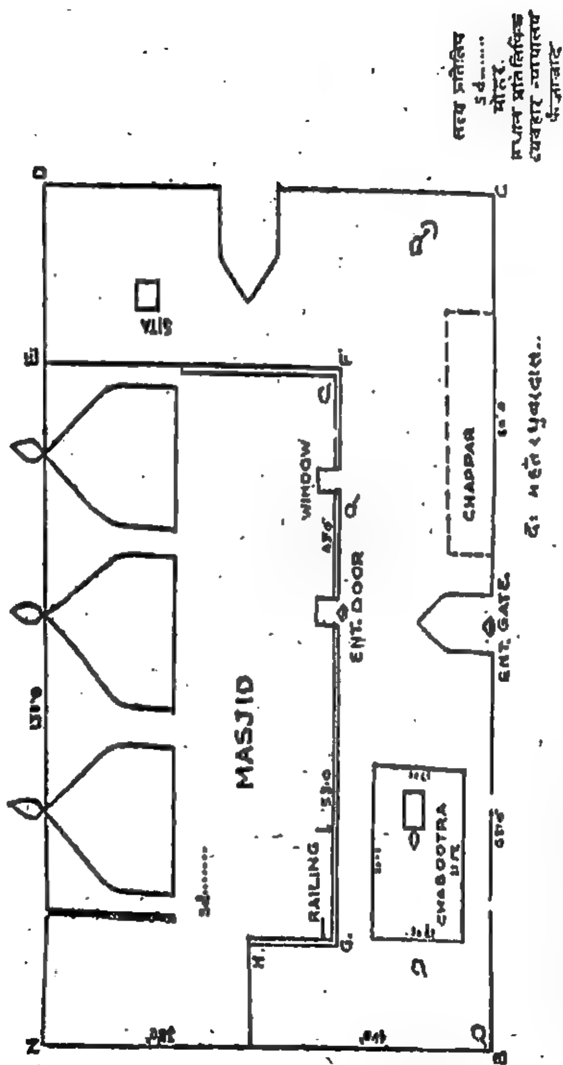
(اے جی نورانی، مین اسٹریم، 4راگست 1990ء)

(بشکریہ: بابری مسجد کے آنسو، مرتب: شمس الہدیٰ ندوی)



## بابری مسجد کا اصل نقشہ

بابری مسجد کا سائٹ پلان نام نہاد رام جنم استھان چبوترہ جسے مقدمہ نمبر 61/280، 1885ء میں
مہنت رگھوبر داس نے داخل کیا تھا۔ 24 دسمبر 1885ء کو سب جج ہرکشن نے مدعی کا دعویٰ رد کردیا۔




ABCDE is in possession of 'Hindoos.
WEFGH is in possession of Mohammadans.

وہ نقشہ جس میں بابری مسجد اور کلیان سنگھ حکومت میں کورٹ کے آرڈر کے برخلاف بنائے جانے والا پلیٹ فارم شامل ہے جسے بعد میں کورٹ نے ہٹانے کا حکم سنایا اور کلیان سنگھ کو ایک دن کی سزا سنائی۔

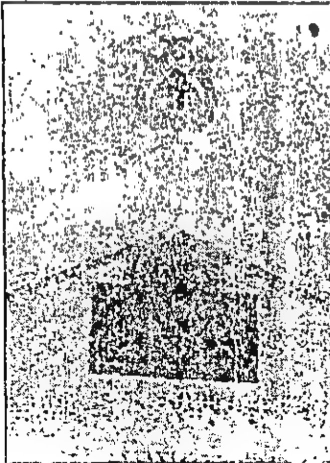


مسجد کی بابری دیواروں پر کتبے اور قرآنی آیات

## مسجد کی باہری دیواروں پر کتبہ اور قرآنی آیات



بابری مسجد کی اندرونی دیواروں پر خطاطی کے ذریعہ اللہ لکھا ہوا، جو 1950ء میں جبراً مندر بنانے کے بعد بھی موجود رہا۔ یہ فوٹوگراف کورٹ میں داخل کیا گیا۔



بابری مسجد کی مغربی دیوار پر خوشنما ڈیزائن کے اندر اللہ لکھا ہوا ہے جو اگست 1950ء تک موجود تھا، جسے بعد میں مٹادیا گیا، اس کے نیچے سیتارام لکھ دیا گیا۔

# ترتیب

## بابری مسجد: شہادت سے قبل ــ شہادت کے بعد

باب: 2 ہندتو: حقیقت، تاریخ، عزائم



باب: 3 بابری مسجد کی تاریخی حیثیت

## باب: 4 بابری مسجد بنام رام جنم بھومی

## باب: 5 شہید بابری مسجد: قانونی پہلو



## باب: 6 بابری مسجد - اجودھیا تنازعہ تاریخ کے آئینے میں
(Chronology of Events)

# کتابیات (BIBLIOGRAPHY)

1. بابری مسجد: تاریخی پس منظر اور پیش نظر کی روشنی میں
از: صباح الدین عبدالرحمٰنؒ، دارالمصنفین، اعظم گڑھ
2. مساجد اللہ از: عبدالعلیم اصلاحی، حیدرآباد
3. بابری مسجد کے آنسو از: شمس الہدیٰ ندوی
4. شہید بابری مسجد از: معصوم مرادآبادی
5. بابری مسجد کی شہادت کے سانحہ کی بازگشت از: عطاء الرحمٰن وجدی، سہارنپوری
6. بابری مسجد، رام جنم بھومی تنازعہ از: شہلا نواب
7. اجودھیا دیواد: سوچنے کی باتیں از: سید محمد اقبال، گیا
8. راہِ عمل از: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
9. ہندتو از: اسرار عالم، دارالعلم، نئی دہلی۔
10. آر.ایس.ایس.: ایک تعارف از: حارث بشیر، کوسموس پبلی کیشنز، نئی دہلی
11. Babri Masjid: A Tale Untold
By: Dr. Jamil Akhtar Genuine Publications, New Delhi
12. India Divided By: Dr. Rajendra Prasad

## رسائل واخبارات (اُردو)

- ماہنامہ افکارِ ملی، نئی دہلی۔ مدیر: ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس بابری مسجد نمبر اور دیگر شمارے۔
- ماہنامہ استقامت ڈائجسٹ، کانپور، شہید بابری مسجد نمبر، 1993ء
- ماہنامہ نقوشِ عالم، بنگلور
- ماہنامہ ہدایت، جے پور
- ماہنامہ ملت کا ترجمان، جامِ نور، سہسرام، (بہار)
- ہفتہ وار نقیب، پھلواری شریف، پٹنہ
- ہفت روزہ، نئی صدا، کولکاتہ
- صدائے جھارکھنڈ، رانچی
- روزنامہ راشٹریہ سہارا (اُردو)، نئی دہلی
- ہفت روزہ، عالمی سہارا، نئی دہلی
- روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی
- روزنامہ انقلاب، ممبئی
- روزنامہ سالار، بنگلور
- روزنامہ ساز دکن، حیدرآباد
- سہ روزہ دعوت، نئی دہلی۔
- ہفتہ وار بلٹز، ممبئی۔
- ہفت روزہ ندائے خلافت، لاہور

## رسائل واخبارات (انگریزی)

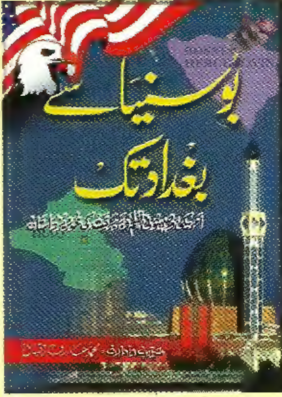
- **Illustrated Weekly**, Mumbai,
- **Probe India**, Monthly, New Delhi
- **Statesman**, Calcutta
- **Deccan Herald**, Bangalore
- **India Today**, New Delhi
- **Frontline**, New Delhi
- **Out Look**, Weekly (English & Hindi Edition)
- **Muslim India**, Edited by: Syed Shahabuddin, New Delhi.
- **The Milli Gazette**, Quarterly, New Delhi
- **Indian Express**, New Delhi
- **Nav Bharat Times** (Hindi), New Delhi
- **The Times of India**, New Delhi
- **Hindustan Times**, New Delhi
- **The Hindu**, Madras, Daily
- **The Pioneer**, Daily
- **The Patriot**, New Delhi, Daily
- **Independant**, Daily

## فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ کی چند تازہ مطبوعات

امریکی وصیہونی ظلم وبربریت کی خونریز داستان اور عراق کی مستند تاریخ




P.268 Price: Rs.67.00

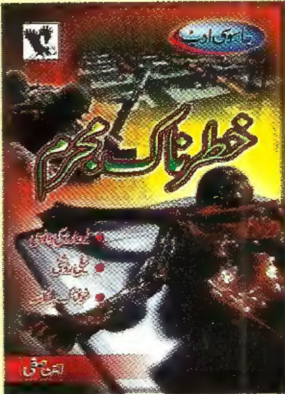



P.168 Price: Rs.45.00

- امریکہ کا حقیقی چہرہ کیا ہے؟
- صیہونیت عالم انسانیت کو کس طرح غلام بنا رہی ہے؟
- عراقی صدر صدام حسین کا اصل جرم کیا ہے؟
- موجودہ حالات میں اسلام اور مسلمانوں کا مستقبل کیا ہے؟
- بوسنیا کے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کیوں اور کس طرح کی گئی؟




P.224 H.bound Rs.56.00




P.240 H.bound Rs.60.00

عظیم مصنف ـــــ معیاری تحریر ـــــ باوقار انداز

ابن صفی کی شاہکار تحریروں کا نادر انتخاب

مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

# فرید بُک ڈپو (پرائیویٹ) لمٹیڈ

Rs.125/-

# FARID BOOK DEPOT (Pvt.) Ltd.


Corp. Off.: 2158, M.P. Street, Pataudi House, Darya Ganj, N. Delhi - 2
Phones : 3289786, 3289159 Fax : 3279998 Res.: 3262486
E-mail : farid@ndf.vsnl.net.in Websites : faridexport.com, faridbook.com